۱۱۰ سوال و جواب

حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی دام ظلہ

مترجم: اقبال حیدر حیدری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا رحم کرنے والا مہربان ہے"

قال رسول الله ﷺ: "انی تارک فیکم الثقلین، کتاب الله، وعترتی اهل بیتی ما ان تمسکتم بهما لن تضلّوا ابدا وانهما لن یفترقا حتّیٰ یردا علیّ الحوض".

حضرت رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: "میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جا تا ہوں: (ایک) کتاب خدا اور (دوسری) میری عترت اہل بیت (علیہم السلام)، اگر تم انھیں اختیار کیے رہو تو کبھی گمراہ نہ ہوگے، یہ دونوں کبھی جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر میرے پاس پہنچیں"۔

(صحیح مسلم: ۷/۱۲۲، سنن دارمی: ۲/۴۳۲، مسند احمد: ج ۳، ۱۴، ۱۷، ۲۶، ۵۹ و ۴/۳۶۶ و ۵/۳۷۱، ۱۸۲ اور ۱۸۹، مستدرک حاکم: ۳/۱۰۹، ۱۴۸، ۵۳۳، وغیرہ)

۱۱۰ سوال و جواب

خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران۔کراچی
شمارہ دیوی: ۲۹۷/۰۷/۶
شمارہ ثبت: ۸۹۶۰
تاریخ ثبت: ۱۳۸۷/۷/۴

۱۱۰ سوال و جواب

حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی دام ظلہ

مترجم: اقبال حیدر حیدری

مجمع جہانی اہل بیت علیہم السلام

سرشناسه	: مکارم شیرازی، ناصر، ۱۳۰۵
عنوان قراردادی	: ۱۱۰ [صد و ده] سوال و جواب / ناصر مکارم شیرازی؛ مترجم اقبال حیدر حیدری.
مشخصات نشر	: قم: مجمع جهانی اهل البیت (ع)، ۱۳۸۵.
مشخصات ظاهری	: ۶۲۴ ص.
شابک	: 964 - 529 - 130-5
یادداشت	: فیپا
یادداشت	: زبان: اردو.
موضوع	: اسلام - مسائل متفرقه - پرسش و پاسخها.
موضوع	: اسلام - پرسش ها و پاسخها.
شناسه افزوده	: حیدری، اقبال حیدر، مترجم.
رده بندی کنگره	: ۱۳۸۵ ۲۰۲۶ ص ۲ م / ۱۲ BP
رده بندی دیویی	: ۲۹۷/۰۷۶
شماره کتابخانه ملی	: ۴۱۵۱۴ - ۸۵ م

نام کتاب:	۱۱۰سوال وجواب
تالیف:	آیۃ اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی
ترتیب و تنظیم:	سید حسین حسینی
مترجم:	اقبال حیدر حیدری
تصحیح:	فیروز حیدر فیضی
نظر ثانی:	نثار احمد زین پوری
پیشکش:	معاونت فرہنگی، ادارۂ ترجمہ
ناشر:	مجمع جہانی اہل بیت علیہم السلام
طبع:	اوّل
سال اشاعت:	۱۴۲۷ھ ۲۰۰۶ء
تعداد:	۳۰۰۰
مطبع:	لیلیٰ

ISBN:_964_529_130_5

info@ahl-ul-bayt.org

www.ahl-ul-bayt.org

حرف اول

جب آفتاب عالم تاب افق پر نمودار ہوتا ہے کائنات کی ہر چیز اپنی صلاحیت و ظرفیت کے مطابق اس سے فیضیاب ہوتی ہے حتی ننھے ننھے پودے اس کی کرنوں سے سبزی حاصل کرتے اور غنچہ و کلیاں رنگ و نکھار پیدا کرلیتی ہیں تاریکیاں کافور اور کوچہ و راہ اجالوں سے پرنور ہوجاتے ہیں، چنانچہ متمدن دنیا سے دور عرب کی سنگلاخ وادیوں میں قدرت کی فیاضیوں سے جس وقت اسلام کا سورج طلوع ہوا، دنیا کی ہر فرد اور ہر قوم نے قوت و قابلیت کے اعتبار سے فیض اٹھایا۔

اسلام کے مبلغ و موسس سرورکائنات حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ غار حراء سے مشعل حق لے کر آئے اور علم و آگہی کی پیاسی اس دنیا کو چشمۂ حق و حقیقت سے سیراب کردیا، آپ کے تمام الٰہی پیغامات ایک ایک عقیدہ اور ایک ایک عمل فطرت انسانی سے ہم آہنگ ارتقائے بشریت کی ضرورت تھا، اس لئے ۲۳ برس کے مختصر عرصے میں ہی اسلام کی عالمتاب شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں اور اس وقت دنیا پر حکمراں ایران و روم کی قدیم تہذیبیں اسلامی قدروں کے سامنے ماند پڑ گئیں، وہ تہذیبی اصنام جو صرف دیکھنے میں اچھے لگتے ہیں اگر حرکت و عمل سے عاری ہوں اور انسانیت کو سمت دینے کا حوصلہ، ولولہ اور شعور نہ رکھتے تو مذہب عقل و آگہی سے روبرو ہونے کی توانائی کھودیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ایک چوتھائی صدی سے بھی کم مدت میں اسلام نے تمام ادیان و مذاہب اور تہذیب و روایات پر غلبہ حاصل کرلیا۔

اگر چہ رسول اسلام ﷺ کی یہ گرانبہا میراث کہ جس کی اہل بیت علیہم السلام اور ان کے پیروؤں نے خود کو طوفانی خطرات سے گزار کر حفاظت و پاسبانی کی ہے، وقت کے ہاتھوں خود فرزندان اسلام کی بے توجہی اور ناقدری کے سبب ایک طویل عرصے کے لئے تنگنائیوں کا شکار ہوکر اپنی عمومی افادیت کو عام کرنے سے محروم کردی گئی تھی، پھر بھی حکومت و سیاست کے عتاب کی پروا کئے بغیر مکتب اہل بیت علیہم السلام نے اپنا چشمۂ فیض جاری رکھا اور چودہ سو سال کے عرصے میں بہت سے ایسے جلیل القدر علماء و دانشور دنیائے اسلام کو تقدیم کئے جنھوں نے بیرونی افکار و نظریات سے متاثر اسلام و قرآن مخالف فکری و نظری موجوں کی زد پر اپنی حق آگین تحریروں اور تقریروں سے مکتب اسلام کی پشتپناہی کی ہے اور ہر دور اور ہر زمانے میں ہر قسم کے شکوک و شبہات کا ازالہ کیا ہے، خاص طور پر عصر حاضر میں اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد ساری دنیا کی نگاہیں ایک بار پھر اسلام و قرآن اور مکتب اہل بیت علیہم السلام کی طرف اٹھی اور گڑی ہوئی ہیں، دشمنان

اسلام اس فکری ومعنوی قوت واقتدار کو توڑنے کے لئے اور دوستداران اسلام اس مذہبی اور ثقافتی موج کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑنے اور کامیاب وکامراں زندگی حاصل کرنے کے لئے بے چین وبے تاب ہیں، یہ زمانہ علمی اور فکری مقابلے کا زمانہ ہے اور جو مکتب بھی تبلیغ اور نشر واشاعت کے بہتر طریقوں سے فائدہ اٹھا کر انسانی عقل وشعور کو جذب کرنے والے افکار ونظریات دنیا تک پہنچائے گا، وہ اس میدان میں آگے نکل جائے گا۔

(عالمی اہل بیتؑ کونسل) مجمع جہانی اہل بیت علیہم السلام نے بھی مسلمانوں خاص طور پر اہل بیتؑ عصمت وطہارت کے پیرووں کے درمیان ہم فکری ویکجہتی کو فروغ دینا وقت کی ایک اہم ضرورت قرار دیتے ہوئے اس راہ میں قدم اٹھایا ہے کہ اس نورانی تحریک میں حصہ لے کر بہتر انداز سے اپنا فریضہ ادا کرے، تا کہ موجودہ دنیائے بشریت جو قرآن وعترت کے صاف وشفاف معارف کی پیاسی ہے زیادہ سے زیادہ عشق ومعنویت سے سرشار اسلام کے اس مکتب عرفان وولایت سے سیراب ہوسکے۔ ہمیں یقین ہے عقل وخرد پر استوار ماہرانہ انداز میں اگر اہل بیتؑ عصمت وطہارت کی ثقافت کو عام کیا جائے اور حریت وبیداری کے علمبردار خاندان نبوتؐ ورسالت کی جاوداں میراث اپنے صحیح خدوخال میں دنیا تک پہنچادی جائے تو اخلاق وانسانیت کے دشمن، انانیت کے شکار، سامراجی خوں خواروں کی نام نہاد تہذیب وثقافت اور عصر حاضر کی ترقی یافتہ جہالت سے تھکی ماندی آدمیت کو امن ونجات کی دعوتوں کے ذریعہ امام عصر (عج) کی عالمی حکومت کے استقبال کے لئے تیار کیا جاسکتا ہے۔

ہم اس راہ میں تمام علمی وتحقیقی کوششوں کے لئے محققین ومصنفین کے شکر گزار ہیں اور خود کو مؤلفین ومترجمین کا ادنیٰ خدمتگار تصور کرتے ہیں، زیر نظر کتاب، مکتب اہل بیت علیہم السلام کی ترویج واشاعت کے اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، حضرت آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی کی گرانقدر کتاب ۱۱۰ سوال وجواب کو فاضل جلیل مولانا اقبال حیدر حیدری نے اردو زبان میں اپنے ترجمہ سے آراستہ کیا ہے جس کے لئے ہم دونوں کے شکر گزار ہیں اور مزید توفیقات کے آرزومند ہیں، اسی منزل میں ہم اپنے تمام دوستوں اور معاونین کا بھی صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ جنھوں نے اس کتاب کے منظر عام تک آنے میں کسی بھی عنوان سے زحمت اٹھائی ہے، خدا کرے کہ ثقافتی میدان میں یہ ادنیٰ جہاد رضائے مولیٰ کا باعث قرار پائے۔

والسلام مع الاکرام

مدیر امور ثقافت، مجمع جہانی اہل بیت علیہم السلام

عرض مترجم

بسم اللہ الرحمن الرحیم الحمد للہ رب العالمین و بہ نستعین و صلی اللہ علیٰ محمد و آلہ الطیبین الطاہرین.

انسان جس چیز کے بارے میں نہیں جانتا اس کے بارے میں سوال کرتا ہے کیونکہ یہ چیز انسان کی فطرت میں شامل ہے، جس کی طرف قرآن کریم نے واضح طور پر اشارہ کیا ہے کہ جس چیز کو تم نہیں جانتے اس کے بارے میں صاحبان علم سے سوال کرو، اس کے علاوہ سوال نصف علم ہوتا ہے، جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد ہے "السؤال نصف العلم"، نیز یہ دیکھا گیا ہے کہ اگر انسان کی معلومات سوال کے ذریعہ حاصل ہوئی ہے تو پائیدار ہوتی ہے، لہٰذا سوال اور جواب کا سلسلہ قابل اہمیت ہے۔

عصر حاضر میں جوانوں اور نوجوانوں کو گمراہ کرنے کے لئے جس قدر پروپیگنڈے کئے جارہے ہیں، تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی، اخبار اور جرائد ایک طرف، تو ریڈیو، ٹی وی دوسری طرف اور آج کل انٹرنیٹ کا زمانہ ہے جہاں پوری دنیا کی اچھائیاں کم اور برائیاں زیادہ پائی جاتی ہیں، ہر طرف سے اسلام کے خلاف پروپیگنڈے کئے جارہے ہیں، اسلام کی ترقی دیکھ کر اسلام دشمن طاقتیں ایڑی چوٹی کا زور لگارہی ہیں، خصوصاً جبکہ دشمن سمجھ چکا ہے کہ حقیقی دین کے ماننے والے یہی شیعہ اثنا عشری ہیں، کہیں یورپ اور امریکہ سے اسلام کے خلاف اعتراضات ہوتے ہیں تو کبھی فرقہ وہابیت کی طرف سے شیعیت پر بے جا اعتراضات کئے جاتے ہیں۔

لہٰذا ایسے ماحول میں اپنے جوانوں اور نوجوانوں کو دینی راستہ پر قائم رکھنا ہم سب کی اہم ذمہ داری ہے، علمائے کرام، دینی رہبروں اور قوم وملت کے صاحبان حیثیت افراد کا فریضہ ہے کہ اس

سلسلے میں ہر ممکن کوشش کریں، کہیں ایسا نہ ہو کہ کل روز قیامت بارگاہ خداوندی میں شرمندگی ہو۔!!

اسی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے مجمع جہانی اہل بیت علیہم اسلام نے اس سلسلہ میں قدم اٹھایا ہے اور عربی وفارسی، اردو اور دوسری زبانوں میں موجودہ مفید کتابوں کا ترجمہ شروع کیا ہے، جس کی ایک کڑی کتاب ہذا ہے، سوال و جواب کا یہ مجموعہ استاد محترم حضرت آیت اللہ العظمی ناصر مکارم شیرازی دام ظلہ کی تفسیر "نمونہ" اور تفسیر "پیام قرآن" سے منتخب کیا گیا ہے، جس کو حجۃ الاسلام و المسلمین جناب سید حسین حسینی صاحب نے ترتیب دیا ہے، واقعاً موصوف قابل تحسین ہیں جنھوں نے مذکورہ تفسیر سے یہ سوالات اور جوابات جمع کئے، تاکہ ہمارے جوان اور نوجوان، خصوصاً طلاب کرام اس مجموعہ سے فیضیاب ہوسکیں۔

ہم تہہ دل سے ان دوستوں کے شکرگزار ہیں جنھوں نے اس کتاب کی تصحیح، کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ نیز طباعت واشاعت میں حقیر کا تعاون کیا، خداوند عالم ہم سب کی توفیقات میں مزید اضافہ فرمائے۔

"رَبَّنا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ العَلِیْم"، والسَّلامُ علَیکُم وَرَحْمَةُ اللهِ وَبرَکاتُه

اقبال حیدر حیدری

۱۷/ربیع الاول ۱۴۲۶ھ

حوزہ علمیہ قم المقدسہ۔ایران

Emial: ihh2001@yahoo.com

تقریظ

حضرت آیت اللہ العظمیٰ مکارم شیرازی دام ظلہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ الحمد لله رب العالمين و به نستعين و صلى الله على محمد و آله الطيبين الطاهرين.

سوال ہمیشہ سے انسانی علم و دانش کے خزانہ کی کنجی رہا ہے۔

لہٰذا وہ افراد اور قوم و ملت جو کم سوال کرتے ہیں انھوں نے اس عظیم خزانہ سے کم فائدہ حاصل کیا ہے، اور بنیادی طور پر سوال کرنا اور اس کا جواب سننا ہر انسان کا حق ہے اور اسے کوئی بھی اس عقلی و منطقی حق سے محروم نہیں کر سکتا، چنانچہ قرآن مجید نے بارہا اس بات کی تاکید کی ہے کہ جس چیز کے بارے میں تم نہیں جانتے، اسے صاحبان علم و دانش سے دریافت کرو ﴿فَاسْـأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾(۱)

اس قرآنی حکم کی وسعت اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اسلام؛ سوال کے لئے کوئی حد معین کرنے کو قبول نہیں کرتا اور مسلمان بلکہ غیر مسلم (کیونکہ آیت غیر مسلم لوگوں سے مخاطب ہے اگرچہ اس کا مفہوم عام ہے) کو اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ مختلف مسائل میں چاہے وہ اعتقادی مسائل ہوں یا اجتماعی، اخلاقی، سیاسی یا کسی بھی چیز کے بارے میں سوال کر سکتے ہیں۔

---

(۱) سورۂ نحل، آیت ۴۳۔

یہ بات واضح ہے کہ لوگوں کے عقائد و افکار کو خراب کرنے یا عام لوگوں کے افکار میں تشویش اور تزلزل ایجاد کرنے یا ہٹ دھرمی اور جنگ وجدال کے لئے انحرافی سوال اس قاعدہ سے مستثنٰی ہیں، کیونکہ درحقیقت یہ سوال نہیں ہے بلکہ سوال کے روپ میں فساد پھیلاتا ہے۔

بہر حال چونکہ قرآن مجید خدا شناسی اور انسانی مسائل کا ایک عظیم الشان دائرۃ المعارف (انسائیکلو پیڈیا) ہے، اس لئے جگہ جگہ پر مختلف آیات کے ذیل میں بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں لیکن چونکہ عام طور پر سابقہ نہیں پڑتا تھا لہٰذا بعض مفسرین نے ان کا جواب پیش نہیں کیا۔

جس وقت ہم نے (چند دیگر فاضل علما کی مدد سے) تفسیر نمونہ لکھنا شروع کی تو ہماری کوشش تھی، ان تمام سوالات (خصوصاً عصر حاضر کی ترقی یافتہ دنیا میں پیدا ہونے والے سوالات) کو بیان کریں اور دقیق طریقہ سے جواب دیا جائے۔

در چونکہ ان سوالات کا جاننا سب کے لئے ضروری ہے خصوصاً آج کل کے پڑھے لکھے نوجوانوں کے لئے نہایت ہی مفید ہے، لہٰذا لنظر حجۃ الاسلام جناب آقای حسینی صاحب نے چند افاضلِ قم کی مدد سے جن کے نام مقدمہ میں بیان ہوئے ہیں اس طرح کے سوالات اور ان کے جوابات کو تفسیر نمونہ کی ۲۷ رجلدوں اور تفسیر پیام قرآن کی ۱۰ رجلدوں سے جمع کر کے ترتیب دیا جس کے نتیجہ میں ۰ راہم سوال آپ حضرات کی خدمت میں حاضر ہیں، واقعاً سوالات کو مختلف ابواب کی صورت میں ترتیب دینا ان کے ذوق اور سلیقہ کی دلیل ہے، (خدا ان کو جزائے خیر دے)، امید ہے کہ سوالات کا یہ مجموعہ سب کے لئے بالخصوص ہمارے جوانوں میں اسلامی اور قرآنی مسائل کو سمجھنے کے لئے مفید واقع ہو اور آخرت کے لئے بہترین ذخیرہ قرار پائے۔

ناصر مکارم شیرازی

حوزہ علمیہ، قم المقدسہ

پیش گفتار

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اگرچہ شیعہ علمائے کرام ابھی تک قرآن مجید کی متعدد تفاسیر لکھ چکے ہیں، جن سے عوام الناس، طلاب حوزات علمیہ اور علمائے کرام فیضیاب ہوتے رہے ہیں، لیکن ان میں "تفسیر نمونہ" خاص امتیاز کی حامل ہے وہ بھی فارسی زبان میں جس کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی، خصوصاً دورِ حاضر میں جبکہ قرآن فہمی کا جذبہ ہر طبقہ میں پیدا ہو رہا ہے۔

حضرت آیت اللہ العظمیٰ مکارم شیرازی نے چند علما کے ساتھ مل کر اس ضرورت کو پورا کیا اور اس تفسیر کے ذریعہ قرآن مجید کی شایان شان خدمت انجام دی۔

اس تفسیر کے خاص امتیازات حسب ذیل ہیں جن کی وجہ سے یہ مقبول عام ہوئی ہے۔

۱۔ یہ تفسیر اگرچہ فارسی زبان میں ہے لیکن اس کے علمی اور تحقیقاتی نکات میں کافی رعایت کی گئی ہے، تا کہ طلاب کرام، علمائے عظام اور قرآن فہمی کا شوق رکھنے والے عوام الناس بھی اس سے فیضیاب ہو سکیں۔

۲۔ تفسیر آیات میں بعض غیر ضروری مسائل میں الجھنے کے بجائے ان مسائل سے خصوصی بحث کی گئی ہے جو انسان کے لئے واقعاً زندگی ساز ہیں جن کے ذریعہ انسان کی فردی اور معاشرتی زندگی کافی متاثر ہے۔

۳۔ آیات میں بیان شدہ عناوین کے تحت ایک مختصر و مفید عنوان سے الگ بحث کی گئی ہے جس کے مطالعہ کے بعد قارئین کرام کو دوسری کتابوں کے مطالعہ کی ضرورت نہ ہوگی۔

۴۔ تفسیر میں مشکل اور پیچیدہ اصطلاحات سے پرہیز کیا گیا ہے لیکن ضرورت کے وقت حاشیہ میں ضروری وضاحت بھی کی گئی ہے، تا کہ علماء اور صاحبان نظر حضرات کے علاوہ عام قارئین کرام کے لئے بھی مفید واقع ہو سکے۔

۵۔ اس تفسیر کا ایک اہم امتیاز یہ ہے کہ اس میں اسلامی معارف اور اصول و فروع کے سلسلہ میں

دور حاضر میں ہونے والے مختلف سوالات اور اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔

انھیں امتیازات کی بنا پر استاد معظم سے اجازت طلب کی تاکہ تفسیر کے مختلف سوالات اور جوابات کو جمع کر کے الگ ایک کتاب کی شکل دے دی جائے جو عام قارئین کرام کے لئے مفید واقع ہو سکے، ہماری خوش قسمتی ہے کہ استاد بزرگوار نے اجازت مرحمت فرمائی، اور ہم نے حجج اسلام احمد جعفری، سید علی رضا جعفری، سید مرتضی موسوی، سید اصغر حسینی اور محمد حسین محمدی کے ہمراہ تفسیر نمونہ اور تفسیر پیام قرآن کا شروع سے آخر تک دقیق مطالعہ کیا اور اس سے سوالات کو جمع کیا، جو ۱۱۰ سوال و جواب کی صورت میں آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔

چند ضروری نکات:

۱۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک ہی سوال، تفسیر کی مختلف جلدوں میں بیان ہوا ہے ہم نے ان کو ایک جگہ جمع کیا اور خاص ترتیب سے ذکر کیا ہے۔

۲۔ اس مجموعہ میں تفسیر آیات سے متعلق سوالات کو ذکر نہیں کیا گیا ہے کیونکہ ہمارا مقصد ان سوالات کا جمع کرنا تھا جو آج کل ہمارے دینی معاشرہ میں بیان ہوتے ہیں، نہ کہ تفسیری نکات' ان کے لئے تفسیر کا مکمل طور پر مطالعہ کیا جائے۔

۳۔ اگرچہ ظاہراً اس کتاب کے مطالب جمع کرنا آسان کام ہے لیکن اس کے مختلف مراحل طے کرنے پڑے ہیں، منجملہ تفسیری دورہ، سوالات وجوابات کی جمع آوری اور ان کو منظم و مرتب کرنا واقعاً ایک فرصت طلب کام تھا۔

۴۔ اس کتاب کے اکثر سوال و جواب تفسیر نمونہ سے لئے گئے ہیں اگرچہ کچھ سوالات پیام قرآن اور پیام امام سے بھی ماخوذ ہیں، (سب کا حوالہ حاشیہ پر ذکر کر دیا گیا ہے)

امید ہے کہ یہ ناچیز کوشش حضرت بقیۃ اللہ امام زمانہ عجل اللہ تعالی فرجہ الشریف کی بارگاہ میں شرف قبولیت حاصل کرے۔

سید حسین حسینی

قم المقدسہ

معرفت خدا

۱۔ خدا کی معرفت کیوں ضروری ہے؟

جب یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ کوئی بھی فعل بغیر علت کے نہیں ہوتا تو پھر اس دنیا کے خالق کی معرفت اور اس کو پہچاننے کے لئے بھی کوئی نہ کوئی علت اور سبب ہونا چاہئے، چنانچہ فلاسفہ اور دانشوروں نے خدا شناسی کے لئے تین بنیادی وجہیں و علتیں بیان کی ہیں، جن پر قرآن کریم نے واضح طور پر روشنی ڈالی ہے:

۱۔ عقلی علت۔

۲۔ فطری علت۔

۳۔ عاطفی علت۔

عقلی علت:

انسان کمال کا عاشق ہوتا ہے، اور یہ عشق تمام انسانوں میں ہمیشہ پایا جاتا ہے، انسان جس چیز میں اپنا کمال دیکھتا ہے اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، البتہ یہ بات علیحدہ ہے کہ بعض لوگ خیالی اور بیہودہ چیزوں ہی کو کمال اور حقیقت تصور کر بیٹھتے ہیں۔

کبھی اس چیز کو ''منافع حاصل کرنے اور نقصان سے روکنے والی طاقت'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے کیونکہ انسان اسی طاقت کی بنا پر اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے کہ جس چیز میں اس کا فائدہ یا نقصان

ہواس پر خاص توجہ دے۔

انسان کی اس حقیقت کو "غریزہ" کا نام دینا بہت مشکل ہے کیونکہ معمولاً غریزہ اس اندرونی رجحان کو کہا جاتا ہے جو انسان اور دیگر جانداروں کی زندگی میں بغیر غور و فکر کے اثر انداز ہوتا ہے اسی وجہ سے حیوانات کے یہاں بھی غریزہ پایا جاتا ہے۔

لہٰذا بہتر ہے کہ اس حقیقت کو "عالی رجحانات" کے نام سے یاد کیا جائے جیسا کہ بعض لوگوں نے اس کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

بہر حال انسان کمال دوست ہوتا ہے اور ہر مادی و معنوی نفع کو حاصل کرنا چاہتا ہے اور ہر طرح کے ضرر و نقصان سے پرہیز کرتا ہے چنانچہ، اگر انسان کو نفع یا نقصان کا احتمال بھی ہو تو اس چیز پر توجہ دیتا ہے اور جس قدر یہ احتمال قوی تر ہو جاتا ہے اسی اعتبار سے اس کی توجہ بھی بڑھتی جاتی ہے، لہٰذا یہ ناممکن ہے کہ انسان اپنی زندگی میں کسی چیز کو اہم و موثر مانے لیکن اس سلسلہ میں تحقیق و کوشش نہ کرے۔

خدا، ایمان اور مذہب کا مسئلہ بھی انھیں مسائل میں سے ہے کیونکہ مذہب کا تعلق انسان کی زندگی سے ہوتا ہے اور اسی سے انسان کی سعادت اور خوشبختی یا شقاوت اور بدبختی کا تعلق ہوتا ہے، اور اسی کے ذریعہ انسان سعادت مند ہوتا ہے یا بدبخت ہو جاتا ہے، اور ان دونوں میں ایک گہرا ربط پایا جاتا ہے۔

اس بات کو واضح کرنے کے لئے بعض علما مثال بیان کرتے ہیں فرض کیجئے ہم کسی کو ایک ایسی جگہ دیکھیں جہاں سے دو راستے نکلتے ہوں، اور وہ کہے کہ یہاں پر رکنا بہت خطرناک ہے اور (ایک راستہ کی طرف اشارہ کرکے) کہے کہ یہ راستہ بھی یقینی طور پر خطرناک ہے لیکن دوسرا راستہ "راہ نجات" ہے اور پھر اپنی بات کو ثابت کرنے کے لئے کچھ شواہد و قرائن بیان کرے، تو ایسے موقع پر گزرنے والا مسافر اپنی یہ ذمہ داری سمجھتا ہے کہ اس سلسلہ میں تحقیق و جستجو کرے، ایسے موقع پر بے

توجہی کرنا عقل کے برخلاف ہے۔(۱)

جیسا کہ "دفع ضرر محتمل" (احتمالی نقصان سے بچنا) ایک مشہور ومعروف قاعدہ ہے جس کی بنیاد عقل ہے، قرآن کریم نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا

﴿قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ثُمَّ كَفَرْتُمْ بِهِ مَنْ أَضَلُّ مِمَّنْ هُوَ فِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ﴾(۲)

"آپ کہہ دیجئے کہ کیا تمھیں یہ خیال ہے اگر یہ قرآن خدا کی طرف سے ہے اور تم نے اس کا انکار کردیا تو اس سے زیادہ کون گمراہ ہوگا"۔

البتہ یہ بات ان لوگوں کے سلسلہ میں ہے جن کے یہاں کوئی دلیل ومنطق قبول نہیں کی جاتی، درحقیقت وہ آخری بات جو متعصب، مغرور اور ہٹ دھرم لوگوں کے جواب میں کہی جاتی ہے، وہ یہ ہے اگر تم لوگ قرآن، توحید اور وجود خدا کی حقانیت کو سو فی صد نہیں مانتے تو یہ بات بھی مسلم ہے کہ اس کے برخلاف بھی تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے، لہٰذا یہ احتمال باقی رہ جاتا ہے کہ قرآنی دعوت اور قیامت واقعیت رکھتے ہوں تو اس موقع پر تم لوگ سوچ سکتے ہو کہ دین خدا سے گمراہی اور شدید مخالفت کی وجہ سے تمہاری زندگی کس قدر تاریکی اور اندھیرے میں ہوگی۔

اس بات کو ائمہ علیہم السلام نے ہٹ دھرم لوگوں کے سامنے آخری بات کے عنوان سے کی ہے، جیسا کہ اصول کافی میں ایک حدیث نقل ہوئی ہے جس میں حضرت امام صادق علیہ السلام نے اپنے زمانہ کے ملحد ومنکر خدا "ابن ابی العوجاء" سے متعدد مرتبہ بحث وگفتگو فرمائی ہے، اور اس گفتگو کا آخری سلسلہ حج کے موسم میں ہوئی ملاقات پر تمام ہوا جب امام علیہ السلام کے بعض اصحاب نے

(۱)تفسیر پیام قرآن، جلد ۳،ص ۲۲
(۲)سورہ فصلت آیت ۵۲

آپ سے کہا کیا ''ابن ابی العوجاء'' مسلمان ہوگیا ہے؟ تو امام علیہ السلام نے فرمایا اس کا دل کہیں زیادہ اندھا ہے یہ ہرگز مسلمان نہیں ہوگا، لیکن جس وقت اس کی نظر امام علیہ السلام پر پڑی تو اس نے کہا: اے میرے مولا و آقا!

امام علیہ السلام نے فرمایا "ماجاءَ بِکَ إلیٰ هذا الموضع" (تو یہاں کیا کر رہا ہے؟)

تو اس نے عرض کی "عادة الجسد، و سنة البلد، و لنظر ما الناس فیه من الجنون و الحلق و رمی الحجارة!" (کیونکہ بدن کو عادت ہوگئی ہے اور ماحول اس طرح کا بن گیا ہے، اس کے علاوہ لوگوں کا دیوانہ پن، ان کا سر منڈانا اور رمی جمرہ دیکھنے کے لئے آگیا ہوں!!)

امام علیہ السلام نے فرمایا: "انت بعدُ علی عتوک و ضلالک یا عبد الکریم! (اے عبدالکریم! تو ابھی بھی اپنے ضلالت و گمراہی پر باقی ہے)(۱)

اس نے امام علیہ السلام سے گفتگو کا آغاز کرنے کے لئے کہا تو امام علیہ السلام نے فرمایا "لا جدال فی الحج" (حج، جنگ و جدل کی جگہ نہیں ہے) اور امام علیہ السلام نے اس کے ہاتھ سے اپنی عبا کو کھینچتے ہوئے یہ جملہ ارشاد فرمایا: "ان یکن الامر کما تقول. ولیس کما تقول. نجونا و نجوت و ان یکن الامر کما نقول .وهو کمانقول نجونا وهلکت"!

"اگر حقیقت ایسے ہی ہے جیسے تو کہتا ہے کہ (خدا اور قیامت کا کوئی وجود نہیں ہے) جب کہ ہرگز ایسا نہیں ہے، تو ہم بھی اہل نجات ہیں اور تو بھی، لیکن اگر ہمارا عقیدہ ہے، جب کہ حق بھی یہی ہے تو ہم اہل نجات ہیں اور تو ہلاک ہو جائے گا"۔

( ) "عبدالکریم" کا اصلی نام "ابن ابی العوجاء" تھا، کیونکہ وہ منکر خدا تھا لہٰذا امام نے خاص طور سے اس کو اس نام سے پکارا تاکہ وہ شرمندہ ہو جائے

"ابن ابی العوجاء" نے اپنے ساتھی کی طرف رخ کیا اور کہا "وجدت فی قلبی حزازة فردونی، فردوه فمات" (میں اپنے دل میں درد کا احساس کر رہا ہوں، مجھے واپس لے چلو، چنانچہ جیسے ہی اس کو لے کر چلے تو تھوڑی ہی دیر بعد وہ اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔(۱)(۲)

۲۔جذبہ محبت:

اشارہ

ایک مشہور و معروف ضرب المثل ہے کہ "انسان احسان کا غلام ہوتا ہے" (الانسان عبید الاحسان)

یہی مطلب تھوڑے سے فرق کے ساتھ حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کی حدیث میں بھی نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

"الإنسان عبد الإحسان"(۳)

"انسان، احسان کا غلام ہے"۔

نیز امام علیہ اسلام نے ایک دوسری حدیث میں فرمایا:

"بالإحسان تملک القلوب"(۴)

"احسان کے ذریعہ انسان کے قلوب کو مسخر کیا جاتا ہے"۔

نیز ایک دوسری حدیث میں حضرت علی علیہ اسلام سے مروی ہے:

"وافضِلْ علی من شئت تکن أمیره"(۵)

---

(۱) کافی، جلد اول، صفحہ ۹۷، (کتاب التوحید باب حدوث العالم)

(۲) تفسیر نمونہ، ج ۲۰، صفحہ ۳۲۵

(۳،۴) غرر الحکم

(۵) بحار الانوار، جلد ۷۷، صفحہ ۴۲۱ (آخری)

"ہر شخص کے ساتھ احسان کرو تاکہ اس کے حاکم بن جاؤ"

ان تمام مطالب کا سرچشمہ حدیث پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے کہ آپ نے فرمایا:

"إنَّ اللهَ جَعَلَ قُلُوب عبادِهِ علی حُبِّ مَنْ أحسَنَ إليها ،و بغض من أساء إليها"(۱)

"خداوندعالم نے اپنے بندوں کے دلوں کو اس شخص کی محبت کیلئے جھکا دیا ہے جو ان پر احسان کرتا ہے اور ان کے دلوں میں اس شخص کی طرف سے عداوت ڈال دی ہے جو ان سے بدسلوکی کرتا ہے"۔

مختصر یہ کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کے ساتھ احسان کرے یا اس کی کوئی خدمت کرے یا اس کو کوئی تحفہ دے تو وہ شخص بھی اس سے محبت کرتا ہے، اور نعمت عطا کرنے والے اور احسان کرنے والے سے مانوس ہوجاتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ اس کو مکمل طریقہ سے پہچانے، اور اس کا شکریہ ادا کرے، اور یہ بات بھی طے ہے کہ نعمت اور احسان جتنے اہم ہوتے ہیں "منعم" [یعنی نعمت دینے والے] کی نسبت اس کی محبت اور اس کی پہچان بھی زیادہ ہوتی ہے۔

اسی وجہ سے علمائے علم کلام (عقائد) قدیم الایام سے مذہب کی تحقیق کے سلسلہ میں "شکر منعم" (نعمت عطا کرنے والے کا شکریہ ادا کرنے کو) معرفت خدا کی علتوں میں سے ایک علت شمار کرتے ہیں۔

لیکن اس بات پر بھی توجہ رکھنا چاہئے کہ "شکر منعم" کا مسئلہ عقلی حکم سے پہلے ایک عاطفی مسئلہ ہے، اس مختصر سے اشارہ کو عرب کے مشہور ومعروف شاعر" بوالفتح بستی" کے شعر پر ختم کرتے ہیں

(۱) تحف العقول ص۳۷ (بخش کلمات پیامبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

احسن إلى النّاس تَستعبد قلوبَهُم

فطالما استعبد الإنسان إحسان

''لوگوں کے ساتھ نیکی کروتا کہ ان کے دل پر حکومت کرسکو، بے شک انسان احسان کا غلام ہوتا ہے''۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: ''ایک روز رسول اکرمؐ عائشہ کے حجرے میں تھے تو عائشہ نے سوال کیا کہ آپ اس قدر کیوں خود کو (عبادت کے لئے) زحمت میں ڈالتے ہیں؟ جبکہ خداوند عالم نے آپ کے گزشتہ اور آئندہ کے تمام گناموں کو معاف کردیا ہے''(۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''إلا اکون عبداً شکوراً''(۲) (کیا مجھے اس کا شکر گزار بندہ نہیں ہونا چاہئے؟)

۳۔ فطری لگاؤ:

اشارہ:

جس وقت فطرت کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے تو اس سے مراد اندرونی ادراک و احساس ہوتا ہے جس کے اوپر کسی عقلی دلیل کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔

جس وقت ہم ایک دلکش منظر، یا خوبصورت باغ اور چمن دیکھتے ہیں اور ہمارے دل میں اس خوبصورت منظر کے پیش نظر کشش محسوس ہوتی ہے تو اندر سے ہمارا احساس آواز دیتا ہے کہ اس کشش اور لگاؤ کا نام عشق یا خوبصورتی رکھ دیا جائے، جبکہ یہاں کسی بھی طرح کے استدلال کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔

---

(۱) سورۂ فتح کی پہلی آیت کی طرف اشارہ ہے، اور اس کی تفسیر کی وضاحت تفسیر نمونہ کی جلد ۲۲، کے صفحہ ۸ پر موجود ہے

(۲) اصول کافی، جلد ۲، باب الشکر حدیث ۶.

جی ہاں! خوبصورتی کا احساس کرنے والی یہ طاقت ،انسان کی بلند پرواز روح کے خواہشات اور رجحانات میں سے ہے، مذہب کے سلسلہ میں یہ کشش خصوصاً معرفت خدا کا مسئلہ بھی ایک اندورنی اور ذاتی احساس ہے، بلکہ انسان کے اندر سب سے بڑی طاقت کا نام ہے۔

اسی وجہ سے ہم کسی قوم وملت کو نہیں دیکھتے (نہ آج اور نہ ماضی میں) کہ ان کے یہاں مذہبی عقائد نہ پائے جاتے ہوں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمیق احساس ہر انسان کے یہاں پایا جاتا ہے۔

قرآن مجید نے عظیم الشان انبیاء کے قوم کے واقعات کو بیان کرتے ہوئے اس نکتہ پر توجہ دی ہے کہ رسالت کی ذمہ داری شرک وبت پرستی کا خاتمہ تھا (نہ کہ خدا کے وجود کو ثابت کرنا، کیونکہ یہ موضوع تو ہر انسان کی فطرت میں پوشیدہ ہے)

یہ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ انبیاء علیہم السلام یہ نہیں چاہتے تھے کہ ''خدا پرستی کا درخت'' لوگوں کے دلوں میں لگائیں بلکہ ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ ان کے دلوں میں موجود اس درخت کی آبیاری کریں اور اس کے پاس سے بے کار گھاس اور کانٹوں کو ہٹادیں جن کی وجہ سے کبھی یہ درخت بالکل خشک ہوسکتا ہے یہاں تک کہ جڑ سے اکھڑ جاتا ہے۔

''اَلّا تعبدوا اِلّا اللّٰہ'' یا ''اَلّا تعبدوا اِلّا اِیّاہ'' (خدا کے علاوہ کسی کی عبادت نہیں کرو) اس جملہ میں بتوں کی پوجا سے روکا جارہا ہے نہ یہ کہ وجود خدا کو ثابت کیا جارہا ہے، اور یہ جملہ بہت سے انبیاء کی گفتگو میں بیان ہوا، منجملہ حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تبلیغ میں (۱) جناب نوح علیہ السلام کی تبلیغ میں (۲) جناب یوسف علیہ السلام کی تبلیغ میں (۳) اور جناب ہود علیہ السلام کی تبلیغ میں بیان ہوا ہے۔(۴)

---

(۱) سورۂ ہود، آیت ۲۔ (۲) سورۂ ہود، آیت ۲۶۔

(۳) سورۂ یوسف، آیت ۴۰ (۴) سورۂ احقاف، آیت ۲۱۔

اس کے علاوہ ہمارے دل و جان میں دوسرے فطری احساسات بھی پائے جاتے ہیں جیسے علم ودانش، جن کے بارے میں بہت زیادہ شوق ورغبت ہوتی ہے۔

کیا یہ ممکن ہے کہ اس وسیع وعریض دنیا کے عجیب وغریب نظام کو تو دیکھیں لیکن اس نظام کے پیدا کرنے والے کی معرفت وشناخت کے سلسلہ میں کوئی شوق ورغبت نہ ہو؟

کیا یہ ممکن ہے کہ ایک دانشور چیونٹیوں کی شناخت کے بارے میں بیس سال تک ریسرچ کرے اور دوسرا دسیوں سال پرندوں یا درختوں، یا دریائی مچھلیوں کے بارے میں تحقیق کرے، لیکن اس کے دل میں علم کا شوق نہ پایا جاتا ہو؟ کیا یہ لوگ اس وسیع وعریض دنیا کے سرچشمہ کی تلاش نہیں کریں گے؟!

جی ہاں! یہ تمام چیزیں ہمیں "معرفت خدا" کی دعوت دیتی ہیں، ہماری عقل کو اس بات کی طرف بلاتی ہیں، ہماری عاطفی طاقت کو اس طرف جذب کرتی ہیں اور ہماری فطرت کو اس راستہ کی طرف لگاتی ہیں۔(۱)

❀❀❀❀❀

(۱)تفسیر پیام قرآن، جلد ۲، صفحہ ۳۳.

۲۔ خداوند عالم کو کیوں درک نہیں کیا جا سکتا؟

خداوند عالم کی ذات پاک کا نامحدود ہونا اور ہماری عقل، علم اور دانش کا محدود ہونا ہی اس مسئلہ کا اصلی نکتہ ہے۔

خداوند عالم کا وجود ہر لحاظ سے لامتناہی ہے، اس کی ذات، اس کے علم وقدرت اور دوسرے صفات کی طرح نامحدود اور ختم نہ ہونے والا ہے، دوسری طرف ہم اور جو چیزیں ہم سے متعلق ہیں چاہے علم ہو یا قدرت، زندگی ہو یا ہمارے، اختیار میں موجود دوسرے امور سب کے سب محدود ہیں۔

لہٰذا ہم اپنی تمام تر محدودیت کے ساتھ کس طرح خداوند عالم کے۔ محدود وجود اور نامحدود صفات کو درک کر سکتے ہیں؟ ہمارا محدود علم اس۔ محدود وجود کی خبر کس طرح دے سکتا ہے؟۔

جی ہاں! اگر ہم دور سے کسی چیز کو دیکھیں اگر چہ وہ ہماری سمجھ میں نہ آ رہی ہو لیکن پھر بھی اس کی طرف ایک مختصر سا اشارہ کیا جا سکتا ہے، لیکن خداوند عالم کی ذات اور صفات کی حقیقت تک پہنچنا ممکن ہی نہیں ہے یعنی تفصیلی طور پر اس کی ذات کا علم نہیں ہو سکتا۔

اس کے علاوہ ایک لامحدود وجود کسی بھی لحاظ سے اپنا مثل و مانند نہیں رکھتا، وہ محض اکیلا ہے کوئی دوسرا اس کی طرح نہیں ہے، کیونکہ اگر کوئی دوسرا اس کی مانند ہوتا تو دونوں محدود ہو جاتے۔

اب ہم کس طرح اس وجود کے بارے میں تفصیلی علم حاصل کریں جس کا کوئی مثل ونظیر نہیں

ہے، اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ سبھی ممکنات کے دائرے میں شامل ہے، اور اس کے صفات خداوندعالم سے مکمل طور پر فرق رکھتے ہیں(۱)

ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ اس کے اصل وجود سے آگاہ نہیں ہیں، اس کے علم، قدرت، ارادہ اور اس کی حیات سے بے خبر ہیں، بلکہ ہم ان تمام امور کے سلسلہ میں ایک اجمالی معرفت رکھتے ہیں، جن کی گہرائی اور باطن سے بے خبر ہیں، بڑے بڑے علما اور دانشوروں کے عقلی گھوڑے (بغیر کسی استثنا کے) اس مقام پر لنگڑاتے ہوئے نظر آتے ہیں، یا شاعر کے بقول:

به عقل نازی حکیم تا کی؟ — به فکرت این ره نمی شود طی!

به کنه ذاتش خرد برد پی — اگر رسد خس و به قعر دریا!(۲)

"اے حکیم ودانا وفلسفی تو اپنی عقل پر کب تک ناز کرے گا، تو عقل کے ذریعہ اس راہ کو طے نہیں کرسکتا۔

اس کی کنہ ذات تک عقل نہیں پہنچ سکتی ہیں جس طرح خس وخاشاک سمندر کی تہ تک نہیں پہنچ سکتے۔

حضرت امام صادق علیہ السلام سے حدیث نقل ہوئی ہے:

---

(۱) اگر آپ حضرات تعجب نہ کریں تو ہم "لامتناہی" [لامحدود] مفہوم کا تصور تو نہیں کر سکتے، لہٰذا کس طرح لفظ "لامتناہی" کو استعمال کیا جاتا ہے؟ اور اس کے سلسلہ میں خبر دی جاتی ہے اور اس کے احکام کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے، تو کیا بغیر تصور کے تصدیق ممکن ہے؟
جواب: لفظ "لامتناہی" دو لفظوں سے مل کر بنا ہے "لا" جو کہ عدم اور نفی کے معنی میں ہے اور "متناہی" جو کہ محدود کے معنی میں ہے، یعنی ان دونوں کو الگ الگ تصور کیا جا سکتا ہے، (نہ، محدود) اس کے بعد دونوں کو مرکب کر دیا گیا، اور اس کے ذریعہ ایسے وجود کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کا تصور نہیں کیا جا سکتا، اور اس پر [صرف] علم اجمالی حاصل ہوتا ہے (غور کیجئے)

(۲) پیام قرآن، جلد ۳، ص ۳۳

"إذا انتهیٰ الکلام إلی الله فامسکوا"(۱)

"جس وقت بات خدا تک پہنچ جائے تو اس وقت خاموش ہو جاؤ"

یعنی حقیقت خدا کے بارے میں گفتگو نہ کرو، کیونکہ اس کے سلسلہ میں عقلیں حیران رہ جاتی ہیں اور کسی مقام پر نہیں پہنچ سکتیں، اس کی لامحدود ذات کے بارے میں محدود عقلوں کے ذریعہ سوچنا ناممکن ہے، کیونکہ جو چیز بھی عقل و فکر کے دائرہ میں آجائے وہ محدود ہوتی ہے اور خداوندعالم کا محدود ہونا محال ہے۔(۲)

واضح الفاظ میں یوں کہا جائے کہ جس وقت ہم اس دنیا کی عجیب و غریب چیزوں اور ان کی ظرافت و عظمت کے بارے میں غور و فکر کرتے ہیں یا خود اپنے اوپر ایک نگاہ ڈالتے ہیں تو اجمالی طور پر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ان تمام چیزوں کا کوئی پیدا کرنے والا ہے، جبکہ یہ وہی علم اجمالی ہے جس پر انسان خدا کی معرفت اور اس کی شناخت کے آخری مرحلہ میں پہنچتا ہے، (لیکن انسان جس قدر سرار کائنات سے آگاہ ہوتا جاتا ہے اور اس کی عظمت واضح ہوتی جاتی ہے تو اس کی وہ اجمالی معرفت قوی تر ہوتی جاتی ہے) لیکن جب ہم خود اپنے سے یہ سوال کرتے ہیں کہ وہ کون ہے؟ اور کس طرح ہے؟ اور اس کی ذات پاک کی طرف ہاتھ پھیلاتے ہیں تو حیرت و پریشانی کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوتا، یہی وہ بات ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی شناخت کا راستہ مکمل طور پر کھلا ہوا ہے حالانکہ مکمل طور پر بند بھی ہے۔

اس مسئلہ کو ایک مثال کے ذریعہ واضح کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ بات ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ قوت جاذبہ کا وجود ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اگر کسی چیز کو چھوڑتے ہیں تو وہ گر جاتی

---

(۱) تفسیر "علی بن ابراہیم" نور الثقلین، جلد ۵، صفحہ ۱۷۰ کی نقل کے مطابق

(۲) تفسیر نمونہ، جلد ۲۲، صفحہ ۵۵۸

ہے اور زمین کی طرف آتی ہے، اور اگر یہ قوتِ جاذبہ نہ ہوتی تو روئے زمین پر بسنے والے کسی موجود کو چین وسکون نہ ملتا، لیکن اس قوۂ جاذبہ کے بارے میں علم ہونا کوئی ایسی بات نہیں جو دانشوروں سے مخصوص ہو، بلکہ چھوٹے بچے بھی اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں البتہ قوتِ جاذبہ کی حقیقت کیا ہے؟ کیا دکھائی نہ دینے والی لہریں ہیں، یا نامعلوم ذرات یا دوسری کوئی طاقت؟ یہ ایک مشکل مرحلہ ہے۔

اور تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ قوتِ جاذبہ، مادی دنیا میں معلوم شدہ چیز کے برخلاف، ظاہراً کسی چیز کو دوسری جگہ پہنچانے میں کسی زمانہ اور وقت کی محتاج نہیں ہے، نور کے برخلاف جو کہ مادی دنیا میں سب سے زیادہ تیز رفتار ہے، لیکن پھر بھی اس نور کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنے کے لئے لاکھوں سال درکار ہوتے ہیں، جبکہ قوت جاذبہ اسے دنیا کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ میں لحہ بھر میں منتقل کر دیتی ہے، یا کم سے کم ہم نے جو سرعت ورفتار سنی ہے اس سے کہیں زیادہ اس کی رفتار ہوتی ہے۔

یہ کونسی طاقت ہے جس کے آثار ایسے [عجیب وغریب] ہیں؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟ کوئی شخص بھی اس کا واضح جواب نہیں دیتا، جب اس ''قوت جاذبہ'' (جو ایک مخلوق ہے) کے بارے میں ہمارا علم صرف اجمالی پہلو رکھتا ہے اور اس کے بارے میں تفصیلی علم نہیں ہے، تو پھر کس طرح اس ذات اقدس کی کنہ [حقیقت] سے باخبر ہو سکتے ہیں جو اس دنیا اور ماورائے طبیعت کا خالق ہے جس کا وجود لامتناہی ہے، لیکن بہرحال ہم اس کو ہر جگہ پر حاضر وناظر مانتے ہیں اور کسی بھی ایسی جگہ کا تصور نہیں کرتے جہاں اس کا وجود نہ ہو۔

با صد هزار جلوه برون آمدی که من   با صد هزار دیده تماشا کنم تو را (۱)

''تو لاکھوں جلووں کے ساتھ جلوہ افروز ہے تا کہ میں لاکھوں آنکھوں کے ذریعہ تیرا دیدار کروں''۔

---

(۱) پیام امام (شرح نہج البلاغہ) جلد اول، صفحہ ۹

۳۔ کس طرح بغیر دیکھے خدا پر ایمان لائیں؟

خدا پرستوں پر، مادیوں کا ایک بیہودہ اعتراض یہ ہوتا ہے کہ "انسان کس طرح ایک ایسی چیز پر ایمان لے آئے جس کو اس نے اپنی آنکھ سے نہ دیکھا ہو یا اپنے حواس سے درک نہ کیا ہو، تم کہتے ہو کہ خدا کا نہ جسم ہے، ورنہ اس کے رہنے کے لئے کوئی جگہ، نہ زمان درکار ہے اور نہ کوئی رنگ و بو وغیرہ تو ایسے وجود کو کس طرح درک کیا جا سکتا ہے اور کس ذریعہ سے پہچانا جا سکتا ہے؟ لہٰذا ہم تو صرف اسی چیز پر ایمان لا سکتے ہیں کہ جس کو اپنے حواس کے ذریعہ درک کر سکیں اور جس چیز کو ہماری عقل درک نہ کر سکے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ در حقیقت اس کا کوئی وجود ہی نہیں ہے"۔

جواب: اس اعتراض کے جواب میں مختلف پہلوؤں سے بحث کی جا سکتی ہے۔

۱۔ معرفت خدا کے سلسلہ میں مادیوں کی مخالفت کے اسباب:

ان کا علمی غرور اور ان کا تمام حقائق پر سائنس کو فوقیت دینا، اور اسی طرح ہر چیز کو سمجھنے اور پرکھنے کا معیار صرف تجربہ اور مشاہدہ قرار دینا ہے، نیز اس بات کا قائل ہونا کہ طبیعی اور مادی چیزوں کے ذریعہ ہی کسی چیز کو درک کیا جا سکتا ہے۔ (یہ سخت بھول ہے۔)

کیونکہ ہم اس مقام پر ان لوگوں سے سوال کرتے ہیں کہ سائنس کے سمجھنے اور پرکھنے کی کوئی حد ہے یا نہیں؟!

واضح ہے کہ اس سوال کا جواب مثبت ہے کیونکہ سائنس کے حدود دوسری موجودات کی طرح محدود ہیں۔

تو پھر کس طرح لامحدود موجود کو طبیعی چیزوں کے ذریعہ درک کیا جاسکتا ہے؟۔

لہٰذا بنیادی طور پر خداوند عالم، اور موجودات ماورائے طبیعت سائنس کی رسائی سے باہر ہیں، اور جو چیزیں ماورائے طبیعت ہوں ان کو سائنس کے آلات کے ذریعہ درک نہیں کیا جاسکتا، ''ماورائے طبیعت'' سے خود ظاہر ہوتا ہے کہ سائنس کے ذریعہ ان کو درک نہیں کیا جاسکتا، جیسا کہ سائنس کے مختلف شعبوں میں سے ہر شعبہ کے لئے ایک الگ میزان ومقیاس ہوتا ہے جس سے دوسرے شعبہ میں کام نہیں لیا جاسکتا، نجوم شناسی، فضا شناسی اور جراثیم شناسی میں ریسرچ کے اسباب ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔

کبھی بھی ایک مادی ماہر اس بات کی اجازت نہیں دے گا کہ ایک منجم سے کہا جائے کہ فلاں جرثومہ کو ستارہ شناسی وسائل کے ذریعہ ثابت کرو، اسی طرح ایک جراثیم شناس ماہر سے اس بات کی امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنے آلات کے ذریعہ ستاروں کے بارے میں خبر دے، کیونکہ ہر شخص اپنے علم کے لحاظ سے اپنے دائرے میں رہ کر کام کرسکتا ہے، وہ اپنے دائرے سے باہر نکل کر کسی چیز کے بارے میں ''مثبت'' یا ''منفی'' نظریہ نہیں دے سکتا۔

لہٰذا ہم کس طرح سائنس کو اس بات کا حق دے سکتے ہیں کہ وہ اپنے دائرے سے باہر بحث وگفتگو کرے، حالانکہ اس کے دائرے کی حد عالم طبیعت اور اس کے آثار وخواص ہیں؟!

یک مادی ماہر کو یہ حق ہے کہ وہ یہ کہے کہ میں ''ماورائے طبیعت'' کے سلسلہ میں خاموش ہوں، کیونکہ یہ میرے دائرے سے باہر کی بات ہے، نہ یہ کہ وہ ماورائے طبیعت کا انکار کر ڈالے، یہ حق اس کو نہیں دیا جاسکتا۔

جیسا کہ اصولِ فلسفۂ حسی کا بانی ''اگسٹ کانٹ'' اپنی کتاب ''کلماتی درپیرامون فلسفۂ حسی''

میں کہتا ہے ''چونکہ ہم موجودات کے آغاز وانجام سے بے خبر ہیں لہٰذا اپنے زمانہ سے پہلے یا اپنے زمانہ کے بعد آنے والی موجودات کا انکار نہیں کرسکتے، جس طرح سے ان کو ثابت بھی نہیں کرسکتے، (غور کیجئے گا)

خلاصہ یہ کہ حسی فلسفہ، جہل مطلق کے ذریعہ کسی بھی طرح کا نظریہ نہیں دیتا، لہٰذا حسی فلسفہ کے فرعی علوم کو بھی موجودات کے آغاز اور انجام کے سلسلہ میں کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہئے، یعنی ہم خدا کے علم وحکمت، اور اس کے وجود کا انکار نہ کریں اور اس کے بارے میں نفی واثبات کے سلسلہ میں بے طرف رہیں، [نہ انکار کریں اور نہ اثبات]''

ہمارے کہنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ ''ماورائے طبیعت دنیا'' کو سائنس کی نگاہوں سے نہیں دیکھا جاسکتا، اصولی طور پر وہ خدا جس کو مادی اسباب کے ذریعہ ثابت کیا جائے خدا نہیں ہوسکتا۔

دنیا بھر کے خدا پرستوں کے عقائد کی بنیاد یہ ہے کہ خدا، مادہ اور مادہ کی خاصیت سے پاک و منزہ ہے، اور اسے کسی بھی مادی وسیلہ سے درک نہیں کیا جاسکتا۔

لہٰذا ہمیں سوچنا چاہئے کہ اس دنیا کو خلق کرنے والے کو آسمان کی گہرائیوں میں میکروسکوپ (Microscope) یا ٹلسکوپ کے ذریعہ تلاش کیا جاسکتا ہے، یہ خیال بیہودہ اور بیجا ہے۔

۲۔اس کی نشانیاں

دنیا کی ہر چیز کی پہچان کے لئے کچھ آثار اور نشانیاں ہوتی ہیں، لہٰذا اس کی نشانیوں کے ذریعہ ہی اس کو پہچانا جاسکتا ہے، یہاں تک کہ آنکھوں اور دوسرے حواس کے ذریعہ جن چیزوں کو درک کرتے ہیں درحقیقت ان کو بھی آثار ونشانیوں کے ذریعہ ہی پہچانتے ہیں، (غور کیجئے)

کیونکہ کوئی بھی چیز ہمارے فکروخیال میں داخل نہیں ہوسکتی اور ہمارا مغز کسی بھی چیز کے لئے ظرف واقع نہیں ہوسکتا۔

مثال کے طور پر۔ اگر آپ آنکھوں کے ذریعہ کسی جسم کو تشخیص دینا چاہیں اور اس کے وجود کو درک کرنا چاہیں تو شروع میں اس چیز کی طرف دیکھیں گے اس کے بعد نور کی شعاعیں اس پر پڑتی ہیں اور آنکھ کی پتلی میں نورانی لہریں "شبکیہ" نامی آنکھ کے پردہ پر منعکس ہوتی ہیں تو بینائی اعصاب نور کو حاصل کر کے مغز تک پہنچاتے ہیں اور پھر انسان اس کو سمجھ لیتا ہے۔

اور اگر لمس کے ذریعہ [یعنی چھو کر] کسی چیز کو درک کریں تو کھال کے نیچے کے اعصاب انسان کے مغز تک اطلاع پہنچاتے ہیں اور انسان اس کو درک کرتا ہے، لہٰذا کسی جسم کو درک کرنا اس کے اثر (رنگ، آواز اور لمس وغیرہ) کے ذریعہ ہی ممکن ہے، اور کبھی بھی وہ جسم ہمارے مغز میں قرار نہیں پاتا، اور اگر اس کا کوئی رنگ نہ ہو اور اعصاب کے ذریعہ اس کا ادراک نہ کیا جا سکتا ہو تو ہم اس چیز کو بالکل نہیں پہچان سکتے۔

مزید یہ کہ کسی چیز کی پہچان کے لئے ایک اثر یا ایک نشانی کا ہونا کافی ہے، مثلاً اگر ہمیں یہ معلوم کرنا ہو کہ دس ہزار سال پہلے زمین کے فلاں حصہ میں ایک آبادی تھی اور اس کے حالات اس طرح تھے، تو صرف وہاں سے ایک مٹی کا کوزہ یا زنگ زدہ اسلحہ برآمد ہونا کافی ہے، اور اسی ایک چیز پر ریسرچ کے ذریعہ ان کی زندگی کے حالات کے بارے میں معلومات حاصل ہو جائیں گی۔

اس بات کے پیش نظر ہر موجود چاہے وہ مادی ہو یا غیر مادی، بس کو اثر یا نشانی کے ذریعہ ہی پہچانا جاتا ہے اور یہ کہ ہر چیز کی پہچان کے لئے ایک اثر یا نشانی کا ہونا کافی ہے، تو کیا پوری دنیا میں عجیب وغریب اور اسرار آمیز چیزوں کو دیکھنا خدا کی شناخت اور اس کی معرفت کے لئے کافی نہیں ہے؟!

آپ کسی چیز کو پہچاننے کے لئے ایک اثر پر کفایت کر لیتے ہیں اور ایک مٹی کے کوزہ کے ذریعہ چند ہزار سال پہلے زندگی بسر کرنے والوں کے بعض حالات کا پتہ لگا سکتے ہیں، جبکہ خدا کی شناخت کے لئے ہمارے پاس بے تعداد آثار، لا تعداد موجودات اور بے کراں نظم، جیسی چیزیں موجود ہیں کیا اتنے آثار کافی نہیں ہیں؟! دنیا کے کسی بھی گوشہ پر نظر ڈالیں خدا کی قدرت اور اس کے علم کی

نشانیاں ہر جگہ موجود ہیں، پھر بھی لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا اور اپنے کانوں سے نہیں سنا، تجربہ اور ٹسکوپ کے ذریعہ نہیں دیکھ سکتے، تو کیا ہر چیز کو صرف آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے؟!

۳۔ دیکھنے اور نہ دیکھنے والی چیزیں:

خوش قسمتی سے آج سائنس نے ترقی کر کے بہت سی ایسی چیزیں بنا ڈالی ہیں کہ ان کے وجود سے مادیت اور اس کے نتیجہ میں مادی اور الحادی نظریہ کی تردید ہو جاتی ہے، قدیم زمانہ میں تو ایک دانشور یہ کہہ سکتا تھا کہ جس چیز کو انسانی حواس درک نہیں کر سکتے اس کو قبول نہیں کیا جا سکتا، لیکن آج سائنس کی ترقی سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے، اس دنیا میں دیکھی جانے والی اور درک ہونے والی چیزوں سے زیادہ وہ چیزیں ہیں جن کو دیکھا اور درک نہیں کیا جا سکتا، عالم طبیعت میں اس قدر موجودات ہیں کہ انھیں حواس میں سے کسی کے بھی ذریعہ درک نہیں کیا جا سکتا، اور ان کے مقابلہ میں درک ہونے والی چیزیں صفر شمار ہوتی ہیں!

نمونہ کے طور پر چند چیزیں آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں:

۱۔ علم فیزکس کہتا ہے کہ رنگوں کی سات قسموں سے زیادہ نہیں ہیں جن میں سے پہلا سرخ اور آخری جانمنی ہے، لیکن ان کے ماوراء ہزاروں رنگ پائے جاتے ہیں جن کو ہم درک نہیں کر سکتے، اور یہ گمان کیا جاتا ہے کہ بعض حیوانات ان بعض رنگوں کو دیکھتے ہیں۔

اس کی وجہ بھی واضح اور روشن ہے، کیونکہ نور کی لہروں کے ذریعہ رنگ پیدا ہوتے ہیں، یعنی آفتاب کا نور دوسرے رنگوں سے مرکب ہو کر سفید رنگ کو تشکیل دیتا ہے اور جب جسم پر پڑتا ہے تو وہ جسم مختلف رنگوں کو ہضم کر لیتا ہے اور بعض کو واپس کرتا ہے جن کو واپس کرتا ہے وہ وہی رنگ ہوتا ہے جس کو ہم دیکھتے ہیں، لہٰذا اندھیرے میں جسم کا کوئی رنگ نہیں ہوتا، دوسری طرف نور کی موجوں کی

لہروں کی شدت اور ضعف کی وجہ سے رنگوں میں اختلاف پیدا ہوتا ہے اور رنگ بدلتے رہتے ہیں، یعنی اگر نور کی لہروں کی شدت فی سیکنڈ ۴۵۸ ہزار ملیارڈ تک پہنچ جائے تو سرخ رنگ بنتا ہے اور ۲۷ ہزار ملیارڈ لہروں کے ساتھ جامنی رنگ دکھائی دیتا ہے، اس سے زیادہ لہروں یا کم لہروں میں بہت سے رنگ ہوتے ہیں جن کو ہم نہیں دیکھ پاتے۔

۲۔ آواز کی موجیں ۱۶ مرتبہ فی سیکنڈ سے لے کر ۲۰،۰۰۰ مرتبہ فی سیکنڈ تک ہمارے لئے قابل فہم ہیں اگر اس سے کم یا زیادہ ہو جائے تو ہم اس آواز کو نہیں سن سکتے۔

۳۔ امواج نور کی جن لہروں کو ہم درک کر سکتے ہیں انھیں ۴۵۸ ہزار ملیارڈ فی سیکنڈ سے ۲۷ ہزار ملیارڈ فی سیکنڈ تک کی حدود میں ہونا چاہئے اس سے کم یا زیادہ چاہے فضا میں کتنی ہی آوازیں موجود ہوں ہم ان کو درک نہیں کر سکتے۔

۴۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ چھوٹے چھوٹے جانداروں (وائرس اور بیکٹریز) کی تعداد انسان کی تعداد سے کہیں زیادہ ہیں، وہ بغیر کسی دوربین کے دیکھے نہیں جاسکتے، اور شاید اس کے علاوہ بہت سے ایسے چھوٹے جاندار پائے جاتے ہیں جن کو سائنس کی بڑی بڑی دوربینوں کے ذریعہ ابھی تک نہ دیکھا گیا ہو۔

۵۔ ایک ایٹم اور اس کی مخصوص باڈی اور الکٹرون کی گردش نیز پروٹن کے ذریعہ ایک ایسی عظیم طاقت ہوتی ہے جو کسی بھی حس کے ذریعہ قابل درک نہیں ہے، حالانکہ دنیا کی ہر چیز ایٹم سے بنی ہے، اور ہوا میں بمشکل دکھائی دینے والے ایک ذرہ غبار میں لاکھوں ایٹم پائے جاتے ہیں۔

گزشتہ دانشوروں نے جو کچھ ایٹم کے بارے میں نظریہ پیش کیا تھا وہ صرف تھیوری کی حد تک تھا لیکن کسی نے بھی ان کی باتوں کو نہیں جھٹلایا۔(۱)

---

(۱) منجملہ ان چیزوں کے جو محسوس نہیں ہوتیں لیکن کسی بھی دانشور نے ان کا انکار نہیں کیا ہے زمین کی حرکت ہے یعنی ۹۹

لہٰذا اگر کوئی چیز غیر محسوس ہے تو یہ اس کے نہ ہونے پر دلیل نہیں ہے، آپ دیکھئے دنیا میں ایسی بہت سی چیزیں بھری پڑی ہیں جو غیر محسوس ہیں جن کو ہمارے حواس درک نہیں کر سکتے!

جیسا کہ ایٹم کے کشف سے پہلے یا ذرہ بینی [چھوٹی چھوٹی چیزوں] کے کشف سے پہلے کسی کو اس بات کا حق نہیں تھا کہ ان کا انکار کرے، اور ممکن ہے کہ بہت سی چیزیں ہمارے لحاظ سے مخفی ہوں اور ابھی تک سائنس نے ان کو کشف نہ کیا ہو بلکہ بعد میں کشف ہوں تو ایسی صورت میں ہماری عقل اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ ان شرائط (علم کا محدود ہونا اور مختلف چیزوں کے درک سے عاجز ہونے) کے تحت ہم ان چیزوں کے بارے میں نظریہ پیش کریں کہ وہ چیزیں ہیں یا نہیں ہیں۔

خلاصہ یہ کہ ہمارے حواس اور دوسرے وسائل کا دائرہ محدود ہے لہٰذا ان کے ذریعہ ہم عالَم کو بھی محدود مانیں۔(۱)

کرۂ زمین گھومتا ہے، اور یہ وہی "مد و جزر" [پھیلنا اور سکڑنا] ہے جو اس زمین پر رونما ہوتا ہے، اور اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ہمارے پاؤں تلے کی زمین دن میں دوبار ۳۰ سینٹی میٹر اوپر آتی ہے، جس کو نہ کبھی ہم نے دیکھا، اور نہ کبھی اس کا احساس کیا، یہ زمین دن میں دو بار ۳۰cm اوپر آتی ہے۔

انھیں چیزوں میں سے ہوا بھی ہے جو ہر وقت ہمارے چاروں طرف موجود رہتی ہے اور اس قدر وزنی ہے کہ ہر انسان ۱۶ ہزار کلو گرام کے برابر اس کو برداشت کر سکتا ہے، اور ہمیشہ عجیب و غریب دباؤ میں رہتا ہے البتہ چونکہ یہ دباؤ (اس کے اندرونی دباؤ کی وجہ سے) ختم ہوتا رہتا ہے لہٰذا اس دباؤ کا ہم پر کوئی اثر نہیں پڑتا، جبکہ کوئی بھی انسان یہ تصور نہیں کرتا کہ ہوا اس قدر وزنی ہے، "گلیلیو" اور "پاسکال" سے پہلے کسی کو ہوا کے وزن کا علم نہیں تھا، اور اب جبکہ سائنس نے اس کے وزن کی صحت کی گواہی دے دی پھر بھی ہم اس کا احساس نہیں کرتے۔

انھیں غیر محسوس چیزوں میں سے "اثر" ہے کہ بہت سے دانشوروں نے ریسرچ کے بعد اس کا اعتراف کیا ہے، اور ان کے نظریہ کے مطابق یہ شئے تمام جگہوں پر موجود ہے اور تمام چیزوں میں پائی جاتی ہے، بلکہ بعض دانشور تو اس کو تمام چیزوں کی اصل مانتے ہیں، اور اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ یہ "اثر" ایک بے وزن اور بے رنگ چیز ہے اور اس کی کوئی بو بھی نہیں ہوتی جو تمام ستاروں، اور تمام چیزوں میں پائی جاتی ہے اور تمام چیزوں کے اندر نفوذ کئے ہوئے ہے، لیکن ہم اسے درک کرنے سے قاصر ہیں۔

(۱) مذکورہ بالا مطلب کی تصدیق کے لئے "کامیل فلاماریون" کی کتاب "اسرار موت" سے ایک اقتباس آپ حضرات کی

البتہ یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ہم یہ دعویٰ کرنا چاہتے ہیں کہ جس طرح سے الکٹرون، پروٹون یا دوسرے رنگ سائنس نے کشف کیے ہیں تو سائنس مزید ترقی کر کے بعض مجہول چیزوں کو کشف کرے گا، اور ممکن ہے کہ ایک روز ایسا آئے کہ اپنے ساز و سامان کے ذریعہ "عالم، ورائے طبیعت" کو بھی کشف کر لے!

جی نہیں، اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے جیسا کہ ہم نے کہا کہ "ماورائے طبیعت" اور "ماورائے مادہ" کو مادی وسائل کے ذریعہ نہیں سمجھا جاسکتا، اور یہ کام مادی اسباب و ساز و سامان کے بس کی بات نہیں ہے۔

▶▶ خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

"لوگ جہالت و نادانی کی وادی میں زندگی بسر کررہے ہیں اور انسان یہ نہیں جانتا کہ اس کی یہ جسمانی ترکیب اس کو حقائق کی طرف رہنمائی نہیں کرسکتی ہے، اور اس کو یہ حواس خمسہ، کسی بھی چیز میں دھوکہ دے سکتے ہیں، صرف انسان کی عقل و فکر اور علمی غور و فکر ہی حقائق کی طرف رہنمائی کرسکتی ہیں"! اس کے بعد ان چیزوں کو بیان کرنا شروع کرتا ہے جس کو انسانی حواس درک نہیں کرسکتے، اور اس کے بعد مؤلف کتاب ایک ایک کر کے بیان کرتا ہے اور پھر ہر ایک حس کی محدودیت کو ثابت کرتا ہے یہاں تک کہ کہتا ہے: "لہٰذا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری عقل اور سائنس کا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ بہت سی حرکات، ذرات، ہوا، طاقتیں اور دیگر چیزیں ایسی ہیں جن کو ہم نہیں دیکھتے، اور ان حواس میں سے کسی ایک سے بھی ان کو درک نہیں کیا جاسکتا، لہٰذا یہ بھی ممکن ہے کہ ہمارے اطراف میں بہت سی ایسی چیزیں ہوں جن کا ہم احساس نہیں کرتے، بہت سے ایسے جاندار ہوں جس کو ہم نہیں دیکھتے، جن کا احساس نہیں کرتے، ہم یہ نہیں کہتے ہیں کہ "ہیں" بلکہ ہم یہ کہیں: "ممکن ہے کہ ہوں" کیونکہ گزشتہ باتوں کا نتیجہ یہی ہے کہ ہمارے حواس تمام موجودات کو ہمارے لئے کشف کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے کہ بلکہ یہی حواس بعض اوقات تو ہمیں فریب دیتے ہیں، اور بہت سی چیزوں کو حقیقت کے برخلاف دکھاتے ہیں، لہٰذا ہمیں یہ تصور نہیں کرنا چاہئے کہ تمام موجودات کی حقیقت صرف وہی ہے جس کو ہم اپنے حواس کے ذریعہ درک کریں، بلکہ ہمیں اس کے برخلاف عقیدہ رکھنا چاہئے اور کہنا چاہئے کہ ممکن ہے کہ بہت سی موجودات ہوں جن کو ہم درک نہیں کرسکتے، جیسا کہ "جراثیم" کے کشف سے پہلے کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ "لاکھوں جراثیم" ہر چیز کے چاروں طرف موجود ہوں گے، اور ان جراثیم کے لئے ہر جاندار کی زندگی ایک میدان کی صورت رکھتی ہوگی

نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے یہ ظاہری حواس اس بات کی صلاحیت نہیں رکھتے کہ موجودات کی حقیقت اور ان کی واقعیت کا صحیح پتہ لگا سکیں بلکہ طور پر حقائق کو بیان کرنے والی شئے ہماری عقل اور فکر ہوتی ہے"۔ (نقل از علی اطلال المذہب المادی، تالیف فرید وجدی، جلد ۳)

مطلب یہ ہے کہ جس طرح بعض چیزوں کے کشف ہونے سے پہلے ان کے بارے میں انکار کرنا جائز نہیں تھا اور ہمیں اس بات کا حق نہیں تھا کہ یہ کہتے ہوئے انکار کریں کہ فلاں چیز کو چونکہ ہم نہیں دیکھتے، جن چیزوں کو دنیاوی سازوسامان کے ذریعہ درک نہیں کیا جاسکتا، یا وہ سائنس کے ذریعہ ثابت نہیں ہیں لہٰذا ان کا کوئی وجود نہیں ہے، اسی طرح سے "ماورائے طبیعت" کے بارے میں یہ نظریہ نہیں دے سکتے کہ اس کا کوئی وجود نہیں ہے، لہٰذا اس غلط راستہ کو چھوڑنا ہوگا اور خدا پرستوں کے دلائل کا بغور مطالعہ کرنا ہوگا اس کے بعد اپنی رائے کے اظہار کا حق ہوگا اس لئے کہ اس صورت میں واقعی طور پر اس کا نتیجہ مثبت ہوگا(۱)

---

(۱) آفریدگار جہان، آیت اللہ العظمیٰ مکارم شیرازی کی بحثوں کا مجموعہ، صفحہ ۲۲۸

۴۔ توحید ذات، توحید صفات، توحید افعال اور توحید عبادت کے کیا معنی ہیں؟

ا۔ توحید ذاتی

بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ توحید ذات کے معنی یہ ہیں کہ خدا ایک ہے دو خدا نہیں ہیں، لیکن یہ معنی صحیح نہیں ہے جیسے کہ حضرت علی علیہ السلام سے منقول روایت میں بیان ہوا ہے، کیونکہ اس کا مطلب ''واحد عددی'' ہے (یعنی دوسرے خدا کا تصور پایا جاتا ہے لیکن اس کا وجود خارجی نہیں ہے)، قطعاً یہ نظریہ باطل ہے، توحید ذات کے صحیح معنی یہ ہیں کہ خدا ایک ہے اور اس کے دوسرے کا تصور بھی نہیں ہے، یا دوسرے الفاظ میں کہا جائے کہ ''خدا کے لئے کوئی شبیہ و نظیر اور مانند نہیں ہے'' نہ کوئی چیز اس کی شبیہ ہے اور نہ ہی وہ کسی چیز سے مشابہ، کیونکہ ایک لامحدود وجود بیکراں کامل وجود کے یہی صفت ہوتے ہیں۔

اسی وجہ سے ایک حدیث میں بیان ہوا ہے کہ حضرت امام صادق علیہ اسلام نے اپنے ایک صحابی سے پوچھ ''اَیّ شَیءٍ اللهُ اَکْبَر'' (اللہ اکبر کے کیا معنی ہیں؟)

تو اس نے عرض کی: ''اللہ اکبر من کل شیء'' اللہ تمام چیزوں سے بڑا ہے۔

امام علیہ اسلام نے فرمایا: ''فَکَانَ ثَمَّ شَیءٍ فیکونُ اَکبرُ مِنْهُ'' کیا کوئی چیز (اس کے مقابلہ میں) موجود ہے جس سے خدا بڑا ہو؟

صحابی نے عرض کیا: ''فما ھو''؟ آپ خود ہی فرمائیں اللہ اکبر کی تفسیر کیا ہے؟

تو امام علیہ السلام نے فرمایا "اللّٰہُ أکبرُ من أن یُوصف" خدا اس سے کہیں بلند و بالا ہے کہ اس کی توصیف کی جائے۔(۱)

۲۔توحید صفاتی

جس وقت ہم یہ کہتے ہیں کہ توحید کی ایک قسم "توحید صفاتی" ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگر ایک طرف خداوند عالم جس طرح اپنی ذات میں ازلی اور ابدی ہے اسی طرح اپنے صفات: علم وقدرت وغیرہ میں بھی ازلی وابدی ہے، تو دوسری طرف یہ کہ یہ صفات زائد بر ذات نہیں ہیں یعنی اس کی ذات پر عارض نہیں ہیں بلکہ یہ صفات، عین ذات ہیں۔

نیز یہ کہ اس کے صفات ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں یعنی اس کا علم اور اس کی قدرت ایک ہی ہیں، اور دونوں اس کی عین ذات ہیں!۔

مزید وضاحت جب ہم اپنے آپ کو دیکھتے ہیں کہ شروع شروع میں ہمارے یہاں بہت سے صفت نہیں تھے، پیدائش کے وقت نہ علم تھا اور نہ طاقت، لیکن آہستہ آہستہ یہ صفات ہمارے یہاں پیدا ہوتے گئے، اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ یہ صفت ہمارے لئے زائد بر ذات ہیں، لہٰذا ممکن ہے کہ ایک روز ہمارا وجود ہو لیکن ہمارا علم وطاقت ختم ہوجائے، نیز ہم اس بات کو واضح طور پر دیکھتے ہیں کہ ہمارا علم اور ہماری قدرت ہم سے جدا اور الگ ہیں، طاقت ہمارے جسم میں اور علم ہماری روح میں نقش ہے!

لیکن خداوند عالم کے یہاں یہ تصور نہیں پایا جاتا، بلکہ اس کی تمام ذات علم ہے، اس کی تمام ذات قدرت ہے اور یہ تمام چیزیں ایک ہی ہیں، البتہ اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ ان معنی و مفہوم کی تصدیق کرنا تھوڑا پیچیدہ اور غیر مانوس ہے کیونکہ یہ صفات ہمارے یہاں نہیں پائے جاتے،

---

(۱) "معانی الاخبار" صدوق، صفحہ ۱۱ حدیث ۱.

صرف عقل و منطق اور دقیق استدلال کے ذریعہ ہی ان صفت کو سمجھا جا سکتا ہے۔(۱)

۳۔ توحید افعالی

یعنی دنیا میں ہر موجود، اور ہر فعل خداوند عالم کی ذات پاک کی طرف پلٹتا ہے، وہی مسبب الاسباب ہے، تمام علتوں کی علت اسی کی ذات اقدس ہے، یہاں تک کہ جن افعال کو ہم انجام دیتے ہیں ایک طرح سے وہ بھی اسی کی طرف پلٹتے ہیں، اس نے ہمیں قدرت، اختیار اور ارادہ دیا ہے، لہٰذا ایک لحاظ سے ہم اپنے افعال کے فاعل اور ان کے ذمہ دار ہیں، اور ایک لحاظ سے ان کا فاعل خداوند عالم ہے، کیونکہ جو کچھ بھی ہمارے پاس ہے وہ سب اسی کی طرف پلٹتا ہے۔ "لا مؤثر فی الوجود الا اللہ" (وجود میں سوائے اللہ کے کوئی مؤثر نہیں ہے)

۴۔ عبادت میں توحید

یعنی صرف اسی کی عبادت کی جائے اور اس کے علاوہ کوئی عبادت کا اہل اور سزاوار نہیں ہے، کیونکہ عبادت اس کی ہونی چاہئے کہ جو کمالِ مطلق اور مطلق کمال ہو، جو سب سے بے نیاز ہو، جو تمام نعمتوں کا عطا کرنے والا ہو، جو تمام موجودات کا خلق کرنے والا ہو، اور یہ صفت ذات اقدس الٰہی کے علاوہ کسی غیر میں نہیں ہیں۔

عبادت کا اصلی مقصد کمالِ مطلق اور لامتناہی وجود کی بارگاہ میں قرب حاصل کرنا ہے، تاکہ اس کے صفات کمال و جمال کا عکس انسان کی روح پر پڑے، جس کے نتیجہ میں انسان ہوا و ہوس سے دوری اختیار کرے اور اپنے نفس کے تزکیہ اور پاکیزگی کے لئے سعی و کوشش کرے۔

عبادت کا یہ ہدف اور مقصد صرف "اللہ تعالیٰ" کی عبادت میں موجود ہے اور اس کے علاوہ کسی غیر کی عبادت میں نہیں پایا جاتا چونکہ صرف وہی کمال مطلق ہے۔(۲)

---

(۱) تفسیر نمونہ، جلد ۲۷، صفحہ ۴۳۹ (۲) تفسیر پیام قرآن، جلد ۳، صفحہ ۲۷۴

۵۔دین کس طرح فطری ہے؟

فطرت کا مطلب یہ ہے کہ انسان بعض حقائق کو بغیر کسی استدلال اور برہان کے حاصل کرلیتا ہے، (چاہے وہ پیچیدہ اور مشکل استدلال ہو اور چاہے واضح اور روشن استدلال ہوں) اور وہ حقائق اس پر واضح وروشن ہوتے ہیں ان کو وہ قبول کرلیتا ہے، مثلاً انسان کسی خوبصورت اور خوشبودار پھول کو دیکھتا ہے تو اس کی ''خوبصورتی'' کا اعتراف کرتا ہے اور اس اعتراف کے سلسلہ میں کسی بھی استدلال کی ضرورت نہیں ہوتی، انسان اس موقع پر کہتا ہے کہ یہ بات ظاہر ہے کہ خوبصورت ہے، اس میں کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔

خدا کی شناخت اور معرفت کے سلسلہ میں بھی فطرت کا کردار یہی ہے جس وقت انسان اپنے درون وجان میں جھانکتا ہے تو اس کو ''نور حق'' دکھائی دیتا ہے، اس کے دل کو ایک آواز سنائی دیتی ہے جو اس کو اس دنیا کے خالق اور صاحب علم وقدرت کی طرف دعوت دیتی ہے، اس مبداء کی طرف بلاتی ہے جو ''کمالِ مطلق'' اور ''مطلقِ کمال'' ہے، اور اس درک اور احساس کے لئے اسی خوبصورت پھول کی طرح کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔

خدا پر ایمان کے فطری ہونے پر زندہ ثبوت:

سوال: ممکن ہے کوئی کہے: یہ صرف دعویٰ ہے، اور خدا شناسی کے سلسلہ میں اس طرح کی

فطرت کو ثابت کرنے کے لئے کوئی راستہ نہیں، کیونکہ میں تو اس طرح کا دعویٰ کرسکتا ہوں کہ میرے دل و جان میں اس طرح کا احساس پایا جاتا ہے، لیکن اگر کوئی اس بات کو قبول نہ کرے تو اس کو کس طرح قانع کرسکتا ہوں؟

جواب ہمارے پاس بہت سے ایسے شواہد موجود ہیں جن کے ذریعہ توحید خدا کو فطری طور پر ثابت کیا جاسکتا ہے اور یہ شواہد انکار کرنے والوں کا منہ توڑ جواب بھی ہیں چنانچہ ان قرائن کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱۔ تاریخی حقائق:

ان تاریخی حقائق کے سلسلہ میں دنیا کے قدیم ترین مورخین نے جو تحقیق اور جستجو کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی بھی قوم وملت میں کوئی دین نہیں تھا؟ بلکہ ہر انسان اپنے لحاظ سے عالم ہستی کے مبدا علم وقدرت کا معتقد تھا اور اس پر ایمان رکھتا تھا اور اس کی عبادت کیا کرتا تھا، اگر یہ مان لیں کہ اس سلسلہ میں بعض اقوام مستثنیٰ تھیں تو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا (کیونکہ ہر عام کے لئے نادر مقامات پر استثنا ہوتا ہے)

"ویل ڈورانٹ" مغربی مشہور مورخ اپنی کتاب "تاریخ تمدن" میں بے دینی کے بعض مقامات ذکر کرنے کے بعد اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے کہتا ہے: "ہمارے ذکر شدہ مطالب کے باوجود "بے دینی" بہت ہی کم حالات میں رہی ہے، اور یہ قدیم عقیدہ کہ دین یک ایسا سلسلہ ہے جس میں تقریباً سبھی افراد شامل رہے ہیں، یہ بات حقیقت پر مبنی ہے، یہ بات ایک فلسفی کی نظر میں بنیادی تاریخی اور علم نفسیات میں شمار ہوتی ہے، وہ اس بات پر قانع نہیں ہوتا کہ تمام ادیان میں باطل و بیہودہ مطالب تھے بلکہ وہ اس بات پر توجہ رکھتا ہے کہ دین قدیم الایام سے ہمیشہ تاریخ میں موجود رہا ہے" (۱)

---

(۱) "تاریخ تمدن، ویل ڈورانٹ"، جلد اول، صفحہ ۸۷، ۸۹.

یہی مولف ایک دوسری جگہ اس سلسلہ میں اس طرح لکھتا ہے: ''اس پرہیزگاری کا منبع و مرکز کہاں قرار پاتا ہے جو کسی بھی وجہ سے انسان کے دل میں ختم ہونے والی نہیں ہے''(۱)

''ویل ڈورانٹ'' اپنی دوسری کتاب ''درسہای تاریخ'' میں ایسے الفاظ میں بیان کرتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غیظ وغضب اور ناراحتی کی حالت میں کہتا ہے کہ ''دین کی سو جانیں ہوتی ہیں اگر اس کو ایک مرتبہ مار دیا جائے تو دوبارہ زندہ ہو جاتا ہے!''(۲)

اگر خدا اور مذہب کا عقیدہ، عادت، تقلید، تلقین یا دوسروں کی تبلیغ کا پہلو رکھتا ہوتا تو یہ ممکن نہیں تھا اس طرح عام طور پر پایا جاتا اور ہمیشہ تاریخ میں موجود رہتا، لہٰذا یہ بہترین دلیل ہے کہ دین فطری ہے۔

۲۔آثار قدیمہ کے شواہد:

وہ آثار اور علامتیں جو ما قبل تاریخ (لکھنے کے فن اختراع سے پہلے اور لوگوں کے حالات زندگی تحریر کرنے سے پہلے) میں ایسے آثار ونشانیاں ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ مختلف قومیں اپنے اپنے لحاظ سے دین ومذہب رکھتی تھیں، ''خدا'' اور مرنے کے بعد ''معاد'' پر عقیدہ رکھتی تھی، کیونکہ ان کی من پسند چیزیں مرنے کے بعد ان کے ساتھ دفن کی گئی ہیں تاکہ وہ مرنے کے بعد والی زندگی میں ان سے کام لے سکیں! مردوں کے جسموں کو گلنے اور سڑنے سے بچانے کے لئے ''مومیائی'' کرنا، یا ''اہرام مصر'' جیسے مقبرے بنانا تاکہ طولانی مدت کے بعد بھی باقی رہیں یہ تمام چیزیں اس بات کی شاہد ہیں کہ ماضی میں زندگی بسر کرنے والے افراد بھی خدا اور قیامت پر ایمان رکھتے تھے۔

(۱) ''تاریخ تمدن، ویل ڈورانٹ''، جلد اول، صفحہ ۸۷و۸۹
(۲) ''فطرت'' شہید مطہری، صفحہ ۱۵۳.

اگرچہ ان کاموں سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ان کے یہاں مذہبی عقائد میں بہت سے خرافات بھی پائے جاتے تھے، لیکن یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اصلی مسئلہ یعنی مذہبی ایمان، قبل تاریخ سے پہلے موجود تھا جس کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔

۳۔ماہرین نفسیات کی تحقیق اوران کے انکشافات:

انسانی روح کے مختلف پہلوؤں اوراس کی اصلی خواہشات پر ریسرچ بھی اس بات کی واضح دلیل ہے کہ مذہبی اعتقاداور دین ایک فطری مسئلہ ہے۔

چار مشہور و معروف احساس (یا چار بلند خواہشات) اورانسانی روح کے بارے میں نفسیاتی ماہرین نے جو چار پہلو بیان کئے ہیں: (۱۔حس دانائی، ۲۔حس زیبائی، ۳۔حس نیکی، ۴۔حس مذہبی،) ان مطالب پر واضح وروشن دلیلیں ہیں۔(۱)

انسان کی حس مذہبی یا روح انسان کا چوتھا پہلو، جس کو کبھی ''کمال مطلق کا لگاؤ'' یا ''دینی اور الٰہی لگاؤ'' کہا جاتا ہے یہ وہی حس اور طاقت ہے جوانسان کو مذہب کی طرف دعوت دیتی ہے، اور بغیر کسی خاص دلیل کے خدا پر ایمان لے آتی ہے، البتہ ممکن ہے کہ اس مذہبی ایمان میں بہت سے خرافات پائے جاتے ہوں، جس کا نتیجہ کبھی بت پرستی، یا سورج پرستی کی شکل میں دکھائی دے، لیکن ہماری گفتگو اصلی سرچشمہ کے بارے میں ہے۔

۴۔مذہب مخالف پروپیگنڈے کا ناکام ہوجانا

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ چند آخری صدیوں میں خصوصاً یورپ میں دین مخالف پروپیگنڈے بہت زیادہ ہوئے ہیں جو ابھی تک وسیع اور ہمہ گیر وسائل کے لحاظ سے بے نظیر ہیں۔

سب سے پہلے یورپ کی علمی تحریک (رنسانس) کے زمانہ سے جب علمی اور سیاسی معاشرہ

---

(۱) ''حس مذہبی یا بعد چہارم روح انسانی'' میں ''کوشاتم'' کے مقالہ کی طرف رجوع فرمائیں۔(ترجمہ مہندس بیانی)

گرجا گھر کی حکومت کے دباؤ سے آزاد ہوا تو اس وقت اس قدر دین کے خلاف پروپیگنڈہ ہوا جس سے الحادی نظریہ یورپ میں وجود میں آیا ہے اور ہر جگہ پھیل گیا (البتہ یہ مخالفت عیسائی مذہب کے خلاف ہوئی چونکہ یہی دین وہاں پر رائج تھا) اس سلسلہ میں فلاسفہ اور سائنس کے ماہرین سے مدد لی گئی تاکہ مذہبی بنیاد کو کھوکھلا کر دیا جائے یہاں تک کہ گرجا گھر کی رونق جاتی رہی، اور یورپی مذہبی علما گوشہ نشین ہوگئے، یہی نہیں بلکہ خدا، معجزہ، آسمانی کتاب اور روز قیامت پر ایمان کا شمار خرافات میں کیا جانے لگا، اور بشریت کے چار زمانہ والا فرضیہ (قصہ و کہانی کا زمانہ، مذہب کا زمانہ، فلسفہ کا زمانہ اور علم کا زمانہ) بہت سے لوگوں کے نزدیک قابل قبول سمجھا جانے لگا، اور اس تقسیم بندی کے لحاظ سے مذہب کا زمانہ بہت پہلے گزر چکا تھا!

عجیب بات تو یہ ہے کہ آج کل کی معاشرہ شناسی کی کتابوں میں جو کہ اسی زمانہ کی ترقی یافتہ کتابیں ہیں ان میں اس فارمولہ کو ایک اصل کے عنوان سے فرض کیا گیا ہے کہ مذہب کا ایک طبیعی سبب ہے چاہے وہ سبب ''جہل'' ہو یا ''خوف'' یا ''اجتماعی ضرورتیں'' یا ''اقتصادی مسائل'' اگرچہ ان کے نظریہ میں اختلاف پایا جاتا ہے!!۔

یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ اس وقت رائج مذہب یعنی گرجا گھر نے ایک طویل مدت تک اپنے ظلم و ستم اور علمی پیمانہ پر لوگوں کے ساتھ بے رحمانہ سلوک کیا اور خاص کر سائنسدانوں پر بہت زیادہ سختیاں کیں نیز اپنے لئے بہت زیادہ مرفہ، ور آرام طلب اور دکھاوے کی زندگی کے قائل ہوئے اور غریب لوگوں کو بالکل بھول گئے لہٰذا انھیں اپنے اعمال کی سزا تو بھگتنا ہی تھی، لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ صرف پاپ اور گرجا کا مسئلہ نہ تھا بلکہ دنیا بھر کے تمام مذاہب کی بات تھی۔

کمیونسٹوں نے مذہب کو مٹانے کے لئے اپنی پوری طاقت صرف کردی اور تمام تر تبلیغاتی وسائل اور فلسفی نظریات کو لے کر میدان میں آئے اور اس پروپیگنڈہ کی بھرپور کوشش کی کہ ''مذہب

معاشرہ کے لئے ''افیون'' ہے!

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ دین کی اس شدید مخالفت کے باوجود وہ لوگوں کے دلوں سے مذہب کی اصل کو نہیں مٹا سکے، اور مذہبی جوش و ولولہ کو نابود نہ کر سکے، اس طرح سے کہ آج ہم خود اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ مذہبی احساسات پر پھر سے نکھار آرہا ہے، یہاں تک کہ خود کمیونسٹ ممالک میں بڑی تیزی سے مذہب کی باتیں ہو رہی ہیں، اور میڈیا کی ہر خبر میں ان ممالک کے حکام کی پریشانی کو بیان کیا جارہا ہے کہ وہاں پر مذہب خصوصاً اسلام کی طرف لوگوں کا رجحان روز بروز بڑھتا جارہا ہے، یہاں تک کہ خود کمیونسٹ ممالک میں کہ جہاں بھی تک مذہب مخالف طاقتیں بیہودہ کوشش جاری رکھے ہوئے ہیں، وہاں پر بھی مذہب پھیلتا ہوا نظر آتا ہے۔

ان مسائل کے پیش نظر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مذہب کا سرچشمہ خود انسان کی ''فطرت'' ہے، لہٰذا وہ شدید مخالفت کے باوجود بھی اپنی حفاظت کرنے پر قادر ہے، اور اگر ایسا نہ ہوتا تو مذہب کبھی کا مٹ گیا ہوتا۔

۵۔ زندگی کی مشکلات میں ذاتی تجربات:

بہت سے لوگوں نے اپنی زندگی میں اس بات کا تجربہ کیا ہے کہ جس وقت بہت زیادہ مشکلات کا سامنا ہوتا ہے اور بدبختیوں اور مصیبتوں کا طوفان آتا ہے جہاں پر ظاہری اسباب دم توڑ دیتے ہیں، اور انسان کی گردن تک چھری پہنچ جاتی ہے، تو اس طوفانی موقع پر اس کے دل کی گہرائیوں سے ایک امید پیدا ہوتی ہے اور انسان اس مبدا کی طرف متوجہ ہوتا ہے جو اس کی تمام مشکلات کو دور کر سکتا ہے، لہٰذا انسان اسی سے لو لگاتا ہے اور اسی سے مدد مانگتا ہے، یہاں تک کہ معمولی افراد جو عام حالات میں دینی رجحان نہیں رکھتے وہ بھی اس مسئلہ سے الگ نہیں ہیں بلکہ وہ بھی شدید مشکلات یا لاعلاج بیماری کے وقت اس طرح کا روحانی نظریہ رکھتے ہیں۔

[قارئین کرام!] یہ تمام چیزیں اس حقیقت پر واضح شاہد ہیں کہ دین ایک فطری شئے ہے

،چنانچہ قرآن مجید نے اس سلسلہ میں بہت پہلے ہی خبر دی ہے.

جی ہاں انسان اپنے دل کی گہرائیوں سے اپنے اندر ایک آواز کو سنتا ہے جو محبت اور پیار سے لبریز ہوتی ہے اور وہ مستحکم و واضح ہوتی ہے اور اس کو ایک عظیم حقیقت یعنی عالم و قادر کی طرف دعوت دیتی ہے جس کا نام ''اللہ'' یا ''خدا'' ہے، ممکن ہے کوئی شخص دوسرے نام سے پکارے، نام سے کوئی بحث نہیں ہے، بلکہ اس حقیقت پر ایمان کا مسئلہ ہے۔

مفکر شعراء کرام نے بھی اپنے دلچسپ اور بہترین اشعار میں اس مطلب کو بیان کیا ہے:

شورش عشق تو در ہیچ سری نیست کہ نیست

منظر روی تو زیب نظری نیست کہ نیست ا

نہ ہمیں از غم تو سینہ ما صد چاک است

داغ تو لالہ صفت، بر جگری نیست کہ نیست

ایک دوسرا شاعر کہتا ہے

در اندرون من خستہ دل ندانم کیست؟

کہ من خموشم و او در فغان و در غوغاست

''میں نہیں جانتا کہ میرے خستہ دل میں کون ہے کہ میں تو خاموش ہوں لیکن وہ نالہ و فریاد کر رہا ہے''۔

۲۔ مذہب کے فطری ہونے پر دانشوروں کی گواہی

''معرفت خدا'' کے مسئلہ کا فطری ہونا کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے کہ جس کے بارے میں صرف قرآن و احادیث نے بیان کیا ہو، بلکہ غیر مسلم فلاسفہ، دانشوروں اور نکتہ فہم شعرا کی گفتگو سے بھی یہ

مسئلہ واضح ہے۔

چند نمونے:

اس سلسلہ میں "اینشٹائن" ایک مفصل بیان کے ضمن میں کہتا ہے: "بغیر کسی استثنا کے سبھی لوگوں میں ایک عقیدہ اور مذہب پایا جاتا ہے ..اور میں اس کا نام "مذہب کی ضرورت کا احساس" رکھتا ہوں۔ چنانچہ انسان دنیوی چیزوں کے علاوہ جن چیزوں کا احساس کرتا ہے اس مذہب کے تحت انسان تمام اہداف اور عظمت وجلال کو حقیر سمجھتا ہے، وہ اپنے وجود کو ایک قید خانہ سمجھتا ہے، گویا اپنے بدن کے پنجرے سے پرواز کرنا چاہتا ہے اور تمام ہستی کو ایک حقیقت کی شکل میں حاصل کرنا چاہتا ہے۔(۱)

اس طرح مشہور ومعروف دانشور "پاسکال" کہتا ہے

"دل کے اندر ایسے دلائل ہوتے ہیں جن تک عقل نہیں پہنچ سکتی"!(۲)

"ولیم جیمز" کہتا ہے: "میں اس بات کو اچھی طرح مانتا ہوں کہ مذہبی زندگی کا سرچشمہ "دل" ہے، اور اس بات کو بھی قبول کرتا ہوں کہ فلسفی فارمولے اور دستور العمل اس ترجمہ شدہ مطلب کی طرح ہیں جس کی اصلی عبارت کسی دوسری زبان میں ہو"۔(۳)

"ماکس مولر" کہتا ہے: "ہمارے بزرگ اس وقت خدا کی بارگاہ میں سر جھکاتے تھے کہ اس وقت خدا کا نام بھی نہیں رکھا گیا تھا۔(۴)

---

(۱) "دنیائی کہ من می بینم" (با تلخیص) صفحہ ۵۳

(۲) "سیر حکمت در اروپا"، جلد۲، صفحہ ۱۳۔

(۳) "سیر حکمت در اروپا"، جلد۲، صفحہ ۳۲۱

(۴) مقدمہ نیایش صفحہ ۳۱

ماکس ایک دوسری جگہ اپنے عقیدہ کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے: ''اس نظریہ کے برخلاف، جس میں کہا جاتا ہے کہ دین پہلے سورج چاند وغیرہ اور بت پرستی سے شروع ہوا ہے اس کے بعد خدائے واحد کی پرستش تک پہنچا ہے، آثار قدیمہ کے ماہرین نے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ خدا پرستی سب سے قدیم دین ہے''۔(۱)

مشہور و معروف مورخ ''پلوتارک'' لکھتا ہے:

''اگر آپ دنیا پر ایک نظر ڈالیں تو بہت سی ایسی جگہ دیکھیں گے جہاں پر نہ کوئی آبادی ہے نہ علم وصنعت اور نہ سیاست وحکومت، لیکن کوئی جگہ ایسی نہیں ملے گی جہاں پر ''خدا'' نہ ہو'' (۲)

''ساموئیل کنیگ'' اپنی کتاب ''جامعہ شناسی'' میں کہتا ہے: ''دنیا میں تمام انسانی جماعتوں کا کوئی نہ کوئی مذہب تھا، اگرچہ سیاحوں، اور پہلے (عیسائی) مبلغین نے بعض گروہوں کا نام لیا ہے جن کا کوئی مذہب نہیں تھا، لیکن بعد میں معلوم یہ ہوا ہے کہ اس کی رپورٹ کا کوئی حوالہ نہیں ہے، اور ان کا یہ فیصلہ صرف اس وجہ سے تھا کہ ان کے گمان کے مطابق ان کا مذہب بھی ہماری طرح کا کوئی مذہب ہونا چاہئے تھا''۔(۳)

[قارئین کرام!] ہم اپنی بحث کو مشہور و معروف دور حاضر کے مورخ ''ویل ڈورانٹ'' کی گفتگو پر ختم کرتے ہیں، وہ کہتا ہے:

''اگر ہم مذہب کے سرچشمہ کو ماقبل تاریخ تصور نہ کریں تو پھر مذہب کو صحیح طور پر نہیں پہچان سکتے''۔(۴)(۵)

---

(۱) ''فطرت'' الشہید مطہری، صفحہ ۱۳۸۔
(۲) مقدمہ نیایش، صفحہ ۳۱۔
(۳) ''جامعہ شناسی، ساموئیل کنیگ'' صفحہ ۱۹۱۔
(۴) تاریخ تمدن، جلد ۱، صفحہ ۸۸۔
(۵) تفسیر پیام قرآن، جلد ۳، صفحہ ۲۰۔

۶۔ خدا کے ”سمیع“ اور ”بصیر“ ہونے کا کیا مطلب ہے؟

تمام اسلامی علما اور دانشوروں نے خداوند عالم کو سمیع و بصیر مانا ہے، کیونکہ یہ دونوں صفات قرآن مجید میں بارہا بیان ہوئی ہیں، البتہ اس سلسلہ میں اختلاف نظر پایا جاتا ہے:

چنانچہ محققین کا اس بات پر عقیدہ ہے کہ خدا کے سمیع و بصیر ہونے کا مطلب اس کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے کہ خداوند عالم ”آواز“ اور ”یعنی دکھائی دینے والی چیزوں“ کی نسبت علم و آگاہی رکھتا ہے، اگرچہ یہ دونوں الفاظ سننے اور دیکھنے کے معنی میں وضع ہوئے تھے، جن کے لئے ہمیشہ ”کان“ اور ”آنکھ“ ضروری ہوتے ہیں، لیکن جب یہ الفاظ خدا کے بارے میں استعمال ہوں تو پھر جسمانی آلات و اعضا کے تصور سے خالی ہوتے ہیں، چونکہ ذات خدا جسم و جسمانیات سے پاک و پاکیزہ ہے۔

اور یہ معنی مجازی نہیں ہے، اور اگر اس کو مجاز کہیں بھی تو یہ مجاز، فوق حقیقت (یعنی معنی حقیقی سے بالاتر) ہے کیونکہ خدا آواز اور مناظر پر اس طرح احاطہ رکھتا ہے اور یہ چیزیں اس کے پاس اس طرح حاضر ہیں کہ ہر آنکھ کان سے بالاتر ہے، لہٰذا دعاؤں میں خداوند عالم کو ”اسمعُ السّامعین“ (سب سے زیادہ سننے والا) اور ”ابصرَ الناظرین“ (سب سے زیادہ دیکھنے والے) کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے۔(۱)

---

(۱) ماہ رجب میں ہر روز پڑھی جانے والی دعا میں وارد ہوا ہے ”یا اسمع السامعین و ابصر الناظرین و اسرع الحاسبین“ (اے سب سے زیادہ سننے والے اور سب سے زیادہ دیکھنے والے اور سب سے زیادہ جلدی حساب کرنے والے!)

لیکن بعض قدیم متکلمین کا عقیدہ تھا کہ خدا کے ''سمیع'' اور ''بصیر'' ہونے کا مطلب صفت ''علم'' کے علاوہ ہے، یہ لوگ مجبور ہیں کہ صفات ''سمیع'' اور ''بصیر'' کو زائد بر ذات مانیں، اور صفات ازلی متعدد ہو جائیں جو ایک طرح کا شرک ہے، وگرنہ خداوند عالم کا ''سمیع'' اور ''بصیر'' ہونا سنی جانے والی آوازوں اور مناظر کے علم کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔(۱)

کتاب ''بحار الانوار'' میں حضرت امام صادق علیہ السلام سے روایت بیان ہوئی ہے کہ ایک شخص امام علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی آپ کے محبوں میں سے ایک شخص کا کہنا ہے: خداوند عالم کان کے ذریعہ سمیع ہے اور آنکھوں کے ذریعہ بصیر ہے! اور علم کی وجہ سے عالم ہے! (یعنی خدا کی صفات زائد بر ذات ہیں) اور قادر ہے اپنی قدرت کی وجہ سے (یعنی اس کے صفات زائد بر ذات ہیں)

امام علیہ السلام نے ناراض ہوتے ہوئے فرمایا: ''مَنْ قَالَ ذٰلِکَ وَ دَانَ بِهِ فَهُوَ مشرکٌ، وَ لَيْسَ منْ ولايتنا على شيءٍ؛ إنَّ اللهَ تبارکَ و تعالى ذات علامة سميعة بصيرة قادرة''(۲) (۳)

''جو شخص یہ کہے اور اس پر عقیدہ رکھے تو ایسا شخص مشرک ہے، اور ہماری ولایت سے دور ہے، خداوند عالم کی ذات عین عالم، عین سمیع، اور عین بصیر و قادر ہے (اور یہ صفات اس کی ذات پر زائد نہیں ہیں)''۔

---

(۱) اشاعرہ خداوند عالم کی سات صفات (علم، قدرت، ارادہ، سمع، بصر، حیات، اور تکلم) کو قدیم اور زائد بر ذات جانتے ہیں، جن میں سے بعض افراد خداوند عالم کی ذات اور سات صفات کے قدماء ثمانیہ (یعنی آٹھ ازلی وجود) کہتے ہیں جبکہ ہماری نظر میں یہ عقیدہ باطل اور شرک ہے [کیونکہ اس صورت میں تعدد الٰہ لازم آتا ہے۔]

(۲) بحار الانوار، جلد ۴، صفحہ ۶۳۔

(۳) تفسیر پیام قرآن، جلد ۴، صفحہ ۹۔

۷۔ صفات جمال وجلال سے کیا مراد ہے؟

خداوند عالم کی صفت کو معمولاً دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

''صفاتِ ذات'' اور ''صفاتِ فعل''۔

اس کے بعد صفات ذات کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا ہے: ''صفاتِ جمال'' اور ''صفاتِ جلال''۔

''صفات جمال'' سے وہ صفات مراد ہیں جو خداوند عالم کے لئے ثابت ہیں جیسے علم، قدرت، ازلیت، ابدیت، لہٰذا ان صفت کو ''صفات ثبوتیہ'' کہا جاتا ہے، اور ''صفت جلال'' سے مراد وہ صفت ہیں جو خدا میں نہیں پائی جاتیں، جیسے جہل، عجز، جسم وغیرہ لہٰذا ان صفت کو ''صفات سلبیہ'' کہا جاتا ہے، اور یہ دونوں صفات خداوند عالم کی ''صفت ذات'' ہیں، وہ اس کے افعال سے قطع نظر قابل درک ہیں۔

''صفات فعل'' سے مراد وہ صفات ہیں جو خداوند عالم کے افعال سے متعلق ہوتی ہیں، یعنی جب تک خداوند عالم اس فعل کو انجام نہ دے تو اس صفت کا اس پر اطلاق نہیں ہوتا، جب وہ فعل انجام دیتا ہے تو اس صفت سے متصف ہوتا ہے جیسے ''خالق''، ''رازق'' اور ''محی''، ''ممیت'' (یعنی خلق کرنے والا، روزی دینے والا، زندہ کرنے والا اور موت دینے والا)

ہم ایک بار پھر اس بات کی تاکید کرتے ہیں کہ خداوند عالم کی ''صفات ذات'' اور ''صفات

فعل "لامحدود ہیں، کیونکہ نہ اس کے کمالات ختم ہونے والے ہیں اور نہ اس کے افعال و مصنوعات، لیکن پھر بھی ان میں سے بعض صفت دوسری صفات کی اصل اور سرچشمہ شمار ہوتی ہیں، نیز وہ ان کی شاخیں شمار کی جاتی ہیں، لہٰذا اس نکتہ کے پیش نظر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ خداوند عالم کی درج ذیل پانچ صفات خداوند عالم کی ذات اقدس کے تمام اسما و صفات کے لئے اصل و سرچشمہ ہیں اور باقی ان کی شاخیں ہیں:

وحدانیت، علم، قدرت، ازلیت اور ابدیت۔(۱)

---

(۱) تفسیر پیام قرآن، جلد۴، صفحہ۵۹.

۸۔ خداوند عالم کے ارادہ کی حقیقت کیا ہے؟

اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ ارادہ جن معنی میں انسان کے بارے میں استعمال ہوتا ہے ان معنی میں خداوند عالم کے لئے استعمال نہیں ہوتا ہے۔

کیونکہ انسان پہلے کسی چیز کا تصور کرتا ہے، (مثلاً پانی پینا) پھر اس کے فوائد کے بارے میں سوچتا ہے، اور اس کے فائدہ کی تصدیق کے بعد اس کام کو انجام دینے کا شوق پیدا ہوتا ہے، اور جس وقت انسان کا شوق آخری درجہ پر پہنچ جاتا ہے تو اعضا کے لئے حکم صادر ہوتا ہے اور انسان اس کام کو شروع کر دیتا ہے۔(۱)

لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہ تمام چیزیں (تصور، تصدیق، شوق، حکم، نفس اور اعضا کی حرکت) خداوند عالم کے سلسلہ میں بے معنی ہیں، کیونکہ یہ تمام چیزیں حادث ہیں، پس خدا کے ارادہ کا کیا مفہوم ہے؟۔

اس سلسلہ میں علم عقائد اور اسلامی علما و فلاسفہ نے ایک ایسا مفہوم بیان کیا ہے کہ ''بسیط'' ہونے کے ساتھ ساتھ خدا میں کسی بھی طرح کی کوئی تبدیلی و تغییر نہیں ہوتا۔

---

(۱) بعض فلاسفہ ارادہ کو وہی ''شوق مؤکد'' کا نام دیتے ہیں، جبکہ بعض دوسرے فلاسفہ ''شوق مؤکد'' کے علاوہ نفس کے ایک فعل اور حرکت کے بھی قائل ہیں، اور ارادہ کو وہی انسانی فعل شمار کرتے ہیں، (غور کیجئے)

ان حضرات کا کہنا ہے کہ خداوند عالم کا ارادہ دو طرح کا ہوتا ہے:

۱۔ ذاتی ارادہ۔

۲۔ فعلی ارادہ۔

۱۔ ''ذاتی ارادہ'' کا مطلب یہ ہے کہ وہ دنیا و مافیہا کے بہترین نظام اور نظام خلقت کا علم رکھتا ہے اور احکام شرعی میں بندوں کے خیر و صلاح کا علم رکھتا ہے۔

وہ جانتا ہے کہ اس کائنات کا بہترین نظام کیا ہے، اور کس علاقہ میں کیا چیز پیدا ہونی چاہئے، یہی ''علم'' مختلف زمانوں میں موجودات اور حوادث کے پیدا ہونے کا سرچشمہ ہوتا ہے۔

اسی طرح وہ یہ بھی جانتا ہے کہ قوانین و احکام کے لحاظ سے کس چیز میں بندوں کی مصلحت ہے؟ اور ان قوانین و احکام کی روح اس کا یہی علم ہے جو مصالح و مفاسد کے بارے میں ہے۔ (غور کیجئے)

۲۔ خداوند عالم کا فعلی ارادہ ''عین ایجاد'' ہے اور صفات فعل کا جز شمار ہوتا ہے، اس بنا پر زمین و آسمان کی خلقت کے بارے میں اس کا ارادہ ''عین ایجاد'' ہے، نماز کے واجب ہونے اور جھوٹ کے حرام ہونے پر ارادہ، عین وجوب و حرام ہے، [یعنی اس نے نماز کے واجب کرنے کا ارادہ کیا وہ واجب ہوگئی]

خلاصہ یہ کہ خداوند عالم کا ذاتی ارادہ اس کا ''عین علم'' اور ''عین ذات'' ہے، اور خداوند عالم کا فعلی ارادہ اس کام کا ''عین ایجاد'' ہے۔(۱)

---

(۱) تفسیر پیام قرآن، جلد ۴، صفحہ ۱۵۳

۹۔اسم اعظم کیا ہے؟

اسم اعظم کے سلسلہ میں مختلف روایات بیان کی گئی ہیں جن سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو شخص بھی اسم اعظم سے باخبر ہوجائے تو نہ صرف یہ کہ اس کی دعا قبول ہوجاتی ہے بلکہ وہ شخص اس اسم اعظم کے ذریعہ اس دنیا کی بہت سی چیزوں میں دخل وتصرف کرسکتا ہے اور بہت سے عجیب وغریب کام انجام دے سکتا ہے۔

خدا کے ناموں میں سے کونسا نام ”اسم اعظم“ ہے؟ اس سلسلہ میں علمائے اسلام نے بہت زیادہ بحث وگفتگو کی ہے، اور اس موضوع پر اکثر بحثیں ہوا کرتی ہیں کہ خدا کے ناموں میں اس اسم کو تلاش کریں جو عجیب وغریب خاصیت رکھتا ہو۔

لیکن ہمارے نظریہ کے مطابق جس چیز پر زیادہ توجہ ہونا چاہئے وہ یہ ہے کہ خدا کے اسما اور صفات کا پتہ لگائیں ان کے مفہوم کو اپنے اندر پیدا کریں اور روحانی تکامل وپیشرفت حاصل کریں جن کے ذریعہ ہماری ذات پر اثر ہوسکے۔

دوسرے الفاظ میں اہم مسئلہ یہ ہے کہ ہم اپنے اندر ان صفات کو پیدا کریں اور اپنے کردار کو ان صفات سے مزین کریں، ورنہ گناہوں میں آلودہ شخص اور ایک ذلیل انسان کیا ”اسم اعظم“ کا علم حاصل کرنے سے ”مستجاب الدعوة“ ہوسکتا ہے؟!

اگر ہم سنتے ہیں کہ ”بلعم“ نامی شخص اسم اعظم کا علم رکھتا تھا لیکن بعد میں اس سے ہاتھ

دھو بیٹھا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے ایمان و عمل صالح اور تقویٰ و پرہیزگاری کے ذریعہ اس روحانی درجہ کو حاصل کرلیا تھا لہٰذا اس کی دعا قبول ہوجاتی تھی، لیکن اپنی خطاؤں کے ذریعہ (کیونکہ انسان خطاو غلطی سے پاک نہیں ہے) اور اپنے زمانہ کے فرعونی اور طاغوتی طاقتوں اور اپنی ہوا و ہوس کی بنا پر اس روحانی طاقت کو بالکل کھودیا، اور اس مرتبہ سے گرگیا، اسم اعظم کے بھول جانے سے یہی معنی مراد ہوسکتے ہیں۔

اور اسی طرح اگر ہم کتابوں میں پڑھتے ہیں کہ انبیاء اور ائمہ علیہم السلام اسم اعظم سے آگاہ تھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے وجود میں خدا کے اسم اعظم کی حقیقت جلوہ گر ہوتی تھی، اور اسی وجہ سے خداوند عالم نے ان کو اس عظیم مرتبہ پر فائز کیا تھا[کہ ان کی دعائیں مستجاب ہوتی تھیں](۱)

(۱)تفسیر نمونہ، جلد ۷، صفحہ ۳۰

۱۰۔ کیا خداوند عالم کو دیکھا جا سکتا ہے؟

عقلی دلائل اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ خداوند عالم کو ہرگز آنکھوں کے ذریعہ نہیں دیکھا جا سکتا، کیونکہ آنکھ تو کسی چیز کے جسم یا صحیح الفاظ میں چیزوں کی کیفیتوں کو دیکھ سکتی ہیں، اور جس چیز کا کوئی جسم نہ ہو بلکہ اس میں جسم کی کوئی کیفیت بھی نہ ہو تو اس چیز کو آنکھ کے ذریعہ نہیں دیکھا جا سکتا، دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ آنکھ اس چیز کو دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے جس میں مکان، جہت اور مادہ ہو، حالانکہ خداوند عالم ان تمام چیزوں سے پاک و پاکیزہ ہے اور اس کا وجود لامحدود ہے اسی وجہ سے وہ ہمارے اس مادی جہان سے بالاتر ہے، کیونکہ مادی جہان میں سب چیزیں محدود ہیں۔

قرآن مجید کی بہت سی آیات، منجملہ بنی اسرائیل سے متعلق آیت جن میں خداوند عالم کے دیدار کی درخواست کی گئی ہے، ان میں مکمل وضاحت کے ساتھ خداوند عالم کے دیدار کے امکان کی نفی کی گئی ہے، لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ بہت سے اہل سنت علما یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اگر خداوند عام اس دنیا میں نہیں دکھائی دے سکتا تو روز قیامت ضرور دکھائی دے گا!! جیسا کہ مشہور و معروف اہل سنت عالم، صاحب تفسیر المنار کہتے ہیں: "ھٰذا مَذهبُ أهل السُّنة و العلم بالحديثِ" (یہ عقیدہ اہل سنت اور علمائے اہل حدیث کا ہے)(۱)

---

(۱) تفسیر المنار، جلد ۷، صفحہ ۶۵۳

اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ عصر حاضر کے علاے اہل سنت جو اپنے کو روشن فکر بھی سمجھتے ہیں وہ بھی اسی عقیدہ کا اظہار کرتے ہیں اور کبھی کبھی تو اس سلسلہ میں بہت زیدہ ہٹ دھرمی کرتے ہیں!

حالانکہ اس عقیدہ کا باطل ہونا اس قدر واضح ہے کہ بحث وگفتگو کی بھی ضرورت نہیں ہے؛ کیونکہ اس سلسلہ میں (جسمانی معاد کے پیش نظر) دنیا و آخرت میں کوئی فرق نہیں ہے، کیونکہ جب خداوندعالم کی ذات اقدس مادی نہیں ہے وہ مادہ سے پاک ومنزہ ہے،تو کیا وہ روز قیامت ایک مادی وجود میں تبدیل ہوجائے گا، اور اپنی لامحدود ذات سے محدود بن جائے گا، کیا اس دن خدا جسم یا عوارض جسم میں تبدیل ہوجائے گا؟ کیا خداوندعالم کے عدم دیدار کے عقلی دلائل دنیا وآخرت میں کوئی فرق کرتے ہیں؟ ہرگز نہیں، کیونکہ عقلی حکم کوئی استثنا نہیں ہوتا۔

اسی طرح بعض لوگوں کا یہ غلط توجیہ کرنا کہ ممکن ہے انسان کو روز قیامت دوسری آنکھیں مل جائیں یا انسان کو ایک دوسرا ادراک مل جائے جس سے وہ خداوندعالم کا دیدار کرسکے،تو یہ بالکل بے بنیاد ہیں، کیونکہ اگر اس دید اور آنکھ سے یہی عقلانی اور فکری دید مراد ہے تو یہ تو اس دنیا میں بھی موجود ہے اور ہم اپنے دل اور عقل کی آنکھوں سے خدا کے جمال کا مشاہدہ کرتے ہیں، اور اگر اس سے مراد وہی چیز ہے جس کو آنکھوں سے دیکھا جائے گا تو اس طرح کی چیز خداوندعالم کے بارے میں محال اور ناممکن ہے، چاہے وہ اس دنیا سے متعلق ہو یا اُس دنیا سے، لہٰذا کسی کا یہ کہنا کہ انسان اس دنیا میں خدا کو نہیں دیکھ سکتا مگر مومنین روز قیامت خداوندعالم کا دیدار کریں گے، یہ بات غیر منطقی اور ناقابل قبول ہے۔

یہ لوگ اپنی معتبر کتابوں میں موجود بعض احادیث کی بنا پر اس عقیدہ کا دفاع کرتے ہیں جن احادیث میں روز قیامت خدا کے دیدار کی بات کہی گئی ہے،لیکن کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ ان روایات کے باطل ہونے کو عقل کے ذریعہ پرکھیں اور ان روایات کو جعلی اور جن کتابوں میں یہ روایات بیان ہوئی

ہیں ان کو بے بنیاد مانیں، مگر یہ کہ ان روایات کو دل کی آنکھوں سے مشاہدہ کے معنی میں تفسیر کریں، کیا یہ صحیح ہے کہ اس طرح کی روایات کی بنا پر اپنی عقل کو الوداع کہہ دیں، اور اگر قرآن کریم کی بعض آیات میں اس طرح کے الفاظ موجود ہیں جن کے ذریعہ پہلی نظر میں دیدار خدا کا مسئلہ سمجھ میں آتا ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ ☆ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾(۱)

"اس دن بعض چہرے شاداب ہوں گے۔ اپنے پروردگار [کی نعمتوں] پر نظر رکھے ہوئے ہوں گے"۔

مذکورہ آیت درج ذیل آیت کی طرح ہے:

﴿يَدُ اللهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ﴾(۲)

"اور ان کے ہاتھوں کے اوپر اللہ ہی کا ہاتھ ہے"۔

جس میں کنایۂ قدرت پروردگار کی بات کی گئی ہے، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ قرآن مجید کی کوئی بھی آیت اپنے حکم کے برخلاف حکم نہیں دے گی۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اہل بیت علیہم السلام سے منقول روایات میں اس باطل عقیدہ کی شدت سے نفی اور مخالفت کی گئی ہے، اور ایسا عقیدہ رکھنے والوں پر مختلف انداز میں تنقید کی گئی ہے، جیسا کہ حضرت امام صادق علیہ السلام کے مشہور و معروف صحابی جناب ہشام کہتے ہیں:

میں حضرت امام صادق علیہ السلام کی خدمت میں تھا کہ امام علیہ السلام کے ایک دوسرے صحابی معاویہ بن وہب آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا اے فرزند رسولؐ! آپ اس روایت کے بارے میں کیا فرماتے ہیں جس میں بیان ہوا ہے کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خدا کا

---

(۱) سورۂ قیامت، آیت ۲۲۔۲۳ (۲) سورۂ فتح، آیت ۱۰

دیدار کیا ہے؟ [اے فرزند رسول آپ بتایئے کہ] آنحضرت ﷺ نے کس طرح خدا کو دیکھا ہے؟ اور اسی طرح آنحضرت ﷺ سے منقول روایت جس میں بیان ہوا ہے کہ مومنین جنت میں خدا کا دیدار کریں گے، تو یہ دیدار کس طرح ہوگا؟!

اس موقع پر امام صادق علیہ اسلام نے مسکراتے ہوئے فرمایا اے معاویہ بن وہب! کتنی بری بات ہے کہ انسان ۷۰، ۸۰ سال کی عمر پائے، خدا کے ملک میں زندگی گزارے اس کی نعمتوں سے فیضیاب ہو، لیکن اس کو صحیح طریقہ سے نہ پہچان سکے، اے معاویہ! پیغمبر اکرم ﷺ نے ان آنکھوں سے خدا کا دیدار نہیں کیا ہے، دیدار اور مشاہدہ کی دو قسمیں ہوتی ہیں: دل کی آنکھوں سے دیدار، اور سر کی آنکھوں سے دیدار، اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اس نے دل کی آنکھوں سے خدا کا دیدار کیا ہے تو صحیح ہے لیکن اگر کوئی کہے کہ ان ظاہری آنکھوں سے خدا کا دیدار کیا ہے تو وہ جھوٹ بولتا ہے اور خدا اور اس کی آیات کا انکار کرتا ہے، کیونکہ پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا: جو شخص خداوند عالم کو مخلوق کی شبیہ اور مانند قرار دے تو وہ کافر ہے۔(۱)

اسی طرح ایک دوسری روایت جو "کتاب توحید" شیخ صدوقؒ میں اسماعیل بن فضل سے نقل ہوئی ہے ان کا بیان ہے کہ میں نے حضرت امام صادق علیہ اسلام سے سوال کیا کہ کیا روز قیامت خداوند عالم کا دیدار ہوسکتا ہے؟ تو امام علیہ السلام نے فرمایا: خداوند عالم اس چیز سے پاک و پاکیزہ ہے اور بہت ہی پاک و پاکیزہ ہے:

"... إنّ الأبصار لا تدرك إلّا ما له لون والكيفية والله خالق الألوان والكيفيات"(۲)

---

(۱) معانی الاخبار بنابر نقل تفسیر المیزان، جلد ۸، صفحہ ۲۶۸.

( ) نور الثقلین، جلد دوم، صفحہ ۵۳۷

"آنکھیں صرف ان چیزوں کو دیکھ سکتی ہیں جن میں رنگ اور کیفیت ہو جبکہ خداوند عالم رنگ اور کیفیت کا خالق ہے"۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس حدیث میں لفظ "لون" (یعنی رنگ) پر خاص توجہ دی گئی ہے اور آج کل ہم پر یہ بات واضح و روشن ہے کہ ہم خود جسم کو نہیں دیکھ سکتے بلکہ کسی چیز کے جسم کا رنگ دیکھا جاتا ہے، اور اگر کسی جسم کا کوئی رنگ نہ ہو تو وہ ہرگز دکھائی نہیں دے سکتا۔(۱)

جناب موسیٰ (ع) نے دیدار خدا کی درخواست کیوں کی؟

سورہ اعراف آیت نمبر ۱۴۳ میں جناب موسیٰ علیہ السلام کی زبانی نقل ہوا کہ انھوں نے عرض کی: ﴿رَبِّ أَرِنِي أَنظُرْ إِلَيْكَ﴾ (پالنے والے! مجھے اپنا دیدار کرادے)، اس آیت کے پیش نظر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جناب موسیٰ جیسے بزرگ اور اولو العزم نبی یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ خداوند عالم نہ جسم رکھتا ہے اور نہ مکان اور نہ ہی قابل دیدار ہے، تو پھر انھوں نے ایسی درخواست کیوں کی جو کہ ایک عام آدمی سے بھی بعید ہے؟

اگرچہ مفسرین نے اس سلسلہ میں مختلف جواب پیش کئے ہیں لیکن سب سے واضح جواب یہ ہے کہ جناب موسیٰ علیہ السلام نے یہ درخواست اپنی قوم کی طرف سے کی تھی، کیونکہ بنی اسرائیل کے بہت سے جاہل لوگ اس بات پر اصرار کرتے تھے کہ خدا پر ایمان لانے کے لئے پہلے اس کو دیکھیں گے، (سورہ نساء کی آیت نمبر ۱۵۳ اس بات کی شاہد ہے) جناب موسیٰ علیہ السلام کو خدا کی طرف سے حکم ملا کہ اس درخواست کو بیان کریں، تاکہ سب لوگ واضح جواب سن سکیں، چنانچہ کتاب عیون اخبار الرضا علیہ السلام میں امام علی بن موسیٰ الرضاؑ سے مروی حدیث بھی اسی مطلب کی وضاحت کرتی ہے۔(۲)

(۱) تفسیر نمونہ، جلد ۵، صفحہ ۳۸۱۔ (۲) تفسیر نور الثقلین، جلد ۲، صفحہ ۶۵

انھیں معنی کو روشن کرنے والے قرائن میں سے ایک قرینہ یہ ہے کہ اسی سورہ کی آیت نمبر ۵۵ میں جناب موسیٰ علیہ السلام اس واقعہ کے بعد عرض کرتے ہیں: **"اتھلکنا بما فعل السفھاء منا"** (کیا اس کام کی وجہ سے ہمیں ہلاک کردے گا؟ جس کو ہمارے بعض کم عقل لوگوں نے انجام دیا ہے؟)

اس جملہ سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ جناب موسیٰ علیہ السلام نے نہ صرف اس طرح کی درخواست نہیں کی تھی بلکہ شاید وہ ۷۰ افراد جو آپ کے ساتھ کوہ طور پر گئے تھے ان کا بھی یہ عقیدہ نہیں تھا، وہ صرف بنی اسرائیل کے دانشور اور لوگوں کی طرف سے نمائندے تھے، تاکہ ان جاہل لوگوں کے سامنے اپنی آنکھوں دیکھی کہانی کو بیان کریں جو خدا کے دیدار کے لئے اصرار کر رہے تھے۔(۱)

(۱) تفسیر نمونہ، جلد ۶، صفحہ ۳۵۶

۱۱۔ عرش خدا کیا ہے؟

قرآن مجید کی آیات میں تقریباً بیس مرتبہ ”عرش الٰہی“ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جس کی بنا پر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عرش الٰہی سے کیا مراد ہے؟

ہم نے مکرر عرض کیا ہے کہ ہماری محدود زندگی کے لئے وضع شدہ الفاظ عظمت خدا یا اس کی عظیم مخلوق کی عظمت کو بیان کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، لہٰذا ان الفاظ کے کنائی معنی اس عظمت کا صرف ایک جلوہ دکھا سکتے ہیں، اسی طرح لفظ ”عرش“ بھی ہے جس کے معنی ”چھت“ یا ”بلند پایہ تخت“ کے ہیں اس کرسی کے مقابلہ میں جس کے پائے چھوٹے ہوتے ہیں، لیکن اس کے بعد قدرت خدا کی جگہ ”عرش پروردگار“ استعمال ہونے لگا۔

اب اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ”عرش الٰہی“ سے کیا مراد ہے اور اس لفظ کے استعمال سے کیا معنی مراد لئے جاتے ہیں؟ اس سلسلہ میں مفسرین، محدثین اور فلاسفہ حضرات کے یہاں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔

کبھی ”عرش الٰہی“ سے ”خداوند عالم کا لامحدود علم“ مراد لیا جاتا ہے۔

کبھی ”خداوند عالم کی مالکیت اور حاکمیت“ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

اور کبھی خداوند عالم کی صفات کمالیہ اور صفت جلالیہ مراد لی جاتی ہیں، کیونکہ ان میں سے ہر صفت؛ خدا کی عظمت کو بیان کرنے والی ہے، جیسا کہ بادشاہوں کے تخت ان کی عظمت اور شان و

شوکت کی نشانی ہوا کرتی ہے۔

جی ہاں! خداوند عالم، عرش علم، عرش قدرت، عرش رحمانیت اور عرش رحیمیت رکھتا ہے۔

[قارئین کرام!] مذکورہ تینوں تفسیروں کے لحاظ سے ''عرش'' کا لفظ خداوند عالم کی صفات کی طرف اشارہ ہے، کسی وجود خارجی کی طرف نہیں، [مثلاً کوئی چیز خارج میں موجود ہو]

اہل بیت علیہم السلام سے منقول بعض روایات میں بھی اسی بات کی تائید ہوئی ہے، جیسا کہ حفص بن غیاث امام صادق علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے ﴿وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ﴾(۱) کے بارے میں سوال کیا، تو امام علیہ السلام نے فرمایا: ''اس سے مراد خداوند عالم کا ''علم'' ہے''۔(۲)

امام صادق علیہ السلام سے ایک دوسری حدیث میں بیان ہوا ہے کہ ''عرش'' یعنی وہ علم جس کو انبیاء کو عطا کیا ہے اور ''کرسی'' وہ علم جو کسی کو عطا نہیں ہوا ہے۔(۳)

حالانکہ بعض دوسرے مفسرین نے دیگر روایات سے الہام لیتے ہوئے ''عرش'' اور ''کرسی'' کے معنی خداوند عالم کی دو عظیم مخلوق تحریر کئے ہیں۔

ان میں سے بعض لوگوں کا کہنا ہے عرش سے تمام کائنات مراد ہے۔

بعض کہتے ہیں تمام زمین و آسمان ''کرسی'' کے اندر قرار دئے گئے ہیں، بلکہ زمین و آسمان ''کرسی'' کے مقابلہ میں وسیع و عریض بیابان میں پڑی ایک انگوٹھی کی طرح ہے، اور خود ''کرسی'' خداوند عالم کے ''عرش'' کے مقابلہ میں وسیع و عریض بیابان میں پڑی ایک انگوٹھی کی طرح ہے۔

---

(۱) سورۂ بقرہ، آیت ۲۵۵

(۲) بحار الانوار، جلد ۵۸، صفحہ ۲۸ (حدیث ۴۶ و ۴۷) ''اس کی کرسی، علم و اقتدار زمین و آسمان سے وسیع تر ہے''۔

(۳) بحار الانوار، جلد ۵۸، صفحہ ۲۸ (حدیث ۴۶ و ۴۷)

اور کبھی انبیاء علیہم السلام، اوصیاء اور کامل مومنین کے "دل" کو "عرش" کہا گیا ہے، جیسے کہ حدیث میں بیان ہوا ہے:

"إنَّ قَلبَ المؤمن عرش الرَّحمٰن"(١)

"بے شک مومن کا دل، عرش الٰہی ہے"۔

اور حدیث قدسی میں بھی بیان ہوا ہے:

"لَمْ یسعني سمائي ولا أرضي و وسعني قلب عبدي المؤمن"(٢)

"میرے زمین و آسمان، میری وسعت کی گنجائش نہیں رکھتے لیکن میرے مومن بندہ کا دل میرا مقام واقع ہو سکتا ہے"۔

(لیکن جہاں تک انسان کی قدرت تشخیص اجازت دیتی ہے) معنی "عرش" سمجھنے کے لئے بہترین راستہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں جہاں لفظ "عرش" استعمال ہوا ہے ان کی دقیق طریقہ سے تحقیق و جستجو کریں۔

قرآن مجید میں یہ لفظ مختلف مقامات پر استعمال ہوا ہے:

﴿ثُمَّ اسْتَوَی عَلَی الْعَرْشِ﴾(٣)

"اور اس کے بعد عرش پر اپنا اقتدار قائم کیا"

بعض آیات میں ان جملوں کے بعد "یدبر الامر" آیا ہے یا ایسے جملے آئے ہیں جو خداوند عالم کے علم اور اس کی تدبیر کی حکایت کرتے ہیں۔

---

(١) بحار الانوار، جلد ٥٨، صفحہ ٣٩

(٢) بحار الانوار، جلد ٥٨، صفحہ ٣٩

(٣) سورۂ اعراف، آیت ٥٤۔ سورۂ یونس، آیت ٣۔ سورۂ رعد، آیت ٢۔ سورۂ فرقان، آیت ٥٩، سورۂ سجدہ، آیت ٤۔ سورۂ حدید، آیت ٤۔

یا قرآن کریم کی بعض دوسری آیات میں ''عرش'' کے لئے ''عظیم'' جیسی صفت بیان ہوئی ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ﴾(۱) ''اور وہی عرش اعظم کا پروردگار ہے''۔

اور کبھی حاملان عرش کے سلسلہ میں گفتگو ہوئی ہے جیسے محل بحث آیہ شریفہ۔

کبھی ان ملائکہ کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے جو عرش کو گھمانے والے ہیں، مثلاً: ﴿وَتَرَى الْمَلَائِكَةَ حَافِّينَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ﴾(۲) ''اور تم دیکھو گے کہ ملائکہ عرش الٰہی کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے اپنے رب کی حمد و تسبیح کر رہے ہیں''۔

کبھی ارشاد ہوتا ہے کہ عرش الٰہی پانی پر ہے ﴿وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ﴾(ھود/۷)

قرآن کریم کے ان الفاظ اور اسلامی روایات میں بیان ہوئی دوسری عبارتوں سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ لفظ ''عرش'' کا مختلف معنی پر اطلاق ہوتا ہے، اگرچہ سب کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔

''عرش'' کے ایک معنی وہی مقام ''حکومت، مالکیت اور عالم ہستی کی تدبیر ہے''، کیونکہ بعض معمولی اوقات میں عرش کہہ کر کنایۃً ایک حاکم کا اپنی رعایا پر مسلط ہونے کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے: ''فلان ثل عرشه'' یہ کنایہ ہے کہ فلاں بادشاہ کی طاقت ختم ہوگئی، جیسا کہ فارسی زبان میں بھی کہا جاتا ہے: ''پایه هاى تخت او درهم شكست'' [یعنی اس کی حکومت کی چولیں ہل گئیں]

''عرش'' کے ایک معنی ''عالم ہستی کا مجموعہ'' ہے، کیونکہ دنیا کی تمام چیزیں اس کی عظمت و بزرگی کی نشانی ہیں، اور کبھی ''عرش'' سے ''آسمان'' اور ''کرسی'' سے ''زمین'' کو مراد لیا جاتا ہے۔

---

(۱)سورۂ توبہ آیت ۱۲۹ (۲)سورۂ زمر آیت ۷۵

اور کبھی ''عرش'' سے ''عالم ماوراء طبیعت'' اور کرسی سے عالم مادہ (چاہے وہ زمین ہو یا آسمان) مراد لیا جاتا ہے جیسا کہ آیۃ الکرسی میں بیان ہوا ہے۔﴿وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ﴾

اور چونکہ خداوند عالم کی مخلوقات اوراس کی معلومات اس کی ذات سے جدا نہیں ہیں لہٰذا کبھی کبھی ''عرش'' سے ''علم خدا'' مراد لیا جاتا ہے۔

اور اگر پاک اور مومن بندوں کے دلوں کو ''عرش الرحمن'' کہا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مومنین کے قلوب خداوند عالم کی ذات پاک کی معرفت کی جگہ اوراس کی عظمت اور قدرت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔

لہٰذا ہر جگہ پر استعمال ہونے والے لفظ ''عرش'' کو اس جگہ موجود قرائن سے سمجھا جاسکتا ہے کہ اس جگہ ''عرش'' سے کون سے معنی مراد ہیں، لیکن یہ تمام معانی اس حقیقت کو بیان کرتے ہیں کہ ''عرش'' خدا کی عظمت وبزرگی کی نشانی ہے۔

محل بحث آیہ شریفہ (جس میں حاملان عرش الٰہی کی گفتگو ہے) میں ممکن ہے کہ اس سے وہی حکومت خدااور عالم ہستی میں اس کی تدبیر مراد ہو، اور حاملان عرش سے مراد خداوند عالم کی حاکمیت اوراس کی تدبیر کو نافذ کرنے والے مراد ہوں۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ تمام کائنات، یا عالم ماوراء طبیعت کے معنی میں ہو، اور حاملان عرش سے مراد وہ فرشتے ہوں جو حکم خدا سے اس کائنات کی تدبیر کے ستون اپنے شانوں پر اٹھائے ہوئے ہوں ـ(۱)

---

(۱) تفسیر نمونہ، ج۲۰، صفحہ ۳۵

۱۲۔ عالم ذرّ کا عہد و پیمان کیا ہے؟

جیسا کہ ہم سورہ اعراف آیت نمبر ۱۷۲ میں پڑھتے ہیں:

﴿وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِن بَنِي آدَمَ مِن ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَىٰ شَهِدْنَا أَن تَقُولُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَٰذَا غَافِلِينَ﴾

"اور جب تمہارے پروردگار نے اولاد آدم کی پشتوں سے ان کی ذریت کو لے کر انھیں خود ان کے اوپر گواہ بنا کر سوال کیا کہ کیا میں تمہارا خدا نہیں ہوں؟ تو سب نے کہا بے شک ہم اس کے گواہ ہیں یہ عہد اس لئے لیا کہ روز قیامت یہ نہ کہہ سکیں کہ ہم اس عہد سے غافل تھے"۔

اس آیت میں بنی آدم کے عہد و پیمان کو مجمل طور سے بیان کیا گیا ہے، لیکن یہ عہد و پیمان کیا تھا؟ [یہ سوال ذہن میں آتا ہے۔]

اس عالم اور اس عہد و پیمان سے مراد وہی "عالم استعداد"، "پیمان فطرت" اور تکوین و آفرینش ہے، وہ بھی اس طرح سے کہ جب انسان "نطفہ" کی صورت میں صلب پدر سے رحم مادر میں منتقل ہوتا ہے جس وقت انسان کی حقیقت ذرات سے زیادہ نہیں ہوتی، اس وقت خداوند عالم حقیقت توحید کو قبول کرنے کی استعداد اور آمادگی عنایت فرماتا ہے، لہٰذا انسان کی فطرت اور اس کی ذات میں

یہ الٰہی راز ایک حس باطنی کی صورت میں ودیعت ہوتا ہے، نیز انسان کی عقل میں ایک حقیقت کی شکل میں قرار دیا جاتا ہے!۔

اس بنا پر تمام انسانوں کے یہاں روح توحید پائی جاتی ہے، اور خداوند عالم نے انسان سے زبان تکوین و آفرینش میں سوال کیا ہے اور اس کا جواب بھی اسی زبان میں ہے۔

اس طرح کی تعبیریں ہمارے روزمرہ کی گفتگو میں ہوتی ہے جیسے کہ ہم کہتے ہیں کہ انسان کے چہرہ کے رنگ سے اس کے اندرونی حالات کا پتہ لگ جاتا ہے، یا انسان کی سرخ آنکھوں کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ شخص رات میں نہیں سویا ہے۔

ایک عرب ادیب اور خطیب سے نقل ہوا ہے:

"سَلْ الأرضَ مَن شَقّ أنهارکِ وغرسَ أشجارکِ وأینعَ ثِمارکِ فإنْ لَم تُجِبکَ حواراً إجابتکَ إعتباراً"

"اس زمین سے سوال کرو کہ تیرے اندر یہ نہریں کس نے جاری کی ہیں اور کس نے یہ درخت اگائے ہیں اور کس نے پھلوں میں رس گھولا ہے؟ تو اگر وہ سادہ زبان میں جواب نہ دے تو پھر زبان حال سے گویا ہوگی"۔

اسی طرح قرآن مجید میں بھی بعض مقامات پر زبان حال سے گفتگو کا بیان ہوا ہے

﴿فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ﴾(۱)

"اور اسے اور زمین کو حکم دیا کہ بخوشی یا بکراہت ہماری طرف آؤ تو دونوں نے عرض کی کہ ہم اطاعت گزار بن کر حاضر ہیں"۔(۲)

---

(۱)سورہ فصلت، آیت ۱۱

(۲)تفسیر صوت، جلد ۷، صفحہ ۶۔

۱۳۔ خداوند عالم کی طرف سے ہدایت و گمراہی کے کیا معنی ہیں؟

لغت میں ہدایت کے معنی دلالت اور رہنمائی کے ہیں(۱) اور اس کی دو قسمیں ہیں

)''ارائۃ الطریق'' [راستہ دکھانا] ۲) ''ایصال الیٰ المطلوب'' [منزل مقصود تک پہنچانا] دوسرے الفاظ میں یوں کہئے ''تشریعی اور تکوینی ہدایت''۔(۲)

وضاحت: کبھی انسان راستہ معلوم کرنے والے کو اپنی تمام وقت اور لطف و کرم کے ساتھ راستہ کا پتہ بتاتا ہے، لیکن راستہ طے کرنا اور منزل مقصود تک پہنچنا خود اس انسان کا کام ہوتا، اور کبھی انسان راستہ معلوم کرنے والے کا ہاتھ پکڑتا ہے اور راستہ کی رہنمائی کے ساتھ ساتھ اس کو منزل مقصود تک پہنچا دیتا ہے، دوسرے الفاظ میں یوں کہیں کہ انسان پہلے مرحلہ میں صرف قوانین بیان کرتا ہے، اور منزل مقصود تک پہنچنے کے شرائط بیان کردیتا ہے، لیکن دوسرے مرحلہ میں ان چیزوں کے علاوہ سامان سفر بھی فراہم کرتا ہے اور اس میں پیش آنے والی رکاوٹوں کو بھی برطرف کردیتا ہے، نیز اس کے مشکلات کو دور کرتا ہے اور اس راہ پر چلنے والوں کے ساتھ ساتھ ان کو منزل مقصود تک پہنچنے میں حفاظت بھی کرتا ہے۔

---

(۱) مفردات راغب، مادہ ''ھدی''

(۲) یہاں پر تکوینی ہدایت وسیع معنی میں استعمال ہوئی ہے، جس میں بیان قوانین اور ارائے طریق کے علاوہ ہر طرح کی ہدایت شامل

اس کے مقابلہ میں ''ضلالت اور گمراہی'' ہے۔

اگر انسان قرآن مجید کی آیت پر ایک اجمالی نظر ڈالے تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ قرآن کریم نے ہدایت اور گمراہی کو فعل خدا شمار کیا ہے، اور دونوں کی نسبت اسی کی طرف دی گئی ہے، گر ہم اس سلسلہ کی تمام آیات کو یکجا کریں تو بحث طولانی ہوجائے گی، صرف اتنا ہی کافی ہے، چنانچہ ہم سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۱۳ میں پڑھتے ہیں:

﴿وَاللهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ﴾

''اور خدا جس کو چاہتا ہے صراط مستقیم کی ہدایت دے دیتا ہے''۔

سورہ نحل کی آیت نمبر ۹۳ میں ارشاد ہوتا ہے۔

﴿وَلَكِنْ يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ﴾

''خدا جسے چاہتا ہے گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے منزل ہدایت تک پہنچا دیتا ہے''۔

ہدایت و گمراہی کے حوالہ سے قرآن مجید میں بہت سی آیات موجود ہیں (۱)

بلکہ اس کے علاوہ بعض آیات میں واضح طور پر پیغمبر اکرم ﷺ سے ہدایت کی نفی کی گئی ہے اور خدا کی طرف نسبت دی ہے، جیسا کہ سورہ قصص آیت نمبر ۵۶ میں بیان ہوا ہے۔

﴿إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَكِنَّ اللهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ﴾

''[اے میرے پیغمبر!] آپ جسے چاہیں اسے ہدایت نہیں دے سکتے بلکہ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے''۔

---

(۱) نمونہ کے طور پر سورہ فاطر، آیت ۸، سورہ زمر، آیت ۲۳، سورہ مدثر، آیت ۳۱، سورہ بقرہ، آیت ۲۷۲، سورہ انعام، آیت ۸۸، سورہ یونس، آیت ۲۵، سورہ رعد، آیت ۲۷، سورہ ابراہیم، آیت ۴۔

سورہ بقرہ آیت نمبر ۲۷۲ میں بیان ہوا ہے:

﴿لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَلَكِنَّ اللهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ﴾

''اے پیغمبر ان کے ہدایت پانے کی ذمہ داری آپ پر نہیں ہے، بلکہ خدا جس کو چاہتا ہے ہدایت دے دیتا ہے''۔

ان آیات کے عمیق معنی کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بعض افراد ان کے ظاہری معنی پر تکیہ کرتے ہوئے ان آیات کی تفسیر میں ایسے ''گمراہ'' اور راہ ''ہدایت'' سے بھٹکے کہ ''جبریہ'' فرقہ کی آتش عقائد میں جا گرے اور یہی نہیں بلکہ بعض مشہور مفسرین بھی اس آفت سے نہ بچ سکے، اور اس فرقہ کی خطرناک وادی میں پھنس گئے ہیں، یہاں تک کہ ہدایت و گمراہی کے تمام مراحل کو ''جبری'' طریقہ پر مان بیٹھے، اور تعجب کی بات یہ ہے کہ جیسے ہی انھوں نے اس عقیدہ کو خدا کی عدالت و حکمت کے منافی دیکھا تو خدا کی عدالت ہی کے منکر ہو گئے، تاکہ اپنی کی ہوئی غلطی کی اصلاح کر سکیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم ''جبر'' کے عقیدہ کو مان لیں تو پھر تکالیف و فرائض اور بعثت انبیاء، اور آسمانی کتابوں کے نزول کا کوئی مفہوم ہی نہیں بچتا۔

لیکن جو افراد نظریۂ ''اختیار'' کے طرفدار ہیں، وہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ کوئی بھی عقل سلیم اس بات کو قبول نہیں کر سکتی کہ خداوند عالم کسی کو گمراہی کا راستہ طے کرنے پر مجبور [بھی] کرے اور پھر اس پر عذاب بھی کرے، یا بعض لوگوں کو ''ہدایت'' کے لئے مجبور کرے اور پھر بلا وجہ ان کو اس کام کی جزا اور ثواب بھی دے، اور ان کو ایسے کام کی وجہ سے دوسروں پر فوقیت دے جو انھوں نے انجام نہیں دیا ہے۔

لہٰذا انھوں نے ان آیات کی تفسیر کے لئے ایک دوسرا راستہ اختیار کیا ہے اور اس سلسلہ میں بہت ہی دقیق تفسیر کی ہے جو ہدایت و گمراہی کے سلسلے میں بیان ہونے والی تمام آیات سے ہم آہنگ ہے اور بغیر کسی ظاہری خلاف کے بہترین طریقہ سے ان تمام آیات کی تفسیر کرتی ہے، اور وہ تفسیر یہ ہے

"تشریعی ہدایت" یعنی عام طور سے سبھی کو راستہ دکھا دیا گیا ہے اس میں کسی طرح کی کوئی قید وشرط نہیں ہے، جیسا کہ سورہ دہر آیت نمبر ۳ میں وارد ہوا ہے:

﴿إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا﴾

"یقیناً ہم نے اس [انسان] کو راستہ کی ہدایت دیدی ہے چاہے وہ شکر گزار ہو جائے یا کفران نعمت کرنے والا ہو جائے"۔

اسی طرح سورہ شوریٰ کی آیت نمبر ۵۲ میں پڑھتے ہیں۔

﴿وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ﴾

"اور بے شک آپ لوگوں کو سیدھے راستہ کی ہدایت کررہے ہیں"۔

ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت حق خدا وند عام کی طرف سے ہے کیونکہ انبیاء کے پاس جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔

بعض منحرف اور مشرکین کے بارے میں سورہ نجم آیت نمبر ۲۳ میں بیان ہوا ہے۔

﴿وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مِنْ رَبِّهِمُ الْهُدَى﴾

"اور یقیناً ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آچکی ہے"۔

لیکن "تکوینی ہدایت" یعنی منزل مقصود تک پہنچانا، راستہ کی تمام رکاوٹوں کو دور کرنا اور ساحل نجات پر پہنچنے تک ہر طرح کی حمایت وحفاظت کرنا، جیسا کہ قرآن مجید کی بہت سی آیات میں بیان ہوا ہے، یہ موضوع بدون قید وشرط نہیں ہے، اور یہ ہدایت ایک ایسے خاص گروہ سے مخصوص ہے جس کے صفات خود قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں، اور اس کے مدمقابل "ضلالت وگمراہی" ہے وہ بھی خاص گروہ سے مخصوص ہے جس کے صفات بھی قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں۔

اگرچہ بہت سی آیات مطلق ہیں لیکن دوسری بہت سی آیات میں وہ شرائط واضح طور پر بیان ہوئے ہیں، اور جب ہم ان "مطلق" اور "مقید" آیات کو ایک دوسرے کے برابر رکھتے ہیں تو مطلب

بالکل واضح ہوجاتا ہے اور آیات کے معنی وتفسیر میں کسی طرح کے شک وتردید کی گنجائش باقی نہیں رہتی، اور نہ صرف یہ کہ انسان کے اختیار، آزادی اور ارادہ کے مخالف نہیں ہے بلکہ مکمل اور دقیق طور پر ان کی تاکید کرتی ہے۔

[قارئین کرام!] یہاں درج ذیل وضاحت ملاحظہ فرمائیں:

قرآن مجید میں ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلاَّ الْفَاسِقِينَ﴾(۱)

"خدا اسی طرح بہت سے لوگوں کو گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے اور بہت سوں کو ہدایت دے دیتا ہے اور گمراہی صرف انھیں کا حصہ ہے جو فاسق ہیں"۔

یہاں پر ضلالت وگمراہی کا سرچشمہ، فسق وفجور اور فرمان الٰہی کی مخالفت بیان کی گئی ہے۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَاللهُ لاَيَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ﴾ (۲)

"اور اللہ ظالموں کی ہدایت نہیں کرتا"۔

اس آیت میں ظلم پر توجہ دی گئی ہے اور اس کو ضلالت وگمراہی کا راستہ ہموار کرنے والا بتایا گیا ہے۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

﴿وَاللهُ لاَيَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ﴾ (۳)

"اور اللہ کافروں کی ہدایت بھی نہیں کرتا"۔

---

(۱)سورہ بقرہ، آیت ۲۶.
(۲)سورہ بقرہ، آیت ۲۵۸.
(۳)سورہ بقرہ، آیت ۲۶۴

یہاں پر کفر کو گمراہی کا سبب قرار دیا گیا ہے۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ كَاذِبٌ كَفَّارٌ﴾ (۱)

"اللہ کسی بھی جھوٹے اور ناشکری کرنے والے کو ہدایت نہیں دیتا ہے"۔

اس آیت میں جھوٹ اور کفر کو ضلالت و گمراہی کا پیش خیمہ شمار کیا گیا ہے۔

نیز ارشاد ہوتا ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ﴾ (۲)

"بیشک اللہ کسی زیادتی کرنے والے اور جھوٹے کی رہنمائی نہیں کرتا ہے"۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ فضول خرچی اور جھوٹ گمراہی کا باعث ہے۔

[قارئین کرام!] ہم نے یہاں تک اس سلسلہ میں بیان ہونے والی چند آیات کو بیان کیا ہے، اسی طرح دوسری آیت قرآن مجید کے مختلف سوروں میں بیان ہوئی ہیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن مجید نے خدا کی طرف سے ضلالت و گمراہی انھیں لوگوں کے لئے مخصوص کی ہے جن میں یہ صفات پائے جاتے ہوں، "کفر"، "ظلم"، "فسق"، "جھوٹ"، "فضول خرچی" اور "کفران نعمت"۔

کیا جن لوگوں میں یہ صفات پائے جاتے ہیں وہ ضلالت و گمراہی کے سزاوار نہیں ہیں؟!

بالفاظ دیگر: جو لوگ ان برائیوں کے مرتکب ہوتے ہیں کیا ان کے دلوں پر ظلمت و تاریکی اثر نہیں کرتی؟!

---

(۱) سورہ زمر، آیت ۳

(۲) سورہ غافر، آیت ۲۸

صاف وشفاف الفاظ میں یوں کہیں کہ اس طرح کے اعمال اور صفات کچھ خاص اثر رکھتے ہیں جو آخر کار انسان میں موثر ہوتے ہیں، اور اس کی عقل، آنکھ اور کان پر پردہ ڈال دیتے ہیں، اس کو ضلالت وگمراہی کی طرف کھینچتے ہیں، اور چونکہ تمام چیزوں کی خاصیت اور تمام اسباب کے اثرات خدا کے حکم سے ہیں لہٰذا ضلالت وگمراہی کو ان تمام موارد میں خدا کی طرف نسبت دی جا سکتی ہے، لیکن یہ نسبت خود انسان کے ارادہ واختیار کی وجہ سے ہے۔

یہ سب کچھ ضلالت وگمراہی کے سلسلہ میں تھا، اُدھر "ہدایت" کے سلسلہ میں بھی قرآن کریم نے کچھ شرائط اور اوصاف بیان کئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بھی بغیر کسی علت اور حکمت الٰہی کے خلاف نہیں ہے۔

بعض وہ صفت جن کی وجہ سے انسان ہدایت اور لطف الٰہی کا مستحق ہوتا ہے' درج ذیل آیات میں بیان ہوئی ہیں:

﴿يَهْدِي بِهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِ وَيَهْدِيهِمْ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ﴾(۱)

"جس کے ذریعہ خدا اپنی خوشنودی کا اتباع کرنے والوں کو سلامتی کے راستوں کی ہدایت کرتا ہے اور انھیں تاریکیوں سے نکال کر اپنے حکم سے نور کی طرف لے آتا ہے اور انھیں صراط مستقیم کی ہدایت کرتا ہے"۔

آیہ مبارکہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حکم خدا کی پیروی اور اس کی رضا حاصل کرنے سے ہدایت کا راستہ ہموار ہو جاتا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

---

(۱)سورہ مائدہ آیت ۱۶

﴿إِنَّ اللهَ يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ أَنَابَ﴾ (۱)

''بیشک اللہ جس کو چاہتا ہے گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے اور جو اس کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں انھیں ہدایت دیتا ہے''۔

یہاں ''توبہ اور استغفار کرنے والے'' کو ہدایت کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔

ایک دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ (۲)

''اور جن لوگوں نے ہمارے حق میں جہاد کیا ہے ہم انھیں اپنے راستوں کی ہدایت کریں گے''۔

اس آیت میں ''راہ خدا میں مخلصانہ جہاد'' کو ہدایت کے لئے اصلی شرط کے عنوان سے ذکر کیا ہے۔

نیز ایک دوسری آیت میں ارشاد ہے:

﴿وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى﴾(۳)

''اور جن لوگوں نے ہدایت حاصل کر لی خدا نے ان کی ہدایت میں اضافہ کر دیا اور ان کو مزید تقویٰ عنایت فرمایا''۔

اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر انسان راہ ہدایت کی طرف قدم بڑھائے تو خداوند عالم اس کو مزید راستہ طے کرنے کی طاقت عطا فرما دیتا ہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ جب تک بندوں کی طرف سے توبہ و استغفار نہ ہو اور خدا کے حکم کی پیروی نہ

---

(۱) سورۂ رعد، آیت ۲۷۔ (۲) سورۂ عنکبوت، آیت ۶۹

(۳) سورۂ محمد، آیت ۱۷

ہو، نیز جب تک خدا کی راہ میں جہاد اور کوشش نہ ہو، اور جب تک خدا کی راہ میں قدم نہ بڑھائے جائیں تو لطف الٰہی ان کے شامل حال نہیں ہوگا، اور ان کی مدد نہیں ہوگی، نیز وہ منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔

جن لوگوں میں یہ صفات موجود ہوں کیا ان کے لئے ہدایت یافتہ ہونا بے حساب وکتاب ہے؟! اور کیا انھیں ہدایت کے لئے مجبور کیا گیا ہے؟!

[قارئین کرام!] آپ حضرات ملاحظہ فرما رہے ہیں کہ اس سلسلہ میں قرآن مجید کی آیت بہت واضح ہیں، لیکن جن لوگوں نے ہدایت وگمراہی کے سلسلہ میں بیان ہونے والی آیات کو صحیح طریقہ سے نہیں سمجھا، یا سمجھنے کی کوشش نہیں کی تو ایسے ہی لوگ اس خطرناک غلطی کا شکار ہوئے ہیں اور بقول شاعر ''چوں ندیدند حقیقت، رہ افسانہ زدند'' [اور جب انھوں نے حقیقت کو نہ پایا تو افسانہ گڑھ لیا] ان کے لئے یہی کہا جائے کہ ان لوگوں نے ''ضلالت وگمراہی'' کا راستہ خود ہی ہموار کیا ہے!

بہر حال ہدایت وضلالت کا مسئلہ حکمت ومشیت سے خالی نہیں ہے، بلکہ ہر موقع پر خاص شرائط ہوتے ہیں جو خدا کے حکیم ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔(۱)

(۱) تفسیر نمونہ، جلد ۹، صفحہ ۳۱۴.

۱۴۔ کس طرح کائنات کی ہر شئی خدا کی تسبیح کرتی ہے؟

قرآن مجید کی مختلف آیت میں بیان ہوا ہے کہ اس کائنات کی تمام موجودات خدا کی تسبیح کرتی ہیں، ان میں سب سے زیادہ واضح آیت سورہ اسراء [بنی اسرائیل] آیت نمبر ۴۴ ہے کہ جہاں ارشاد ہوتا ہے

﴿وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَكِنْ لَا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ﴾

"اور کوئی شئی ایسی نہیں ہے جو اس کی تسبیح نہ کرتی ہو یہ اور بات ہے کہ تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے"۔

اس آیت کی بنا پر کائنات کی تمام موجوات بغیر کسی استثنا کے خداوند عالم کی اس عام تسبیح میں شامل ہیں۔

اس حمد و تسبیح کی حقیقت کی تفسیر کے بارے میں علما و فلاسفہ کے درمیان بہت زیدہ بحث و گفتگو ہے۔

بعض افراد نے اس حمد و تسبیح کو "حالی" [یعنی زبان حال] مانا ہے، جبکہ بعض دوسرے افراد نے اس سے "قولی" تسبیح مراد لی ہے، ہم یہاں پر ان تمام نظریات کا خلاصہ اور اپنا نظریہ بیان کرتے ہیں:

۱۔ بعض گروہ کا کہنا یہ ہے کہ اس کائنات کے تمام ذرات چاہے وہ جاندار اور عاقل ہوں یا

بے جان اور غیر عاقل، سب کی سب ایک طرح کا شعور اور ادراک رکھتی ہیں، اور یہ سب چیزیں خداوند عالم کی حمد و تسبیح کرتی ہیں، اگر چہ ہم ان کی حمد و تسبیح کو سمجھ نہیں پاتے، اور نہ ہی سن پاتے ہیں۔

قرآن مجید کی بہت سی آیات اس عقیدہ پر شاہد اور گواہ ہیں، نمونہ کے طور پر:

﴿وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ﴾(۱)

"اور بعض خوف خدا سے گر پڑتے ہیں"۔

﴿فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ﴾(۲)

"اور اسے اور زمین کو حکم دیا کہ بخوشی یا بکراہت ہماری طرف آؤ تو دونوں نے عرض کی کہ ہم اطاعت گزار بن کر حاضر ہیں"۔

۲۔ بہت سے افراد کا عقیدہ ہے کہ یہ حمد و تسبیح وہی ہے جس کو ہم "زبان حال" کہتے ہیں، اور یہ حمد و تسبیح حقیقی طور پر ہے، مجازی طور پر نہیں، لیکن زبان حال سے ہے نہ کہ زبان قال سے۔ (غور کیجئے)

وضاحت: بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان کے چہرے پر پریشانی اور ناراحتی یا درد و غم کے آثار پائے جاتے ہیں یا اس کی آنکھوں سے بیداری کے آثار واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں، چنانچہ ایسے موقع پر کہا جاتا ہے: اگر چہ تم اپنی زبان سے پریشانی اور مشکل نہیں بتا رہے ہو، لیکن تمہارے چہرے سے پریشانی کے آثار دکھائی دے رہے ہیں، یا کہتے ہیں کہ تمہیں رات میں نیند نہیں آئی ہے!!

کبھی کبھی یہ "زبان حال" اس قدر واضح اور روشن ہوتی ہے کہ "زبان قال" کو موثر بنا دیتی ہے، اور زبان قال کو جھٹلا دیتی ہے، جیسے کہ ایک شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

(۱) سورہ بقرہ، آیت ۷۴۔ (۲) سورہ فصلت، آیت ۱۱

گفتم که با مکر و فسون پنهان کنم راز درون!

پنهان نمی گردد که خون از دیدگانم می رود!

''میں نے کہا کہ مکر وفریب سے اپنے اندرونی راز کو چھپالوں لیکن خون کبھی چھپائے سے نہیں چھپتا، اور میری آنکھوں سے خون برستا دکھائی دیتا ہے''۔

اسی چیز کی طرف حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام نے اپنے مشہور ومعروف قول میں اشارہ فرمایا ہے:

''مَا اَضمَرَ أحد شیئاً اِلاَّ ظَهر فی فلتاتِ لسانِهِ وَصفحاتِ وَجهه''(۱)

''کوئی بھی راز دل میں چھپائے سے چھپ نہیں سکتا، اور ایک نہ ایک دن اس کی زبان یا چہرے پر ظاہر ہو ہی جاتا ہے''۔

دوسری طرف کیا یہ ممکن ہے کہ ایک بہترین مصور کی بنائی ہوئی تصویر اس کی مہارت اور ذوق کی گواہی نہ دے اور اس کی مدح وثنا نہ کرے؟

کیا اس بات سے انکار کیا جاسکتا ہے کہ ایک مشہور ومعروف شاعر کا کلام اس کے بہترین ذوق کی عکاسی نہ کرے اور ہمیشہ اس کی مدح وثنا نہ کرے؟

کیا اس بات کا منکر ہوا جا سکتا ہے کہ ایک عظیم الشان عمارت اور بڑے بڑے کارخانے وغیرہ اپنی بے زبانی سے اپنے بنانے والے کے خلاق ذہن اور ایجادات کرنے والے ذہن کی تعریف نہ کریں اور ان کی ذہنیت کی قصیدہ خوانی نہ کریں؟

لہٰذا ہم کو یہ بات مان لینا چاہئے کہ کائنات کا یہ عجیب وغریب نظام اور چکا چوند کر دینے والی چیزیں خداوند عالم کی ''حمد وتسبیح'' کرتی ہیں۔

---

(۱) نہج البلاغہ کلمات قصار نمبر ۲۶

کیا ''تسبیح'' پاک و پاکیزہ ماننے کے علاوہ کسی اور چیز کا نام ہے، اس کائنات کا نظام اپنے پورے وجود کے ساتھ یہ اعلان کررہا ہے کہ اس کا خالق ہر طرح کے نقص وعیب سے پاک و پاکیزہ ہے۔

کیا ''حمد'' صفاتِ کمال بیان کرنے کے علاوہ کسی اور چیز کو کہتے ہیں؟ یہ کائنات کا نظام خداوند عالم کی صفات کمال (بے کراں علم وقدرت، اور مکمل حکمت) کی گفتگو نہیں کررہا ہے۔

[قارئین کرام!] ''حمد وتسبیح'' کے یہ معنی تمام موجوات کے لئے قابل فہم ہیں اور اس بات کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ ہم تمام مخلوقات کے ذروں کو صاحب عقل وشعور فرض کریں، کیونکہ کوئی قطعی دلیل ان کے بارے میں موجود نہیں ہے، اور مذکورہ آیات بھی قوی احتمال کی بناپر ''زبان حال'' کو بیان کرتی ہیں۔

لیکن یہاں پر یک سوال باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ اگر خداوند عالم کی ''حمد وتسبیح'' سے مراد نظام کائنات کا خدا کی عظمت اور اس کی پاکیزگی وعظمت کی حکایت کرتا ہے اور ''صفات سلبیہ'' و ''صفات ثبوتیہ'' اس کی وضاحت کرتی ہیں، تو پھر قرآن مجید میں کیوں ارشاد ہوا ہے کہ تم ان کی حمد وتسبیح کو نہیں سمجھتے؟

اگر بعض عوام انساس نہیں سمجھ سکتے تو کم سے کم دانشوروں کو تو سمجھنا چاہئے؟

اس سوال کے دو جواب دئے جاسکتے ہیں:

پہلا جواب: یہ ہے کہ قرآن مجید میں خطاب اکثر جاہلوں خصوصاً مشرکین سے ہے اور مومن دانشوروں کی اقلیت اس عموم سے مستثنیٰ ہے کیونکہ ہر عام کے لئے ایک استثنا ہوتا ہے۔

دوسرا جواب: یہ ہے کہ اس کائنات کے جن اسرار کو ہم جانتے ہیں وہ نامعلوم اسرار کے مقابل سمندر کے مقابل ایک قطرہ یا پہاڑ کے مقابلہ میں ایک ذرہ کی حیثیت رکھتے ہیں کہ اگر صحیح غور وفکر کریں تو اس کو کسی علم ودانش کا نام تک نہیں دیا جاسکتا۔

تا بدانجا رسید دانش من   که بدانستمی که نادانم

''میری عقل آخر میں اس بات کو سمجھ پائی ہے کہ میں نادان اور جاہل ہوں''

لہٰذا حقیقت تو یہ ہے کہ اگر چہ ہم کتنے ہی بڑے عالم کیوں نہ ہوں اس کائنات کے ذروں کو نہیں سمجھ سکتے، کیونکہ جو کچھ ہم سنتے ہیں وہ کسی بڑی کتاب کا ایک لفظ ہے، اس بنا پر تمام عوام الناس کے لئے یہ اعلان عام کیا جاسکتا ہے کہ تم اس کائنات کی موجودات کی حمد و تسبیح کو نہیں سمجھ سکتے کیونکہ وہ زبان حال سے خداوند عالم کی حمد و تسبیح کرتے ہیں اور جو چیزیں ہم سمجھتے ہیں وہ اس قدر کم اور ناچیز ہیں کہ ان کا کوئی شمار ہی نہیں ہے۔

۳۔ بعض مفسرین نے یہ بھی احتمال دیا ہے کہ اس کائنات کی موجودات کی حمد و تسبیح زبان ''حال'' اور زبان ''قال'' دونوں سے مرکب ہے یا دوسرے الفاظ میں ''تکوینی اور تشریعی تسبیح'' ہے، کیونکہ بہت سے انسان اور تمام ملائکہ اپنی عقل و شعور کے لحاظ سے خداوند عالم کی حمد و تسبیح کرتے ہیں لیکن اس کائنات کے تمام ذرے اپنی زبان بے زبانی سے خداوند عالم کی عظمت و کبریائی کی گواہی دے رہے ہیں۔

اگر چہ ''حمد و تسبیح'' کے دونوں معنی آپس میں مختلف ہیں لیکن ''ایک مشترک پہلو بھی رکھتے ہیں'' یعنی حمد و تسبیح کے عام اور وسیع معنی [یعنی اعلان پاکیزگی اور مدح وثنا] میں مشترک ہیں۔

لیکن جیسا کہ ظاہر ہے کہ مذکورہ دوسری تفسیر سب سے بہتر ہے۔(۱)

(۱)تفسیر نمونہ، جلد ۱۲، صفحہ ۱۳۴۔

۱۵۔ کیا خداوند عالم کسی چیز میں حلول کرسکتا ہے؟

بعض عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ خداوند عالم "عیسی مسیح" میں حلول کئے ہوئے ہے، اور بعض صوفی لوگ بھی اپنے پیر و مرشد کے بارے میں یہی نظریہ رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خداوند عالم ان میں حلول کئے ہوئے ہے۔

کتاب "کشف المراد" میں علامہ حلی علیہ الرحمہ کے قول کے مطابق اس عقیدہ کے باطل و بے بنیاد ہونے میں ذرہ برابر بھی شک و شبہ نہیں ہے، کیونکہ حلول سے جو چیز تصور کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ یک موجود دوسرے موجود کے ذریعہ قائم ہو، (مثال کے طور پر کہا جائے کہ گلاب کے پھول میں خوشبو حلول کئے ہوئے ہے)، مسلم طور پر خداوند عالم کے سلسلہ میں یہ معنی قابل تصور نہیں ہیں، کیونکہ اس کا لازمہ مکان، نیاز اور ضرورت ہے جو "واجب الوجود" کے لئے "غیر ممکن" ہے، اور جو لوگ خداوند عالم کے حلول کے معتقد ہیں آخرکار وہ شرک میں گرفتار ہوکر دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتے ہیں۔

تصوّف اور اتحاد و حلول کا مسئلہ

مرحوم علامہ حلی علیہ الرحمہ اپنی کتاب "نہج الحق" میں فرماتے ہیں کہ کسی دوسری چیز میں خداوند عالم کا اس طرح سے حلول کرنا کہ دونوں شئی ایک چیز بن جائیں، یہ عقیدہ باطل ہے، اور اس کا باطل و بے بنیاد ہونا بالکل واضح ہے، اس کے بعد فرماتے ہیں: "اہل سنت کے صوفیہ فرقہ نے اس

سلسلہ میں قرآن وحدیث کی مخالفت کی ہے، اور کہتے ہیں کہ خداوند عالم، عرفاء کے بدن میں حلول کرجاتا ہے!! یہاں تک کہ ان میں سے بعض لوگ کہتے ہیں خداوندعالم عین موجودات ہے، اور ہر موجود خدا ہے، (وحدت مصداقی وجود کے مسئلہ کی طرف اشارہ ہے)، اس کے بعد علامہ موصوف فرماتے ہیں: 'یہ عقیدہ عین کفر وزندیقیت ہے، خدا کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں اہل بیت علیہم اسلام کی برکت سے اس باطل عقیدہ سے دور رکھا ہے''۔

علامہ موصوف ''حلول'' کی بحث میں فرماتے ہیں: ''یہ ایک مسلّم مسئلہ ہے کہ اگر کوئی چیز کسی چیز میں حلول کرنا چاہے تو اس کو''محل'' کی ضرورت ہوتی ہے اور چونکہ خداوند عالم واجب الوجود ہے اور اسے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے، لہٰذا اس کا کسی چیز میں حلول کرنا غیر ممکن ہے'' اس کے بعد فرماتے ہیں: ''اہل سنت کے صوفیہ فرقہ نے اس مسئلہ میں مخالفت کی ہے، اور خداوندعالم کے حلول کو، عرفاء کے بدن میں ممکن شمار کرتے ہیں'' اس کے بعد علامہ موصوف ان لوگوں کی بہت زیادہ مذمت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ہم نے خود صوفیہ کے ایک گروہ کو حضرت امام حسین علیہ السلام کے روضہ مبارک میں دیکھا ہے کہ ایک شخص کے علاوہ سب نے نماز مغرب پڑھی، اس کے بعد سبھی نے نماز عشاء پڑھی سوائے اسی ایک شخص کے، چنانچہ وہ یونہی بیٹھا رہا!!

ہم نے سوال کیا کہ اس نے نماز کیوں نہیں پڑھی؟ تو جواب دیا کہ اس کو نماز کی کیا ضرورت ہے؟ وہ تو خدا سے پیوستہ ہے! کیا یہ بات جائز ہے کہ خدا اور اس کے درمیان کوئی چیز پردہ بن جائے، نماز ان کے اور خدا کے درمیان ایک پردہ ہے!(۱)

یہی معنی ''مثنوی'' کی پانچویں جلد میں ایک دوسری طرح پیش کئے گئے ہیں: جب تم منزل مقصود پر پہنچ جاؤ تو وہی حقیقت ہے، اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے۔

---

(۱) نہج الحق، ص۵۸، ۵۹۔

"لَو ظَهرتْ الحقائقُ بَطَلَتِ الشَّرائعُ"

"جب حقائق ظاہر ہوجاتے ہیں تو شریعتیں باطل ہوجاتی ہیں"۔

اس کے بعد شریعت کو علم کیمیا سے مشابہ قرار دیا ہے (جس علم کے ذریعہ تانبا کو سونے میں تبدیل کیا جاتا ہے) اور کہا ہے: جو چیز اصل میں ہی سونا ہے، یا سونا بن چکا ہے تو اسے علم کیمیا کی کیا ضرورت ہے؟! جیسا کہ کہتے ہیں "طَلَبُ الدَّلیلِ بعدَ الوُصُولِ إلیٰ المدلولِ قبیحٌ!" (۱)

"منزل مقصود تک پہنچنے کے بعد دلیل طلب کرنا قبیح اور برا ہے"۔

کتاب "دلائل الصدق" شرح "نہج الحق" میں بھی "صاحب مواقف" سے نقل کیا گیا ہے کہ نفی "حلول" اور "اتحاد" کے سلسلہ میں مخالفوں کے تین گروپ ہیں، اس کے بعد دوسرے گروہ کے بعض صوفیوں کا نام لیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کی باتیں حلول واتحاد کے بارے میں مردود ہیں، (حلول سے مراد خداوندعالم کا کسی چیز میں نفوذ کرنا ہے، اور اتحاد و وحدت سے مراد خدا اور دوسری چیزوں کا ایک ہوجانا ہے)

اس کے بعد موصوف مزید فرماتے ہیں: ہم نے بعض "صوفیہ وجودیہ" کو دیکھا ہے جو حلول واتحاد کا انکار کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہ دونوں الفاظ خدا اور مخلوق میں مغایرت (جدائی) کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور ہم اس چیز کے قائل نہیں ہیں! بلکہ ہمارا کہنا یہ ہے۔

"لیسَ فِی دارِ الوجودِ غیرهُ دیّار"، (وجود کی وادی میں اس کے علاوہ کوئی چیز موجود ہی نہیں ہے"!)

اس موقع پر صاحب مواقف کہتے ہیں کہ یہ عذر، گناہ سے بھی بدتر ہے۔(۲)

---

(۱) دفتر پنجم مثنوی ص ۸۱۸ طبع سپہر تہران۔

(۲) دلائل الصدق، جلد اول، صفحہ ۱۳۷۔

البتہ اس سلسلہ میں صوفیوں کی بہت سی بے تکی باتیں ہیں جو نہ اصول و منطق سے ہم آہنگ ہیں اور نہ ہی شریعت کے موافق۔

بہر حال دو چیزوں کے درمیان حقیقی "اتحاد" محال اور ناممکن ہے جیسا کہ "علامہ مرحوم" نے بیان فرمایا ہے چونکہ یہ بات بالکل تضاد اور ٹکراؤ پر مشتمل ہے، یہ کیسے ممکن ہے کہ دو چیزیں ایک ہوجائیں، اس کے علاوہ اگر کوئی خدا کا دوسری مخلوق بالخصوص عارفوں سے اتحاد کے عقیدہ کا قائل ہو، تو اس کا لازمہ یہ ہے کہ خداوند عالم میں ممکنات کے صفات پائے جائیں جیسے زمان و مکان اور تغیر وغیرہ۔

اور اسی طرح خداوند عالم کا دوسری چیزوں میں "حلول" کا لازمہ بھی زمان و مکان ہے جبکہ یہ چیزیں خداوند عالم کے واجب الوجود ہونے سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔(۱)

اصولی طور پر خود صوفی بھی اس بات کے قائل ہیں کہ اس طرح کی باتوں کو عقلی دلائل کے ذریعہ ثابت نہیں کیا جاسکتا، اور غالباً اپنے راستہ کو عقلی راستہ سے الگ کرلیتے ہیں، اور اس سلسلہ میں اپنی مرضی جس کو "راہ دل" کہتے ہیں اس کے ذریعہ اپنے عقائد کو ثابت کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں، اور مسلّم طور پر اگر کوئی عقلی منطق کو نہ مانے تو اس سے اس طرح کی ضد و نقیض باتوں کے علاوہ اور کوئی امید بھی نہیں کی جاسکتی۔

یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ تاریخ میں بڑے بڑے علمائے کرام نے ان لوگوں سے دوری اختیار کی ہے، اور ان کو اپنے سے دور رکھا ہے۔

قرآن کریم نے بہت سی آیات میں عقل و برہان اور غور و خوض کے بارے میں توجہ دلائی ہے اور اسی کو "معرفۃ اللہ" کا راستہ بتایا ہے۔(۲)

---

(۱) قابل توجہ بات یہ ہے کہ حلول و اتحاد کے باطل ہونے کے سلسلہ میں علامہ حلی علیہ الرحمہ نے شرح تجرید الاعتقاد میں مفصل استدلال کے ساتھ بیان کیا ہے، (کشف المراد صفحہ ۲۲۷، باب اللہ تعالیٰ لیس بحال فی غیرہ ونفی الاتحاد عنہ)

(۲) تفسیر پیام قرآن، جلد ۲، صفحہ ۲۷۶ تا ۲۸۱۔

۱۶۔ بداء کیا ہے؟

جیسا کہ ہم قرآن کریم میں پڑھتے ہیں ﴿یَمْحُوا اللّٰہُ مَا یَشَاءُ وَیُثْبِتُ وَعِنْدَہُ أُمُّ الْکِتَابِ﴾ (۱)

''اللہ جس چیز کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے یا برقرار رکھتا ہے کیا اصل کتاب اسی کے پاس ہے''۔

مذکورہ بالا آیت کے ذیل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خداوند عالم کے سلسلہ میں ''بداء'' سے کیا مراد ہے؟

''بداء'' کا مسئلہ شیعہ و سنی علما کے درمیان ہونے والی معرکۃ الآراء بحثوں میں ایک اہم بحث ہے، چنانچہ علامہ فخر الدین رازی اپنی تفسیر میں محل بحث آیت کے ذیل میں کہتے ہیں: ''شیعہ خداوند عالم کے لئے ''بداء'' کو جائز مانتے ہیں، اور ان کے نزدیک بداء کی حقیقت یہ ہے کہ جیسے کوئی شخص کسی چیز کا معتقد ہو جائے لیکن اس کے بعد معلوم ہو کہ وہ چیز اس کے عقیدہ کے برخلاف ہے اور پھر اس سے پھر جائے، اور شیعہ لوگ اپنے اس عقیدہ کو ثابت کرنے کے لئے آیہ مبارکہ ﴿یَمْحُوا اللّٰہُ مَا یَشَاءُ وَیُثْبِتُ وَعِنْدَہُ أُمُّ الْکِتَابِ﴾ سے استدلال کرتے ہیں، اس کے بعد فخر رازی مزید کہتے ہیں کہ یہ عقیدہ باطل اور بے بنیاد ہے، کیونکہ خداوند عالم کا علم ذاتی ہے جس میں تغیر و تبدیلی محال ہے''۔

---

(۱) سورۂ رعد، آیت ۳۹۔

افسوس کی بات ہے کہ ''بداء'' کے سلسلہ میں شیعوں کے عقیدہ سے مطلع نہ ہونا اس بات کا سبب بنا کہ بہت سے برادران اہل سنت، شیعہ حضرات پر اس طرح کی ناروا تہمتیں لگائیں!

وضاحت: لغت میں ''بداء'' کے معنی واضح یا آشکار ہونے کے ہیں، البتہ پشیمان ہونے کے معنی میں بھی آیا ہے، کیونکہ جو شخص پشیمان ہوتا ہے اس کے لئے کوئی نئی بات سامنے آتی ہے [تب ہی وہ گزشتہ بات پر پشیمان ہوتا ہے]

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ان معنی میں ''بداء'' خداوند عالم کے بارے میں صحیح نہیں ہے، اور کوئی بھی عاقل انسان خدا کے بارے میں یہ احتمال نہیں دے سکتا کہ اس سے کوئی چیز مخفی اور پوشیدہ ہو، اور ایک مدت گزرنے کے بعد خدا کے لئے وہ چیز واضح ہو جائے، اصولاً یہ چیز کھلا ہوا کفر اور خدا کے بارے میں بہت بُری بات ہے، کیونکہ اس سے خداوند عالم کی ذات پاک کی طرف جہل و نادانی کی نسبت دینا اور اس کی ذات اقدس کو محل تغیر و حوادث ماننا لازم آتا ہے، لہٰذا ہرگز ایسا نہیں ہے کہ شیعہ اثنا عشری خداوند عالم کی ذات مقدس کے بارے میں اس طرح کا عقیدہ رکھتے ہوں۔

''بداء'' کے سلسلہ میں شیعوں کا جو عقیدہ ہے اور جس بات پر وہ زور دیتے ہیں وہ یہ ہے جیسا کہ اہل بیت علیہم السلام کی احادیث میں بیان ہوا ہے: ''ما عرف اللّٰہ حَقّ معرفتِہ مَنْ لَمْ یعرفہُ بالبداءِ'' (جو شخص خدا کو ''بداء'' کے ذریعہ سے نہ پہچانے اس نے خدا کو صحیح طریقہ سے نہیں پہچانا) چنانچہ ''بداء'' کے سلسلہ میں اس حدیث کے مطابق شیعوں کا یہی عقیدہ ہے:

اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ظاہری اسباب و علل کے پیش نظر ہم کو یہ احساس ہوتا ہے کہ کوئی واقعہ پیش آنے والا ہے، یا خداوند عالم نے کسی واقعہ کے بارے میں اپنے نبی یا رسول کے ذریعہ آگاہ فرمایا دیا تھا لیکن بعد میں وہ واقعہ پیش نہیں آیا تو، ایسے موقع پر ہم کہتے ہیں کہ ''بداء'' حاصل ہوا، یعنی جیسا کہ ظاہری اسباب و علل کے لحاظ سے کسی واقعہ کے بارے میں احساس کر رہے تھے اور اس واقعہ کے وقوع کو لازمی اور ضروری سمجھ رہے تھے ایسا نہ ہو بلکہ اس کے خلاف ظاہر ہو۔

اس کی اصلی علت یہ ہے کہ کبھی کبھی ہمیں صرف علت ناقصہ کا علم ہوتا ہے، اور ہم اس کے شرائط و موانع کو نہیں دیکھ پاتے، اسی لحاظ سے فیصلہ کر بیٹھتے ہیں، بعد میں اس کی شرط حاصل نہ ہو یا کوئی مانع اور رکاوٹ پیش آجائے اور ہمارے فیصلہ کے برخلاف مسئلہ پیش آئے تو اس طرح کے مسائل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

اسی طرح بعض اوقات پیغمبر یا امام "لوح محو و اثبات" سے مطلع ہوتے ہیں جو طبیعی طور پر قابل تغیر و تبدیل ہے، اور کبھی بعض موانع کی بنا پر یا شرط کے نہ ہونے سے وہ واقعہ پیش نہیں آتا۔

اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے ہم "نسخ" اور "بداء" کے درمیان ایک موازنہ کرتے ہیں، ہم اس بات کو جانتے ہیں کہ "نسخ احکام" تمام مسلمانوں کی نظر میں جائز ہے، یعنی یہ بات ممکن ہے کہ کوئی حکم گزشتہ شریعت میں نازل ہوا ہو اور لوگوں کو بھی اس بات کا یقین ہو کہ یہ حکم ہمیشہ باقی رہے گا لیکن ایک مدت کے بعد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ وہ حکم منسوخ ہو جائے، اور اس کی جگہ کوئی دوسرا حکم آجائے، (جیسا کہ تفسیر، فقہ اور تاریخی کتابوں میں "تحویل و تبدیل قبلہ" کا واقعہ موجود ہے)۔

دراصل یہ [نسخ] بھی ایک قسم کا "بداء" ہے، لیکن تشریعی امور میں، قوانین اور احکام میں "نسخ" کہا جاتا ہے، جبکہ تکوینی امور میں اسی کو "بداء" کہا جاتا ہے۔

اسی وجہ سے بعض اوقات کہا جاتا ہے: **"احکام میں نسخ ایک قسم کا "بداء" ہے، اور تکوینی امور میں "بداء" ایک قسم کا نسخ ہے"۔**

کیا کوئی اس منطقی بات کا انکار کر سکتا ہے؟ صرف وہی اس بات کا انکار کر سکتا ہے جو علت تامہ اور علت ناقصہ کو صحیح طور پر سمجھ نہ سکے، یا شیعہ مخالف گروپ کے غلط پروپیگنڈے سے متاثر ہو، اور اس کا تعصب اس حد تک بڑھ چکا ہو کہ شیعہ عقائد کے سلسلہ میں شیعہ کتابوں کا مطالعہ نہ کر سکے، تعجب کی بات یہ ہے کہ فخر رازی نے ﴿**يَمْحُوا اللهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهُ أُمُّ الْكِتَابِ**﴾ کے ذیل میں بداء کے مسئلہ کو بیان کیا ہے لیکن اس بات پر ذرا بھی توجہ نہیں دی کہ بداء "محو و اثبات" کے علاوہ

کوئی دوسری چیز نہیں ہے، اپنے مخصوص تعصب کی بنا پر شیعوں کو نشانہ بنایا ہے کہ شیعہ کیوں ''بداء'' کے قائل ہیں؟

[قارئین کرام!] آپ حضرات کی اجازت سے ہم چند ایسے نمونہ بیان کرتے ہیں جن کو سبھی نے قبول کیا ہے۔

۱۔ ہم جناب یونس علیہ السلام کے واقعہ میں پڑھتے ہیں کہ آپ کی قوم کی نافرمانی کی وجہ سے عذاب الٰہی طے ہوگیا، اور جناب یونس علیہ اسلام جو اپنی قوم کو قابل ہدایت نہیں جانتے تھے اور ان کو مستحق عذاب جانتے تھے لہٰذا وہ بھی ان کو چھوڑ کر چلے گئے، لیکن اچانک (بداء واقع ہوا) اس قوم کی ایک بزرگ شخصیت نے عذاب الٰہی کے آثار دیکھے تو اپنی قوم کو جمع کیا اور ان کو توبہ کی دعوت دی، سب لوگوں نے توبہ کرلی، ادھر عذاب الٰہی کے جو آثار ظاہر ہو چکے تھے ختم ہوگئے جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿فَلَوْلاَ كَانَتْ قَرْيَةٌ آمَنَتْ فَنَفَعَهَا إِيمَانُهَا إِلاَّ قَوْمَ يُونُسَ لَمَّا آمَنُوا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنَاهُمْ إِلَى حِينٍ﴾ (۱)

''پس کوئی بستی ایسی کیوں نہیں ہے جو ایمان لے آئے اور اس کا ایمان اسے فائدہ پہنچائے علاوہ قوم یونس کے کہ جب وہ ایمان لے آئی تو ہم نے ان سے زندگانی دنیا میں رسوائی کا عذاب دفع کر دیا اور انھیں ایک مدت تک سکون سے رہنے دیا''۔

۲۔ اسلامی تواریخ میں بیان ہوا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ اسلام نے ایک دلہن کے بارے میں خبر دی تھی کہ وہ شب وصال ہی مرجائے گی لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیشین گوئی کے برخلاف وہ دلہن زندہ رہی! جس وقت اس سے تفصیل معلوم کی اور سوال کیا: کیا تو نے راہ خدا میں صدقہ دیا

(۱) سورہ یونس، آیت ۹۸

ہے؟ تو اس نے کہا: ہاں، میں نے صدقہ دیا تھا، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: صدقہ، یقینی بلاؤں کو بھی دور کردیتا ہے!(۱)

دراصل حضرت عیسیٰ علیہ السلام لوح محفوظ سے باخبر تھے جس کی بنا پر انھوں نے اس واقعہ کی خبر دی تھی، جبکہ یہ واقعہ اس شرط پر موقوف تھا (کہ اس راہ میں کوئی مانع پیش نہ آئے مثال کے طور پر "صدقہ") لیکن جیسے ہی اس راہ میں مانع پیش آگیا تو فوراً نتیجہ بھی بدل گیا۔

۳۔ ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام بت شکن بہادر کے واقعہ کو قرآن میں پڑھتے ہیں کہ انھیں اسماعیل کو ذبح کرنے کا حکم دیا گیا، لہٰذا وہ اس حکم کی تعمیل کے لئے اپنے فرزند ارجمند کو قربانگاہ میں لے گئے، لیکن جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مکمل تیاری واضح ہوگئی تو "بداء" ہوگیا، اور یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ ایک امتحانی حکم تھا، تاکہ جناب ابراہیم علیہ السلام اور ان کے فرزند ارجمند کی اطاعت و تسلیم کی حد کو آزمایا جاسکے۔

۴۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں بھی بیان ہوا ہے کہ پہلے انھیں حکم دیا گیا کہ تیس دن تک کے لئے اپنی قوم کو چھوڑ دیں اور احکام توریت حاصل کرنے کے لئے الٰہی وعدہ گاہ پر جائیں، لیکن بعد میں اس مدت میں دس دن کا اور اضافہ کیا (تاکہ بنی اسرائیل کی آزمائش ہوسکے)

[قارئین کرام!] یہاں پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ "بداء" کا فائدہ کیا ہے؟

اس سوال کا جواب گزشتہ مطالب کے پیش نظر کوئی مشکل کام نہیں ہے، کیونکہ کبھی کبھی اہم مسائل جیسے کسی شخص یا قوم وملت کا امتحان، یا توبہ و استغفار کی تاثیر (جیسا کہ حضرت یونس علیہ السلام کے واقعہ میں بیان ہوا ہے) یا صدقہ، غریبوں کی مدد کرنا یا نیک کام انجام دینا یہ سب خطرناک واقعات کو برطرف کرنے میں موثر ہوتے ہیں، یہ امور باعث بنتے ہیں کہ آئندہ کے وہ حادثات جو

(۱) بحار الانوار، جلد ۴، صفحہ ۹۴، ۱۳۱۔ چاپ قدیم، از امالی شیخ صدوق

پہلے دوسرے طریقہ سے طے ہوتے ہیں لیکن بعد میں خاص شرائط کے تحت ان کو بدل دیا جاتا ہے تاکہ عام لوگوں کو یہ معلوم ہوجائے کہ ان کی زندگی کے حادث ان کے ہاتھوں میں ہے، اور اپنے چال چلن اور راہ وروش کو تبدیل کرکے اپنی زندگی کے حادثات بدل سکتے ہیں، اور یہی "بداء" کا سب سے بڑا فائدہ ہے۔ (غور کیجئے)

جیسا کہ ہم نے گزشتہ حدیث میں پڑھا ہے کہ "جو شخص خدا کو "بداء" کے ذریعہ سے نہ پہچانے اس نے خدا کو صحیح طریقہ سے نہیں پہچانا" اس حدیث میں انھیں حقائق کی طرف اشارہ ہے۔

لہٰذا حضرت امام صادق علیہ السلام کی ایک حدیث میں وارد ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

"مَا بَعَثَ اللّٰهُ عزَّ وَجلَّ نَبِیًّا حَتّٰی یاخذ عَلَیهِ ثلاثُ خِصَالٍ، الإقرار بالعبو دیة، وَخلع الأنداد، وإنَّ اللّٰه یقدّم ما یشاءُ وَیؤخّرُ مَا یشاءُ" (۱)

"خداوند عالم نے کسی نبی یا پیغمبر کو نہیں بھیجا مگر یہ کہ ان سے تین چیزوں کے بارے میں عہد و پیان لیا، خداوند عالم کی بندگی کا اقرار، ہر طرح کے شرک کی نفی، اور یہ کہ خداوند عالم جس چیز کو چاہے مقدم و موخر کرے"۔

دراصل سب سے پہلا عہد و پیان خداوند عالم کی اطاعت اور اس کے سامنے تسلیم رہنے سے متعلق ہے، اور دوسرا عہد و پیان شرک سے مقابلہ ہے اور تیسرا عہد و پیان "بداء" سے متعلق ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کی سرگزشت خود اپنے ہاتھوں میں ہوتی ہے یعنی اگر انسان اپنی زندگی کے حالات اور شرائط کو بدل دے تو اس پر یا رحمت خدا نازل ہوتی ہے یا وہ عذاب الٰہی سے دوچار ہوتا ہے۔

[قارئین کرام!] آخر کلام میں عرض کیا جائے، گزشتہ وجوہات کی بنا پر علمائے شیعہ کہتے ہیں کہ جس "بداء" کی نسبت خداوند عالم کی طرف دی جاتی ہے تو اس کے معنی "ابداء" کے ہیں یعنی کسی

(۱) اصول کافی، جلد اول، صفحہ ۴۰ الامامیہ ایمان، جلد اول، صفحہ ۶۱

چیز کو واضح اور ظاہر کرنا جو کہ پہلے ظاہر نہیں تھی اور اس کے بارے میں پیشین گوئی نہیں کی گئی تھی۔

لیکن شیعوں کی طرف یہ نسبت دینا کہ ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ خدا کبھی کبھی اپنے کاموں پر پشیمان اور شرمندہ ہو جاتا ہے یا بعد میں ایسی چیز سے باخبر ہوتا ہے جو پہلے معلوم نہ ہو، تو یہ سب سے بڑا ظلم و خیانت ہے اور ایک ایسی تہمت ہے جس کو کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔

اسی وجہ سے ائمہ معصومین علیہم السلام سے نقل ہوا ہے:

"مَنْ زَعَمَ اَنَّ اللّٰہَ عزَّ وَجَلَّ یبدو لَہُ فِی شَیءٍ لَمْ یعلمْہُ امس فابرئوا منہ" (۱)(۲)

"جو شخص گمان کرے کہ خداوند عالم کے لئے آج وہ چیز واضح و آشکار ہوگئی ہے جو کل واضح نہیں تھی تو ایسے شخص سے نفرت اور بیزاری اختیار کرو"۔

() سفینۃ البحار، جلد اول، صفحہ ۶۱

() تفسیر نمونہ، جلد ۱۰، صفحہ ۲۳۵.

۱۷۔ کیا اولیاء اللہ کو وسیلہ قرار دینا توحید خدا کے مخالف ہے؟

[قارئین کرام!] پہلے ہی یہ نکتہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ توسل سے مراد یہ نہیں ہے کہ انسان پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا ائمہ علیہم السلام سے مستقل طور پر کوئی چیز طلب کرے بلکہ توسل سے مراد یہ ہے کہ اعمال صالحہ یا پیغمبر اور امام کی اطاعت و پیروی کے ذریعہ یا ان حضرات کی شفاعت یا خداوند عالم کو ان حضرات کے عظیم مرتبہ کی قسم دے کر (جو خود ایک طرح سے ان کی عظمت اور بلندی کا احترام کرنا ہے اور ایک طرح سے خدا کی عبادت ہے) خداوند عالم سے کوئی چیز مانگی جائے تو اس میں نہ کسی طرح کا کوئی شرک ہے اور نہ ہی یہ قرآنی آیات کے مخالف ہے۔

اس کے علاوہ قرآنی آیت سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ خداوند عالم کو کسی صالح اور نیک انسان کی عظمت کا واسطہ دے کر اس سے کوئی چیز طلب کرنے میں کوئی قباحت نہیں اور توحید خدا سے بھی منافی نہیں ہے، جیسا کہ سورہ نساء میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ جَاءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللَّهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللَّهَ تَوَّابًا رَحِيمًا﴾ (۱)

"اور کاش جب ان لوگوں نے اپنے نفس پر ظلم کیا تھا تو آپ کے پاس آتے اور خود بھی اپنے گناہوں کے لئے استغفار کرتے اور رسول بھی ان کے حق میں استغفار کرتا تو یہ خدا کو بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پاتے"۔

---

(۱) سورہ نساء، آیت ۶۴

توسل اور اسلامی روایات

توسل کے سلسلہ میں اہل سنت ،ور شیعہ کتابوں میں بہت سی روایات بیان ہوئی ہیں جن سے مکمل طور پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ توسل اور وسیلہ قرار دینے میں کوئی اشکال نہیں پایا جاتا، بلکہ ایک نیک کام ہے، اس سلسلہ میں بہت زیادہ روایات ہیں اور بہت سی کتابوں میں نقل بھی ہوئی ہیں، ہم نمونہ کے طور پر اہل سنت کی مشہور و معروف کتابوں سے چند روایات کو نقل کرتے ہیں۔

ا۔ مشہور و معروف سنی عالم دین ''سمہودی'' اپنی کتاب ''وفاء الوفاء'' میں رقمطراز ہیں: پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا آپ کی عظمت و بزرگی کے واسطہ سے خدا کی بارگاہ میں مدد طلب کرنا، شفاعت چاہنا، آنحضرت کی خلقت سے پہلے بھی جائز تھا، آپکی پیدائش کے بعد اور آپکی وفات کے بعد، عالم برزخ اور روز قیامت میں بھی جائز ہے، اس کے بعد حضرت عمر بن خطاب سے روایت نقل کرتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے توسل کیا۔ جناب آدم علیہ اسلام پیغمبر اکرمؐ کی خلقت کے بارے میں علم حاصل کرنے کے بعد خداوند عالم کی بارگاہ میں اس طرح عرض کرتے ہیں:

''یا ربِّ اسئلکَ بحَقِّ مُحمّدٍ لِمَا غفرتَ لِی''(۱)

''پالنے والے! تجھے محمد [صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم] کا واسطہ، تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ مجھے معاف کردے''۔

اس کے بعد اہل سنت کے مشہور و معروف دانشوروں جیسے ''نسائی'' اور ''ترمذی'' سے ایک حدیث نقل کرتے ہیں اور اس کو توسل کے جواز پر شاہد کے عنوان سے نقل کرتے ہیں، جس حدیث کا

---

(۱) وفاء الوفاء، جلد ۳، صفحہ ۱۳۷۱۔ کتاب (التوصل الی حقیقۃ التوسل میں، صفحہ ۲۱۵، مذکورہ حدیث کو ''دلائل النبوۃ'' میں بیہقی نے بھی نقل کیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے: ایک نابینا شخص نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنی بیماری کی شفاء کے لئے درخواست کی تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ اس طرح دعا کرو

"اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْئَلُکَ وَاَتَوَجَّہُ اِلَیْکَ بِنَبِیِّکَ مُحَمَّدٍ نَبِیِّ الرَّحمۃِ یَا مُحَمَّدُ اِنِّی تَوَجَّھْتُ بِکَ اِلٰی رَبِّی فِی حَاجَتِی لِتَقْضِیَ لِی اَللّٰھُمَّ شَفِّعْہُ فِیَّ"(۱)

"پالنے والے! تیرے پیغمبر رحمت کے واسطہ سے تجھ سے درخواست کرتا ہوں اور اے محمدؐ! آپ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں اور آپ ہی کے واسطہ سے اپنی حاجت روائی کے لئے خدا کی بارگاہ میں متوجہ ہوتا ہوں، پالنے والے! آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو میرا شفیع قرار دے"۔

اس کے بعد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد توسل کے جواز کو ثابت کرنے کے لئے یوں بیان کرتے ہیں حضرت عثمان کے زمانہ میں ایک حاجت مند پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر کے نزدیک آیا اور اس نے نماز پڑھی اور اس طرح دعا کرنے لگا۔

"اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْئَلُکَ وَاَتَوَجَّہُ اِلَیْکَ بِنَبِیِّنَا مُحَمَّدٍ نَبِیِّ الرَّحمۃِ یَا مُحَمَّدُ اِنِّی اَتَوَجَّہُ اِلٰی رَبِّکَ اَنْ تَقْضِیَ حَاجَتِی"(۱)

"پالنے والے! تیری بارگاہ میں پیغمبر اکرم [صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم]، پیغمبر رحمت کے وسیلہ سے درخواست کرتا ہوں اور تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں، اے محمدؐ! آپ کے وسیلہ سے خدا کی بارگاہ میں متوجہ ہوتا ہوں تاکہ میری مشکل آسان ہو جائے"۔

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ اس کی مشکل آسان ہوگئی۔(۲)

۳۔"التوصل الی حقیقۃ التوسل" کے مؤلف مختلف منابع و مآخذ سے ۲۶/احادیث نقل کرتے

(۱)وفاء الوفاء، صفحہ ۱۳۷۲۔

(۲)وفاء الوفاء، صفحہ ۱۳۷۳۔

ہیں جن سے توسل کا جائز ہونا سمجھ میں آتا ہے، اگرچہ موصوف نے ان احادیث کی سند میں اشکال کرنا چاہا ہے، لیکن یہ بات واضح ہے کہ جب روایات زیادہ ہوجاتی ہیں اور تواتر[۱] کی حد تک پہنچ جاتی ہیں تو پھر سند میں اشکال واعتراض کی گنجائش نہیں رہتی، اور مخفی نہ رہے کہ توسل کے سلسلہ میں احادیث تواتر کی حد سے بھی زیادہ ہیں، ان کی نقل کی ہوئی روایات میں سے ایک یہ ہے:

''ابن حجر مکی'' اپنی کتاب ''الصواعق المحرقۃ'' میں اہل سنت کے مشہور ومعروف ''امام شافعی'' سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے اہل بیت پیغمبرؐ سے توسل کیا اور اس طرح کہا:

آل النّبِيِّ ذَرِيعَتِي وَهُمْ إِلَيه وَسِيلَتِي

ارْجُوبِهِمْ أعطي غَداً بِيَدِ اليَمِينِ صَحِيفَتِي(۲)

''آل پیغمبرؐ میرا وسیلہ ہیں، اور وہی خدا کی بارگاہ میں میرے لئے باعث تقرب ہیں''

''میں امیدوار ہوں کہ ان کے وسیلہ سے میرا نامہ اعمال میرے داہنے ہاتھ میں دیا جائے''

اسی طرح ''بیہقی'' بھی نقل کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ خلیفہ دوم کی خلافت کے زمانہ میں قحط پڑا، جناب بلال چند اصحاب کے ساتھ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی قبر مبارک پر آئے اور اس طرح عرض کی:

''یَا رَسُولَ اللهِ استسق لأمّتک ... فإنّهم قد هلکوا ...'' (۳)

''یارسول اللہ! اپنی امت کے لئے باران رحمت طلب فرمایئے ... کیونکہ آپ کی امت ہلاک ہوا چاہتی ہے''۔

[ ] علم حدیث میں ''حدیث تواتر'' اس حدیث کو کہا جاتا ہے جس کے راویوں کی تعداد اس حد تک ہو کہ ان کی ایک ساتھ جمع ہوکر سازش کا قابل احتمال نہ ہو۔ (مترجم)

(۲) التوصل الی حقیقۃ التوسل، صفحہ ۳۲۹

(۳) التوصل الی حقیقۃ التوسل، صفحہ ۲۵۳

یہاں تک کہ ابن حجر اپنی کتاب ''الخیرات الحسان'' میں نقل کرتے ہیں کہ ''امام شافعی'' بغداد میں قیام کے دوران ''ابو حنیفہ'' کی زیارت کے لئے جاتے تھے، اور اپنی حاجتوں میں ان کو وسیلہ بناتے تھے اوران سے متوسل ہوتے تھے۔(۱)

نیز ''صحیح دارمی'' میں ''ابی الجوزاء'' سے نقل ہوا ہے کہ ایک سال مدینہ میں بہت سخت قحط پڑگیا، بعض افراد جناب عائشہ کی خدمت میں جاکر شکایت کرنے لگے، اوران سے درخواست کی کہ قبر پیغمبر کی چھت میں سوراخ کردیا جائے تاکہ قبر پیغمبر کی برکت سے خداوندعالم باران رحمت نازل فرمادے، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اوراس وقت بہت زیادہ بارش ہوئی!

تفسیر ''آلوسی'' میں اس سلسلہ میں بہت سی احادیث نقل ہوئی ہیں اور پھران احادیث کا مفصل طریقہ سے تجزیہ وتحلیل کرنے کے بعداور مذکورہ احادیث میں بہت سخت رویہ اختیار کرنے کے بعدان کا اعتراف کرتے ہوئے اس طرح کہتے ہیں.

''اس گفتگو کے تمام ہونے کے بعدمیرے نزدیک کوئی مانع نہیں ہے کہ خدوندعالم کی بارگاہ میں پیغمبراکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کووسیلہ قراردیا جائے، چاہے پیغمبراکرمؐ کی زندگی میں ہو یا آنحضرتؐ کے انتقال کے بعد'' موصوف اس سلسلہ میں کافی بحث کرنے کے بعدمزید فرماتے ہیں ''خداوندعالم کی بارگاہ میں پیغمبر کے علاوہ کسی دوسرے سے توسل کرنے میں بھی کوئی ممانعت نہیں ہے، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ پیغمبر کے علاوہ جس کوخدا کی بارگاہ میں وسیلہ بنایا جائے اس کا مرتبہ خدا کی نظر میں بلندوبالا ہو۔(۲)

لیکن شیعہ منابع ومآخذ میں وسیلہ اور توسل کا موضوع اس قدر واضح ہے کہ اس کو بیان کرنے کی [بھی] ضرورت نہیں ہے۔

---

(۱)التوصل الی حقیقۃ التوسل، صفحہ ۳۳۱ (۲)روح المعانی، جلد ۲، ۶، صفحہ ۱۱۲۔ ۱۱۵

چند ضروری نکات:

[قارئین کرام!] یہاں پر چند نکات کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے:

۱۔ توسل اور وسیلہ سے یہ مراد نہیں ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا ائمہ معصومین علیہم السلام سے کوئی شخص اپنی حاجات طلب کرے، بلکہ مراد یہ ہے کہ خدا کی بارگاہ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ معصومین علیہم السلام کی عظمت اور بلندی کے ذریعہ متوسل ہو، اور یہ کام درحقیقت خداوند عالم کی طرف توجہ کرنا ہے، کیونکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا احترام بھی خدا کی وجہ سے ہے کہ آپ خدا کے رسول ہیں، اس کی راہ پر چلے، ان باتوں کے باوجود ان لوگوں پر تعجب ہوتا ہے جو اس طرح کے توسل کو شرک کی ایک قسم کہہ دیتے ہیں جبکہ شرک یہ ہے کہ خدا کی صفات اور اس کے افعال میں کسی کو شریک مانیں، جبکہ اس طرح کا توسل شرک سے کوئی شباہت نہیں رکھتا۔

۲۔ بعض لوگوں نے اس بات کی بہت کوشش کی ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ علیہم السلام کی حیات اور وفات میں فرق قرار دیں، حالانکہ مذکورہ روایات جن میں بہت سی روایات وفات کے بارے میں ہیں' لہٰذا ان کے پیش نظر مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ انبیاء اور صالحین وفات کے بعد ''برزخی حیات'' رکھتے ہیں جو کہ دنیوی زندگی سے وسیع تر ہے جیسا کہ شہداء کے بارے میں وضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ ان کو مردہ تصور نہ کرو وہ زندہ ہیں اور خدا کی طرف سے رزق پاتے ہیں۔(۱)

۳۔ بعض لوگ اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دعا کی درخواست اور خدا کی بارگاہ میں ان کی عظمت کی قسم دینے میں فرق ہے، لہٰذا دعا کی درخواست کو جائز اور خدا کی بارگاہ میں ان کی عظمت کی قسم دینے کو حرام جانتے ہیں، حالانکہ ان دونوں کے درمیان کسی بھی طرح کا کوئی منطقی فرق دکھائی نہیں دیتا۔

---

(۱) سورۂ آل عمران، آیت ۱۶۹۔

۴۔ بعض علمائے اہل سنت خصوصاً "وہابی علماء" اپنی خاص ہٹ دھرمی کی بنا پر کوشش کرتے ہیں کہ وسیلہ اور توسل کے بارے میں بیان ہونے والی تمام احادیث کو ضعیف اور کمزور ثابت کرڈالیں، اس سلسلہ میں بے بنیاد اعتراضات کرتے ہیں جو درحقیقت بہت پرانے ہو چکے ہیں، جن کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک انصاف پسند انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ ان لوگوں نے پہلے اپنا عقیدہ معین کرلیا ہے اور پھر اپنے عقیدہ کو اسلامی روایات پر "تھوپنا" چاہتے ہیں، اور ایسا ہی کرتے ہیں اور جو کچھ ان کے عقیدہ کے خلاف ہوتا ہے اس کو چھوڑ دیتے ہیں، جبکہ ایک تحقیق کرنے والا محقق انسان اس طرح کی غیر منطقی اور تعصب آمیز بحث کو قبول نہیں کرسکتا۔

۵۔ ہم بیان کرچکے ہیں کہ توسل کے سلسلہ میں بیان شدہ روایات حد تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں، یعنی اس قدر ہیں کہ ان کی سند میں بحث کی کوئی ضرورت نہیں رہتی، اس کے علاوہ ان کے درمیان بہت زیادہ صحیح روایت بھی ہیں، لہٰذا ان کی اسناد میں اعتراض واشکال کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

۶۔ ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ آیہ شریفہ کے ذیل میں بیان ہونے والی روایات کا مفہوم یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے اصحاب سے فرمایا: "خداوند عالم سے میرے لئے "وسیلہ" طلب کرو"، یا جیسا کہ اصول کافی میں حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ بہشت میں وسیلہ سب سے بلند وبالا مقام ہے، اور جیسا کہ ہم نے آیت کی تفسیر میں بیان کیا ہے: ان کے درمیان کسی طرح کا کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ ہم نے بارہا عرض کیا ہے کہ ہر طرح کے تقرب خدا پر "وسیلہ" صادق آتا ہے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے تقرب خدا حاصل کرنے کا نام وسیلہ ہے جو کہ جنت میں سب سے بلند وبالا مقام ہے۔ (۱)

---

(۱) تفسیر نمونہ، جلد ۱۲، صفحہ ۳۶۲.

۱۸۔ دعا کرتے وقت آسمان کی طرف ہاتھ کیوں بلند کرتے ہیں؟

اکثر اوقات عوام الناس کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب خداوند عالم کے لئے کوئی [خاص] محل و مکان نہیں ہے تو پھر دعا کرتے وقت آسمان کی طرف ہاتھ کیوں اٹھاتے ہیں؟ کیوں آسمان کی طرف آنکھیں متوجہ کی جاتی ہیں؟ نعوذ باللہ کیا خداوند عالم آسمان میں ہے؟

[قارئین کرام!] یہ سوال حضرات ائمہ معصومین علیہم السلام کے زمانہ میں بھی ہوتا تھا، جیسا کہ ہمیں تاریخ میں ملتا ہے کہ "ہشام بن حکم" کہتے ہیں ایک زندیق حضرت امام صادق علیہ السلام کی خدمت میں آیا اور اس نے درج ذیل آیت کے بارے میں سوال کیا:

﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی﴾(۱)

"وہ رحمن عرش پر اختیار اور اقتدار رکھنے والا ہے"۔

امام علیہ السلام نے وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: خداوند عالم کو کسی جگہ اور کسی مخلوق کی کوئی ضرورت نہیں ہے، بلکہ تمام مخلوقات اس کی محتاج ہے۔

سوال کرنے والے نے عرض کی تو پھر کوئی فرق نہیں ہے کہ (دعا کے وقت) چاہے ہاتھ آسمان کی طرف بلند ہوں یا زمین کی طرف؟!

(۱)سورہ طٰہٰ، آیت ۵۔

اس وقت امام علیہ السلام نے فرمایا: یہ موضوع خداوندعالم کے علم واحاطہ میں برابر ہے (اور کوئی فرق نہیں ہے) لیکن خداوندعالم نے اپنے انبیاء اور صالح بندوں کو خود حکم دیا کہ اپنے ہاتھوں کو آسمان اور عرش کی طرف اٹھائیں، کیونکہ معدنِ رزق وہیں ہے، جو کچھ قرآن کریم اور احادیث سے ثابت ہے ہم اس کو ثابت مانتے ہیں جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: اپنے ہاتھوں کو خداوندعالم کی بارگاہ میں بلند کرو، اس بات پر تمام امت کا اتفاق اور اجماع ہے۔(۱)

اسی طرح کتاب خصال [شیخ صدوق علیہ الرحمہ] میں حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام سے منقول ہے: "إِذَا فَرَغَ أَحَدُكُمْ مِنَ الصَّلَوةِ فَلْيَرْفَعْ يَدَيْهِ إِلَىٰ السَّمَاءِ، وليَنصَب فِي الدعاءِ" "جب تم نماز سے فارغ ہوجاؤ تو اپنے ہاتھوں کو آسمان کی طرف بلند کرو اور دعا میں مشغول ہوجاؤ"۔

اس وقت ایک شخص نے عرض کیا: یا امیر المومنین! کیا خداوندعالم سب جگہ موجود نہیں ہے؟
امام علیہ السلام نے فرمایا: جی ہاں! سب جگہ موجود ہے۔
اس شخص نے عرض کیا: تو پھر بندے آسمان کی طرف اپنے ہاتھوں کو کیوں اٹھائیں؟
اس موقع پر امام علیہ السلام نے درج ذیل آیہ شریفہ کی تلاوت فرمائی:

﴿وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ﴾(۲)

"اور آسمان میں تمہارا رزق ہے اور جن باتوں کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے (سب کچھ موجود ہے)"۔(۳)

---

(۱) بحار الانوار، جلد ۳، صفحہ ۳۳۰، توحید صدوق، صفحہ ۲۴۸، حدیث ۱، باب ۳۶ "باب الرد علی الثنوية والزنادقة"

(۲) سورۂ ذاریات، آیت ۲۲۔

(۳) بحار الانوار، جلد ۹۰، صفحہ ۳۰۸، حدیث ۷، مذکورہ حدیث تفسیر نور الثقلین، جلد ۵، صفحہ ۱۲۴ و ۱۲۵ میں بھی ذکر ہوئی ہے۔

ان روایات کے مطابق چونکہ انسان کا اکثر رزق آسمان سے ہے، (بارش، جس سے بنجر زمین زراعت کے لائق ہو جاتی ہے، آسمان سے نازل ہوتی ہے، سورج کی روشنی جو کہ زندگی اور حیات کا مرکز ہے، آسمان سے آتی ہے، ہوا بھی آسمان میں ہے جو کہ زندگی کے لئے تیسرا اہم سبب ہے) اور آسمان رزق اور برکات الٰہی کا معدن و مرکز ہے، لہٰذا دعا کے وقت آسمان کی طرف توجہ کی جاتی ہے اور رزق و روزی کے مالک و خالق سے اپنی مشکلات کے حل کی دعا کی جاتی ہے۔

بعض روایات میں اس کام کے لئے ایک دوسرا فلسفہ بھی بیان کیا گیا ہے، اور وہ ہے خداوند عالم کی بارگاہ میں خضوع و تذلل کرنا، کیونکہ ہم کسی شخص یا کسی شئے کے سامنے تواضع کے اظہار کے وقت اور تسلیم ہوتے وقت اپنے ہاتھوں کو بلند کرتے ہیں۔(۱)

---

(۱) تفسیر پیام قرآن، جلد ۲، صفحہ ۲۷۔

عدل الهی

۱۹۔ کیا انسانوں میں پیدائشی فرق؛ خداوندعالم کی عدالت سے ہم آہنگ ہے؟

جیسا کہ ہم قرآن کریم میں پڑھتے ہیں: ﴿وَلا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰہُ بِهِ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ...﴾ (۱)

''اور خبردار جو خدا نے بعض افراد کو بعض سے کچھ زیادہ دیا ہے اس کی تمنا اور آرزو نہ کرنا''۔

اس آیہ شریفہ کے پیش نظر بہت سے لوگوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کی استعداد اور قابلیت زیادہ اور بعض لوگوں کی استعداد کم کیوں ہے؟ اسی طرح بعض لوگ دوسروں سے زیادہ خوبصورت اور بعض کم خوبصورت ہیں، نیز بعض لوگ بہت زیادہ طاقتور اور بعض معمولی طاقت رکھتے ہیں، کیا یہ فرق خداوندعالم کی عدالت کے منافی نہیں ہے؟

اس سوال کے ذیل میں ہم چند نکات کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۱۔ بعض لوگوں میں جسمانی یا روحانی فرق کا ایک حصہ طبقاتی نظام، اجتماعی ظلم وستم یا ذاتی سستی اور کاہلی کا نتیجہ ہوتا ہے جس کا نظام خلقت سے کوئی سروکار نہیں، مثال کے طور پر بہت سے

---

(۱)سورہ نساء، آیت نمبر۳۲۔

مالدار لوگوں کی اولاد غریب لوگوں کی اولاد کی نسبت جسمی لحاظ سے طاقتور، خوبصورتی کے لحاظ سے بہتر اور استعداد وقابلیت کے لحاظ سے بہت آگے ہوتی ہے، کیونکہ ان کے یہاں غذائی اشیاء کافی مقدار میں ہوتی ہیں اور صفائی کا بھی خیال رکھا جاتا ہے، جبکہ غریب لوگوں کے یہاں یہ چیزیں نہیں ہوتیں، یہ بہت سے لوگ سستی اور کاہلی سے کام لیتے ہیں اور اپنی جسمانی طاقت کھو بیٹھتے ہیں، لہٰذا اس طرح کے فرق کو "جعلی اور بے دلیل" کہا جائے گا جو طبقاتی نظام کے خاتمہ اور معاشرہ میں عدل وانصاف کا ماحول پیدا ہونے سے خود بخود ختم ہو جائے گا، قرآن کریم نے اس طرح کے فرق کو کبھی بھی صحیح نہیں مانا ہے۔

۲۔ اس فرق کا ایک حصہ انسانی خلقت کا لازمہ اور ایک طبعی چیز ہے یعنی اگر کسی معاشرہ میں مکمل طور پر عدل وانصاف پایا جاتا ہو تو بھی تمام لوگ ایک کارخانہ کی مصنوعات کی طرح ایک جیسے نہیں ہو سکتے، طبیعی طور پر ایک دوسرے میں فرق ہونا چاہئے، لیکن یہ بات معلوم ہونا چاہئے کہ معمولاً خداداد صلاحیتیں اور روحی وجسمی استعداد اس طرح تقسیم ہوئی ہیں کہ ہر انسان میں استعداد کا ایک حصہ پایا جاتا ہے یعنی بہت ہی کم لوگ ایسے ملیں گے کہ یہ تمام چیزیں ان میں جمع ہوں، ایک انسان، جسمانی طاقت سے سرفراز ہے تو دوسرا علم حساب میں بہترین استعداد کا مالک ہے، کسی انسان میں شعر کہنے کی صلاحیت ہوتی ہے تو دوسرے میں تجارت کا سلیقہ پایا جاتا ہے، بعض میں زراعتی امور انجام دینے کی طاقت پائی جاتی ہے، اور بعض دوسرے لوگوں میں دوسری مخصوص صلاحیتیں ہوتی ہیں، اہم بات یہ ہے کہ معاشرہ یا انسان اپنی صلاحیت کو بروئے کار لائے اور صحیح ماحول میں اس کی پرورش کرے تاکہ ہر انسان اپنی صلاحیت کو ظاہر کر سکے اور اس سے حتی الامکان سرفراز ہو سکے۔

۳۔ اس نکتہ پر بھی توجہ کرنی چاہئے کہ ایک معاشرہ کے لئے انسانی بدن کی طرح مختلف چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے یعنی اگر ایک بدن کے تمام اعضا اور خلیے (Cells) ظریف اور لطیف ہوں گے جیسے آنکھ، کان اور مغز وغیرہ کے خلیے تو انسان میں دوام پیدا نہیں ہو سکے گا، یا اگر انسانی جسم

کے تمام اعضا نرم نہ ہوں بلکہ ہڈیوں کے جیسوں کی طرح سخت ہوں تو وہ مختلف کاموں کے لئے بے کار ہیں [اور اس صورت میں انسان زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکتا] بلکہ انسان کے جسم کے لئے مختلف خلیوں کی ضرورت ہوتی ہے، ایک عضو میں سننے کی صلاحیت ہوتی ہے تو دوسرے میں دیکھنے کی صلاحیت ہوتی ہے زبان سے گفتگو کی جاتی ہے، پیروں سے ادھر ادھر جانا ہوتا ہے، لہٰذا جس طرح انسان کے لئے مختلف اعضا و جوارح کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح ایک ''عمدہ معاشرہ'' کے لئے مختلف صلاحیتوں اور استعداد کی ضرورت ہوتی ہے جن میں سے بعض لوگ بدنی طور پر کام کریں اور بعض لوگ علمی اور غور و فکر کا کام انجام دیں، لیکن یہ نہیں کہ معاشرہ میں کچھ لوگ غربت اور پریشانی کی زندگی بسر کریں، یا ان کی خدمات کو اہمیت نہ دی جائے یا ان کو ذلت کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ جس طرح سے انسانی اعضا و جوارح اپنے تمام تر فرق کے باوجود ہر قسم کی غذا اور دوسری ضرورتوں سے فیضیاب ہوتے ہیں۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ انسان میں روحی اور جسمی طبیعی اختلاف خداوند عالم کی حکمت کے عین مطابق ہے اور خداوند عالم کی عدالت، حکمت سے کبھی جدا نہیں ہوتی، مثال کے طور پر اگر انسان کے تمام اعضا ایک ہی طرح کے خلق کئے جاتے تو اس کی حکمت کے منافی تھا اور یہ عدالت نہ ہوتی، جبکہ عدالت کے معنی ہر چیز کو اس کی جگہ پر قرار دینے کے ہیں، اسی طرح اگر معاشرہ کے تمام لوگ ایک روز ایک ہی بات سوچیں اور ایک دوسرے کی استعداد برابر ہو جائے تو اسی ایک دن میں معاشرہ کی حالت درہم و برہم ہو جائے گی! (۱)

(۱) تفسیر نمونہ، جلد ۲، صفحہ ۳۶۵۔

۲۰۔ کیا روزی کے لحاظ سے لوگوں میں موجودہ فرق، عدالت الٰہی سے ہم آہنگ ہے؟

قرآن کریم کے سورہ نحل میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَاللهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ﴾ (۱) "خداوند عالم نے تم میں سے بعض لوگوں کو روزی کے لحاظ سے بعض دوسرے لوگوں پر برتری دی ہے"۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسانوں کے درمیان رزق و روزی کے لحاظ سے فرق قرار دینا کیا خداوند عالم کی عدالت اور معاشرہ کے لئے ضروری مساوات سے ہم آہنگ ہے؟

قارئین کرام! اس سوال کے جواب میں دو نکتوں کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے

۱۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مادی اسباب اور مال و دولت کے لحاظ سے انسانوں کے درمیان پائے جانے والے فرق کی اہم وجہ خود انسانوں کی استعداد اور صلاحیت ہے، انسان میں موجودہ جسمی اور عقلی بھی فرق ہی باعث ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کے پاس بہت زیادہ مال و دولت جمع ہو جائے اور بعض دوسروں کے پاس نسبتاً کم رہے۔

---

(۱) سورہ نحل، آیت ۷۱۔

البتہ اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ بعض لوگ اتفاقات کی بنا پر مالدار بن جاتے ہیں جو کہ خود ہمارے نظریہ کے مطابق صرف ایک اتفاق ہوتا ہے لیکن ایسی چیزوں کو مستثنیٰ شمار کیا جاسکتا ہے، ہاں جو چیز اکثر اوقات قاعدہ وقانون کے تحت ہوتی ہے تو وہ استعداد وصلاحیت اور انسان کی کارکردگی کا فرق ہے (البتہ ہماری گفتگو ایسے سالم معاشرہ کے بارے میں ہے جس میں ظلم وستم نہ ہو اور نہ ہی استثمار، اور نہ ہی ایسا معاشرہ جو قوانین خلقت اور انسانی نظام سے بالکل دور ہو)

تعجب کی بات تو یہ ہے کہ کبھی کبھی ہم جن لوگوں کو اپاہج [لولا اور لنگڑا] اور کم اہمیت سمجھتے ہیں وہ بہت زیادہ مال ودولت جمع کر لیتے ہیں اور اگر ان کے جسم وعقل کے بارے میں مزید غور وفکر کریں اور ظاہری طور پر فیصلہ کرنے کے بجائے گہرائی سے سوچیں تو ہمیں یہ بات معلوم ہوجائے گی کہ ان کے اندر کچھ ایسی طاقتور چیزیں پائی جاتی ہیں جن کی وجہ سے وہ اس مقام تک پہنچے ہیں، (ایک بار پھر اس بات کی تکرار کرتے ہیں کہ ہماری بحث ایک سالم اور ظلم وستم سے دور معاشرہ کے بارے میں ہے)۔

بہر حال استعداد اور صلاحیت کی وجہ سے آمدنی میں فرق ہوتا ہے، اور استعداد خداوند عالم کی عطا کردہ نعمت ہے، ہوسکتا ہے بعض مقامات میں انسان سعی وکوشش کے ذریعہ کسب کرلے، لیکن دیگر مواقع پر انسان کسب نہیں کرسکتا، یہاں تک کہ ایک سالم معاشرہ میں بھی اقتصادی لحاظ سے درآمد میں فرق پایا جانا چاہئے، مگر یہ کہ ایک جیسے انسان، ایک جیسی استعداد اور ایک جیسے رنگ کے انسان بن جائیں کہ جن میں ذرہ برابر بھی کوئی فرق نہ ہو، جو خود مشکلات اور پریشانیوں کی ابتدا ہے!

۲۔ کسی انسان کے بدن، یا کسی درخت یا کسی پھول کو مد نظر رکھیں، کیا یہ ممکن ہے کہ ان تمام چیزوں کے جسم کے تمام اعضا ہر لحاظ سے ایک جیسے ہوجائیں؟

تو کیا درختوں کی جڑوں کی طاقت نازک پتوں کی طرح یا انسان کے پیر کی ایڑی، آنکھ کے نازک پردہ کی طرح ہوسکتی ہے؟ اگر ہم ان کو ایک جیسا بنادیں تو کیا ہمارے اس کام کو صحیح کہا جاسکے

گا؟! [اگر یہ نازک آنکھ، ایڑی کی طرح سخت یا ایڑی، آنکھ کی طرح نرم ہو جائے تو انسان کتنے دن زندہ رہ سکتا ہے؟!!]

اگر جھوٹے نعرے اور شعور سے خالی نعروں کو دور رکھ کر فرض کریں کہ اگر ہم نے کسی روز تمام انسانوں کو ایک طرح بنا دیا جو ہر لحاظ سے ایک جیسے ہوں، اور دنیا کی آبادی پانچ ارب فرض کریں اور وہ سبھی ذوق، فکر و صلاحیت بلکہ ہر لحاظ سے ایک جیسے ہوں، بالکل ایک کارخانہ سے بننے والی سگریٹ کی طرح۔

تو کیا اس وقت انسان بہتر طور پر زندگی گزار سکے گا؟ قطعی طور پر جواب منفی ہوگا، یہی نہیں بلکہ دنیا ایک جہنم بن جائے گی، سب لوگ ایک چیز کی طرف دوڑیں گے، ایک ہی عہدہ کے طالب ہوں گے، سب کو ایک ہی کھانا اچھا لگے گا، اور سب ایک ہی کام کرنا چاہیں گے!

یہ بات مکمل طور پر واضح ہے کہ اس طرح زندگی کی گاڑی نہیں چل سکتی، اور اگر یہ گاڑی چلی بھی تو واقعاً بور کرنے والی، بے مزہ اور ایک طرح کی ہوگی، جس کا موت سے کوئی زیادہ فرق نہیں ہوگا۔

اجتماعی زندگی کی بقا بلکہ مختلف استعداد کی پرورش کے لئے نہایت ضروری ہے کہ استعداد اور صلاحیت میں فرق ہو، جھوٹے نعرے اس حقیقت پر پردہ نہیں ڈال سکتے۔

لیکن اس بات سے کوئی یہ مطلب نہ نکالے کہ ہم طبقاتی نظام یا استعماری نظام کو قبول کرتے ہیں، نہیں، ہرگز نہیں، ہماری مراد طبیعی فرق ہے نہ کہ مصنوعی، اور وہ فرق مراد ہے جو ایک دوسرے کے تعاون کا باعث ہو، نہ کہ ایک دوسرے کی ترقی میں رکاوٹ بنے، اور جس سے ایک دوسرے پر ظلم و ستم کیا جائے۔

طبقاتی اختلاف (توجہ رہے کہ طبقات سے مراد وہی استثماری نظام اور استعماری نظام کو قبول کرنے والے لوگ ہیں) نظام خلقت کے موافق نہیں ہے، بلکہ نظام خلقت سے موافق استعداد

اور صلاحیت اور سعی وکوشش کا فرق ہے، اور ان دونوں کے درمیان زمین تا آسمان فرق ہے۔ (غور کیجئے)

دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ استعداد اور لیاقت کے فرق سے اپنی اور معاشرہ کی فلاح وبہبود کے راستہ میں مدد لی جائے، بالکل ایک بدن کے اعضا کے فرق کی طرح، یا ایک پھول کے مختلف حصوں کی طرح، جو اپنے فرق کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کے مددگار ہیں نہ کہ ایک دوسرے کے لئے باعث زحمت وپریشانی۔

المختصر: استعداد اور صلاحیت کے فرق سے غلط فائدہ نہیں اٹھانا چاہئے، اور نہ ہی اس کو طبقاتی نظام بنانے میں بروئے کار لانا چاہئے۔

اسی وجہ سے قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿أَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُونَ﴾ (۱) "کیا خداوند عالم کی عطا کردہ نعمتوں کا انکار کرتے ہو؟"۔

اس آیت میں طبیعی طور پر فرق (نہ کہ مصنوعی اور ظالمانہ فرق) خداوند عالم کی ان نعمتوں میں سے ہے جس کو معاشرہ کی بقا کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے۔ (۲)

---

(۱) سورۂ نحل، آیت ۷۱۔

(۲) تفسیر نمونہ، جلد ۱۱، صفحہ ۳۱۲۔

۲۱۔ انسان کو پیش آنے والی پریشانیوں اور مصیبتوں کا فلسفہ کیا ہے؟

جیسا کہ سورہ شوریٰ آیت نمبر ۳۰ میں ارشاد ہوا: ﴿وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ﴾ "جو مصیبت بھی تم پر پڑتی ہے وہ تمہارے کئے ہوئے اعمال کی وجہ سے ہوتی ہے"۔

مذکورہ آیت کے پیش نظر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم پر پڑنے والی مصیبتوں کا سرچشمہ کیا ہے؟

اس آیت سے متعلق چند نکات کے بارے میں غور کرنے سے بات واضح ہو جاتی ہے۔

۱۔ آیۂ کریمہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسان پر پڑنے والی مصیبتیں ایک طرح سے خدا کی طرف سے سزا اور ایک چیلنج ہوتی ہیں، (اگرچہ بعض مقامات جدا ہیں جن کی طرف ہم بعد میں اشارہ کریں گے) اس وجہ سے دردناک حادثات اور زندگی میں آنے والی پریشانیوں کا فلسفہ سمجھ میں آجاتا ہے۔

جیسا کہ حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام سے منقول حدیث میں آیا ہے کہ آپ پیغمبر اکرمؐ سے نقل کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا

یہ آیۂ شریفہ ﴿وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ ...﴾ قرآن کریم کی بہترین آیت ہے، یا علی! انسان کے جسم میں کوئی خراش نہیں آتی، اور نہ ہی کسی قدم میں لڑکھڑاہٹ پیدا ہوتی مگر اس کے

انجام دئے گناہوں کی بنا پر آتی ہے، اور جو کچھ خداوند عالم اس دنیا میں معاف کردیتا ہے اس سے کہیں زیادہ قیامت کے دن معاف فرمائے گا، اور جو کچھ اس دنیا میں عقوبت اور سزا دی ہے تو خدا اس سے کہیں زیادہ عادل ہے کہ روز قیامت اس کو دوبارہ سزا دے"۔(۱)

لہٰذا اس طرح کے مصائب اور پریشانیاں نہ صرف یہ کہ انسان کے بوجھ کو کم کردیتی ہیں بلکہ آئندہ کے لئے بھی اس کو کنٹرول کرتی رہتی ہیں۔

۲۔ اگرچہ آیت کے ظاہر سے عمومیت کا اندازہ ہوتا ہے یعنی تمام مصیبتوں اور پریشانیوں کو شامل ہے، لیکن مشہور قاعدہ کے مطابق تمام عموم میں ایک مستثنیٰ ہوتا ہے، جیسا کہ انبیاء اور ائمہ علیہم السلام کو بہت سے مصائب اور پریشانیاں پیش آئی ہیں، جن کی وجہ سے ان حضرات کا امتحان ہوا ہے جس سے ان کا مقام رفیع و بلند ہوا ہے۔

اسی طرح جن مصائب سے غیر معصومین دوچار ہوئے ہیں ان میں بھی امتحان اور آزمائش کا پہلو رہا ہے۔

یا جو مصائب جہالت کی بنا پر یا غور وفکر اور مشورہ نہ کرنے کی وجہ سے یا کاہلی اور سستی کی بنا پر پیش آتے ہیں وہ خود انسان کے اعمال کا اثر ہوتا ہے۔

با لفاظ دیگر قرآن مجید کی مختلف آیات اور معصومین علیہم اسلام سے منقول روایت کے پیش نظر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مذکورہ آیت کی عمومیت سے بعض مقامات مستثنیٰ ہیں، اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ بعض مفسرین نے اس مسئلہ میں مستقل باب میں بحث وگفتگو کی ہے۔

خلاصہ یہ کہ بڑے بڑے مصائب اور پریشانیوں کے مختلف فلسفے ہوتے ہیں جن کے بارے میں توحید اور عدل الٰہی کی بحث میں اشارہ کیا جاچکا ہے۔

(۱) "مجمع البیان"، جلد ۹، صفحہ ۳۱ اس حدیث کو "در المنثور" و تفسیر "روح المعانی" میں مختصر فرق کے ساتھ بیان کیا ہے اور اس طرح کی حدیثیں بہت زیادہ ہیں۔

مصائب اور مشکلات '' استعداد کی ترقی '' آئندہ کے لئے چیلنج، امتحان الٰہی، غفلت، غرور کا خاتمہ اور گناہوں کا کفارہ ہوتے ہیں۔

لیکن چونکہ یہ مصائب اور مشکلات اکثر افراد کے لئے کفارہ اور سزا کا پہلو رکھتے ہیں لہٰذا مذکورہ آیت نے عام طور پر بیان کیا ہے، اسی طرح حدیث میں بھی وارد ہوا ہے کہ جس وقت حضرت امام زین العابدین علیہ السلام یزید کے دربار میں پہنچے تو یزید نے آپ کی طرف دیکھا اور کہا:

"یا علیّ! وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ!"

(یعنی کربلا کا واقعہ تمہارے اعمال کا نتیجہ ہے)

لیکن امام زین العابدین علیہ السلام نے فوراً اس کے جواب میں فرمایا:

"نہیں ایسا نہیں ہے، یہ آیہ شریفہ ہماری شان میں نازل نہیں ہوئی ہے، ہماری شان میں نازل ہونے والی دوسری آیت ہے، جس میں ارشاد ہوتا ہے: ہر وہ مصیبت جو زمین یا تمہارے جسم و جان پر آتی ہے، خلقت سے پہلے کتاب (لوح محفوظ) میں موجود تھی، خداوند عالم ان چیزوں سے باخبر ہے، یہ اس لئے ہے تاکہ تم مصیبتوں میں غمگین نہ ہو اور جو کچھ تمہارے پاس ہے اس پر بہت زیادہ خوش نہ ہو، (ان مصائب کا مقصد یہ ہے کہ تم جلد فنا ہونے والی اس دنیوی زندگی سے دل نہ لگاؤ، یہ چیزیں تمہارے لئے ایک امتحان اور آزمائش ہے)

اس کے بعد امام علیہ السلام نے فرمایا: "ہم کسی چیز کے نقصان پر کبھی غمگین نہیں ہوتے، اور جو کچھ ہمارے ہاتھ میں ہوتا ہے اس پر خوش نہیں ہوتے، (ہم سب چیزوں کو جلد ختم ہونے والی مانتے ہیں، اور خداوند عالم کے لطف و کرم کے منتظر رہتے ہیں)(۱)

۳۔ بعض اوقات مصائب، اجتماعی پہلو رکھتے ہیں اور تمام لوگوں کے گناہوں کا نتیجہ ہوتے

(۱) تفسیر "علی بن ابراہیم" مطابق "نور الثقلین"، جلد ۴، صفحہ ۵۸۔

ہیں جیسے کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا:

﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ﴾(۱)

"لوگوں کے ہاتھوں کی کمائی کی بنا پر فساد خشکی اور تری ہر جگہ غالب آگیا ہے تاکہ خدا ان کے کچھ اعمال کا مزہ چکھا دے تو شاید یہ لوگ پلٹ کر راستہ پر آجائیں"۔

یہ بات واضح ہے کہ یہ سب اس انسانی معاشرہ کے لئے ہے جو اپنے کئے ہوئے اعمال کی وجہ سے عذاب اور مشکلات میں گرفتار ہو جاتا ہے۔

اسی طرح سورہ رعد آیت نمبر ۱۱ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ﴾

"اور خدا کسی قوم کے حالات کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے کو تبدیل نہ کرلے"۔

اور اسی طرح کی دیگر آیات اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ انسان کے اعمال اور اس کی زندگی کے درمیان ایک خاص رابطہ ہے کہ اگر فطرت اور خلقت کے اصول کے تحت قدم اٹھائے تو خداوند عالم کی طرف سے برکت عطا ہوتی ہے، اور جب انسان ان اصول سے گمراہ ہو جاتا ہے تو اس کی زندگی بھی تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔(۲)

اس سلسلہ میں اسلامی معتبر کتابوں میں بہت سی روایات بیان ہوئی ہیں ہم ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کرکے اپنی بحث کو مکمل کرتے ہیں:

۱۔ حضرت علی علیہ السلام اپنے ایک خطبہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

---

(۱) سورہ روم، آیت ۴۱۔ (۲) تفسیر المیزان، جلد ۱۸، صفحہ ۹

"مَا كَانَ قَطُّ فِي غَضِّ نِعمَةٍ مِنْ عَيشٍ، فَزَالَ عَنْهُم، إِلَّا بِذُنُوبٍ اجترحُوهَا، لِأَنَّ اللهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِلْعَبِيدِ، وَلَوْ كَانَ النَّاسُ حِينَ تَنزِلُ بِهِمُ النِّقَمُ، وَتَزُولُ عَنْهُمُ النِّعَمُ، فَزِعُوا إِلَى رَبِّهِمْ بِصِدقٍ مِنْ نِيَّاتِهِمْ وَوَلَهٍ مِنْ قُلُوبِهِمْ، لَرَدَّ عَلَيْهِمْ كُلَّ شَارِدٍ، وَأَصْلَحَ لَهُمْ كُلَّ فَاسِدٍ"(۱)

"خدا کی قسم کوئی بھی قوم جو نعمتوں کی تر و تازہ اور شاداب زندگی میں تھی اور پھر اس کی وہ زندگی زائل ہوگئی تو اس کا کوئی سبب ان گناہوں کے علاوہ نہیں ہے جن کا ارتکاب اس قوم نے کیا ہے، اس لئے کہ پروردگار اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا ہے، پھر بھی جن لوگوں پر عتاب نازل ہوتا ہے اور نعمتیں زائل ہوجاتی ہیں اگر صدق نیت اور سچے دل سے پروردگار کی بارگاہ میں فریاد کریں تو وہ گئی ہوئی نعمت واپس کردے گا اور بگڑے کاموں کو بنا دے گا"۔

۲۔ کتاب "جامع الاخبار" میں حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام سے ایک دوسری روایت نقل ہوئی ہے کہ آپ نے فرمایا:

"إِنَّ الْبَلَاءَ لِلظَّالِمِ أَدَبٌ، وَلِلْمُؤْمِنِ امْتِحَانٌ، وَلِلْأَنْبِيَاءِ دَرَجَةٌ وَلِلْأَوْلِيَاءِ كَرَامَةٌ"(۲)

"انسان پر پڑنے والی یہ مصیبتیں؛ ظالم کے لئے سزا، مومنین کے لئے امتحان، انبیاء اور پیامبروں کے لئے درجات [کی بلندی] اور اولیاء الٰہی کے کرامت و بزرگی ہوتی ہیں"۔

یہ حدیث اس بات پر ایک بہترین گواہ ہے کہ مذکورہ آیت میں کچھ مقامات مستثنیٰ ہیں۔

۳۔ ایک دوسری حدیث اصول کافی میں حضرت امام صادق علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے کہ آپ نے فرمایا:

(۱) نہج البلاغہ، خطبہ ۱۷۸۔ (۲) بحار الانوار، جلد ۸۱، صفحہ ۱۹۸۔

"إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا كَثُرَتْ ذُنُوبُهُ ،وَلَمْ يَكُنْ عِنْدَهُ مِنَ الْعَمَلِ مَا يُكَفِّرُهَا، ابتلاهُ بِالْحُزْنِ لِيُكَفِّرَهَا"(۱)

"جس وقت انسان کے گناہ زیادہ ہوجاتے ہیں اور جبران وتلافی کرنے والے اعمال اس کے پاس نہیں ہوتے تو خداوندعالم اس کو غم واندوہ میں مبتلا کردیتا ہے تاکہ اس کے گناہوں کی تلافی ہوجائے"۔

۲۔ اصول کافی میں اس سلسلہ میں ایک خاص باب قرار دیا گیا ہے جس میں ۱۲ حدیثیں بیان ہوئی ہیں۔(۲)

البتہ یہ تمام ان گناہوں کے علاوہ ہے جن کو خداوندعالم مذکورہ آیت کے مطابق معاف کردیتا ہے اور انسان پر رحمت کی بارش برساتا ہے جو خود ایک عظیم نعمت ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

ممکن ہے کہ بعض لوگ اس قرآنی حقیقت سے غلط فائدہ اٹھائیں اور وہ یہ کہ جو مصیبت بھی ان پر پڑے اس کا پُر جوش استقبال کریں اور کہیں کہ ہمیں ان تمام مصائب کے سامنے تسلیم ہونا چاہئے ،اور اس درس آموز اصل اور قرآنی حقیقت کے برعکس نتیجہ اخذ کریں ،یعنی اس سے غلط نتیجہ اخذ کریں کہ جو بہت زیادہ خطرناک ہے۔

کبھی بھی قرآن کریم یہ نہیں کہتا کہ مصیبتوں کے سامنے تسلیم ہوجائیں اور ان کو دور کرنے کے لئے کوشش نہ کریں، اور ظلم وستم اور بیماریوں کے مقابلہ میں خاموش رہیں، بلکہ قرآن کا فرمان

(۱)"اصول کافی"،جلد دوم،کتاب الایمان والکفر باب تعجیل عقوبۃ الذنب حدیث۲

(۲)"اصول کافی"،جلددوم،کتاب الایمان والکفر باب تعجیل عقوبۃ الذنب حدیث۲

ہے: اگر اپنی تمام تر کوشش کے باوجود مشکلات دور نہ ہوں تو سمجھ لو کہ کوئی ایسا گناہ کیا ہے جس کی یہ سزا مل رہی ہے، لہٰذا اپنے گزشتہ اعمال کی طرف توجہ کریں اور اپنے گناہوں سے توبہ واستغفار کریں، اور اپنی اصلاح کریں اپنے کو برائیوں سے دور کریں۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض روایات میں مذکورہ آیت کو انھیں بہترین اور اہم تربیتی آثار کی بناپر ''بہترین آیت'' شمار کیا گیا ہے، اور دوسری طرف اس سے انسان کا بوجھ بھی کم ہوتا ہے، اس کے دل میں امید کی کرن پیدا ہوتی ہے اور خدا کا عشق بھی پیدا ہوجاتا ہے۔(۱)

---

(۱) تفسیر نمونہ، جلد ۲۰، صفحہ ۳۳۰

۲۴۔خداوند عالم نے شیطان کو کیوں پیدا کیا؟

بہت سے لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ اگر انسان خدا کی عبادت کے ذریعہ سعادت اور کمال تک پہنچنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے تو پھر کمال اور سعادت کے مخالف شیطان کو کیوں پیدا کیا گیا، اس کی کیا دلیل ہو سکتی ہے؟ اور وہ بھی ایک ایسا وجود جو بہت ہوشیار، کینہ اور حسد رکھنے والا، مکار، فریب کار اور اپنے ارادہ میں مصمم ہے!

[قارئین کرام!] اگر ذرا بھی غور و فکر سے کام لیں تو اس دشمن کا وجود انسانوں کے کمال اور سعادت تک پہنچنے کے لئے مددگار ہے۔

کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے دفاع کرنے والی [ہماری] فوج، دشمن کے مقابلہ میں بہت زیادہ شجاع اور دلیر بن جاتی تھی، اور کامیابی کی منزلوں تک پہنچ جاتی تھی۔

طاقتور اور تجربہ کار وہی سپاہی اور سردار ہوتے ہیں جو بڑی بڑی جنگوں میں دشمن کے سامنے ڈٹ جاتے ہیں اور گھمسان کی جنگ لڑتے ہیں۔

وہی سیاستمدار تجربہ کار اور طاقتور ہوتے ہیں جو بڑے سے بڑے سیاسی بحران میں سختی کے ساتھ دشمن سے مقابلہ کرتے ہیں۔

نامی پہلوان وہی ہوتے ہیں جو اپنے مد مقابل طاقتور پہلوان سے زور آزمائی کرتے ہیں۔

اس وجہ سے کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ خداوند عالم کے نیک اور صالح بندے شیطان

سے ہر روز مقابلہ کرتے کرتے دن بدن طاقتور اور قدرت مند ہوتے چلے جاتے ہیں!

آج کل کے دانشور انسانی جسم میں پائے جانے والے خطرناک جراثیم کے بارے میں کہتے ہیں: اگر یہ نہ ہوتے تو انسان کے خلیے (Cells) سست اور ناکارہ ہو جاتے اور ایک احتمال کی بنا پر انسان کی رشد ونمو ۸۰ سینٹی میٹر سے زیادہ نہ ہوتی، اور سب کوتاہ قد نظر آتے، لیکن آج کا انسان مزاحم میکروب سے لڑتے لڑتے بہت طاقتور بن گیا ہے۔

بالکل اسی طرح انسان کی روح ہے جو ہوائے نفس اور شیطان سے مقابلہ کرتے کرتے طاقتور ہو جاتی ہے۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ شیطان کی ذمہ داری ہے کہ وہ خدا کے بندوں کو بہکائے، پہلے شیطان کی خلقت دوسری مخلوق کی طرح پاک و پاکیزہ تھی انسان میں انحراف، گمراہی، بدبختی اور شیطنت اس کے اپنے ارادہ سے ہوتی ہیں، لہٰذا خداوندعالم نے ابلیس کو شیطان نہیں پیدا کیا تھا اس نے خود اپنے آپ کو شیطان بنایا، لیکن شیطنت کے باوجود خدا کے حق طلب بندوں کو نہ صرف یہ کہ کوئی نقصان نہیں پہنچتا بلکہ ان کی ترقی اور کامیابی کا زینہ ہے۔ (غور کیجئے)

لیکن یہاں پر یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ خداوندعالم نے اسے قیامت تک کی زندگی کیوں دیدی، کیوں فوراً ہی اس کو نیست ونابود کیوں نہ کردیا؟!

اگرچہ گزشتہ گفتگو سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے لیکن ہم ایک اور چیز عرض کرتے ہیں:

دنیا امتحان اور آزمائش کی جگہ ہے، (انسان کی کامیابی اور ترقی کا باعث امتحان اور آزمائش ہے) اور ہم جانتے ہیں کہ یہ امتحان اور آزمائش، بڑے دشمن اور طوفان سے مقابلہ کئے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔

البتہ اگر شیطان نہ ہوتا تو بھی انسان کی ہوائے نفس اور نفسانی وسوسہ کے ذریعہ انسان کا

امتحان ہوسکتا تھا، لیکن شیطان کے ہونے سے اس تنور کی آگ اور زیادہ بھڑک گئی ہے، کیونکہ شیطان باہر سے بہکانے والا ہے اور ہوائے نفس انسان کو اندر سے بہکاتی ہے۔(۱)

ایک سوال کا جواب:

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ خداوند عالم ایسے بے رحم اور طاقتور دشمن کے مقابلہ میں ہمیں تن تنہا چھوڑ دے؟ اور کیا یہ چیز خداوند عالم کی حکمت اور اس کے عدل و انصاف سے ہم آہنگ ہے؟

اس سوال کا جواب درج ذیل نکتہ سے واضح ہو جائے گا اور جیسا کہ قرآن مجید میں بھی بیان ہوا ہے کہ خداوند عالم مومنین کے ساتھ فرشتوں کا لشکر بھیجتا ہے اور غیبی اور معنوی طاقت عطا کرتا ہے جس سے جہاد بالنفس اور دشمن سے برسر پیکار ہونے میں مدد ملتی ہے۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ ☆ نَحْنُ أَوْلِيَاؤُكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ﴾(۲)

”بیشک جن لوگوں نے یہ کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے اور اس پر جمے رہے ان پر ملائکہ یہ پیغام لے کر نازل ہوتے ہیں کہ ڈرو نہیں اور رنجیدہ بھی نہ ہو اور اس جنت سے مسرور ہو جاؤ جس کا تم سے وعدہ کیا جارہا ہے، ہم زندگانی دنیا میں بھی تمہارے ساتھی تھے اور آخرت میں بھی تمہارے ساتھی ہیں“۔

ایک دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ شیطان کبھی بھی ہمارے دل میں اچانک نہیں آتا، اور ہماری روح کے باڈر سے بغیر پاسپورٹ کے داخل نہیں ہوسکتا، اس کا حملہ کبھی بھی اچانک نہیں ہوتا، وہ ہماری

---

(۱)تفسیر نمونہ، جلد ۱۹ صفحہ ۳۳۵

(۲)سورۂ فصلت، آیت ۳۰۔۳۱

اجازت سے ہم پر سوار ہوتا ہے، جی ہاں وہ دروازہ سے آتا ہے نہ کہ کسی مورچہ سے، یہ ہم ہی ہیں جو اس کے لئے دروازہ کھول دیتے ہیں، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ، إِنَّمَا سُلْطَانُهُ عَلَى الَّذِينَ يَتَوَلَّوْنَهُ وَالَّذِينَ هُمْ بِهِ مُشْرِكُونَ﴾(۱)

''شیطان ہرگز ان لوگوں پر غلبہ نہیں پاسکتا جو صاحبان ایمان ہیں اور جن کا اللہ پر توکل اور اعتماد ہے، اس کا غلبہ صرف ان لوگوں پر ہوتا ہے جو اسے سرپرست بناتے ہیں اور اللہ کے بارے میں شرک کرنے والے ہیں''۔

اصولی طور پر یہ انسان کے اعمال ہوتے ہیں جو شیطان کے سوار ہونے کا راستہ ہموار کرتے ہیں، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ﴾(۲)

''اسراف کرنے والے شیاطین کے بھائی ہیں''۔

لیکن بہرحال شیطان اور اس کے مختلف سپاہیوں کے رنگارنگ جال، مختلف شہوتیں، فساد کے ٹھکانے، استعماری سیاست، انحرافی مکاتب اور منحرف ثقافت سے نجات کے لئے ایمان وتقویٰ، اور لطف الٰہی اور خدا پر بھروسہ کرنے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَلَوْلاَ فَضْلُ اللهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لاَتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَانَ إِلاَّ قَلِيلاً﴾(۳)

''اور اگر تم لوگوں پر خدا کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو چند افراد کے علاوہ سب شیطان کا اتباع کر لیتے''۔(۴)

(۱)سورۂ نحل، آیت۹۹،۱۰۰

(۲)سورۂ اسراء، آیت ۲۷

(۳)سورۂ نساء، آیت ۸۳

(۴)تفسیر پیام قرآن، جلد اول، صفحہ ۲۲۳

انبیاء علیهم السلام

۲۳۔ خاتمیت انسانی تدریجی ترقی کے ساتھ کس طرح ہم آہنگ ہے؟

کیا انسانی معاشرہ کسی ایک جگہ پر رک سکتا ہے؟ کیا انسان کے کمال اور ترقی کے لئے کوئی حد معین ہے؟ کیا ہم اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ رہے ہیں کہ آج کا انسان گزشتہ لوگوں کی نسبت بہت زیدہ آگے بڑھتا چلا جارہا ہے؟

ان حالات کے پیش نظر یہ کس طرح ممکن ہے کہ دفتر نبوت بالکل ہی بند ہو جائے اور انسان اس ترقی کے زمانہ میں اپنے کسی نئے رہبر اور نبی سے محروم ہو جائے؟

اس سوال کا جواب ایک نکتہ پر توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے اور وہ ہے کہ: انسان فکر و ثقافت کے مرحلہ میں اس منزل پر پہنچ چکا ہے کہ وہ پیغمبر خاتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بتائے ہوئے اصول اور تعلیمات کے پیش نظر کسی نئی شریعت کے بغیر اپنی ترقی کے مراحل کو طے کر سکتا ہے۔

یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے انسان کو تعلیم کے ہر مرحلہ میں ایک نئے استاد کی ضرورت ہوتی ہے، تاکہ تعلیم کے مختلف مراحل سے گزر کر آگے بڑھ سکے، لیکن جب انسان ڈاکٹر بن جاتا ہے یا کسی دوسرے علم میں صاحب نظر بن جاتا ہے تو پھر انسان کسی نئے استاد سے تعلیم حاصل نہیں کرتا بلکہ اپنے گزشتہ اساتذہ خصوصاً آخری استاد سے حاصل کئے ہوئے مطالب پر بحث و تحقیق کرتا ہے اور تعلیمی میدان میں آگے بڑھتا جاتا ہے نئی نئی تحقیق اور نئے نئے نظریات پیش کرتا ہے، دوسرے الفاظ میں یوں کہیں کہ اپنے گزشتہ اساتذہ کے بتائے ہوئے عام اصول کی بنا پر راستے کی مشکلات کو حل کرتا ہے۔

لہٰذا اس بات کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ زمانہ کے ساتھ ساتھ کوئی نیا دین اور نیا مذہب وجود میں آئے۔ (غور فرمایئے گا)

باالفاظِ دیگر: روحانی اور معنوی ترقی کی راہ میں موجود نشیب و فراز کے سلسلہ میں گزشتہ انبیاء نے بشری انسان کی ہدایت کے لئے نقشہ پیش کیا تاکہ انسان میں اتنی صلاحیت پیدا ہوجائے کہ اس راستہ کا جامع اور کلی نقشہ خداوند عالم کی طرف سے پیغمبر آخر الزمان ﷺ پیش فرمادیں۔

یہ بات واضح ہے کہ جامع اور کلی نقشہ حاصل کرنے کے بعد پھر کسی نقشہ کی ضرورت نہیں ہوتی ہے، اور یہ حقیقت خاتمیت کے سلسلہ میں بیان ہوئی احادیث میں موجود ہے، اور پیغمبر اکرمؐ کو رسالت کی آخری اینٹ یا خوبصورت محل کی آخری اینٹ رکھنے والے کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے۔

یہ تمام چیزیں کسی نئے دین ومذہب کی ضرورت نہ ہونے کے لئے کافی ہیں، [یعنی مذکورہ باتوں کے پیش نظر اب کسی نئے دین کی ضرورت نہیں ہے] لیکن رہبری اور امامت کا مسئلہ انھیں کلی اصول وقوانین پر عمل درآمد ہونے پر نظارت اور اس راہ میں پیچھے رہ جانے والوں کو امداد پہنچانے کے عنوان سے ہے، لبتہ یہ ایک الگ مسئلہ ہے کہ انسان کبھی بھی ان سے بے نیاز نہیں ہوسکتا ہمیشہ امام اور رہبر کی ضرورت رہے گی، اس دلیل کی بناپر سلسلۂ نبوت کے ختم ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ سلسلہ امامت بھی ختم ہوجائے، کیونکہ ''ان اصول کی وضاحت''، ''ان کا بیان کرنا'' اور ''ان کو عملی جامہ پہنانا'' بغیر کسی معصوم رہبر کے ممکن نہیں ہے۔(۱)

---

(۱)تفسیر نمونہ، جلد ۱۷، صفحہ ۳۳۵

۲۴۔ثابت قوانین، آج کل کی مختلف ضرورتوں سے کس طرح ہم آہنگ ہے؟

ہم یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ زمان ومکان کے لحاظ سے ضرورتیں الگ الگ ہوتی ہیں، دوسرے الفاظ میں یوں کہیں کہ انسان کی ضرورت ہمیشہ بدلتی رہتی ہے، حالانکہ خاتم النبیین کی شریعت ثابت اور غیر قابل تبدیل ہے، کیا یہ ثابت شریعت زمانہ کے لحاظ سے مختلف ضرورتوں کو پورا کرسکتی ہے؟

اگر اسلام کے تمام قوانین جزئی اور انفرادی ہوتے اور ہر موضوع کا حکم مکمل طور پر معین، مشخص اور جزئی ہوتا تو اس سوال کی گنجائش ہوتی، لیکن کیونکہ اسلام کے احکام وقوانین بہت وسیع اور کلی اصول پر مبنی ہیں جن پر ہر زمانہ کی مختلف ضرورتوں کو منطبق کیا جاسکتا ہے، اور اس کے لحاظ سے جواب دیا جاسکتا ہے، لہٰذا اس طرح کے سوال کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی، مثال کے طور پر عصر حاضر میں مختلف معاملات انسانی معاشرہ کی ضرورت بنتے جارہے ہیں جب صدر اسلام میں ایسے معاملات نہیں تھے جیسے "بیمہ" یا اس کی مختلف شاخیں، جو اس زمانہ میں نہیں تھیں،(۱) اسی طرح آج کل کی

---

(۱) صدر اسلام میں "بیمہ" سے مشابہ موضوعات موجود ہیں لیکن خاص محدودیت کے ساتھ جیسے ضمان جریرہ، تحلق دیہ خطا عقل پہ عاقلہ" لیکن یہ مسائل صرف شباہت کی حد تک ہیں

ضرورت کے تحت بڑی بڑی کمپنیاں بنائی جاتی ہیں، ان تمام چیزوں کے لئے اسلام میں ایک کلی اصل موجود ہے، جو سورہ مائدہ کے شروع میں بیان ہوئی ہے جسے "وفائے عہد" کہا جاتا ہے، ارشاد ہوتا ہے: ﴿یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ﴾ (۱) "اے وہ لوگو جو ایمان لائے اپنے معاملات میں وفائے عہد کرو"۔

ہم ان تمام معاہدات کو اس کے تحت قرار دے سکتے ہیں، البتہ بعض قیود اور شرائط اس اصل میں بیان ہوئی ہیں، جن پر توجہ رکھنا ضروری ہے، لہٰذا یہ عام قانون اس سلسلہ میں موجود ہے، اگرچہ اس کے مصادیق بدلتے رہتے ہیں اور ہر روز اس کا ایک نیا مصداق پیدا ہوتا رہتا ہے۔

دوسری مثال: ہمیں اسلام میں ایک مسلّم اور ثابت قانون ملتا ہے جو "قانونِ لاضرر" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے [یعنی کسی کا کوئی نقصان نہیں ہونا چاہئے] جس کے ذریعہ اسلامی معاشرہ میں کسی بھی طرح کے نقصان کے سلسلہ میں حکم لگایا جاسکتا ہے، اور اس کے تحت معاشرہ کی بہت سی مشکلوں کو حل کیا جاسکتا ہے۔

اس کے علاوہ "معاشرہ کا تحفظ"، "مقدمۂ واجب کا واجب ہونا" اور "اہم ومہم" جیسے مسائل کے ذریعہ بھی بہت سی مشکلات کو حل کیا جاسکتا ہے، ان تمام چیزوں کے علاوہ اسلامی حکومت میں "ولی فقیہ" بہت سے اختیارات اور امکانات ہوتے ہیں اسلامی کلی اصول کے تحت بہت سی مشکلات کو حل کیا جاسکتا ہے، البتہ ان تمام امور کے بیان کے لئے بہت زیادہ بحث وگفتگو کی ضرورت ہے خصوصاً جب کہ "باب اجتہاد" (۲) کھلا ہے، جس کی تفصیل بیان کرنے کا یہ موقع نہیں ہے، لیکن جن چیزوں کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے وہ مذکورہ اعتراض کے جواب کے لئے کافی ہیں۔ (۳)

---

(۱) سورہ مائدہ، آیت ۱۔

(۲) اجتہاد یعنی اسلامی منابع ومآخذ کے ذریعہ الٰہی احکام حاصل کرنا۔

(۳) تفسیر نمونہ، جلد ۱۷، صفحہ ۳۳۶

۲۵۔ کیا توریت اور انجیل میں پیغمبر اکرمؐ کی بشارت دی گئی ہے؟

جیسا کہ ہم سورہ اعراف میں پڑھتے ہیں: ﴿الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ﴾(۱) ''جو لوگ ہمارے رسول نبی امی کا اتباع کرتے ہیں جس (کی بشارت) کو وہ اپنے پاس توریت اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں''۔

مذکورہ آیت کے پیش نظر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا توریت اور انجیل میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور کی بشارت دی گئی ہے؟

اگرچہ یقینی قرائن اور اسی طرح یہودیوں اور عیسائیوں کے یہاں دور حاضر کی موجودہ ''مقدس کتابوں'' [توریت وانجیل] کے مطالب اس بات پر یہ دونوں گواہ ہیں کہ جناب موسیٰ علیہ السلام اور جناب عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی آسمانی یہ دونوں کتابیں اصل نہیں ہیں، بلکہ ان میں بہت زیادہ تبدیلی کردی گئی ہے، یہاں تک کہ بعض تو بالکل ہی ختم ہوگئی ہے، اور جو کچھ اس وقت کی موجودہ مقدس کتابوں میں موجود ہے وہ انسانی فکر اور بعض خدا کی طرف سے موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام پر نازل ہونے والے مطالب کا ایک مرکب مجموعہ ہے، جس کو ان کے بعض شاگردوں نے جمع کیا ہے۔(۲)

---

(۱)سورہ اعراف، آیت ۱۵۷

(۲) اس سلسلہ میں مزید آگاہی کے لئے کتاب ''رہبر سعادت یا دین محمد'' اور کتاب ''قرآن و آخرین پیامبر'' کو ملاحظہ فرمائیں۔

اس بنا پر، ان موجودہ کتابوں میں اگر کوئی ایسا جملہ نہ ملے جس میں صراحت کے ساتھ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور کی بشارت دی گئی ہو، تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

لیکن تحریف کے باوجود بھی ان کتابوں میں ایسے الفاظ ملتے ہیں جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور کی بشارت پر دلالت کرتے ہیں، جن کو مسلمان دانشوروں نے اپنی کتابوں اور مضامین میں تحریر کیا ہے، چونکہ ان تمام مطالب کو ذکر کرنا اس کتاب کی گنجائش سے باہر ہے لہٰذا نمونہ کے طور پر چند چیزوں کو بیان کرتے ہیں۔

۱۔ توریت کے سفر تکوین فصل ۱۷، نمبر ۱۷ سے ۲۰ تک میں اس طرح مرقوم ہے:

''اور ابراہیم نے خداوند عالم سے فرمایا کہ اے کاش! اسماعیل تیرے حضور میں زندگی کرتا اور اسماعیل کے حق میں تیری دعا کو سنا، اس وجہ سے اس کو صاحب برکت قرار دیا اور اس کو پھل دار بنادیا ہے، اور آخر کار اس کی اولاد کو کثیر قرار دیا، اس کے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور اس کو ایک عظیم امت قرار دوں گا''۔

۲۔ سفر پیدائش باب ۴۹، نمبر ۱۰ میں وارد ہوا ہے:

عصا ی سلطنت یہودا سے اور ایک فرمان روا اس کے پیروں کے آگے سے قیام کرے گا تا اینکہ ''شیلوہ'' آجائے کہ اس پر تمام امتیں اکٹھا ہوجائیں گی۔

یہاں پر قابل توجہ بات یہ ہے کہ شیلوہ کے ایک معنی ''رسول'' یا ''رسول اللہ'' کے ہیں، جیسا کہ مسٹر ہاکس نے کتاب ''قاموس مقدس'' میں بیان کیا ہے۔

۳۔ کتاب انجیل یوحنا، باب ۱۴، نمبر ۱۵، ۱۶ میں یوں بیان ہوا ہے:

''اگر تم لوگ مجھے دوست رکھتے ہو تو میرے احکام کی رعایت کرو، میں پدر سے درخواست کروں گا وہ تمہیں ایک اور تسلی دینے والا عطا کرے گا جو ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے گا''۔

۴۔ اسی طرح مذکورہ کتاب انجیل یوحنا، باب ۱۵، نمبر ۲۶ میں اس طرح وارد ہوا ہے۔

''جب وہ تسلی دینے والا آجائے گا جس کو میں پدر کی طرف سے بھجواؤں گا یعنی وہ سچی روح جو پدر کی طرف سے آئے گی، وہ میرے بارے میں شہادت دی گی''۔

۵۔ نیز اسی انجیل یوحنا باب ۱۶، نمبر ۷ کے بعد میں وارد ہوا ہے:

''لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اگر میں تمہارے درمیان سے چلا جاؤں تو یہ تمہارے لئے مفید ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں گا تو تمہارے پاس وہ تسلی دینے والا نہیں آئے گا، اور اگر میں چلا گیا تو اس کو تمہارے لئے بھیج دوں گا۔ لیکن جب وہ سچی روح تمہارے پاس آجائے گی تو تمہیں تمام سچائیوں کی طرف ہدایت کر دے گی، کیونکہ وہ اپنی طرف سے کچھ کلام نہیں کرے گا بلکہ جو کچھ اس کو سنائی دے گا وہی کہے گا، اور تمہیں آئندہ کے بارے میں خبر [بھی] دے گا''(۱)

قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ فارسی انجیل میں ''تسلی دینے والے'' کی جگہ عربی انجیل مطبوعہ لندن (ولیم وٹس پریس، ۱۸۵۷ء) میں اس کی جگہ ''فارقلیطا'' ذکر ہوا ہے۔(۲)

ایک اور زندہ گواہ

''فخر الاسلام'' جو کتاب ''انیس الاعلام'' کے مؤلف ہیں پہلے عیسائی عالم تھے، انھوں نے اپنی تعلیم عیسائی پادریوں میں مکمل کی تھی اور ان کے درمیان ایک بلند مقام حاصل کر لیا تھا وہ انیس الاعلام کے مقدمہ میں اپنے مسلمان ہونے کے عجیب وغریب واقعہ کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

''....بڑی جستجو، زحمتوں اور کئی ایک شہروں میں گردش کے بعد میں ایک عظیم پادری کے پاس پہنچا جو زہد و تقویٰ میں ممتاز تھا، ''کیتھولک'' فرقہ کے بادشاہ وغیرہ اپنے مسائل میں اس کی طرف رجوع

(۱) مذکورہ تمام تحریریں، جن کو عہد قدیم اور عہد جدید سے نقل کیا گیا ہے، اس فارسی ترجمہ سے ہے جو ۱۸۷۸ء میں لندن سے عیسائی مترجمین کے ذریعہ عبرانی زبان سے فارسی میں ترجمہ کیا گیا ہے۔

(۲) تفسیر نمونہ، جلد ۹، صفحہ ۳۰۲

کرتے تھے، ایک مدت تک میں اس کے پاس نصاریٰ کے مختلف مذاہب کی تعلیم حاصل کرتا رہا، اس کے بہت سے شاگرد تھے لیکن اتفاقاً مجھ سے اسے کچھ خاص ہی لگاؤ تھا، اس کے گھر کی تمام کنجیاں میرے ہاتھ میں تھیں، صرف ایک صندوق خانے کی کنجی اس کے پاس ہوا کرتی تھی۔

اس دوران وہ پادری بیمار ہوگیا تو اس نے مجھ سے کہا کہ شاگردوں سے جا کر کہہ دو کہ آج میں درس نہیں دے سکتا، جب میں طالب علموں کے پاس آیا تو دیکھا کہ وہ سب بحث ومباحثے میں مصروف ہیں یہ بحث سریانی کے لفظ ''فارقلیط'' اور یونانی زبان کے لفظ ''پریکلتوس'' کے معنی تک جا پہنچی اور وہ کافی دیر تک جھگڑتے رہے، ہر ایک کی الگ رائے تھی، واپس آنے پر استاد نے مجھ سے پوچھا تم لوگوں نے آج کیا بحث کی ہے؟ تو میں نے لفظ فارقلیطا کا اختلاف اس کے سامنے بیان کیا وہ کہنے لگا: تو نے ان میں کس قول کا انتخاب کیا ہے، میں نے کہا کہ فلاں مفسر کے قول کو پسند کیا ہے۔

استاد پادری کہنے لگا تو نے کوتاہی تو نہیں کی لیکن حق وحقیقت ان تمام اقوال کے خلاف ہے کیونکہ اس کی حقیقت کو ''رَاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ'' کے علاوہ دوسرے لوگ نہیں جانتے اور ان میں سے بھی بہت کم اس حقیقت سے آشنا ہیں، میں نے اصرار کیا کہ اس کے معنی مجھے بتائیے، وہ بہت رویا اور کہنے لگا میں کوئی چیز تم سے نہیں چھپاتا لیکن اس نام کے معنی معلوم ہوجانے کا نتیجہ تو بہت سخت ہوگا کیونکہ اس کے معلوم ہونے کے ساتھ ساتھ مجھے اور تمہیں قتل کر دیا جائے گا، اب اگر تم وعدہ کرو کہ کسی سے نہیں کہو گے تو میں اسے ظاہر کردیتا ہوں۔

میں نے تمام مقدسات مذہبی کی قسم کھائی کہ اسے فاش نہیں کروں گا تو اس نے کہا کہ یہ مسلمانوں کے پیغمبر کے ناموں میں سے ایک نام ہے اور اس کے معنی ''احمد'' اور ''محمد'' ہیں۔

اس کے بعد اس نے اس چھوٹے کمرے کی کنجی مجھے دی اور کہا کہ فلاں صندوق کا دروازہ کھولو اور فلاں فلاں کتاب لے آؤ، چنانچہ میں وہ کتابیں اس کے پاس لے آیا، یہ دونوں کتابیں رسول اسلام ﷺ کے ظہور سے پہلے کی تھیں اور چمڑے پر لکھی ہوئی تھیں۔

دونوں کتابوں میں لفظ ''فارقلیط'' کا ترجمہ ''احمد'' اور ''محمد'' کیا گیا تھا اس کے بعد استاد نے مزید کہا کہ آنحضرت کے ظہور سے پہلے علمائے نصاریٰ میں کوئی اختلاف نہ تھا کہ فارقلیطا کے معنی احمد و محمد ہیں، لیکن ظہور محمد [صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم] کے بعد اپنی سرداری اور مادی فوائد کی بقا کے لئے اس کی تاویل کر دی اور اس کے نئے دوسرے معنی گڑھ لئے حالانکہ صاحب انجیل کی مراد وہ معنی یقیناً نہیں ہیں۔

میں نے سوال کیا کہ دین نصاریٰ کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں، اس نے کہا دین اسلام کے آنے سے منسوخ ہو گیا ہے اس جملہ کی اس نے تین مرتبہ تکرار کی۔

پس میں نے کہا کہ اس زمانہ میں طریق نجات اور صراط مستقیم، کونسا راستہ ہے؟۔

اس نے کہا: مختصر یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی پیروی واتباع کرو۔

میں نے کہا: کیا اس کی پیروی کرنے والے اہل نجات ہیں؟ اس نے کہا ہاں! خدا کی قسم (اور تین مرتبہ قسم کھائی)

پھر استاد نے گریہ کیا اور میں بھی بہت رویا اور اس نے کہا اگر آخرت اور نجات چاہتے ہو تو دین حق ضرور قبول کرو، میں ہمیشہ تمہارے لئے دعا کروں گا اس شرط کے ساتھ کہ قیامت کے دن گواہی دو کہ میں باطن میں مسلمان اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا پیروکار ہوں اور علمائے نصاریٰ کے ایک گروہ کی باطن میں مجھ جیسی حالت ہے اور ظاہراً میری طرح اپنے دنیاوی مقام سے کنارہ کش نہیں ہو سکتے ورنہ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ اس وقت روئے زمین پر دین خدا دین اسلام ہی ہے۔''!!(۱)

آپ دیکھیں کہ علمائے اہل کتاب نے پیامبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ظہور کے بعد اپنے ذاتی مفاد کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے نام اور نشانیوں کو بدل ڈالا۔!!(۲)

---

(۱) اقتباس، از کتاب ہدایت دوم، مقدمہ کتاب انیس الاعلام، اختصار کے ساتھ

(۲) تفسیر نمونہ، جلد اول، صفحہ ۲۱۱

۲۶۔اولوالعزم پیغمبر کون ہیں؟

جیسا کہ سورہ احقاف آیت ۳۵ میں ہم پڑھتے ہیں: ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ ...﴾ اے پیغمبر! آپ اسی طرح صبر کریں جس طرح پہلے اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اولوالعزم پیغمبر کون ہیں؟

اس سلسلہ میں مفسرین کے درمیان بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے، قبل اس کے کہ اس سلسلہ میں تحقیق کریں پہلے ''عزم'' کے معنی کو دیکھیں کیونکہ ''اولوالعزم'' یعنی صاحبان ''عزم''۔

''عزم'' کے معنی مستحکم اور مضبوط ارادہ کے ہیں، راغب اصفہانی اپنی مشہور و معروف کتاب ''مفردات'' میں کہتے ہیں عزم کے معنی کسی کام کے لئے مصمم ارادہ کرنا ہے، ''عقد القلب علی امضاء الامر''

قرآن مجید میں کبھی ''عزم'' کے معنی صبر کے لئے گئے ہیں، جیسا کہ ارشاد خداوند ہے:

﴿وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ﴾(۱)

''اور یقیناً جو صبر کرے اور معاف کردے تو اس کا یہ عمل بڑے صبر کا کام ہے''۔

---

(۱) سورۂ شوریٰ، آیت ۴۳

اور کبھی "وفائے عہد" کے معنی میں استعمال ہوا ہے، جیسا کہ ارشاد ہوا

﴿وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَىٰ آدَمَ مِن قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا﴾ (۱)

"اور ہم نے آدم سے اس سے پہلے عہد لیا مگر انھوں نے اسے ترک کردیا اور ہم نے ان کے پاس عزم وثبات نہیں پایا"۔

لیکن چونکہ صاحب شریعت انبیاء علیہم السلام ایک نئی اور تازہ شریعت لے کر آتے تھے، جس کی بنا پر ان کو بہت سی مشکلات پیش آتی تھی، جن سے مقابلہ کرنے کے لئے ان کو مستحکم اور مصمم ارادہ کی ضرورت ہوتی تھی، لہٰذا ان انبیاء کو "اولوالعزم" پیغمبر کہا گیا، اور مذکورہ آیت بھی ظاہراً انھیں معنی کی طرف اشارہ کررہی ہے۔

ضمنی طور پر ایک اشارہ یہ بھی ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان ہی اولوالعزم پیغمبروں میں سے ہیں، کیونکہ ارشاد ہوا "آپ بھی اسی طرح صبر کریں جس طرح سے آپ سے پہلے اولوالعزم پیغمبروں نے صبر سے کام لیا ہے"۔

اگر بعض مفسرین نے "عزم" اور "عزیمت" کے معنی "حکم وشریعت" مراد لیتے ہیں تو اس کی وجہ بھی یہی ہے ورنہ لغوی اعتبار سے "عزم" کے معنی "شریعت" نہیں ہے۔

بہر حال ان معنی کے لحاظ سے "مِنَ الرُّسُل" میں "مِن" "تبعیضیہ" ہے جس سے کچھ خاص بزرگ پیغمبر مراد ہیں جو صاحب شریعت تھے، جیسا کہ سورہ احزاب میں بھی اسی چیز کی طرف اشارہ ہے۔

﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ وَمِنكَ وَمِن نُّوحٍ وَإِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَأَخَذْنَا مِنْهُم مِّيثَاقًا غَلِيظًا﴾ (۲)

---

(۱) سورۂ طٰہٰ، آیت ۱۱۵۔ (۲) سورہ احزاب، آیت ۷۔

''اور اس وقت کو یاد کیجئے جب ہم نے تمام انبیاء سے اور بالخصوص آپ سے اور نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ بن مریم سے عہد لیا اور سب سے بہت سخت قسم کا عہد لیا''۔

یہاں پر تمام انبیاء علیہم السلام کو صیغہ جمع کی صورت میں بیان کرنے کے بعد ان پانچ اولوالعزم پیغمبروں کا نام لینا یہ ان کی خصوصیت پر بہترین دلیل ہے۔

اسی طرح سورہ شوریٰ میں بھی اولوالعزم پیغمبر کے بارے میں بیان ہوا ہے، ارشاد خداوند عالم ہے:

﴿شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ﴾(۱)

''اس نے تمہارے لئے دین میں وہ راستہ مقرر کیا ہے جس کی نصیحت نوح کو کی ہے اور جس کی وحی اے پیغمبر! تمہاری طرف بھی کی ہے، اور جس کی نصیحت ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو بھی کی ہے''۔

اسی طرح شیعہ اور سنی معتبر کتابوں میں روایات بیان ہوئی ہیں کہ اولوالعزم یہی پانچ پیغمبر تھے، جیسا کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک حدیث کے ضمن میں بیان ہوا ہے۔

"مِنْهُم خَمْسَةٌ أَوَّلُهم نُوح، ثُمَّ إبراهِيمَ، ثُمَّ موسى، ثُمَّ عِيسىٰ، ثُمَّ مُحَمَّد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم"(۲)

''اولوالعزم پیغمبر پانچ ہیں، پہلے جناب نوحؑ، ان کے بعد جناب ابراہیمؑ، ان کے بعد جناب موسیٰ، ان کے بعد حضرت عیسیٰ اور آخر میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم''۔

---

(۱) سورۂ شوریٰ، آیت ۱۳

(۲) ''مجمع البیان'' محل بحث آیات کے ذیل میں، (جلد ۹، صفحہ ۲۴)

اور جب سائل نے سوال کیا: "لم سموا اولو العزم" ان کو اولوالعزم کیوں کہا جاتا ہے؟

تو امام علیہ السلام نے اس کے جواب میں فرمایا:

"لأنّهُم بَعثُوا إلیٰ شَرقِهَا وَ غَربِهَا وَ جِنّها وَ إنسِها"(۱)

"کیونکہ [یہ اولوالعزم] پیغمبر مشرق ومغرب اور جن وانس کے لئے مبعوث ہوئے ہیں"۔

اسی طرح ایک دوسری حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا

"سَادَةُ النَّبِیّین وَالمُرسَلِینَ خَمسَةٌ وَهُم اولوا العزمِ مِنَ الرُّسل و علیهم دارة الرَّحیٰ نوح و ابراهیم وموسیٰ و عیسیٰ ومحمد ﷺ"(۲)

"انبیاء ومرسلین کے سردار پانچ نبی ہیں اور نبوت ورسالت کی چکی ان ہی کے دم پر چلتی ہے، اور وہ یہ ہیں جناب نوح، جناب ابراہیم، جناب موسیٰ، جناب عیسیٰ اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ"۔

تفسیر "الدر المنثور" میں ابن عباس سے یہی روایت کی گئی ہے کہ اولوالعزم یہی پانچ پیغمبر ہیں۔(۳)

لیکن بعض مفسرین نے ان انبیاء کو اولوالعزم پیغمبر بتایا ہے جو دشمنوں سے جنگ کرنے پر مامور ہوئے ہیں۔

اسی طرح بعض مفسرین نے اولوالعزم پیغمبر کی تعداد ۳۱۳ بیان کی ہے،(۴) جبکہ بعض مفسرین نے تمام انبیاء علیہم السلام کو اولوالعزم پیغمبر قرار دیا ہے(۵) اور اس نظریہ کے مطابق "مِن الرُّسل" میں "من" "بیانیہ" ہوگا "تبعیضیہ" نہیں، لیکن پہلی تفسیر سب سے زیادہ صحیح ہے اور اسلامی روایات سے بھی اس کی تاکید ہوتی ہے۔(۶)

---

(۱) بحار الانوار، جلد ۱۱، صفحہ ۵۸، (حدیث ۶۱) اور اسی جلد میں صفحہ ۵۶، حدیث ۵۵، میں بھی صراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

(۲) اصول کافی، جلد ۱، باب "طبقات الانبیاء والرسل" حدیث ۳

(۳،۴،۵) الدر المنثور، جلد ۶، صفحہ ۴۵۔ (۶) تفسیر نمونہ، جلد ۲۱، صفحہ ۳۷۷۔

۲۷۔ بچپن میں نبوت یا امامت ملنا کس طرح ممکن ہے؟

جیسا کہ ہم قرآن مجید میں پڑھتے ہیں: ﴿یَا یَحْیَی خُذِ الْکِتَابَ بِقُوَّۃٍ وَ آتَیْنَاہُ الْحُکْمَ صَبِیًّا﴾(۱)

''[اے] یحیٰ! کتاب کو مضبوطی سے پکڑ لو اور ہم نے انھیں بچپنے ہی میں نبوت عطا کردی''۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ انسان کو مقام نبوت یا امامت بچپن میں ہی مل جائے؟

یہ بات صحیح ہے کہ عام طور پر انسان کی عقل کی ترقی ایک موقع پر ہوتی ہے، لیکن ہم یہ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہمیشہ معاشرہ میں کچھ عجیب وغریب قسم کے افراد پائے جاتے ہیں، ان کی عقل کی پرواز بہت زیادہ ہوتی ہے، تو پھر کیا ممانعت ہے کہ خداوند عالم اس وقت کو بعض مصلحت کی بنا پر مختصر کردے اور بعض انسان کے لئے کم مدت میں اس مرحلہ کو طے کرائے، کیونکہ عام طور پر بچہ ایک سال کے بعد بولنا شروع کرتا ہے جبکہ ہم جانتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ولادت کے وقت ہی بولنے لگے اور وہ بھی پُر معنی مطالب جو بڑے بڑے ذہین لوگوں کے الفاظ ہوتے ہیں۔

---

(۱)سورہ مریم، آیت ۲

یہاں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ شیعوں کے بعض ائمہ کس طرح بچپن میں مقام امامت تک پہنچ گئے، ان کا یہ اعتراض بے بنیاد ہے۔

حضرت امام محمد تقی علیہ السلام کے صحابی "علی بن اسباط" نے روایت کی ہے کہ میں امام علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا (جبکہ امام علیہ السلام کی عمر کم تھی) میں امام کے قد وقامت کو غور سے دیکھ رہا تھا تاکہ ذہن نشین کروں اور جب مصر واپس جاؤں تو دوستوں کے لئے آپ کے قد وقامت کو ہو بہو بیان کروں، بالکل اسی وقت جب میں یہ سوچ رہا تھا تو امام علیہ السلام بیٹھ گئے (گویا امام میرے سوال کو سمجھ گئے) اور میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا اے علی بن اسباط! خداوند عالم نے امامت کے سلسلہ میں وہی کیا جو نبوت کے بارے میں انجام دیا ہے، کبھی ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَآتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا﴾ (ہم نے یحیی کو بچپن میں نبوت وعقل ودرایت عطا کی" اور کبھی انسان کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے: ﴿حَتَّى إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَبَلَغَ أَرْبَعِينَ سَنَةً﴾ (احقاف/۱۵) (جب انسان بلوغ کامل کی حد تک پہنچا تو چالیس سال کا ہوگیا)، پس جس طرح خدا کے لئے یہ ممکن ہے کہ انسان کو بچپن ہی میں نبوت وحکمت عطا فرمائے جبکہ وہی چیز انسان کی عقل کو چالیس سال میں مکمل فرمائے۔(۱)

مذکورہ آیت ان لوگوں کے لئے ایک دندان شکن جواب ہے جو حضرت علی علیہ السلام کے سلسلہ میں اعتراض کرتے ہیں کہ مردوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں حضرت علی علیہ السلام نہیں ہیں کیونکہ اس وقت آپ کی عمر ۱۰ سال تھی اور دس سال کے بچہ کا ایمان قابل قبول نہیں ہے۔

[قارئین کرام!] یہاں پر اس نکتہ کا ذکر بیجا نہ ہوگا جیسا کہ ہم حضرت امام علی بن موسی الرضا علیہ السلام سے منقول ایک حدیث میں پڑھتے ہیں کہ حضرت یحیی علیہ السلام کے زمانہ کے کچھ بچے

(۱) نور الثقلین، جلد ۳، صفحہ ۳۲۵

ان کے پاس آئے اور کہا "اذهب بنا نلعب" (آؤ چلو آپس میں کھیلتے ہیں) تو جناب یحییٰ علیہ السلام نے فرمایا "ما للعب خلقت" (ہم کھیلنے کے لئے پیدا نہیں ہوئے ہیں) اس موقع پر خداوند عالم نے ان کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی ﴿وَآتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا﴾(۱)

البتہ اس چیز پر توجہ رکھنا چاہئے کہ یہاں پر "کھیل" سے مراد بیہودہ اور بے فائدہ کھیل مراد ہے ورنہ اگر کھیل سے کوئی منطقی اور عاقلانہ فائدہ ہو تو اس کا حکم جدا ہے۔(۲)

---

(۱) نور الثقلین، جلد ۳، صفحہ ۳۲۵ (سورہ مریم، آیت ۱۲)

(۲) تفسیر نمونہ، جلد ۱۳، صفحہ ۱۷

۲۸۔ وحی کی اسرار آمیز حقیقت کیا ہے؟

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہم "وحی" کی حقیقت کے بارے میں بہت زیادہ معلومات حاصل نہیں کرسکتے، کیونکہ وحی ایک ایسا "ادراک" ہے جو ہمارے ادراک اور سمجھ کی حد سے باہر ہے، بلکہ یہ ایک ایسا رابطہ ہے جو ہمارے جانے پہچانے ہوئے ارتباط سے باہر ہے، پس ہم عالم وحی سے اس لئے آشنا نہیں ہوسکتے کہ یہ ہماری سمجھ سے باہر ہے۔

لہذا ایک خاکی انسان عالم ہستی سے کس طرح رابطہ پیدا کرسکتا ہے؟ اور خداوند عالم جو ازلی، ابدی اور ہر لحاظ سے نامحدود ہے کس طرح محدود و ممکن الوجود سے رابطہ برقرار کرتا ہے؟ وحی نازل ہوتے وقت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کس طرح یقین کرتے تھے کہ یہ رابطہ خدا کی طرف سے ہے؟!

یہ تمام ایسے سوالات ہیں جن کا جواب دینا مشکل ہے، اور اس کے سمجھنے کے لئے زیادہ کوشش کرنا [بھی] بے کار ہے۔

ہم یہاں یہ عرض کرتے ہیں کہ اس طرح کا رابطہ موجود ہے، چنانچہ ہمارا یہ نظریہ ہے کہ اس طرح کے رابطہ کی نفی پر کوئی عقلی دلیل موجود نہیں ہے، بلکہ اس کے برخلاف اپنی اس دنیا میں بھی کچھ ایسے راز ہوتے ہیں جن کو ہم بیان کرنے سے عاجز ہیں، اور ان خاص رابطوں کے پیش نظر ہمیں اندازہ ہوجاتا ہے کہ ہمارے احساس و رابطہ کے مافوق بھی احساس، ادراک اور آنکھیں موجود ہیں۔

مناسب ہے کہ اس بات کو واضح کرنے کے لئے ایک مثال کا سہارا لیا جائے۔

فرض کیجئے کہ ہم کسی ایسے شہر میں زندگی بسر کرتے ہوں جہاں پر صرف اور صرف نابینا لوگ رہتے ہوں (البتہ پیدائشی نابینا) اور وہاں صرف ہم ہی دیکھنے والے ہوں، شہر کے تمام لوگ "چار حس" والے ہوں (اس فرض کے ساتھ کہ انسان کی پانچ حس ہوتی ہیں) اور صرف ہم ہی "پانچ حس" والے ہوں، ہم اس شہر میں ہونے والے مختلف واقعات کو دیکھتے ہیں اور شہر والوں کو خبر دیتے ہیں، لیکن وہ سب تعجب کرتے ہیں کہ یہ پانچویں حس کیا چیز ہے، جس کی کارکردگی کا دائرہ اتنا وسیع ہے؟ اور ان کے لئے جس قدر بھی بینائی کے بارے میں بحث وگفتگو کریں تو بے فائدہ ہے، ان کے ذہن میں ایک نامفہوم شکل کے علاوہ کچھ نہیں آئے گا، ایک طرف سے اس کا انکار بھی نہیں کرسکتے، کیونکہ اس کے مختلف آثار وفوائد کا احساس کرتے ہیں، دوسری طرف چونکہ بینائی کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ بھی نہیں سکتے ہیں کیونکہ انھوں نے لحہ بھر کے لئے بھی نہیں دیکھا ہے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ وحی "چھٹی حس" کا نام ہے بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ ایک قسم کا ادارک اور عالم غیب اور ذات خدا سے رابطہ ہے جو ہمارے یہاں نہیں پایا جاتا ہے، جس کی حقیقت کو ہم نہیں سمجھ سکتے، اگرچہ اس کے آثار کی وجہ سے اس پر ایمان رکھتے ہیں۔

ہم تو صرف یہی دیکھتے ہیں کہ صاحب عظمت افراد ایسے مطالب جو انسانی فکر سے بلند ہیں؛ اس کے ساتھ انسانوں کے پاس آتے ہیں اور ان کو خدا اور دین الٰہی کی طرف بلاتے ہیں، اور ایسے معجزات پیش کرتے ہیں جو انسانی طاقت سے بلند وبالا ہے، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کا عالم غیب سے رابطہ ہے، جس کے آثار واضح وروشن ہیں لیکن اس کی حقیقت مخفی ہے۔

کیا ہم نے اس دنیا کے تمام رازوں کو کشف کرلیا ہے کہ اگر وحی کی حقیقت کو نہ سمجھ سکیں تو اس کا انکار کرڈالیں؟

تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ہم حیوانات کے یہاں بعض پُر اسرار چیزیں دیکھتے ہیں جن کی تفسیر وتوضیح سے عاجز ہیں، مگر مہاجر پرندے جو کبھی کبھی ۱۸۰۰۰ کلو میٹر کا طولانی سفر طے کرتے ہیں

اور قطب شمال سے جنوب کی طرف یا اس کے برعکس جنوب سے شمال کی طرف سفر کرتے ہیں، کیا ان کی پُراسرار زندگی ہمارے لئے واضح ہے؟

یہ پرندے کس طرح سمت کا پتہ لگاتے ہیں اور اپنے راستہ کو صحیح پہچانتے ہیں؟ کبھی دن میں اور کبھی اندھیری رات میں دور دراز کا سفر طے کرتے ہیں حالانکہ اگر ہم ان کی طرح بغیر کسی وسیلہ اور گائڈ کے ایک فی صد بھی سفر کریں تو بہت جلد راستہ بھٹک جائیں گے، یہ وہ چیز ہے جس کے سلسلہ میں علم و دانش بھی ابھی تک پردہ نہیں اٹھا سکی، اسی طرح بہت سی مچھلیاں دریا کی گہرائی میں رہتی ہیں اور انڈے دینے کے وقت پنی جائے پیدائش تک پہنچ جاتی ہیں کہ شاید ہزاروں کلو میٹر کا فاصلہ ہو، یہ مچھلیاں کس طرح اپنی جائے پیدائش کو اتنی آسانی سے تلاش کر لیتی ہیں؟

ان کے علاوہ اس دنیا میں ہمیں بہت سی مثالیں ملتی ہیں جو ہمیں انکار اور نفی سے روک دیتی ہیں، اس جگہ ہمیں شیخ الرئیس ابو علی سینا کا قول یاد آتا ہے "کُلُّ ما قَرَعَ سمعکَ مِن الغرائبِ فضعه فی بقعة الإمکان مالم یذدکَ عنه قاطعُ البرهانِ" (اگر کوئی عجیب و غریب چیز سننے میں آئے تو اس کا انکار نہ کرو، بلکہ اس کے بارے میں یہ کہو کہ ممکن ہے، جب تک کہ اس کے برخلاف کوئی مضبوط دلیل نہ مل جائے!)

منکر وحی کی دلیل

جب بعض لوگوں کے سامنے وحی کا مسئلہ آتا ہے تو جلد بازی میں جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں: یہ چیز علم اور سائنس کے برخلاف ہے!

اگر ان سے سوال کیا جائے کہ یہ کہاں علم اور سائنس کے برخلاف ہے؟ تو یقین کے ساتھ اور مغرور لہجہ میں کہتے ہیں: جس چیز کو علوم طبیعی ورسائنس ثابت نہ کرے تو اس کے انکار کے لئے یہی کافی ہے، اصولی طور پر وہی مطلب ہمارے لئے قابل قبول ہے جو علوم اور سائنس کے تجربوں سے

ثابت ہو جائے!!

اس کے علاوہ سائنس کی ریسرچ نے اس بات کو ثابت نہیں کیا ہے کہ انسان کے اندر ایک ایسی حس موجود ہے جس سے ماوراء طبیعت کا پتہ لگایا جا سکے، انبیاء بھی ہماری ہی طرح انسان تھے ان کی اور ہماری جنس ایک ہی ہے، تو پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ ان کے یہاں ایسا احساس اور ادراک پایا جاتا ہو جو ہم میں نہ ہو؟

ہمیشہ کا اعتراض اور ہمیشہ کا جواب

مادہ پرستوں کا اعتراض صرف "وحی" کے سلسلہ میں نہیں ہے وہ تو "ماوراء طبیعت" کے تمام مسائل کا انکار کرتے رہتے ہیں، اور ہم اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے ہر جگہ یہی جواب پیش کرتے ہیں:

یہ بات ذہن نشین رہے کہ سائنس کا دائرہ صرف (مادی) دنیا تک ہے، اور سائنس کی بحث و گفتگو کا معیار اور آلات لیبریٹری، ٹلسکوپ، میکرواسکوپ وغیرہ ہیں اور اسی دائرے میں گفتگو ہوتی ہے، سائنس ان معیار اور وسائل کے ذریعہ "جہان مادہ" کے علاوہ کوئی بات نہیں کہہ سکتی نہ کسی چیز کو ثابت کرسکتی ہے اور نہ کسی چیز کا انکار کرسکتی ہے، اس بات کی دلیل بھی روشن ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ تمام وسائل محدود اور خاص دائرے سے مخصوص ہیں۔

بلکہ علم و سائنس کے مختلف آلات کسی دوسرے علم میں کارگر نہیں ہو سکتے، مثال کے طور پر اگر "سل" کے جراثیم کو بڑی بڑی نجومی ٹلسکوپ کے ذریعہ نہ دیکھا جا سکے تو اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح اگر "پلوٹن" ستارے کو میکروسکوپ اور ذرہ بین کے ذریعہ نہ دیکھا جا سکے تو اس پر اعتراض نہیں ہونا چاہئے!!

کسی چیز کی پہچان اور شناخت کے لئے اسی علم کے آلات اور وسائل ہونا ضروری ہے، لہٰذا

"ماوراء طبیعت" کی پہچان کے صرف عقلی دلائل ہی کارگر ہوسکتے ہیں جن کے ذریعہ اس عظیم دنیا کے راستے ہمارے لئے کھل جاتے ہیں۔

جو افراد علم کو اس کی حدود سے خارج کرتے ہیں وہ نہ عالم ہیں اور نہ فیلسوف، یہ لوگ صرف دعویٰ کرتے ہیں حالانکہ خطا کار اور گمراہ ہیں۔

ہم صرف یہی دیکھتے ہیں کہ کچھ عظیم انسان آئے اور ہمارے سامنے کچھ مطالب بیان کئے، جو نوع بشر کی طاقت سے باہر تھے، جس کی بنا پر ہم سمجھ گئے کہ ان کا "ماوراء طبیعت" سے رابطہ ہے، لیکن یہ رابطہ کیسا ہے؟ یہ ہمارے لئے بہت زیادہ اہم نہیں ہے، اہم بات یہ ہے کہ ہمیں اس بات کا علم ہونا چاہئے کہ ہاں اس طرح کا رابطہ موجود ہے۔(۱)

(۱) تفسیر نمونہ، جلد ۱۲، صفحہ ۲۴۶

۲۹۔ کیا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امّی تھے؟

"امّی" کے معنی میں تین مشہور احتمال پائے جاتے ہیں، پہلا احتمال یہ ہے کہ "امّی" یعنی جس نے سبق نہ پڑھا ہو، دوسرا احتمال یہ ہے کہ "امّی" یعنی جس کی جائے پیدائش مکہ ہو اور مکہ میں ظاہر ہوا ہو، اور تیسرے معنی یہ ہیں کہ "امّی" یعنی جس نے قوم اور امت کے درمیان قیام کیا ہو، لیکن سب سے زیادہ مشہور ومعروف پہلے معنی ہیں، جو استعمال کے موارد سے بھی ہم آہنگ ہیں، اور ممکن ہے تینوں معنی باہم مراد ہوں۔

اس سلسلہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے، کہ "پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی مکتب اور مدرسہ میں نہیں گئے" اور قرآن کریم نے بھی بعثت سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے:

﴿وَمَا كُنتَ تَتْلُوا مِن قَبْلِهِ مِن كِتَابٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ إِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُونَ﴾(۱)

"اور اے پیغمبر! آپ اس قرآن سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے کچھ لکھتے تھے ورنہ یہ اہل باطل شبہ میں پڑ جاتے"۔

---

(۱) سورۂ عنکبوت، آیت ۴۸

یہ بات حقیقت ہے کہ اس وقت پورے حجاز میں پڑھے لکھے لوگ اتنے کم تھے کہ ان کی تعداد انگشت شمار تھی اور سبھی ان کو جانتے تھے، مکہ میں جو حجاز کا مرکز شمار کیا جاتا تھا لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد ۱۷ سے زیادہ نہیں تھی اور عورتوں میں صرف ایک عورت پڑھی لکھی تھی۔(۱)

ایسے ماحول میں اگر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی استاد سے تعلیم حاصل کی ہوتی تو یقینی طور پر یہ بات مشہور ہو جاتی، بالفرض اگر [نعوذ باللہ] آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کو قبول نہ کریں، تو پھر آپ اپنی کتاب میں اس موضوع کی نفی کیسے کر سکتے تھے؟ کیا لوگ اعتراض نہ کرتے کہ تم نے تعلیم حاصل کی ہے، لہٰذا یہ بہترین شاہد ہے کہ آپ نے کسی کے پاس تعلیم حاصل نہیں کی ہے۔

بہر حال پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اس صفت کا ہونا نبوت کے اثبات کے لئے زیادہ بہتر ہے جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جس شخص نے کہیں کسی سے تعلیم حاصل نہ کی ہو وہ اس طرح کی عمدہ گفتگو کرتا ہے جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خداوند عالم اور عالم ماوراء طبیعت سے واقعاً رابطہ ہے۔

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت نبوت سے پہلے، لیکن بعثت کے بعد بھی کسی تاریخ نے نقل نہیں کیا کہ آپ نے کسی کے پاس لکھنا پڑھنا سیکھا ہو، لہٰذا معلوم یہ ہو کہ آپ اول عمر سے آخر عمر تک اسی ''امّی'' صفت پر باقی رہے۔

لیکن یہاں پر سب سے بڑی غلط فہمی یہ ہے جس سے اجتناب کرنا ضروری ہے وہ یہ کہ تعلیم حاصل نہ کرنے کے معنی جاہل ہونا نہیں ہے، اور جو لوگ لفظ ''امّی'' کے جاہل معنی کرتے ہیں وہ اس فرق کی طرف متوجہ نہیں ہیں۔

اس بات میں کوئی مانع نہیں ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تعلیم الٰہی کے ذریعہ ''پڑھنا'' یا ''پڑھنا

---

(۱) فتوح البلدان بلاذری، مطبوعہ مصر، صفحہ ۴۵۹

اور لکھنا" جانتے ہوں، بغیر اس کے کہ کسی انسان کے پاس تعلیم حاصل کی ہو، بے شک اس طرح کی معلومات انسانی کمالات میں سے ہیں اور مقام نبوت کے لئے ضروری ہیں۔

حضرات ائمہ معصومین علیہم السلام سے منقول روایات اس بات پر بہترین شاہد ہیں، جن میں بیان ہوا ہے. پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لکھنے پڑھنے کی قدرت رکھتے تھے۔(۱)

لیکن ان کی نبوت میں کہیں کوئی شک نہ کرے اس قدرت سے استفادہ نہیں کرتے تھے، اور جیسا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ لکھنے پڑھنے کی طاقت کوئی کمال محسوب نہیں ہوتی، بلکہ یہ دونوں علمی کمالات تک پہنچنے کے لئے کنجی کی حیثیت رکھتے ہیں نہ کہ علم واقعی اور کمال حقیقی تو اس کا جواب بھی اسی میں مخفی ہے کیونکہ کمالات کے وسائل سے آگاہی رکھنا خود ایک واضح کمال ہے۔

لیکن جیسا کہ بعض لوگوں کا تصور ہے. جس طرح کہ سورہ جمعہ میں بیان ہوا ہے.

﴿يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾(۲) یا اس کے مانند دوسری آیات، اس بات کی دلیل ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کے سامنے لکھی ہوئی کتاب [قرآن] سے پڑھتے تھے، یہ بھی ایک غلط فہمی ہے، کیونکہ تلاوت کے معنی لکھی ہوئی کتاب پڑھنا بھی ہیں اور زبانی طور پر پڑھنا بھی، جو لوگ قرآن، اشعار یا دعاؤں کو زبانی پڑھتے ہیں ان پر بھی تلاوت کا اطلاق بہت زیادہ ہوتا ہے۔(۳)

---

(۱) تفسیر برہان، جلد۴، صفحہ ۳۳۲، سورۂ جمعہ کی پہلی آیت کے ذیل میں.

(۲) سورہ جمعہ، آیت ۲" [وہ رسول] انھیں کے سامنے آیات کی تلاوت کرے ان کے نفوس کو پاکیزہ بنائے اور انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے"۔

(۳) تفسیر نمونہ، جلد ۶، صفحہ ۴۰۰.

۳۰۔ معراج؛ جسمانی تھی یا روحانی اور معراج کا مقصد کیا تھا؟

شیعہ، سنی تمام علمائے اسلام کے درمیان مشہور ہے کہ رسول اسلام کو یہ عالم بیداری میں معراج ہوئی، چنانچہ سورہ بنی اسرائیل کی پہلی آیت اور سورہ نجم کی آیات کا ظاہری مفہوم بھی اس بات پر گواہ ہے کہ یہ بیداری کی حالت میں معراج ہوئی۔

اسلامی تواریخ بھی اس بات پر گواہ ہیں چنانچہ بیان ہوا ہے، جس وقت رسول اللہؐ نے واقعۂ معراج کو بیان کیا تو مشرکین نے شدت کے ساتھ اس کا انکار کر دیا اور اسے آپ کے خلاف ایک بہانہ بنالیا۔

یہ بات خود اس چیز پر گواہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہرگز خواب یا روحانی معراج کے مدعی نہ تھے ورنہ مخالفین اتنا شور وغل نہ کرتے۔

لیکن جیسا کہ حسن بصری سے روایت ہے: "کان فی المنام رؤیا رآھا" (یہ واقعہ خواب میں پیش آیا)

اور اسی طرح حضرت عائشہ سے روایت ہے: "واللہ ما فقد جسد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولکن عرج بروحہ"

"خدا کی قسم بدن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم سے جدا نہیں ہوا صرف آپ کی روح آسمان پر گئی"۔

ظاہرا ایسی روایات سے کسی بیہودہ رکھتی ہیں۔(۱)

معراج کا مقصد

یہ بات ہمارے لئے واضح ہے کہ معراج کا مقصد یہ نہیں کہ رسول اکرمؐ دیدار خدا کے لئے آسمانوں پر جائیں، جیسے کہ سادہ لوح افراد خیال کرتے ہیں، افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بعض مغربی دانشور بھی ناآگاہی کی بنا پر دوسروں کے سامنے اسلام کا چہرہ بگاڑ کر پیش کرنے کے لئے ایسی باتیں کرتے ہیں جس میں سے ایک مسٹر ''گیور گیو'' بھی ہیں وہ بھی کتاب ''محمد وہ پیغمبر ہیں جنہیں پھر سے پہچاننا چاہئے''(۲) میں کہتے ہیں:

''محمد اپنے سفر معراج میں ایسی جگہ پہنچے کہ انہیں خدا کے قلم کی آواز سنائی دی، انہوں نے سمجھ کہ اللہ اپنے بندوں کے حساب کتاب میں مشغول ہے البتہ وہ اللہ کے قلم کی آواز تو سنتے تھے مگر انہیں اللہ دکھائی نہ دیتا تھا کیونکہ کوئی شخص خدا کو نہیں دیکھ سکتا خواہ پیغمبر ہی کیوں نہ ہوں''

یہ عبارت نشاندہی کرتی ہے کہ وہ قلم لکڑی کا تھا، اور وہ کاغذ پر لکھتے وقت لرزتا تھا اور اس سے آواز پیدا ہوتی تھی، اور اسی طرح کی اور بہت سے خرافات اس میں موجود ہیں''۔

جب کہ مقصد معراج یہ تھا کہ اللہ کے عظیم پیغمبر کائنات بالخصوص عالم بالا میں موجود عظمت الٰہی کی نشانیوں کا مشاہدہ کریں اور انسانوں کی ہدایت و رہبری کے لئے ایک نیا احساس اور ایک نئی بصیرت حاصل کریں۔

معراج کا ہدف واضح طور پر سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت اور سورۂ نجم کی آیت ۱۸ میں بیان ہوا ہے۔

---

(۱)تفسیر نمونہ، جلد ۱۲، صفحہ ۱۵.

(۲) مذکورہ کتاب کے فارسی ترجمہ کا نام ہے''محمد پیغمبری کہ از نو باید شناخت''صفحہ ۱۲۵.

اس سلسلہ میں ایک روایت امام صادق علیہ السلام سے بیان ہوئی ہے جس میں آپ سے مقصد معراج پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا

"إنّ اللہ لا یُوصف بمکانٍ ،ولا یجری علیہ زمان ،ولکنّہ عزّوجلّ أراد أنْ یشرف بہ ملائکتہ وسکان سماواتہ، و یکرّمھم بمشاھدتہ ،ویُریہ من عجائب عظمتہ مایخبر بہ بعد ھبوطہ" (۱)

"خدا ہرگز کوئی مکان نہیں رکھتا اور نہ اس پر کوئی زمانہ گزرتا ہے لیکن وہ چاہتا تھا کہ فرشتوں اور آسمان کے باشندوں کو اپنے پیغمبر کی تشریف آوری سے عزت بخشے اور انہیں آپ کی زیارت کا شرف عطا کرے نیز آپ کو اپنی عظمت کے عجائبات دکھائے تاکہ واپس آ کر ان کو لوگوں کے سامنے بیان کریں"۔(۲)

---

(۱) تفسیر برہان، جلد۲، صفحہ ۴۰۰

(۲) تفسیر نمونہ، جلد ۱۲، صفحہ ۱۶

۳۱۔ کیا معراج، آج کے علوم سے ہم آہنگ ہے؟

گزشتہ زمانے میں بعض فلاسفہ بطلیوس کی طرح یہ نظریہ رکھتے تھے کہ نو آسمان پیاز کے چھلکے کی طرح تہہ بہ تہہ ایک دوسرے کے اوپر ہیں واقعہ معراج کو قبول کرنے میں ان کے لئے سب سے بڑی رکاوٹ ان کا یہی نظریہ تھا ان کے خیال میں اس طرح تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ آسمان شگافتہ ہو گئے اور پھر آپس میں مل گئے؟(۱)

لیکن "بطلیموسی" نظریہ ختم ہو گیا تو آسمانوں کے شگافتہ ہونے کا مسئلہ ختم ہو گیا البتہ علم ہیئت میں جو ترقی ہوئی ہے اس سے معراج کے سلسلے میں نئے سوالات ابھرے ہیں مثلاً

۱۔ ایسے فضائی سفر میں پہلی رکاوٹ کشش ثقل ہے جس پر کنٹرول حاصل کرنے کے لئے غیر معمولی وسائل و ذرائع کی ضرورت ہے کیونکہ زمین کے مدار اور مرکز ثقل سے نکلنے کے لئے کم از کم چالیس ہزار کلو میٹر فی گھنٹہ رفتار کی ضرورت ہے۔

۲۔ دوسری رکاوٹ یہ ہے کہ زمین کے باہر خلا میں ہوا نہیں ہے جبکہ ہوا کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔

---

(۱) بعض قدیم فلاسفہ کا یہ نظریہ تھا کہ آسمانوں میں ایسا ہونا ممکن نہیں ہے، اصطلاح میں وہ کہتے تھے کہ افلاک میں "خرق" (پھٹنا) اور "التیام" (ملنا) ممکن نہیں۔

۳۔ایسے سفر میں تیسری رکاوٹ اس حصہ میں سورج کی جلادینے والی تپش ہے جبکہ جس حصہ پر سورج کی بلاواسطہ روشنی پڑ رہی ہے اور اسی طرح اس حصہ میں جان لیوا سردی ہے جس میں سورج کی روشنی نہیں پڑ رہی ہے۔

۴۔اس سفر میں چوتھی رکاوٹ وہ خطرناک شعاعیں ہیں کہ جو فضائے زمین کے اوپر موجود ہیں مثلاً کاسمک ریز cosmic ravs الٹراوائلٹ ریز ultra violet ravs اور ایکس ریز x ravs یہ شعاعیں اگر تھوڑی مقدار میں انسانی بدن پر پڑیں تو بدن کے ارگانزم organism کے لئے نقصان دہ نہیں ہیں لیکن فضائے زمین کے باہر یہ شعاعیں بہت تباہ کن ہوتی ہیں (زمین پر رہنے والوں کے لئے زمین کے اوپر موجودہ فضا کی وجہ سے ان کی تپش ختم ہوجاتی ہے)

۵۔ س سلسلہ میں ایک اور مشکل یہ ہے کہ خلا میں انسان کا وزن ختم ہوجاتا ہے اگرچہ تدریجاً بے وزنی کی عادت پیدا کی جاسکتی ہے لیکن اگر زمین کے باشندہ بغیر کسی تیاری اور تمہید کے خلا میں جا پہنچیں تو اس کیفیت سے نمٹنا بہت ہی مشکل ہے۔

۶۔اس سلسلہ میں آخری مشکل زمانہ کی مشکل ہے اور یہ نہایت اہم رکاوٹ ہے کیونکہ دور حاضر کے سائنسی علوم کے مطابق روشنی کی رفتار ہر چیز سے زیادہ ہے اور اگر کوئی آسمانوں کی سیر کرنا چاہے تو ضروری ہوگا کہ اس کی رفتار اس سے زیادہ ہو۔

ان سوالات کے پیش نظر چند چیزوں پر توجہ ضروری ہے:

۱۔ہم جانتے ہیں کہ فضائی سفر کی تمام تر مشکلات کے باوجود آخرکار انسان علم کی قوت سے اس پر دسترس حاصل کرچکا ہے اور سوائے زمانے کی مشکل کے باقی تمام مشکلات حل ہوچکی ہیں اور زمانے والی مشکل بھی بہت دور کے سفر سے مربوط ہے۔

۲۔اس میں شک نہیں کہ مسئلہ معراج عمومی اور معمولی پہلو نہیں رکھتا تھا بلکہ یہ اللہ کی لا متناہی

قدرت وطاقت کے ذریعہ صورت پذیر ہوااور انبیاء کے تمام معجزات اسی قسم کے تھے۔

زیادہ واضح الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ معجزہ عقلاً محال نہیں ہونا چاہئے اور جب معجزہ بھی عقلاً ممکن ہے، تو باقی معاملات اللہ کی قدرت سے حل ہو جاتے ہیں۔

جب انسان یہ طاقت رکھتا ہے کہ سائنسی ترقی کی بنیاد پر ایسی چیزیں بنالے جو زمینی مرکز ثقل سے باہر نکل سکتی ہیں، ایسی چیزیں تیار کرلے کہ فضائے زمین سے باہر کی ہولناک شعاعیں ان پر اثر نہ کرسکیں، اور ایسے لباس پہنے کہ جو اسے انتہائی گرمی ،ور سردی سے محفوظ رکھ سکیں اور مشق کے ذریعہ بے وزنی کی کیفیت میں رہنے کی عادت پیدا کرے، یعنی جب انسان اپنی محدود قوت کے ذریعہ یہ کام کرسکتا ہے تو پھر کیا اللہ اپنی لامحدود طاقت کے ذریعہ یہ کام نہیں کرسکتا؟

ہمیں یقین ہے کہ اللہ نے اپنے رسول کو اس سفر کے لئے انتہائی تیز رفتار سواری دی تھی اور اس سفر میں درپیش خطرات سے محفوظ رہنے کے لئے انہیں اپنی مدد کالباس پہنایا تھا، ہاں یہ سواری کس قسم کی تھی اور اس کا نام کیا تھا، براق؟ رفرف؟ یا کوئی اور...؟ یہ مسئلہ قدرت کا راز ہے، ہمیں اس کا علم نہیں۔

ان تمام چیزوں سے قطع نظر تیز ترین رفتار کے بارے میں مذکورہ نظریہ آج کے سائنسدانوں کے درمیان متزلزل ہو چکا ہے اگر چہ آئن سٹائن اپنے مشہور نظریہ پر پختہ یقین رکھتا ہے۔

آج کے سائنسداں کہتے ہیں کہ امواج جاذبہ "Rdvs of at f fion" زمانے کی احتیاج کے بغیر آن واحد میں دنیا کی ایک طرف سے دوسری طرف منتقل ہو جاتی ہیں اور اپنا اثر چھوڑتی ہیں یہاں تک کہ یہ احتمال بھی ہے کہ عالم کے پھیلاؤ سے مربوط حرکات میں ایسے نظام موجود ہیں کہ جو روشنی کی رفتار سے زیادہ تیزی سے مرکز جہان سے دور ہو جاتے ہیں (ہم جانتے ہیں کہ کائنات پھیل رہی ہے اور ستارے اور شمسی نظام تیزی کے ساتھ ایک دوسرے سے دور ہو رہے

ہیں)(غور کیجئے)

مختصر یہ کہ اس سفر کے لئے جو بھی مشکلات بیان کی گئی ہیں ان میں سے کوئی بھی عقلی طور پر اس راہ میں حائل نہیں ہے اور ایسی کوئی بنیاد نہیں کہ واقعۂ معراج کو عقلی طور پر محال سمجھا جائے، اس راستہ میں درپیش مسائل کو حل کرنے کے لئے جو وسائل درکار ہیں وہ موجود ہوں تو ایسا ہو سکتا ہے۔

بہرحال واقعۂ معراج نہ تو عقلی دلائل کے حوالہ سے ناممکن ہے اور نہ دورِ حاضر کے سائنسی معیاروں کے لحاظ سے، البتہ اس کے غیر معمولی اور معجزہ ہونے کو سب قبول کرتے ہیں لہٰذا جب قطعی اور یقینی نقلی دلیل سے ثابت ہو جائے تو اسے قبول کر لینا چاہئے۔(۱)(۲)

(۱) معراج، شق القمر و دوسرے قطعی اور عقلی عبادت کے سلسلہ میں ہماری کتاب "ہمارے اور ہمارے اجداد" میں رجوع فرمائیں۔

(۲) تفسیر نمونہ، جلد ۱۲، صفحہ ۱۷۔

۳۲۔ کیا عصمت انبیاء جبری طور پر ہے؟

بہت سے لوگ جب عصمت انبیاء کی بحث کا مطالعہ کرتے ہیں تو فوراً ان کے ذہن میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ مقام عصمت ایک الٰہی عطیہ ہے جو انبیاء اور ائمہ [علیہم السلام] کو لازمی طور پر دیا جاتا ہے، اور جس کو یہ خداداد نعمت مل جاتی ہے تو وہ گناہ اور خطاؤں سے محفوظ ہو جاتا ہے، لہٰذا ان کا معصوم ہونا کوئی فضیلت و قابل افتخار نہیں ہوگا، جو شخص بھی اس الٰہی نعمت سے بہرہ مند ہو جائے تو وہ [خود بخود] تمام گناہوں اور خطاؤں سے پرہیز کرے گا، اور یہ اللہ کی طرف سے جبری طور پر ہے۔

لہٰذا مقام عصمت کے ہوتے ہوئے گناہ اور خطا کا مرتکب ہونا محال ہے، جبکہ یہ بات بھی واضح ہے کہ "محال کو چھوڑ دینا" کوئی فضیلت نہیں ہوتی، مثال کے طور پر اگر ہم سو سال بعد پیدا ہونے والے یا سو سال پہلے گزرنے والوں پر ظلم و ستم نہیں کر سکتے، تو یہ ہمارے لئے کوئی باعث افتخار نہیں ہے، کیونکہ ایسا کرنا ہمارے امکان سے باہر ہے"

مذکورہ اعتراض، اگرچہ "عصمت انبیاء" پر نہیں ہے بلکہ عصمت کی فضیلت گھٹانے کے لئے ہے، لیکن پھر بھی درج ذیل چند نکات پر توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جائے گا۔

۱۔ جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں، ان کی توجہ "عصمت انبیاء" پر نہیں ہوتی، بلکہ ان لوگوں کا گمان ہے کہ مقام عصمت، بیماریوں کے مقابلہ میں بچاؤ کی طرح ہے، جیسے کہ بعض بیماریوں سے

بچنے کے لئے ٹیکے لگائے جاتے ہیں، جن کی بنا پر وہ بیماریاں نہیں آتیں۔

لیکن معصومین میں گناہ کے مقابل یہ تحفظ ان کی معرفت، علم اور تقویٰ کی بنیاد پر ہوتا ہے، بالکل اسی طرح جس طرح ہم بعض چیزوں کا علم رکھتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ یہ کام بُرا ہے، مثلاً ہم کبھی بھی بالکل برہنہ ہو کر گلی کوچوں میں نہیں گھومتے، اسی طرح جو شخص نشہ آور چیزوں کے استعمال کے نقصان کے بارے میں کافی معلومات رکھتا ہے کہ اس سے انسان آہستہ آہستہ موت کی آغوش میں چلا جاتا ہے' وہ اس کے قریب تک نہیں جاتا، یقیناً اس طرح نشہ آور چیزوں کو ترک کرنا انسان کے لئے فضیلت اور کمال ہے، لیکن اس میں کسی طرح کا کوئی جبری پہلو نہیں ہے، کیونکہ انسان نشہ آور چیزوں کے استعمال میں آزاد ہے۔

اسی وجہ سے ہم کوشش کرتے ہیں کہ لوگوں میں تعلیم و تربیت کے ذریعہ علم و معرفت اور تقویٰ کی سطح کو بلند کریں تاکہ ان کو بڑے بڑے گناہوں اور برے اعمال کے ارتکاب سے بچالیں۔

جو لوگ اس تعلیم و تربیت کے نتیجہ میں بعض بُرے اعمال کو ترک کرتے ہوئے نظر آئیں تو کیا ان کے لئے یہ فضیلت اور افتخار کا مقام نہیں ہے؟!

دوسرے الفاظ میں یوں کہیں تو بہتر ہوگا کہ انبیاء کے لئے یہ ''محالِ عادّی'' ہے ''محالِ عقلی'' نہیں، کیونکہ ہم یہ بات جانتے ہیں کہ ''محالِ عادّی'' انسان کے اختیار میں ہوتا ہے، ''محالِ عادّی'' کی مثال اس طرح تصور کریں کہ ایک عالم اور مومن مسجد میں شراب لے جا سکتا ہے اور نماز جماعت کے دوران شراب پی سکتا ہے، [لیکن عادتاً مومن افراد اس طرح نہیں کرتے] یہ محالِ عقلی نہیں بلکہ ''محالِ عادّی'' ہے۔

مختصر یہ کہ انبیاء علیہم السلام چونکہ معرفت و ایمان کے بلند درجہ پر فائز ہوتے ہیں جو خود ایک عظیم فضیلت اور افتخار ہے، جو دوسری فضیلت اور افتخار کا سبب ہوتے ہیں اسی فضیلت کو عصمت کہتے ہیں۔ (غور فرمائیے گا)

اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ ایمان اور معرفت کہاں سے آئی، تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ عظیم ایمان اور معرفت خداوندعالم کی امداد سے حاصل ہوئی ہے، لیکن اس وضاحت کے ساتھ کہ خداوندعالم کی امداد بے حساب وکتاب نہیں ہے، بلکہ ان میں ایسی لیاقت اور صلاحیت موجود تھی، جیسا کہ قرآن مجید حضرت ابراہیم خلیل خدا کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے کہ جب تک انھوں نے الٰہی امتحان نہ دے دیا تو ان کو لوگوں کا امام قرار نہیں دیا گیا، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَإِذِ ابْتَلَى إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا﴾(۱)

یعنی جناب ابراہیم علیہ السلام اپنے ارادہ واختیار سے ان مراحل کو طے کرنے کے بعد عظیم الٰہی نعمت سے سرفراز ہوئے۔

اسی طرح جناب یوسف علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے ”جس وقت وہ بلوغ اور طاقت نیز جسم وجان کے تکامل وترقی تک پہنچے (اور وحی قبول کرنے کے لئے تیار ہوگئے) تو ہم نے ان کو علم وحکمت عنایت فرمایا اور اس طرح ہم نیک لوگوں کو جزا دیتے ہیں“

﴿وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ﴾ (۲)

آیت کا یہ حصہ ﴿كَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ﴾ ہماری بات پر بہترین دلیل ہے کیونکہ اس میں ارشاد ہوتا ہے کہ [جناب] یوسف کے نیک اور شائستہ اعمال کی وجہ سے ان کو خدا کی عظیم نعمت حاصل ہوئی۔

اسی طرح جناب موسیٰ علیہ سلام کے بارے میں ایسے الفاظ ملتے ہیں جو اسی حقیقت کو واضح کرتے ہیں، ارشاد خداوندی ہوتا ہے۔ ”ہم نے بارہا تمہارا امتحان لیا ہے، اور تم نے برسوں اہل

---

(۱) سورۂ بقرہ، آیت ۱۲۴ (۲) سورۂ یوسف، آیت ۲۲

"مدین" کے یہاں قیام کیا ہے (اور ضروری تیاری کے بعد امتحانات کی بھٹی سے سرفراز اور کامیاب نکل آئے) تو آپ کو بلند مقام اور درجات حاصل ہوئے:

﴿وَفَتَنَّاكَ فُتُونًا فَلَبِثْتَ سِنِينَ فِي أَهْلِ مَدْيَنَ ثُمَّ جِئْتَ عَلَى قَدَرٍ يَا مُوسَى﴾ (۱) (۲) "اور تمہارا باقاعدہ امتحان لیا پھر تم اہل مدین میں کئی برس تک رہے اس کے بعد تم ایک منزل پر آگئے اے موسیٰ"۔

یہ بات معلوم ہے کہ ان عظیم الشان انبیاء میں استعداد اور صلاحیت پائی جاتی تھی لیکن ان کو بروئے کار لانے کے لئے کوئی جبری پہلو نہیں تھا، بلکہ اپنے ارادے و اختیار سے اس راستہ کو طے کیا ہے، بہت سے لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان میں بہت سی صلاحیت اور لیاقت پائی جاتی ہیں لیکن ان سے استفادہ نہیں کرتے، یہ ایک طرف۔

دوسری طرف اگر انبیاء علیہم السلام کو اس طرح کی عنایات حاصل ہوئی ہیں تو ان کے مقابل ان کی ذمہ داریاں بھی سخت تر ہیں، یہ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ خداوند عالم جس مقدار میں انسان کو ذمہ داری دیتا ہے اسی لحاظ سے اسے طاقت بھی دیتا ہے، اور پھر اس ذمہ داری کے نبھانے پر امتحان لیتا ہے۔

۲۔ اس سوال کا ایک دوسرا جواب بھی دیا جا سکتا ہے وہ یہ کہ فرض کیجئے کہ انبیاء علیہم السلام خدا کی جبری امداد کی بنا پر ہر طرح کے گناہ اور خطا سے محفوظ رہتے ہیں تاکہ عوام الناس کے اطمینان میں مزید اضافہ ہو جائے، اور یہ چیز ان کے لئے چراغ ہدایت بن جائے، لیکن "ترک اولیٰ" کا احتمال باقی رہتا ہے، یعنی ایسا کام جو گناہ نہیں ہے لیکن انبیاء علیہم السلام کی شان کے مطابق نہیں ہے۔

---

(۱) سورۂ طٰہٰ، آیت ۴۰

(۲) جملہ ﴿ثُمَّ جِئْتَ عَلَى قَدَرٍ يَا مُوسَى﴾ سے کبھی وحی کے قبول کرنے کی لیاقت اور صلاحیت کے معنی لئے گئے ہیں اور کبھی رسالت حاصل کرنے کے لئے جو زمانہ معین کیا گیا تھا اس کے معنی کئے گئے ہیں۔

انبیاء کا افتخار یہ ہے کہ ان سے ترک اولیٰ تک نہیں ہوتا، اور یہ ان کے لئے ایک اختیاری چیز ہے، اور اگر بعض انبیاء علیہم السلام سے بہت ہی کم ترک اولیٰ ہوا ہے تو اسی لحاظ سے مصائب و بلا میں گرفتار ہوئے ہیں، تو اس سے بڑھ کر، اور کیا فضیلت ہوگی کہ وہ اطاعت الٰہی میں کوئی ترک اولیٰ بھی نہیں کرتے۔

اس بنا پر انبیاء علیہم اسلام کے لئے باعث افتخار ہے کہ خدا کی عطا کردہ نعمتوں کے مقابل ذمہ داری بھی زیادہ ہوتی ہے اور ترک اولیٰ کے قریب تک نہیں جاتے، اور اگر بعض موارد میں ترک اولیٰ ہوتا ہے تو فوراً اس کی تلافی کردیتے ہیں۔(۱)

---

(۱)تفسیر پیام قرآن، جلد ۷، صفحہ ۱۹۳

۳۳۔ جادوگروں اور ریاضت کرنے والوں کے عجیب وغریب کاموں اور معجزہ میں کیا فرق ہے؟

ا۔ معجزات، خداداد طاقت کے بل بوتہ پر ہوتے ہیں۔

جبکہ جادوگری اور ان کے غیر معمولی کارنامے انسانی طاقت کا سرچشمہ ہوتے ہیں، لہٰذا معجزات بہت ہی عظیم اور نا محدود ہوتے ہیں، جبکہ جادوگروں کے کارنامے محدود ہوتے ہیں۔

دوسرے الفاظ میں، جادوگر فقط وہی کام انجام دے سکتے ہیں جن کی انھوں نے تمرین کی ہے، اور اس کام کے انجام دینے کے لئے کافی آمادگی رکھتے ہوں، اگر ان سے کوئی دوسرا کام انجام دینے کے لئے کہا جائے تو وہ کبھی نہیں کر سکتے، اب تک آپ نے کسی ایسے جادوگر اور ریاضت کرنے والے کو نہیں دیکھا ہوگا کہ جو یہ کہتا ہوا نظر آئے کہ جو کچھ بھی تم چاہو میں اس کو کر دکھاؤں گا، کیونکہ جادوگروں کو کسی خاص کام میں مہارت اور آگاہی ہوتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ انبیاء علیہم السلام لوگوں کی درخواست کے بغیر خود اپنے طور پر بھی معجزہ پیش کرتے تھے (جیسے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن کریم پیش کیا، جناب موسیٰ علیہ السلام نے عصا کو اژدہا بنا دیا، اور آپ کا معجزہ "ید بیضا" اسی طرح جناب عیسیٰ علیہ السلام کا مردوں کا زندہ کرنا) لیکن جس وقت ان کی امت ایک نئے معجزہ کی فرمائش کرتی تھی جیسے "شق القمر" یا فرعونیوں سے بدوؤں کا دور

ہونا، یا حواریوں کے لئے آسمان سے غذائیں نازل ہونا وغیرہ، تو انبیاء علیہم السلام ہرگز اس سے ممانعت نہیں کرتے تھے (البتہ اس شرط کے ساتھ کہ ان کی فرمائش حقیقت کی تلاش کے لئے ہو، نہ صرف بہانہ بازی کے لئے)

لہٰذا جناب موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں ملتا ہے کہ فرعونیوں نے ایک طولانی مدت کی مہلت مانگی تاکہ تمام جادوگروں کو جمع کرسکیں، اور پروگرام کے تمام مقدمات فراہم کرلیں، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿فَأَجْمِعُوا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوا صَفًّا﴾(۱)

"لہٰذا تم لوگ اپنی تدبیروں کو جمع کرو اور صف باندھ کر اس کے مقابلہ میں آجاؤ"۔

اپنی تمام طاقت و توانائی کو جمع کریں اور اس سے استفادہ کریں، جبکہ جناب موسیٰ علیہ السلام کو ان مقدمات کی کوئی ضرورت نہیں تھی، اور ان تمام جادوگروں سے مقابلہ کرنے کے لئے کسی طرح کی کوئی مہلت نہ مانگی، چونکہ وہ قدرت خدا پر بھروسہ کئے ہوئے تھے، اور جادوگر انسانی محدود طاقت کے بل پر یہ کام انجام دینا چاہتے تھے۔

اسی وجہ سے انسان کے غیر معمولی کام کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے یعنی اس کی طرح کوئی دوسرا شخص بھی اس کام کو انجام دے سکتا ہے، اسی وجہ سے کوئی بھی جادوگر یہ چیلنج نہیں کرسکتا کہ کوئی دوسرا مجھ جیسہ کام انجام نہیں دے سکتا، جبکہ (معصوم کے علاوہ) کوئی دوسرا شخص (انسانی طاقت سے) معجزہ نہیں دکھا سکتا. لہٰذا اس میں ہمیشہ چیلنج ہوتا ہے، جیسا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اگر تمام جن وانس مل کر قرآن کے مثل لانا چاہیں تو نہیں لاسکتے!

یہی وجہ ہے کہ جب انسان کے غیر معمولی کارنامے، معجزہ کے مقابل آتے ہیں تو بہت ہی

---

(۱) سورۂ طہٰ، آیت ۶۴.

جلد مغلوب ہو جاتے ہیں اور جادو کبھی بھی معجزہ کے مقابل نہیں آ سکتا، جس طرح کوئی بھی انسان خداوند عالم سے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتا۔

چنانچہ نمونہ کے طور پر قرآن مجید میں جناب موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے واقعہ کو ملاحظہ کیا جاسکتا ہے کہ فرعون نے مصر کے تمام شہروں سے جادوگروں کو جمع کیا اور مدتوں اس کے مقدمات فراہم کرتا رہا تاکہ اپنے پروگرام کو صحیح طور پر چلا سکے لیکن جناب موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ کے سامنے چشم زدن میں مغلوب ہو گیا۔

۲۔ معجزات چونکہ خداوند عالم کی طرف سے ہوتے ہیں لہٰذا خاص تعلیم و تربیت کی ضرورت نہیں ہوتی

جبکہ جادوگر مدتوں سیکھتے ہیں اور بہت زیادہ تمرین کرتے ہیں، اس طرح سے کہ اگر شاگرد نے استاد کی تعلیمات کو خوب اچھے طریقہ سے حاصل نہ کیا ہو تو ممکن ہے کہ لوگوں کے سامنے صحیح طور پر کارنامہ نہ دکھا سکے، جس کے نتیجہ میں وہ ذلیل ہو جائے، لیکن معجزہ کسی بھی وقت بغیر کسی مقدمہ کے دکھایا جاسکتا ہے جبکہ غیر معمولی کارنامے آہستہ آہستہ مختلف مہارتوں کے ذریعہ انجام دئے جاتے ہیں یعنی کبھی بھی اچانک انجام نہیں پاتے۔

جناب موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے واقعہ میں اس بات کی طرف اشارہ ہوا کہ فرعون نے جادوگروں پر الزام لگایا کہ موسیٰ تمہارا سردار ہے جس نے تمہیں سحر اور جادو سکھایا ہے

﴿إِنَّهُ لَكَبِيرُكُمُ الَّذِي عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ﴾ (۱)

اسی وجہ سے جادوگر اپنے شاگردوں کو مہینوں یا برسوں سکھاتے ہیں اور ان کے ساتھ تمرین کرتے ہیں۔

(۱) سورۂ طٰہٰ آیت ۷۱

۴۔ معجزنما کے اوصاف خود ان کی صداقت کی دلیل ہوتی ہے۔

سحر و جادو اور معجزہ کی پہچان کا ایک دوسرا طریقہ یہ ہے کہ صاحب معجزہ اور جادوگروں کے صفت کو دیکھا جاتا ہے، کیونکہ معجزہ دکھانے والا خدا کی طرف سے لوگوں کی ہدایت پر مامور ہوتا ہے لہٰذا اسی لحاظ سے اس میں صفت پائے جاتے ہیں، جبکہ ساحر اور جادوگر اور ریاضت کرنے والے نہ تو لوگوں کی ہدایت پر مامور ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کا یہ مقصد ہوتا ہے، درج ذیل چیزیں ان کا مقصد ہوا کرتی ہیں:

۱۔ سادہ لوح لوگوں کو غافل کرنا۔

۲۔ عوام الناس کے درمیان شہرت حاصل کرنا۔

۳۔ لوگوں کو تماشہ دکھا کر کسب معاش کرنا۔

جب انبیاء علیہم السلام اور جادوگر میدان عمل میں آتے ہیں تو طولانی مدت تک اپنے مقاصد کو مخفی نہیں رکھ سکتے، جیسا کہ فرعون نے جن جادوگروں کو جمع کیا تھا انھوں نے اپنا کارنامہ دکھانے سے پہلے فرعون سے انعام حاصل کرنے کی درخواست کی اور فرعون نے بھی ان سے اہم انعام کا وعدہ دیا،

﴿قَالُوا إِنَّ لَنَا لَأَجْرًا إِن كُنَّا نَحْنُ الْغَالِبِينَ ☆ قَالَ نَعَمْ وَإِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ﴾(۱)

"[جادوگر فرعون کے پاس حاضر ہوگئے اور] انھوں نے کہا کہ اگر ہم غالب آگئے تو کیا ہمیں اس کی اجرت ملے گی؟ فرعون نے کہا بے شک تم میرے دربار میں مقرب ہو جاؤ گے"۔

جبکہ انبیاء علیہم السلام نے اس بات کا بارہا اعلان کیا ہے:

﴿وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ﴾ (۲)

(۱) سورۂ اعراف، آیت ۱۱۳۔۱۱۴۔ (۲) سورۂ شعراء، آیت ۱۰۹۔

"ہم تم سے کوئی اجر طلب نہیں کرتے"۔

(قارئین کرام! مذکورہ آیت قرآن مجید میں متعدد انبیاء کے حوالہ سے بیان کی گئی ہے۔)

اصولی طور پر اگر جادوگروں کو فرعون جیسے ظالم و جابر کی خدمت میں دیکھا جائے تو "جادو" اور "معجزہ" کی پہچان کے لئے کافی ہے۔

یہ بات کہے بغیر ہی واضح ہے کہ انسان اپنے افکار کو مخفی رکھنے میں خواہ کتنا ہی ماہر ہو پھر بھی اس کے اعمال و کردار سے اس کا حقیقی چہرہ سامنے آجاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان جیسے لوگوں کی سوانح عمری اور ان کے غیر معمولی کارناموں کو انجام دینے کے طریقہ کار، اسی طرح مختلف اجتماعی امور میں ان کی یکسوئی اور ان کی رفتار و گفتار اور ان کا اخلاق "سحر و جادو" اور "معجزہ" میں تمیز کرنے کے لئے بہترین رہنما ہے، اور گزشتہ بحث میں بیان کئے ہوئے فرق کے علاوہ یہ راستہ بہت آسان ہے جس سے انسان سحر و جادو اور معجزہ کے درمیان فرق کرسکتا ہے۔

قرآن مجید نے بہت دقیق و عمیق الفاظ کے ساتھ اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے، ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿ قَالَ مُوسَىٰ مَا جِئْتُم بِهِ السِّحْرُ إِنَّ اللَّهَ سَيُبْطِلُهُ إِنَّ اللَّهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِينَ ﴾(۱)

"پھر جب ان لوگوں نے رسیوں کو ڈال دیا تو موسیٰ نے کہا کہ جو کچھ تم لے آئے ہو یہ جادو ہے اور اللہ اس کو بے کار کردے گا کہ وہ مفسدین کے عمل کو درست نہیں ہونے دیتا"۔

---

(۱) سورۂ یونس، آیت ۸۱۔

جی ہاں جادوگر، مفسد ہوتے ہیں اوران کے اعمال باطل ہوتے ہیں، اوران کے اس کام کے ذریعہ معاشرہ کی اصلاح نہیں کی جاسکتی۔

ایک دوسرے مقام پر خداوند عالم نے جناب موسیٰ علیہ السلام سے خطاب فرمایا:

﴿لاتَخَفْ إِنَّكَ أَنْتَ الأَعْلىٰ﴾ (۱) ''[ہم نے کہا کہ] موسیٰ ڈرو نہیں تم بہرحال غالب رہنے والے ہو''۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَأَلْقِ مَا فِي يَمِينِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوا إِنَّمَا صَنَعُوا كَيْدُ سَاحِرٍ وَلاَيُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ أَتىٰ﴾ (۲)

''اور جو کچھ تمہارے ہاتھ میں ہے اُسے ڈال دو یہ ان کے سارے کئے دھرے کو چن لے گا، ان لوگوں نے جو کچھ کیا ہے وہ صرف جادوگر کی چال ہے اور بس، اور جادوگر جہاں بھی جائے کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا''۔

جی ہاں جادوگر چال بازی اور دھوکہ دھڑی سے کام لیتے ہیں اور طبیعی طور پر یہی مزاج رکھتے ہیں، یہ لوگ دھوکہ دھڑی کرتے رہتے ہیں ان کے صفات اور کارناموں کو دیکھ کر بہت ہی جلد ان کو پہچانا جاسکتا ہے، جبکہ انبیاء علیہم السلام کا اخلاص، صداقت اور پاکیزگی ان کے لئے ایک سند ہے جو معجزہ کے ساتھ مزید ہدایت گر ثابت ہوتی ہے۔ (۳)

---

(۱) سورۂ طٰہ، آیت ۶۸

(۲) سورۂ طٰہ، آیت ۶۹

(۳) تفسیر پیام قرآن، جلد ۷، صفحہ ۲۸۸

۳۴۔ جناب آدم کا ترک اولیٰ کیا تھا؟

جیسا کہ ہم سورہ طٰہٰ آیت نمبر ۱۲۱ میں پڑھتے ہیں۔ ﴿وَ عصیٰ آدمُ ربَّہ فغویٰ﴾
''اور جناب آدم نے اپنے پروردگار کی نصیحت پر عمل نہ کیا، تو ثواب کے راستہ سے بے راہ ہو گئے''۔

تو یہاں پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ جناب آدم علیہ السلام کس ترک اولیٰ کے مرتکب ہوئے؟
اسلامی منابع اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ کوئی بھی پیغمبر گناہ کا مرتکب نہیں ہوا، اور اللہ کے بندوں کی ہدایت کی ذمہ داری کسی گناہگار شخص کو نہیں دی جا سکتی، اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ جناب آدم علیہ السلام خدا کے بھیجے ہوئے نبیوں میں سے تھے، مذکورہ آیت اور اس سے مشابہ آیتوں میں دوسرے انبیاء کی طرف عصیان کی نسبت دی گئی ہے لیکن سب جگہ یہ نسبت ''نسبی عصیان'' اور ''ترک اولیٰ'' کے معنی میں ہے، یعنی مطلق گناہ کے معنی میں نہیں ہے۔

وضاحت:

گناہ کی دو قسم ہوتی ہیں ''مطلق گناہ'' اور ''نسبی گناہ'' مطلق گناہ یعنی نہی تحریمی کی مخالفت اور خداوند عالم کے قطعی حکم کی نافرمانی کا نام ہے اور ہر طرح کے واجب کو ترک کرنا اور حرام کا مرتکب ہونا مطلق گناہ کہلاتا ہے۔

لیکن نسبی گناہ، وہ گناہ ہوتا ہے جو کسی بزرگ انسان کی شان کے خلاف ہے ممکن ہے کہ کوئی مباح کام بلکہ مستحب کام عظیم انسان کی شان کے مطابق نہ ہو، تو اس صورت میں یہ عمل اس کی شان میں "نسبی گناہ" شمار کیا جائے گا، مثلاً اگر کوئی مالدار مومن کسی غریب کی بہت کم مدد کرے، تو اگرچہ یہ امداد کم ہے اور کوئی حرام کام نہیں ہے بلکہ مستحب ہے، لیکن جو شخص بھی اس کو سنے گا وہ اس طرح مذمت کرے گا جیسے اس نے کوئی برا کام کیا ہو، کیونکہ ایسے مالدار اور باایمان شخص سے اس سے کہیں زیادہ امید تھی۔

[دوسرے لفظوں میں جناب آدم علیہ السلام کا گناہ ان کی حیثیت سے گناہ تھا لیکن مطلق گناہ نہ تھا، مطلق گناہ وہ گناہ ہوتا ہے جس کے لئے سزا معین ہو (جیسے شرک، کفر، ظلم اور ستم وغیرہ) اور نسبت کے اعتبار سے گناہ کا مفہوم یہ ہے کہ بعض اوقات کچھ مباح اعمال بلکہ مستحب اعمال بھی بڑے لوگوں کی عظمت کے لحاظ سے مناسب نہیں ہوتے، انہیں چاہئے کہ ان اعمال سے پرہیز کریں اور اہم کام بجالائیں ورنہ کہا جائے گا کہ انھوں نے ترک اولیٰ کیا ہے۔]

اسی وجہ سے انبیاء علیہم السلام کے عمل ایک ممتاز ترازو میں تولے جاتے ہیں اور کبھی ان پر "عصیان" اور "ذنب" کا اطلاق ہوتا ہے، مثال کے طور پر ایک نماز عام انسان کے لئے بہترین نماز شمار کی جائے لیکن وہی نماز اولیاء الٰہی کے لئے ترک اولیٰ شمار کی جائے، کیونکہ ان کے لئے نماز میں پل بھر کی غفلت ان کی شان کے خلاف ہے، بلکہ ان کے علم، تقویٰ اور عظمت کے لحاظ سے ان کو عبادت میں خدا کے صفات جلال و جمال میں غرق ہونا چاہئے۔

عبادت کے علاوہ ان کے دوسرے اعمال بھی اسی طرح ہیں، ان کی عظمت اور مقام کے لحاظ سے تولے جاتے ہیں اسی وجہ سے اگر ان سے ایک "ترک اولیٰ" بھی انجام پاتا ہے تو خداوند عالم کی طرف سے مورد سرزنش ہوتے ہیں (ترک اولیٰ سے مراد یہ ہے کہ انسان بہتر کام کو چھوڑ کر کم درجہ کا کام انجام دے۔)

اسلامی احادیث میں بیان ہوا ہے کہ جناب یعقوب علیہ السلام نے فراق فرزند میں جس قدر پریشانیاں اٹھائیں ہیں اس کی وجہ یہ تھی کہ مغرب کے وقت ایک روزہ داران کے در پر آیا، اور اس نے مدد کی درخواست کی لیکن انھوں نے اس سے غفلت کی، وہ فقیر بھوکا اور دل شکستہ ان کے در سے واپس چلا گیا۔

یہ کام اگر چہ ایک عام انسان انجام دیتا تو شاید اتنا اہم نہ تھا، لیکن اس عظیم الشان پیغمبر کی طرف سے اس کام کو بہت اہمیت دی گئی کہ خداوند عالم کی طرف سے سخت سزا معین کی گئی۔ (۱) (۲)

---

(۱) نور الثقلین، جلد ۲، صفحہ ۴۱۱ بہ نقل کتاب علل الشرائع۔

(۲) مذکورہ روایت کی تفصیل یہ ہے کہ ابو حمزہ ثمالی نے ایک روایت امام سجاد علیہ السلام سے نقل کی ہے، ابو حمزہ کہتے ہیں جمعہ کے دن میں مدینہ منورہ میں تھا نماز صبح میں نے امام سجاد علیہ السلام کے ساتھ پڑھی جس وقت امام نماز اور تسبیح سے فارغ ہوئے تو گھر کی طرف چل پڑے میں آپ کے ساتھ تھا، آپ نے خادمہ کو آواز دی اور کہا: خیال رکھنا، جو سائل اور ضرورت مند گھر کے دروازے سے گزرے اسے کھانا دینا کیونکہ آج جمعہ کا دن ہے۔

ابو حمزہ کہتے ہیں میں نے کہا: ہر وہ شخص جو مدد کا تقاضا کرتا ہے مستحق نہیں ہوتا تو امام نے فرمایا:

ٹھیک ہے، لیکن میں اس سے ڈرتا ہوں کہ ان میں مستحق افراد ہوں اور انہیں غذا نہ دیں اور اپنے گھر کے دروازے سے دھتکار دیں تو کہیں ہمارے گھر والوں پر وہی مصیبت نہ آن پڑے جو یعقوب اور آل یعقوب پر آن پڑی تھی اس کے بعد آپ نے فرمایا ان سب کو کھانا دو کیا (کیا تم نے نہیں سنا ہے کہ) یعقوب کے لئے ہر روز ایک گوسفند ذبح کیا جاتا تھا اس کا ایک حصہ مستحقین کو دیا جاتا تھا ایک حصہ وہ خود اور اس کی اولاد کھاتے تھے ایک دن ایک سائل آیا وہ مومن اور روزہ دار تھا خدا کے نزدیک اس کی بڑی قدر و منزلت تھی وہ شہر (کنعان) سے گزر رہا تھا شب جمعہ تھی افطار کے وقت وہ دروازہ یعقوب پر آیا اور کہنے لگا بچی کچی غذا سے مدد کے طالب غریب و مسافر بھوکے مہمان کی مدد کرو، اس نے یہ بات کئی مرتبہ دہرائی انہوں نے سنا تو سہی لیکن اس کی بات کو باور نہ کیا جب وہ مایوس ہو گیا اور رات کی تاریکی ہر طرف چھا گئی تو وہ لوٹ گیا جاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اس نے بارگاہ الٰہی میں بھوک کی شکایت کی رات اس نے بھوک ہی میں گزاری اور صبح اسی طرح روزہ رکھا جب کہ وہ صبر کئے ہوئے تھا اور خدا کی حمد و ثنا کرتا تھا لیکن حضرت یعقوبؑ اور ان کے گھر والے مکمل طور پر سیر تھے اور صبح کے وقت ان کا کچھ کھانا بچ بھی گیا تھا۔

امام نے اس کے بعد مزید فرمایا: خدا نے اسی صبح یعقوب کی طرف وحی بھیجی، اے یعقوب! تو نے میرے بندے کو ذلیل و خوار کیا ہے اور میرے غضب کو بھڑکایا ہے اور تو اور تیری اولاد نزول سزا کی مستحق ہو گئی ہے، اے یعقوب! میں اپنے دوستوں کو زیادہ جلدی ◄◄

جناب آدم علیہ السلام کو "شجرہ ممنوعہ" کے نزدیک جانے سے منع کیا گیا تھا جو کہ تحریمی نہی نہیں تھی بلکہ ایک ترک اولیٰ تھا، لیکن جناب آدم علیہ السلام کی عظمت اور شان کے لحاظ سے اہمیت دی گئی، اور اس مخالفت (نہی کراہتی) پر اس قدر تنبیہ کی گئی۔(۱)

◄◄ سرزنش وملامت کرتا دوسرا دیتا ہوں اور یہ اس لئے کہ میں ان سے محبت کرتا ہوں۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ اس حدیث کے بعد ابوحمزہ ثمالی کہتے ہیں میں نے امام سجاد علیہ السلام سے پوچھا یوسف نے وہ خواب کس موقع پر دیکھا تھا؟ امام نے فرمایا اسی رات۔

اس حدیث سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء و اولیاء کے حق میں ایک چھوٹی سی لغزش یا زیادہ صریح الفاظ میں ایک "ترک اولیٰ" کہ جو گناہ اور معصیت بھی شمار نہیں ہوتا (کیونکہ اس سائل کی حالت حضرت یعقوب علیہ السلام پر واضح نہیں تھی) بعض اوقات خدا کی طرف سے ان کی تنبیہ کا سبب بنتا ہے اور یہ صرف اس لئے ہے کہ ان کا بلند وبالا مقام تقاضا کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی چھوٹی سے چھوٹی بات اور عمل کی طرف متوجہ رہیں کیونکہ "حسنات الابرار سیئات المقربین" (نیک لوگوں کی نیکیاں مقربین [خدا] کے لئے برائی ہوتی ہیں)

(۱) تفسیر نمونہ، جلد ۶، صفحہ ۳۳

۳۵۔ کیا معجزہ ''شق القمر'' سائنس کے لحاظ سے ممکن ہے؟

ہم سورہ قمر کی پہلی آیت میں پڑھتے ہیں ﴿اقتربت الساعة و انشق القمر﴾ (قیامت آگئی اور چاند کے دوٹکڑے ہوگئے)

اس آیہ شریفہ میں معجزہ شق القمر کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

مشہور روایات میں کہ جن کے سلسلہ میں بعض لوگوں نے تواتر[۱] کا دعویٰ بھی کیا ہے، بیان ہوا ہے کہ مشرکین مکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور کہا اگر آپ سچ کہتے ہیں کہ میں خدا کا رسول ہوں، تو آپ چاند کے دوٹکڑے کر دیجئے! آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا. اگر میں اس کام کو کردوں تو کیا تم ایمان لے آؤ گے؟ سب نے کہا: ہاں، ہم ایمان لے آئیں گے، (وہ چودھویں رات کا چاند تھا) اس وقت پیغمبر اکرمؐ نے خدا کی بارگاہ میں دعا کی کہ جو یہ لوگ طلب کر رہے ہیں وہ عطا کر دے، چنانچہ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ چاند دوٹکڑے ہوگیا، اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک ایک کو آواز دیتے جاتے تھے اور فرماتے تھے دیکھو دیکھو! ()

---

[۱] علم حدیث میں ''حدیث تواتر'' اس حدیث کو کہا جاتا ہے جس کے راویوں کی تعداد اس حد تک ہو کر ان کے ایک ساتھ جمع ہو کر سازش کرنے کا قابل اعتماد احتمال نہ ہو۔ (مترجم)

() ''مجمع البیان'' اور دیگر تفاسیر، مذکورہ آیت کے ذیل میں۔

یہاں پر ممکن ہے اس طرح کے سوالات کیے جائیں کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ اتنا عظیم کرہ [چاند] دو ٹکڑے ہو جائے، پھر اس عظیم واقعہ کا کرہ زمین اور نظام شمسی پر کیا اثر ہوگا؟ اور چاند کے دو ٹکڑے ہونے کے بعد کس طرح آپس میں مل گئے، اور کس طرح ممکن ہے کہ اتنا بڑا واقعہ رونما ہو جائے لیکن تاریخ بشریت اس کو نقل نہ کرے؟!

اس طرح کے سوالات کا جواب دانشوروں اور نجومیوں کے مطالعات اور ان کے انکشافات کے پیش نظر کوئی پیچیدہ نہیں ہے، کیونکہ جدید انکشافات کہتے ہیں: اس طرح کی چیز نہ صرف یہ کہ محال نہیں ہے بلکہ اس طرح کے واقعات بار بار رونما ہوئے ہیں، اگرچہ ہر واقعہ میں مخصوص عوامل کارفرما تھے۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہیں نظام شمسی اور دوسرے آسمانی کرات میں سے کسی آسمانی کرہ کا اس طرح شق ہو جانا اور پھر مل جانا ایک ممکن امر ہے، نمونے کے طور پر چند چیزیں درج ذیل ہیں۔

الف۔ پیدائش نظام شمسی اس نظریہ کو تقریباً سبھی ماہرین نے مانا ہے کہ نظام شمسی کے تمام کرات ابتدا میں سورج کے اجزا تھے بعد میں سورج سے الگ ہوئے ہیں، اور ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے مدار میں گردش کرنے لگا۔

مسٹر ''لاپلاس'' کا نظریہ یہ ہے کہ کسی چیز کے الگ ہونے کے اس عمل کا سبب مرکز سے گریز کی وہ قوت ہے جو سورج کے منطقہ استوائی میں پائی جاتی ہے وہ اس طرح کہ جس وقت سورج ایک جلنے والی گیس کے ٹکڑے کی شکل میں تھا، (اور اب بھی ویسا ہی ہے) اور اپنے گرد گردش کرتا تھا تو اس کی گردش کی سرعت منطقہ استوائی میں اس بات کا سبب بنی کہ سورج کے کچھ ٹکڑے اس سے الگ ہو جائیں اور فضا میں بکھر جائیں، اور مرکز اصلی یعنی خود سورج کے گرد گردش کرنے لگیں۔

لیکن رہا اس کے بعد بعض دانشوروں نے تحقیقات کیں جس کی بنا پر ایک دوسرا فرضیہ پیش

کیا کہ اس جدائی کا سبب سورج کے مقابل سمندر میں ہونے والے شدید مدوجزر [۱] ہے جو سورج کی سطح پر ایک بہت بڑے ستارے کے گزرنے کے سبب ایجاد ہوتا ہے۔

اس فرضیہ سے اتفاق کرنے والے اس وقت کی سورج کی حرکت وضعی کو سورج کے ٹکڑوں کے علیحدہ ہونے کی توجیہ کو کافی نہیں سمجھتے وہ اس مفروضہ کی تائید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مذکورہ مد و جزر نے سورج کی سطح پر بہت بڑی بڑی لہریں اس طرح پیدا کیں جیسے پتھر کا کوئی بہت بڑا ٹکڑا سمندر میں گرے اور اس سے لہریں پیدا ہوں، اس طرح سورج کے ٹکڑے یکے بعد دیگرے باہر نکل کر سورج کے گرد گردش کرنے لگے، بہر حال اس علیحدگی کا سبب کچھ بھی ہو اس پر سب متفق ہیں کہ نظام شمسی کی تخلیق انشقاق کے نتیجہ میں ہوئی ہے۔

ب۔ بڑے شہاب: یہ بڑے بڑے آسمانی پتھر ہیں جو نظام شمسی کے گرد گردش کر رہے ہیں اور جو کبھی کبھی چھوٹے کرّات اور سیاروں سے مشابہت رکھنے والے قرار دیئے جاتے ہیں، بڑے اس وجہ سے کہ ان کا قطر ۲۵ کلومیٹر ہوتا ہے لیکن وہ عموماً چھوٹے ہوتے ہیں، ماہرین کا نظریہ ہے کہ "استروئید ہا" (بڑے شہاب) ایک عظیم سیارے کے بقیہ جات ہیں جو مشتری اور مریخ کے درمیان مدار میں حرکت کر رہا تھا، اور اس کے بعد نامعلوم اسباب کی بنا پر وہ پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا، اب تک پانچ ہزار سے زیادہ اس طرح کے شہاب کے ٹکڑے معلوم کئے جا چکے ہیں اور ان میں سے جو بڑے ہیں ان کے نام بھی رکھے جا چکے ہیں، بلکہ ان کا حجم، مقدار اور سورج کے گرد ان کی گردش کا حساب بھی لگایا جا چکا ہے، بعض ماہرین فضا ان استروئیدوں کی خاص اہمیت کے قائل ہیں، ان کا

---

[۱] مدوجزر۔ دریا کے پانی میں ہونے والی تبدیلی کو کہا جاتا ہے، شب و روز میں دریا کا پانی ایک مرتبہ گھٹتا ہے اس کو "جزر" کہا جاتا ہے اور ایک مرتبہ بڑھتا ہے جس کو "مد" کہا جاتا ہے، اور پانی میں یہ تبدیلی سورج اور چاند کی قوۂ جاذبہ کی وجہ سے ہوتی ہے۔ [مترجم]

نظریہ ہے کہ فضا کے دوردراز حصوں کے جا جب سفر کرنے کے لئے اولین قدم کے عنوان سے ان سے

استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

آسمانی کرات کے انشقاق کا ایک دوسرا نمونہ

ج۔**شہاب ثاقب**، یہ چھوٹے چھوٹے آسمانی پتھر ہیں جو کبھی کبھی چھوٹی انگلی کے برابر ہوتے ہیں، بہر حال وہ سورج کے گرد ایک خاص مدار میں بڑی تیزی کے ساتھ گروش کررہے ہیں، اور جب کبھی ان کا راستہ مدار زمین کو کاٹ کر نکلتا ہے تو وہ زمین کا رخ اختیار کر لیتے ہیں۔

یہ چھوٹے پتھر اس ہوا سے شدت کے ساتھ ٹکرانے کی وجہ سے کہ جو زمین کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور تھرتھراہٹ پیدا کرنے والی اس تیزی کی وجہ سے کہ جوان کے اندر ہے زیدہ گرم ہوکر اس طرح بھڑک اٹھتے ہیں کہ ان میں سے شعلے نکلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور ہم انھیں ایک پر نور اور خوبصورت لکیر کی شکل میں آسمانی فضا میں دیکھتے ہیں ورانھیں "شہاب کے تیر" کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور کبھی یہ خیال کرتے ہیں کہ ایک دوردراز کا ستارہ ہے جو گر رہا ہے حالانکہ وہ چھوٹا شہاب ہے کہ جو بہت ہی قریبی فاصلہ پر بھڑک کر خاک ہو جاتا ہے۔

شہابوں کی گردش کا مدار زمین کے مدار سے دو نقطوں پر ملتا ہے اسی بنا پر ستمبر اور اکتوبر میں جو دو مداروں کے نقطہ تقاطع ہیں شہاب ثاقب زیادہ نظر آتے ہیں۔

ماہرین کا خیال ہے کہ یہ مدار ستارے کے باقی حصے ہیں جو نامعلوم حوادث کی بنا پر پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ہیں۔

آسمانی کرات کے پھٹنے کا ایک اور نمونہ

بہر حال آسمانی کرات کا انشقاق یعنی پھٹنا اور پھٹ کر بکھرنا کوئی بے بنیاد بات نہیں ہے اور جدید علوم کی نظر میں یہ کوئی محال کام نہیں ہے کہ یہ کہا جائے کہ معجزہ کا تعلق امر محال کے ساتھ نہیں

ہوا کرتا، یہ سب باتیں انشقاق یعنی پھٹنے کے سلسلہ کی ہیں، دو ٹکڑوں میں قوت جاذبہ ہوتی ہے اس بنا پر اس انشقاق کی بازگشت ناممکن نہیں ہے۔

اگر چہ ہیئت قدیم میں بطلیموس کے نظریہ کے مطابق نو آسمان پیاز کے تہہ بہ تہہ چھلکوں کی طرح ہیں اور گھومتے رہتے ہیں اور اس طرح یہ نو آسمان ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں جن کا ٹوٹنا اور جڑنا ایک جماعت کی نظر میں امر محال تھا، اس لئے اس نظریہ کے حامل افراد معراج آسمانی کے بھی منکر تھے اور "شق القمر" کے بھی، لیکن اب جبکہ ہیئت بطلیموس کا مفروضہ خیالی افسانوں اور کہانیوں کی حیثیت اختیار کر چکا ہے اور نو آسمانوں کا نام ونشان تک باقی نہیں رہا تو اب ان باتوں کی گنجائش بھی باقی نہیں رہی۔

یہ نکتہ کسی یاددہانی کا محتاج نہیں ہے کہ "شق القمر" ایک عام طبیعی عامل کے زیر اثر رونما نہیں ہوا بلکہ اعجاز نمائی کا نتیجہ تھا، لیکن چونکہ اعجاز، محال عقلی سے تعلق نہیں رکھتا، لہٰذا یہاں اس مقصد کے امکان کو بیان کرنا تھا۔ (غور کیجئے) (۱)

---

(۱) تفسیر نمونہ، جلد ۲۳، صفحہ ۹ اور ۱۳

۳۶۔ بعض آیات واحادیث میں غیر خدا سے علم غیب کی نفی اور بعض میں ثابت ہے، اس اختلاف کا حل کیا ہے؟

اس اختلاف کو حل کرنے کے لئے چند راہ حل ہیں:

۱۔ اس اختلاف کے حل کا مشہور ومعروف طریقہ یہ ہے کہ جن آیت وروایات میں علم غیب کو خداوند عالم سے مخصوص کیا گیا ہے ان کا مطلب یہ ہے کہ علم غیب ذاتی طور پر خداوند عالم سے مخصوص ہے، لہٰذا دوسرے افراد مستقل طور پر علم غیب نہیں رکھتے، جو کچھ بھی وہ غیب کی خبریں بتاتے ہیں وہ خداوند عالم کی طرف سے اس کی عنایت سے ہوتی ہیں، چنانچہ اس راہ حل کے لئے قرآن مجید کی آیت بھی شاہد اور گواہ ہے جس میں ارشاد ہوتا ہے

﴿عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا ، إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِن رَّسُولٍ...﴾(۱)

''وہ عالم غیب ہے اور اپنے غیب پر کسی کو بھی مطلع نہیں کرتا ہے مگر جس رسول کو پسند کرے''۔

اسی چیز کی طرف نہج البلاغہ میں اشارہ ہوا ہے جس وقت حضرت علی علیہ السلام آئندہ کے واقعات کو بیان کر رہے تھے (ور اسلامی ممالک پر مغلوں کے حملہ کی خبر دے رہے تھے) تو آپ

---

(۱)سورہ جن آیت ۲۶

کے ایک صحابی نے عرض کیا یا امیر المومنین! کیا آپ کو غیب کا علم ہے؟ تو حضرت مسکرائے اور فرمایا:

"لَیسَ هُوَ بِعلمِ غیبٍ ، وَاِنّماهو تعلّم مِن ذِی عِلم" (۱)

"یہ علم غیب نہیں ہے، یہ ایک علم ہے جس کو صاحب علم (یعنی پیغمبر اکرم ﷺ) سے حاصل کیا ہے"۔

۲۔ غیب کی باتیں دو طرح کی ہوتی ہیں، ایک وہ جو خداوند عالم سے مخصوص ہیں، اور اس کے علاوہ کوئی بھی نہیں جانتا، جیسے قیامت، میزان وغیرہ اور غیب کی دوسری قسم وہ ہے جس کو خداوند عالم اپنے انبیاء اور اوصیاء کو تعلیم دیتا ہے، جیسا کہ نہج البلاغہ کے اسی مذکورہ خطبہ کے ذیل میں ارشاد ہوتا ہے۔

"علم غیب صرف قیامت کا اور ان چیزوں کا علم ہے جن کو خدا نے قرآن مجید میں شمار کر دیا ہے کہ جہاں ارشاد ہوتا ہے: قیامت کے دن کا علم خدا سے مخصوص ہے، اور وہی باران رحمت نازل کرتا ہے، اور جو کچھ شکم مادر میں ہوتا ہے اس کو جانتا ہے، کسی کو بھی یہ معلوم نہیں ہے کہ کل کیا کام انجام دے گا اور کس سرزمین پر موت آئے گی"۔

اس کے بعد امام علی علیہ السلام نے اس چیز کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

خداوند عالم جانتا ہے کہ رحم کا بچہ لڑکا ہے یا لڑکی؟ حسین ہے یا قبیح؟ سخی ہے یا بخیل؟ شقی ہے یا سعید؟ اہل دوزخ ہے یا اہل بہشت؟ یہ یہی علوم ہیں جن کو خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا، اور اس کے علاوہ دوسرے علوم خداوند عالم نے اپنے پیغمبر کو تعلیم دئے ہیں اور انھوں نے مجھے تعلیم دئے ہیں"۔ (۲)

ممکن ہے کہ بعض، ماہر افراد بچے یا بارش وغیرہ کے بارے میں علم اجمالی حاصل کر لیں لیکن اس کا تفصیلی علم اور اس کی جزئیات صرف خداوند عالم ہی کو معلوم ہے، جیسا کہ قیامت کے بارے میں

(۱،۲) نہج البلاغہ، خطبہ ۱۲۸۔

ہمیں علم اجمالی ہے لیکن اس کی جزئیات اور خصوصیات سے بے خبر ہیں، اگر بعض روایات میں بیان ہوا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا ائمہ علیہم السلام نے بعض بچوں کے بارے میں یا بعض لوگوں کی موت کے بارے میں خبر دی کہ فلاں شخص کی موت کیسے آئے گی تو یہ اسی علم اجمالی سے متعلق ہے۔

۳۔ ان مختلف آیات وروایات کا ایک راہ حل یہ ہے کہ غیب کی باتیں دو مقام پر لکھی ہوئی ہیں ایک ''لوح محفوظ'' (یعنی خداوند عالم کے علم کا مخصوص خزانہ) میں جس میں کسی بھی طرح کوئی تغیر وتبدل نہیں ہوتا، اور کوئی بھی اس سے باخبر نہیں ہے، دوسرے ''لوح محو واثبات'' جس میں صرف مقتضی کا علم ہوتا ہے اور علت تامہ کا علم نہیں ہوتا، اسی وجہ سے اس میں تبدیلی ہوسکتی ہے اور جو کچھ دوسرے حضرات جانتے ہیں اسی حصہ سے متعلق ہے۔

حضرت امام صادق علیہ السلام سے منقول حدیث میں پڑھتے ہیں خداوند عالم کے پاس ایک ایسا علم ہے جو کسی دوسرے کے پاس نہیں ہے، اور دوسرا علم وہ ہے جس کو اس نے ملائکہ، انبیاء اور مرسلین کو عطا کیا ہے، اور جو کچھ ملائکہ، انبیاء اور مرسلین کو عطا ہوا ہے وہ ہم بھی جانتے ہیں۔(۱)

اس سلسلہ میں حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے ایک اہم روایت نقل ہوئی ہے، جس میں امام علیہ السلام نے فرمایا ''اگر قرآن مجید میں ایک آیت نہ ہوتی تو میں ماضی اور روز قیامت تک پیش آنے والے تمام واقعات بتادیتا، کسی نے عرض کیا کہ وہ کون سی آیت ہے؟ تو امام علیہ السلام نے درج ذیل آیہ شریفہ کی تلاوت فرمائی ﴿یَمْحُوا اللّٰہُ مَا یَشَاءُ وَیُثْبِتُ﴾(۲) ''اللہ جس چیز کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے یا برقرار رکھتا ہے، اور ام الکتاب (لوح محفوظ) اس کے پاس ہے۔(۳)

(۱) بحار الانوار، جلد ۲۶، صفحہ ۱۶۰، (حدیث ۵)

(۲) سورہ رعد، آیت ۳۹۔

(۳) نور الثقلین، جلد ۲، صفحہ ۵۱۲، (حدیث ۱۶۰)

اس راہ کے لحاظ سے علوم کی تقسیم بندی "حتمی ہونے" اور حتمی نہ ہونے کے لحاظ سے ہے اور گزشتہ راہ حل معلومات کی مقدار کے لحاظ سے ہیں۔ (غور کیجئے)

۴۔اس مشکل کو حل کرنے کے لئے ایک دوسرا طریقہ یہ ہے کہ خداوند عالم تمام اسرار غیب کو بالفعل (ابھی) جانتا ہے، لیکن ممکن ہے کہ انبیاء اور اولیاء الٰہی علم غیب کی بہت سی باتوں کو نہ جانتے ہوں ہاں جس وقت وہ ارادہ کرتے ہیں تو خداوند عالم ان کو تعلیم دے دیتا ہے، البتہ یہ ارادہ بھی خداوند عالم کی اجازت سے ہوتا ہے۔

اس راہ حل کی بنا پر وہ آیت و روایات جو کہتی ہیں کہ غیب کی باتوں کو خدا کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں جانتا تو ان کا مقصد یہ ہے کہ کسی دوسرے کو بالفعل علم نہیں ہے اور یہ آیات و روایات فعلی طور پر نہ جاننے کے بارے میں ہیں، اور جو کہتی ہیں کہ دوسرے جانتے ہیں وہ امکان کی صورت کو بیان کرتی ہیں یعنی دوسروں کے لئے ممکن ہے۔

یہ بالکل اس شخص کی طرح ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کو ایک خط دے تاکہ فلاں شخص تک پہنچا دے، تو یہاں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ وہ خط کے مضمون سے آگاہ نہیں ہے، حالانکہ وہ خط کھول کر اس کے مضمون سے باخبر ہوسکتا ہے، لیکن کبھی صاحب خط کی طرف سے خط پڑھنے کی اجازت ہوتی ہے تو وہ اس صورت میں خط کے مضمون سے آگاہ ہوسکتا ہے اور کبھی خط کے کھولنے کی اجازت نہیں ہوتی۔

اس راہ حل کے لئے بہت سی احادیث گواہ ہیں جو [عظیم الشان] کتاب اصول کافی ہے باب "إنَّ الأئمَّةَ إذا شاؤا أن يَعلَموا عَلِمُوا" (ائمہ جب کوئی چیز جاننا چاہتے ہیں تو ان کو تعلیم ہوجاتا ہے) میں بیان ہوئی ہیں، ان میں سے ایک حدیث حضرت امام صادق علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے:

"إِذَا أَرَادَ الإِمَامُ أَن يَعلَمَ شَيئاً أَعلَمَهُ اللهُ بِذٰلِكَ" (۱)

"جب امام کسی چیز کے بارے میں علم حاصل کرنا چاہے تو خداوند عالم تعلیم کر دیتا ہے"۔

یہی راہ حل پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ علیہم السلام کے علم کے سلسلہ میں بہت سی مشکلات کو حل کر دیتا ہے، مثال کے طور پر: کس طرح ائمہ علیہم السلام زہر آلود کھانا کھا لیتے ہیں جبکہ ایک عام انسان کے لئے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ نقصان دینے والے کام کو انجام دے اس طرح کے مواقع پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا ائمہ علیہم السلام کو اس بات کی اجازت نہیں تھی کہ وہ ارادہ کریں تا کہ غیب کے اسرار ان کے لئے کشف ہو جائیں۔

اسی طرح کبھی کبھی مصلحت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا ائمہ علیہم السلام کو کسی بات کا علم نہ ہو، یا اس کے ذریعہ ان کا امتحان ہوتا ہے تا کہ ان کے کمال اور فضیلت میں مزید اضافہ ہو سکے، جیسا کہ شب ہجرت کے واقعہ میں بیان ہوا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام پیغمبر اکرمؐ کے بستر پر لیٹ گئے، حالانکہ خود حضرت کی زبانی نقل ہوا ہے کہ میں نہیں جانتا تھا کہ پیغمبر اکرم کے بستر پر جب مشرکین قریش حملہ کریں تو میں شہید ہو جاؤں گا یا جان بچ جائے گی؟

اس موقع پر مصلحت یہی ہے کہ امام علیہ السلام اس کام کے انجام سے آگاہ نہ ہوں تا کہ خدا امتحان لے سکے اور اگر امام علیہ السلام کو یہ معلوم ہوتا کہ میری جان کے لئے کوئی خطرہ نہیں ہے تو یہ کوئی افتخار اور فضیلت کی بات نہیں تھی، اس بنا پر قرآن اور احادیث میں اس قربانی کے فضائل و مناقب بیان ہوتے ہیں وہ قابل توجہ نہ رہتے۔

جی ہاں! علم ارادی کا مسئلہ اس طرح کے تمام اعتراضات کے لئے بہترین جواب ہے۔

۵۔ علم غیب کے بارے میں بیان ہوئی مختلف روایت کے اختلاف کا ایک حل یہ ہے

---

(۱) اصول کافی "باب ان الائمة اذا شاؤوا ان یعلموا علموا" (حدیث ۳) اور اسی مضمون کی دوسری روایتیں بھی اسی باب میں نقل ہوئی ہیں۔

(اگر چہ یہ راہ حل بعض روایات پر صادق ہے) کہ ان روایات کے سننے والے مختلف سطح کے لوگ تھے، جو لوگ ائمہ علیہم السلام کے بارے میں علم غیب کو قبول کرنے کی استعداد اور صلاحیت رکھتے تھے، ان کے سامنے حق مطلب بیان کیا گیا، لیکن مخالف یا کم استعداد لوگوں کے سامنے ان کی سمجھ ہی کے اعتبار سے بیان ہوا ہے۔

مثال کے طور پر ایک حدیث میں بیان ہوا کہ ابو بصیر اور امام صادق علیہ اسلام کے چند اصحاب ایک مقام پر بیٹھے ہوئے تھے امام علیہ اسلام حالت غضب میں وارد مجلس ہوئے اور جب امام علیہ السلام تشریف فرما ہوئے تو فرمایا عجیب بات ہے کہ بعض لوگوں کا گمان ہے کہ ہم علم غیب جانتے ہیں، جبکہ خدا کے علاوہ کوئی بھی علم غیب نہیں رکھتا، میں چاہتا تھا کہ اپنی کنیز کو تنبیہ کروں، لیکن بھاگ گئی اور نہ معلوم گھر کے کس کمرہ میں چھپ گئی!!"۔(۱)

راوی کہتا ہے: جس وقت امام علیہ اسلام وہاں سے تشریف لے گئے، میں اور بعض دوسرے اصحاب اندرون خانہ وارد ہوئے تو امام علیہ السلام سے عرض کی: ہم آپ پر قربان! آپ نے اپنی کنیز کے بارے میں ایسی بات کہی،، جبکہ ہمیں معلوم ہے آپ بہت سے علوم جانتے ہیں اور ہم علم غیب کا نام تک نہیں لیتے؟ امام علیہ السلام نے اس مسئلہ میں وضاحت فرمائی کہ ہمارا مقصد اسرار غیب کا علم تھا۔

یہ بات واضح رہے کہ اس مقام پر ایسے بھی لوگ بیٹھے تھے جن کے یہاں امام کی معرفت اور علم غیب کے معنی کو سمجھنے کی استعداد نہیں پائی جاتی تھی۔

[قارئین کرام!] توجہ فرمائیں کہ یہ پانچ راہ حل آپس میں کوئی تضاد اور تناقض نہیں رکھتی اور سبھی صحیح ہو سکتی ہیں۔(غور کیجئے)

---

(۱) اصول کافی، جلد اول، باب نادر فیہ ذکر الغیب حدیث۳۔

۲۔ائمہ علیہم السلام کے لئے علم غیب ثابت کرنے کے دیگر طریقے

یہاں پر اس حقیقت کو ثابت کرنے کے دو طریقے اور بھی ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ معصومین علیہم السلام اجمالاً غیب کے اسرار سے واقف تھے۔

۱۔ہم یہ بات جانتے ہیں کہ ان کی نبوت یا امامت کا دائرہ کسی زمان ومکان سے مخصوص نہیں تھا، بلکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت اور ائمہ علیہم السلام کی امامت عالمی اور جاویدانی ہے، لہٰذا یہ بات کس طرح ممکن ہے کہ کوئی اس قدر وسیع ذمہ داری رکھتا ہو، حالانکہ اس کو اپنے زمانہ اور محدود دائرہ کے علاوہ کسی چیز کی خبر نہ ہو؟ مثال کے طور پر اگر کسی کو کسی بڑے صوبہ کی امارت یا کلکٹری دی جائے اور سے اس کے بارے میں آگاہی نہ ہو، تو کیا وہ اپنی ذمہ داری کو خوب نبھا سکتا ہے؟!

دوسرے لفظوں میں یوں کہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ علیہم السلام اپنی [ظاہری] زندگی میں اس طرح احکام الٰہی کو بیان اور نافذ کریں تاکہ ہر زمانہ اور ہر جگہ کے تمام انسانوں کی ضرورتوں کو مدنظر رکھیں، اور یہ ممکن نہیں ہے مگر اسی صورت میں کہ اسرار غیب کے کم از کم ایک حصہ کو جانتے ہوں۔

۲۔اس کے علاوہ قرآن مجید میں تین آیات ایسی موجود ہیں کہ اگر ان کو ایک جگہ جمع کردیں تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ معصومین علیہم السلام کے علم غیب کا مسئلہ واضح ہوجاتا ہے، پہلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے کہ ایک شخص (آصف بن برخیا) نے تخت بلقیس چشم زدن میں جناب سلیمان کے پاس حاضر کردیا، ارشاد ہوتا ہے:

﴿قَالَ الَّذِی عِنْدَهُ عِلْمٌ مِنَ الْکِتَابِ اَنَا آتِیکَ بِهِ قَبْلَ اَنْ یَرْتَدَّ إِلَیْکَ طَرْفُکَ فَلَمَّا رَآهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهُ قَالَ هَذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّی﴾(۱)

"ایک شخص نے جس کے پاس کتاب کے ایک حصہ کا علم تھا اس نے کہا کہ میں اتنی جلدی

---

(۱)سورۂ نمل، آیت ۴۰

لے آؤں گا کہ آپ کی پلک بھی نہ جھپکنے پائے۔اس کے بعد سلیمان نے تخت کو اپنے سامنے حاضر دیکھا تو کہنے لگے: یہ میرے پروردگار کا فضل وکرم ہے"۔

دوسری آیت میں بیان ہوتا ہے۔

﴿قُلْ كَفَى بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ عِندَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ﴾(۱)

"[اے رسول آپ] کہہ دیجئے کہ ہمارے اور تمہارے درمیان رسالت کی گواہی کے لئے خدا کافی ہے اور وہ شخص کافی ہے جس کے پاس پوری کتاب کا علم ہے"۔

سنی وشیعہ معتبر کتابوں میں بہت سی احادیث نقل ہوئی ہیں جن میں بیان ہوا ہے کہ ابو سعید خدری کہتے ہیں کہ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے "الذی عنده علم من الکتاب" کے بارے میں سوال کیا، تو آنحضرتؐ نے فرمایا وہ میرے بھائی جناب سلیمان بن داوود کے وصی تھے، میں نے پھر دوبارہ یہ سوال کیا کہ "من عنده علم الکتاب" سے کون مراد ہے؟ تو آپ نے فرمایا "ذاک أخي عليّ بن أبي طالب" (اس سے مراد میرے بھائی علی بن ابی طالبؑ ہیں)(۲)

اور آیت "علم من الکتاب" کے پیش نظر جو کہ آصف بن برخیا کے بارے میں ہے "جزئی علم" کو بیان کرتی ہے، اور "علم الکتاب" جو کہ حضرت علی علیہ سلام کے بارے میں ہے "کلی علم" کو بیان کرتی ہے، لہذا اس آیت سے آصف بن برخیا اور حضرت علی علیہ اسلام کا علمی مقام واضح ہو جاتا ہے۔

تیسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے

﴿وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ...﴾(۳)

---

(۱) سورۂ رعد، آیت ۴۳

(۲) "احقاق الحق"، جلد ۳، صفحہ ۲۸۰۔ ۲۸۱، اور "نور الثقلین"، جلد ۲، صفحہ ۵۲۳ پر رجوع کریں

(۳) سورۂ نحل، آیت ۸۹

"اور ہم نے آپ پر کتاب نازل کی ہے جس میں ہر شئے کی وضاحت موجود ہے"۔

یہ بات واضح ہے کہ ایسی کتاب کے اسرار کا علم رکھنے والا، اسرار غیب بھی جانتا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا امام علیہ السلام حکم خدا کے ذریعہ اسرار غیب سے آگاہ ہوں۔(۱)

(۱) تفسیر نمونہ، جلد ۲۵، صفحہ ۲۶

۳۷۔ کیا انبیاءؑ میں بھول چوک کا امکان ان کی عصمت سے ہم آہنگ ہے؟

سورہ کہف کی مختلف آیات میں یہ بیان ہوا ہے کہ جناب موسیٰ علیہ السلام بھول گئے، ایک جگہ پر ارشاد ہوتا ہے کہ جس وقت وہ دونوں (جناب موسیٰ اور ان کے ہم سفر دوست) دو دریا کے سنگم پر پہنچے تو اپنی مچھلی بھول گئے، اور وہ مچھلی عجیب طرح سے دریا میں چلنے لگی[۱]۔

﴿فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ﴾ (۱)

"پھر جب دونوں دو دریا کے سنگم تک پہنچ گئے تو اپنی مچھلی بھول گئے اور اس نے سمندر میں اپنا راستہ نکال لیا"۔

لہٰذا دونوں ہی بھول گئے۔

اور دو آیت کے بعد جناب موسیٰ علیہ السلام کے دوست کی زبانی نقل ہوا ہے:

﴿فَإِنِّي نَسِيتُ الْحُوتَ وَمَا أَنْسَانِيهُ إِلَّا الشَّيْطَانُ أَنْ أَذْكُرَهُ﴾ (۲)

"[اس جوان نے کہا کہ کیا آپ نے یہ دیکھا ہے کہ جب ہم پتھر کے پاس ٹھہرے تھے] تو

---

(۱) سورۂ کہف، آیت ۶۱

(۲) سورۂ کہف، آیت ۶۳

میں نے مچھلی وہیں چھوڑدی تھی اور شیطان نے اس کے ذکر کرنے سے بھی غافل کردیا تھا“۔

اگر جناب موسیٰ علیہ السلام کے دوست یوشع بن نون تھے (جیسا کہ مفسرین کے درمیان مشہور ہے) حالانکہ وہ بھی پیغمبر تھے تو معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام پر بھول طاری ہوسکتی ہے۔

نیز چند آیتوں کے بعد جناب موسیٰ علیہ السلام کی زبانی نقل ہوا ہے کہ جب ان کی ملاقات اس عظیم بندۂ خدا (جناب خضر) سے ہوئی تو ان سے وعدہ کیا کہ ان کے اسرار آمیز اعمال کے بارے میں کوئی سوال نہیں کریں گے، یہاں تک کہ وہ خود اس کے بارے میں وضاحت کریں، لیکن جناب موسیٰ علیہ السلام پہلی مرتبہ بھول گئے، کیونکہ جب جناب خضر اس صحیح و سالم کشتی میں سوراخ کرنے لگے تو جناب موسیٰ نے اعتراض کردیا کہ آپ ایسا کیوں کررہے ہیں؟! تو اس وقت جناب خضر نے ان کا کیا ہوا وعدہ یاد دلایا، جناب موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ﴿قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِي بِمَا نَسِيتُ﴾(۱)

”موسیٰ نے کہا کہ خیر جو فروگزاشت ہوگئی اس کا مواخذہ نہ کریں“۔

اور یہی بات دوسری اور تیسری مرتبہ بھی تکرار ہوئی۔

کیا ان تمام مذکورہ آیات کے پیش نظر یہ نتیجہ نہیں نکلتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام فراموشی اور بھول طاری ہوسکتی ہے؟ اور کیا بھول چوک عصمت کے منافی نہیں ہے؟

اس سوال کے جواب میں مفسرین نے مختلف راہ حل بیان کی ہیں، بعض مفسرین کہتے ہیں: ”نسیان“ [بھول] کسی چیز کے ترک کرنے کے معنی میں ہے اگرچہ اس کو بھلایا بھی نہ جائے، جیسا کہ جناب آدم علیہ السلام کے واقعہ میں پڑھتے ہیں:

﴿وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَىٰ آدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ...﴾(۲)

”اور ہم نے آدم سے اس سے پہلے عہد لیا مگر انھوں نے اسے ترک کردیا“۔

---

(۱)سورۂ کہف، آیت۷۳۔ (۲)سورۂ طٰہٰ، آیت۱۱۵

یہ بات مسلم ہے کہ جناب آدم علیہ السلام ممنوعہ درخت کا پھل کھانے کے بارے میں عہد الٰہی کو نہیں بھولے لیکن چونکہ اس کی نسبت بے اعتنائی کی لہٰذا "نسیان" [بھول] کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ "بھولنے والے" درحقیقت جناب موسیٰ علیہ السلام کے دوست تھے نہ خود جناب موسیٰ، اور ان کے بارے میں یہ معلوم نہیں ہے کہ وہ نبی تھے یا نہیں، کم از کم قرآن مجید کی رُو سے یہ بات ثابت نہیں ہے، اس کے علاوہ انھیں آیت میں بیان ہوا ہے کہ جناب موسیٰ علیہ السلام کے دوست نے مچھلی کو دریا میں گرنے، اس کے زندہ ہونے اور اس کے چلنے کو دیکھا، انھوں نے سوچا کہ جناب موسیٰ علیہ السلام سے اس ماجرے کو بیان کرے لیکن وہ بھول گئے، لہٰذا یہاں پر بھولنے والے جناب موسیٰ کے ساتھی ہی تھے، کیونکہ صرف انھوں نے اس واقعہ کو دیکھا تھا، اور اگر آیت میں "نسیا" کا لفظ آیا ہے جس میں دونوں کی طرف بھول کی نسبت دی گئی ہے تو یہ نسبت ایسی ہی ہے جیسے مزدور کے کام کو ٹھیکیدار کی طرف نسبت دیتے ہیں وراسے بہت رائج ہے، [مثلاً عمارت میں کام کرنے والے مزدور ہوتے ہیں لیکن کہا جاتا ہے کہ فلاں انجینئر نے یہ عمارت بنائی ہے وغیرہ وغیرہ]

ممکن ہے کوئی یہ کہے یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ انسان اتنے اہم مسئلہ [یعنی مچھلی کا زندہ ہوجانے] کو بھول جائے، تو اس کے جواب میں عرض ہے کہ جناب موسیٰ علیہ السلام کے دوست نے اس سے اہم معجزات دیکھے تھے، اس کے علاوہ اس عجیب وغریب سفر میں اس سے کہیں زیدہ اہم مسائل کی جستجو کی جارہی تھی، اسی وجہ سے اس واقعہ کو بھول جانا جائے تعجب نہیں ہے۔

اور جیسا کہ بھولنے کی نسبت شیطان کی طرف دی گئی ہے، تو اس کی وجہ ممکن ہے یہ ہو مچھلی زندہ ہونے کا واقعہ اس عالم [خضر] کے ملنے سے تعلق رکھتا ہو جن سے جناب موسیٰ علیہ اسلام کو علم حاصل کرنا تھا، اور چونکہ شیطان کا کام بہکانا ہے جو ہمیشہ یہی چاہتا ہے کہ کوئی بھی اپنے پاک وپاکیزہ

مقصد تک نہ پہنچ سکے، یا دیر سے پہنچے، لہٰذا اس نے جناب موسیٰ کے دوست کو بھلا دیا ہو۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بعض احادیث میں بیان ہوا ہے کہ جس وقت مچھلی زندہ ہو کر دریا میں کود پڑی، اور پانی میں چلنے لگی، اس وقت جناب موسیٰ علیہ السلام سو رہے تھے، اور ان کے دوست (جو اس واقعہ کو دیکھ رہے تھے) انھوں نے جناب موسیٰ کو بیدار کرنا نہیں چاہا، تاکہ ان سے واقعہ بیان کر ے لیکن جب جناب موسیٰ بیدار ہوگئے تو وہ بھول گئے، اور جناب موسیٰ علیہ السلام سے نہ بتا سکے، جس کی بنا پر ایک روز و شب اپنے راستے پر چلتے رہے، اس کے بعد ان کے دوست کو یاد آیا تو انھوں نے جناب موسیٰ علیہ السلام سے وہ واقعہ بیان کیا، تو انھیں مجبوراً اسی جگہ آنا پڑا کہ جہاں پر مچھلی پانی میں گری تھی۔(۱)

اور بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ انبیاء علیہم السلام بھول چوک سے معصوم ہوتے ہیں، لیکن وہ بھول چوک جو لوگوں کی ہدایت سے متعلق ہو، لیکن ایسی بھول چوک جو ان کے روز مرہ کے ذاتی کاموں سے متعلق ہو اور جو ت، تعلیم و تربیت اور تبلیغ سے متعلق نہ ہو، تو ایسی بھول ان کی عصمت کے لئے منافات نہیں رکھتی، ور مذکورہ آیت میں جو بھول بیان ہوئی ہے وہ اسی طرح کی ہے۔(۲)

---

(۱) تفسیر مراغی، جلد ۱۵، صفحہ ۱۷۷

(۲) تفسیر پیام قرآن، جلد ۷، صفحہ ۱۳۶

۳۸۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی متعدد بیویوں کا فلسفہ کیا ہے؟

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مختلف اور متعدد بیویوں سے عقد کرنا بہت سی اجتماعی اور سیاسی مشکلات کا حل تھا۔

کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ جس وقت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعلان رسالت کیا اور خدا کی وحدانیت کی طرف دعوت دی تو اس وقت آپ تن تنہا تھے، اور ایک طولانی مدت تک چند لوگوں کے علاوہ کوئی ایمان نہیں لایا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے زمانہ کے تمام خرافاتی عقائد کے خلاف قیام کیا تھا، اور سبھی کے لئے اعلان جنگ کر رکھا تھا، جس کی وجہ سے تمام اقوام اور قبائل آپ سے مقابلہ کے لئے تیار تھے۔

لہٰذا آنحضرتؐ نے ان کے ناپاک اتحاد کو ختم کرنے کے لئے ہر ممکن راستہ اختیار کیا مختلف قبائل میں شادی کے ذریعہ رشتہ داری قائم کرنا ان میں سے ایک راستہ تھا، کیونکہ اس وقت کے جاہل عرب کے نزدیک سب سے مستحکم رابطہ یہی رشتہ داری تھی، اور قبیلہ کے داماد کو اپنا مانتے تھے، اس کا دفاع کرتے تھے، نیز اس کو تنہا چھوڑ دینا گناہ سمجھتے تھے۔

بہت سے قرائن اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شادیاں، بہت سے موارد میں سیاسی پہلو رکھتی تھیں۔

ان میں سے بعض شادی (جیسے زینب سے شادی) زمانہ جاہلیت کی غلط رسم و رواج کو ختم

کرنے کے لئے تھی، جس کی تفصیل سورہ احزاب آیت نمبر ۳۷ میں بیان ہوئی ہے۔

ان میں سے بعض شادی کی وجہ یہ تھی کہ کچھ لوگوں یا چند متعصب اور ہٹ دھرم قبیلوں کے دلوں سے دشمنی اور عداوت کو دور کرکے ان کے دلوں میں محبت کا جام بھر دیں۔

کیونکہ یہ بات واضح ہے کہ جس نے اپنی جوانی اور پورے شباب (۲۵ سال کی عمر) میں ایک بیوہ سے شادی کی ہو اور ۵۳ سال کی عمر تک اسی ایک بیوہ عورت کے ساتھ زندگی گزاری ہو، اور اس طرح اس نے اپنی زندگی کے دن گزار دئے ہوں اور پیری کا عالم آگیا ہو، تو اگر اس موقع پر مختلف قبائل کی عورتوں سے عقد کریں تو پھر اس کا کوئی نہ کوئی فلسفہ ضرور ہے، اور جنسی رجحان سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، کیونکہ اس جاہلیت کے زمانہ میں چند شادیاں کرلینا ایک عام بات تھی یہاں تک کبھی کبھی پہلی بیوی اپنے شوہر کے لئے دوسری بیوی کا رشتہ لے کر جایا کرتی تھی اور شادیوں کی تعداد میں کسی طرح کی کوئی حد معین نہیں تھی، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے جوانی کے عالم میں متعدد شادیاں کرنے میں نہ تو معاشرہ کے لحاظ سے کوئی ممانعت تھی اور نہ مالی اعتبار سے کوئی مشکل تھی، اور نہ ہی اس کو کسی طرح کا کوئی عیب سمجھا جاتا۔

تعجب کی بات تو یہ ہے کہ تاریخ نے بیان کیا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صرف ایک "باکرہ" عورت سے نکاح کیا ہے اور وہ عائشہ تھی، اس کے علاوہ آپ کی تمام بیویاں بیوہ تھیں جو فطری طور پر جنسی تحریک کے لئے کوئی خاص رغبت نہیں رکھتیں۔(۱)

یہاں تک کہ بعض تواریخ میں بیان ہوا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے متعدد عقد کئے، اور صرف عقد خوانی کی رسم ادا کی، اور ان کے ساتھ ہمبستر تک نہ ہوئے، بلکہ بعض قبائل کی عورتوں سے صرف رشتہ کی حد تک قناعت کی۔(۲)

---

(۱)(۲) بحار الانوار، جلد ۲۲، صفحہ ۱۹۱و۱۹۲ [حقیر کے علاوہ اس سے متفق نہیں ہیں، ان کی تحقیق یہ ہے کہ جناب خدیجہ باکرہ تھیں، اور آپ سے پہلے انھوں نے کسی دوسرے شخص سے شادی نہیں کی تھی۔ مترجم]

اور وہ لوگ اسی پر فخر و مباہات کیا کرتے تھے کہ ان کے قبیلہ کی عورت پیغمبر اکرم ﷺ سے منسوب ہوگئی ہے، اور یہ افتخار ان کو مل گیا ہے، جس کی بنا پر اجتماعی طور پر پیغمبر اکرم ﷺ سے رابطہ مستحکم تر ہو جاتا تھا اور آنحضرت ﷺ کے دفاع کے لئے مصمم ہو جایا کرتے تھے۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی مسلم ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ [خدانخواستہ] عقیم نہیں تھے لیکن تاریخ نے بہت ہی کم آپ کی اولاد بتائی ہے، جبکہ اگر یہ تمام شادیاں اور عقد جنسی شہوت کے لئے ہوتیں تو لامحالہ آپ کی اولاد کی تعداد بھی زیادہ ہوتی۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی بعض بیویاں جیسے عائشہ کم سنی کے عالم میں آپ کی زوجیت میں آئی ہیں اور چند سال کے بعد واقعی طور پر ایک زوجہ قرار پائی ہیں، جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ کا اس طرح کی لڑکی سے عقد کرنے کا مقصد جنسی شہوت نہیں تھا بلکہ ہدف اور اس سے وہی مقصد تھا جو اوپر بیان کیا گیا ہے۔

اگرچہ اسلام کے دشمنوں نے پیغمبر اکرم ﷺ کی متعدد بیویوں کو بہانہ بنا کر آپ کی شخصیت کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے اور نہ جانے کیسے کیسے جھوٹے افسانے گڑھ ڈالے ہیں، لیکن ان شادیوں کے وقت آنحضرت ﷺ کی عمر کا زیادہ ہونا اور مختلف قبائل کی عورتوں کا بیوہ یا ضعیف العمر ہونا ایک طرف اور ان بیویوں کے قبائلی شرائط دوسری طرف، نیز مذکورہ قرائن کے پیش نظر حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے، اور دشمنوں کا راز فاش ہو جاتا ہے۔(۱)

---

(۱) تفسیر نمونہ، جلد ۱۷، صفحہ ۳۸

قرآن مجید

۳۹۔ کیا قرآن مجید میں تحریف ہوئی ہے؟

شیعہ وسنی علما کے یہاں مشہور ومعروف یہی ہے کہ قرآن مجید میں کوئی تحریف نہیں ہوئی ہے، اور موجودہ قرآن کریم وہی قرآن ہے جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا، اوراس میں ایک لفظ بھی کم و زیادنہیں ہوا ہے۔

قدما اور متاخرین میں جن شیعہ علما نے اس حقیقت کی وضاحت کی ہے ان کے اسما درج ذیل ہیں:

۱۔ مرحوم شیخ طوسیؒ جو "شیخ الطائفہ" کے نام سے مشہور ہیں، موصوف نے اپنی مشہور ومعروف کتاب "تبیان" میں وضاحت اور تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

۲۔ سید مرتضیٰؒ، جو چوتھی صدی کے عظیم الشان عالم ہیں۔

۳۔ رئیس المحدثین مرحوم شیخ صدوق محمد بن علی بن بابویہؒ، موصوف شیعہ عقیدہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں کسی طرح کی کوئی تحریف نہیں ہوئی ہے"۔

۴۔ جلیل القدر مفسر قرآن مرحوم علامہ طبرسی، جنھوں نے اپنی تفسیر (مجمع البیان) کے مقدمہ میں اس سلسلہ میں ایک واضح اور مفصل بحث کی ہے۔

۵۔ مرحوم کاشف الغطاء جو علمائے متاخرین میں عظیم مرتبہ رکھتے ہیں۔

۶۔ مرحوم محقق یزدیؒ نے اپنی کتاب عروۃ الوثقیٰ میں قرآن میں تحریف نہ ہونے کے اقوال کو

اکثر شیعہ مجتہدین سے نقل کیا ہے۔

۷۔ نیز بہت سے جید علما جیسے ''شیخ مفید''، ''شیخ بہائی''، قاضی نور اللہ'' اور دوسرے شیعہ محققین نے اسی بات کو نقل کیا ہے کہ قرآن مجید میں کوئی تحریف نہیں ہوئی ہے۔

اہل سنت کے علما اور محققین کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ قرآن کریم میں تحریف نہیں ہوئی ہے۔

اگرچہ بعض شیعہ و سنی محدثین جو قرآن کریم کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتے تھے، اس بات کے قائل ہوئے ہیں کہ قرآن کریم میں تحریف ہوئی ہے، لیکن دونوں مذہب کے عظیم علما کی روشن فکری کی بنا پر یہ عقیدہ باطل قرار دیا گیا اور اس کو بھلا دیا گیا ہے۔

یہاں تک کہ مرحوم سید مرتضیٰ ''المسائل الطرابلسیات'' کے جواب میں کہتے ہیں: ''قرآن کریم کی نقل صحت اتنی واضح اور روشن ہے جیسے دنیا کے مشہور و معروف شہروں کے بارے میں ہمیں اطلاع ہے، یا تاریخ کے مشہور و معروف واقعات معلوم ہیں''۔

مثال کے طور پر کیا کوئی مکہ اور مدینہ یا لندن اور پیرس جیسے مشہور و معروف شہروں کے وجود میں شک کر سکتا ہے؟ اگرچہ کسی انسان نے ان شہروں کو نزدیک سے نہ دیکھا ہو، یا انسان ایران پر مغلوں کے حملے، یا فرانس کے عظیم انقلاب یا پہلی اور دوسری عالمی جنگ کا انکار کر سکتا ہے؟!

پس جیسے ان کا انکار اس لئے نہیں کر سکتے کہ یہ تمام واقعات تواتر کے ساتھ ہم نے سنے ہیں، تو قرآن کریم کی آیات بھی اسی طرح ہیں، جس کی تشریح ہم بعد میں بیان کریں گے۔

لہٰذا جو لوگ اپنے تعصب کے تحت شیعہ اہل سنت کے درمیان اختلاف پیدا کرنے کے لئے تحریف قرآن کی نسبت شیعوں کی طرف دیتے ہیں تو وہ اس نظریہ کو باطل کرنے والے دلائل کیوں بیان نہیں کرتے جو خود شیعہ علما کی کتابوں میں موجود ہیں؟!

کیا یہ بات جائے تعجب نہیں ہے کہ ''فخر الدین رازی'' جیسا شخص (جو ''شیعوں'' کی نسبت بہت زیادہ متعصب ہے) سورہ حجر کی آیت نمبر ۹ کے ذیل میں کہتا ہے کہ یہ آیۂ شریفہ ﴿إِنَّا نَحْنُ

نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ شیعوں کے عقیدہ کو باطل کرنے کے لئے کافی ہے، جو قرآن مجید میں تحریف [کمی یا زیادتی] کے قائل ہیں۔

تو ہم فخر رازی کے جواب میں کہتے ہیں اگر ان کی مراد بزرگ شیعہ محققین ہیں تو ان میں سے کوئی بھی ایسا عقیدہ نہیں رکھتا ہے، اور اگر ان کی مراد بعض علماء کا ضعیف قول ہے تو اس طرح کا نظریہ تو اہل سنت کے یہاں بھی پایا جاتا ہے، جس پر نہ اہل سنت توجہ کرتے ہیں اور نہ ہی شیعہ علما توجہ کرتے ہیں۔

چنانچہ مشہور و معروف محقق ''کاشف الغطاء'' اپنی کتاب ''کشف الغطاء'' میں فرماتے ہیں:

''لاریب انّهُ (أی القرآن) محفوظٌ مِنَ النُّقصَانِ بحفظِ الملک الدّیان کما دَلَّ علَیہِ صَریحُ القُرآنِ وَإجماع العلماء فِی کُلِّ زمان ولا عبرة بنادر''(۱)

''اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ قرآن مجید میں کسی بھی طرح کی کوئی تحریف نہیں ہوئی ہے، کیونکہ خداوند عالم اس کا محافظ ہے، جیسا کہ قرآن کریم اور ہر زمانہ کے علما کا اجماع اس بات کی وضاحت کرتا ہے اور شاذ و نادر قول پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی''۔

تاریخ اسلام میں ایسی بہت سی غلط نسبتیں موجود ہیں جو صرف تعصب کی وجہ سے دی گئی ہیں جبکہ ہم جانتے ہیں کہ ان میں سے بہت سی نسبتوں کی علت اور وجہ صرف اور صرف دشمنی تھی، اور بعض لوگ اس طرح کی چیزوں کو بہانہ بنا کر کوشش کرتے تھے کہ مسلمانوں کے درمیان اختلاف کرائیں۔

اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ حجاز کا مشہور و معروف مؤلف ''عبد اللہ علی قصیمی'' اپنی کتاب ''الصراع'' میں شیعوں کی مذمت کرتے ہوئے کہتا ہے:

''شیعہ ہمیشہ سے مسجد کے دشمن رہے ہیں! اور یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شیعہ علاقے میں شمال

(۱) تفسیر آلاء الرحمن صفحہ ۲۵۔

سے جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک دیکھے تو بہت ہی کم مسجدیں ملتی ہیں"!!(۱)

ذرا دیکھے تو سہی ! کہ شیعہ علاقوں میں کس قدر مساجد موجود ہیں، شہر کی سڑکوں پر، گلیوں میں اور بازاروں میں بہت زیادہ مسجدیں ملتی ہیں، کہیں کہیں تو مسجدوں کی تعداد اتنی ہوتی ہے کہ بعض لوگ اعتراض کرنے لگتے ہیں کہ کافی ہے، ہمارے کانوں میں چاروں طرف سے اذانوں کی آوازیں آتی ہیں جن سے ہم پریشان ہیں، لیکن اس کے باوجود مذکورہ مؤلف اتنی وضاحت کے ساتھ یہ بات کہہ رہے ہیں جس پر ہمیں ہنسی آتی ہے چونکہ ہم شیعہ علاقوں میں رہ رہے ہیں، لہٰذا فخر الدین رازی جیسے افراد مذکورہ نسبت دینے لگیں تو ہمیں کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیے۔(۲)

---

(۱) موصوف کی عربی عبارت یہ ہے "والشیعة هم ابداً اعداء المساجد ولهذا یقل أن یشاهد الضارب فی طول بلادهم و عرضها مسجداً" (الصراع جلد ۲، صفحہ ۲۳ علامہ امینی کی نقل کے مطابق الغدیر، جلد ۳، صفحہ ۳۰۰)

(۲) تفسیر نمونہ، جلد ۱۱، صفحہ ۱۸

۴۰۔ قرآن کریم کس طرح معجزہ ہے؟

ہم پہلے قرآن کریم کی عظمت کے سلسلہ میں چند نامور افراد یہاں تک کہ ان لوگوں کے اقوال بھی نقل کریں گے کہ جن لوگوں پر قرآن کریم سے مقابلہ کرنے کا الزام بھی ہے۔

۱۔ ابوالعلاء معرّی (جس پر قرآن کریم سے مقابلہ کرنے کا الزام بھی ہے) کہتا ہے:

اس بات پر سبھی لوگ متفق ہیں (چاہے وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلمان) کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہونے والی کتاب نے لوگوں کی عقلوں کو مغلوب اور مبہوت کردیا ہے، اور ہر ایک اس کی مثل و مانند لانے سے قاصر ہے، اس کتاب کا طرز بیان عرب ماحول کے کسی بھی طرز بیان سے ذرہ برابر بھی مشابہت نہیں رکھتا، نہ شعر سے مشابہ ہے، نہ خطابت سے، اور نہ کاہنوں کے سجع سے مشابہ ہے، اس کتاب کی کشش اور اس کا امتیاز اس قدر عالی ہے کہ اگر اس کی ایک آیت دوسرے کے کلام میں موجود ہو تو اندھیری رات میں چمکتے ہوئے ستاروں کی طرح روشن ہوگی!"۔

۲۔ ولید بن مغیرہ مخزومی، (جو شخص عرب میں حسن تدبیر کے نام سے شہرت رکھتا تھا) اور دور جاہلیت میں مشکلات کو حل کرنے کے لئے اس کی فکر اور تدبیر سے استفادہ کیا جاتا تھا، اسی وجہ سے اس کو "ریحانہ قریش" (یعنی قریش کا سب سے بہترین پھول) کہا جاتا تھا، یہ شخص پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سورہ غافر کی چند آیتوں کو سننے کے بعد قبیلہ "بنی مخزوم" کی ایک نشست میں اس طرح کہتا ہے:

"خدا کی قسم میں نے محمد [صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم] سے ایسا کلام سنا ہے جو نہ انسان کے کلام سے شباہت

رکھتا ہے اور نہ پریوں کے کلام سے، "إنّ لهُ لحلاوة، و إنّ عليه لطلاوة و انّ اعلاه لمثمر و انّ أسفله لمغدق، و انّه يعلو و لا يُعلى عليه" (اس کے کلام کی ایک مخصوص چاشنی ہے، اس میں مخصوص خوبصورتی پائی جاتی ہے، اس کی شاخیں پُر ثمر ہیں اور اس کی جڑیں مضبوط ہیں، یہ وہ کلام ہے جو تمام چیزوں پر غالب ہے اور کوئی چیز اس پر غالب نہیں ہے۔)(۱)

۳۔کارلائل۔ یہ انگلینڈ کا مورخ اور محقق ہے جو قرآن کے حوالہ سے کہتا ہے۔

''اگر اس مقدس کتاب پر ایک نظر ڈالی جائے تو اس کے مضامین برجستہ حقائق اور موجودات کے اسرار اس طرح موجزن ہیں جس سے قرآن مجید کی عظمت بہت زیادہ واضح ہوجاتی ہے، اور یہ خود ایک ایسی فضیلت ہے جو صرف اور صرف قرآن مجید سے مخصوص ہے، اور یہ چیز کسی دوسری علمی، سائنسی وراقتصادی کتاب میں دیکھنے تک کو نہیں ملتی، اگرچہ بعض کتابوں کے پڑھنے سے انسان کے ذہن پر اثر ہوتا ہے لیکن قرآن کی تاثیر کا کوئی موازنہ نہیں ہے، لہٰذا ان باتوں کے پیش نظر یہ کہا جائے کہ قرآن کی ابتدائی خوبیاں اور بنیادی دستاویزات جن کا تعلق حقیقت، پاکیزہ احساسات، برجستہ عنوانات اور اس کے اہم مسائل ومضامین میں سے ہے ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہیں، وہ فضائل جو تکمیل انسانیت اور سعادت بشری کا باعث ہیں اس میں ان کی انتہا ہے اور قرآن وضاحت کے ساتھ ان فضائل کی نشاندہی کرتا ہے۔(۲)

۴۔جان ڈیون پورٹ: یہ کتاب ''عذر تقصیر بہ پیش گاہ محمد وقرآن'' کا مصنف ہے، قرآن کے بارے میں کہتا ہے: ''قرآن نقائص سے اس قدر مبرا ومنزہ ہے کہ چھوٹی سی چھوٹی تصحیح اور اصلاح کا بھی محتاج نہیں ہے، ممکن ہے کہ انسان اول سے آخر تک پڑھے، اور ذرا بھی تھکان و فسردگی بھی محسوس نہ کرے''۔(۳)

(۱) مجمع البیان، جلد ۱۰، سورۂ مدثر

(۲) مقدمہ سازمانہائی تمدن امپراطوری اسلام۔

(۳) مقدمہ سازمانہائی تمدن امپراطوری اسلام، صفحہ ۱۱

اس کے بعد مزید لکھتا ہے: سب اس بات کو قبول کرتے ہیں کہ قرآن سب سے زیادہ فصیح و بلیغ زبان اور عرب کے سب سے زیادہ نجیب اور ادیب قبیلہ قریش کے لب ولہجہ میں نازل ہوا ہے اور یہ روشن ترین صورتوں اور محکم ترین تشبیہات سے معمور ہے"۔(۱)

۵۔گوئٹے: جرمنی شاعر اور دانشور کہتا ہے:

"قرآن ایسی کتاب ہے کہ ابتدا میں قاری اس کی وزنی عبارت کی وجہ سے روگردانی کرنے لگتا ہے لیکن اس کے بعد اس کی کشش کا فریفتہ ہو جاتا ہے اور بے اختیار اس کی متعدد خوبیوں کا عاشق ہو جاتا ہے"۔

یہی گوئٹے ایک اور جگہ لکھتا ہے:

"سالہا سال خدا سے نا آشنا پوپ ہمیں قرآن اور اس کے لانے والے محمد کی عظمت سے دور رکھے رہے مگر علم و دانش کی شاہراہ پر جتنا ہم نے قدم آگے بڑھایا تو جہالت و تعصب کے ناروا پردے ہٹتے گئے اور بہت جلد اس کتاب نے جس کی تعریف و توصیف نہیں ہو سکتی دنیا کو اپنی طرف کھینچ لیا اور اس نے دنیا کے علم و دانش پر گہرا اثر کیا ہے اور آخرکار یہ کتاب دنیا بھر کے لوگوں کے افکار کا محور قرار پائے گی"۔

مزید لکھتا ہے۔ "ہم ابتدا میں قرآن سے روگرداں تھے لیکن زیادہ وقت نہیں گزرا کہ اس کتاب نے ہماری توجہ اپنی طرف جذب کرلی اور ہمیں حیران کردیا یہاں تک کہ اس کے اصول اور عظیم علمی قوانین کے سامنے ہم نے سر تسلیم خم کردیا۔(۲)

۶۔ول ڈیورانٹ: یہ ایک مشہور مورخ ہے، لکھتا ہے

---

(۱)مقدمہ رسالہ اہای تمدن امپر طوری اسلام، صفحہ ۹

(۲)کتاب "عذر تقصیر بہ پیشگاہ محمد و قرآن"

''قرآن نے مسلمانوں میں اس طرح کی عزت نفس، عدالت اور تقویٰ پیدا کیا ہے جس کی مثال دنیا کے دوسرے ممالک میں نہیں ملتی''۔

۷۔ژول لابوم: یہ ایک فرانسیسی مفکر ہے اپنی کتاب ''تفصیل الآیات'' میں کہتا ہے:

''دنیا نے علم ودانش مسلمانوں سے لیا ہے اور مسلمانوں نے یہ علوم قرآن سے لئے ہیں جو علم ودانش کا دریا ہے اور اس سے عالم بشریت کے لئے کئی نہریں جاری ہوتی ہیں''۔

۸۔دیورٹ: یہ ایک اور مستشرق ہے، لکھتا ہے ''ضروری ہے کہ ہم اس بات کا اعتراف کریں کہ علوم طبیعی وفلکی اور فلسفہ وریاضیات جو یورپ میں رائج ہیں زیادہ تر قرآن کی برکت سے ہیں اور ہم مسلمانوں کے مقروض ہیں بلکہ اس لحاظ سے یورپ ایک اسلامی شہر ہے''۔(۱)

۹۔ڈاکٹر مسز لورا واکسیا گلیری: یہ ناپل یونیورسٹی کی پروفیسر ہے، ''پیش رفت سریع اسلام'' میں لکھتی ہے ''اسلام کی کتاب آسمانی اعجاز کا ایک نمونہ ہے....قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس کی نظیر پیش نہیں کی جاسکتی، قرآن کا طرز واسلوب گزشتہ ادبیات میں نہیں پایا جاتا، اور یہ طرز روح انسانی میں جو تاثیر پیدا کرتا ہے وہ اس کے امتیازات اور بلندیوں سے پیدا ہوتی ہے کس طرح ممکن ہے کہ یہ اعجاز آمیز کتاب محمد کی خود ساختہ ہو جب کہ وہ ایک ایسا عرب تھا جس نے تعلیم حاصل نہیں کی، ہمیں اس کتاب میں علوم کے خزانے اور ذخیرے نظر آتے ہیں جو نہایت ہوشمند اشخاص، بزرگ ترین فلسفہ اور قوی ترین سیاست مدار اور قانون داں لوگوں کی استعداد اور ظرفیت سے بلند ہیں، اسی بنا پر قرآن کریم کسی تعلیم یافتہ مفکر اور عالم کا کلام نہیں ہوسکتا''۔(۲)(۳)

---

(۱) المعجزۃ الخالدہ، بنابر نقل از قرآن بر فراز اعصار

(۲) پیش رفت سریع اسلام، اعجاز قرآن کے سلسلہ میں مذکورہ بحث میں ''قرآن وآخرین پیامبر'' سے استفادہ کیا گیا ہے

(۳) تفسیر نمونہ جلد ۱ صفحہ ۱۳۵

قرآن مجید کی حقانیت کی ایک دلیل یہ ہے کہ پورے قرآن میں کوئی تضاد اور اختلاف نہیں پایا جاتا، اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے درج ذیل مطالب پر توجہ فرمائیں:

"انسانی خواہشات میں ہمیشہ تبدیلی آتی رہتی ہے، تکامل اور ترقی کا قانون عام حالات میں انسان کی فکر ونظر سے متاثر رہتا ہے، اور زمانہ کی رفتار کے ساتھ اس میں بھی تبدیلی آتی رہتی ہے، اگر ہم غور کریں تو ایک مؤلف کی تحریر ایک جیسی نہیں ہوتی، بلکہ کتاب کے شروع اور آخر میں فرق ہوتا ہے، خصوصاً اگر کوئی شخص ایسے مختلف حوادث سے گزرا ہو، جو ایک فکری، اجتماعی اور اعتقادی انقلاب کے باعث ہوں، تو ایسے شخص کے کلام میں یکسوئی اور وحدت کا پایا جانا مشکل ہے، خصوصاً اگر اس نے تعلیم بھی حاصل نہ کی ہو، اور اس نے ایک پسماندہ علاقہ میں پرورش پائی ہو۔

لیکن قرآن کریم ۲۳ رسال کی مدت میں اس وقت کے لوگوں کی تدریجی ضرورت کے مطابق نازل ہوا ہے، جبکہ اس وقت کے حالات مختلف تھے، لیکن یہ کتاب موضوعات کے بارے میں متنوع گفتگو کرتی ہے، اور معمولی کتابوں کی طرح صرف ایک اجتماعی یا سیاسی یا فلسفی یا حقوقی یا تاریخی بحث نہیں کرتی، بلکہ کبھی توحید اور اسرار خلقت سے بحث کرتی ہے اور کبھی احکام وقوانین اور آداب ورسوم کی بحث کرتی ہے اور کبھی گزشتہ امتوں اور ان کے ہلا دینے والے واقعات کو بیان کرتی ہے، ایک موقع پر وعظ ونصیحت، عبادت اور انسان کے خدا سے رابطہ کے بارے میں گفتگو کرتی ہے۔

اور ڈاکٹر "گوستاولبن" کے مطابق مسلمانوں کی آسمانی کتاب قرآن مجید صرف مذہبی تعلیمات اور احکام میں منحصر نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کے سیاسی اور اجتماعی احکام بھی اس میں درج ہیں۔

عام طور پر ایسی کتاب میں متضاد باتیں، متناقض گفتگو اور بہت زیادہ اتار چڑھاؤ پایا جاتا ہے، لیکن اس کے باوجود بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی آیات ہر لحاظ سے ہم آہنگ اور ہر قسم کی تناقض گوئی سے خالی ہیں، جس سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آتی ہے کہ یہ کتاب کسی انسان کا نتیجۂ

فکر نہیں ہے بلکہ خداوندعالم کی طرف سے ہے جیسا کہ خود قرآن کریم نے اس حقیقت کو بیان کیا ہے"۔(۱)(۲)

سورہ ہود کی آیت نمبر ۱۲ سے ۱۴ تک ایک بار پھر قرآن مجید کے معجزہ ہونے کو بیان کررہی ہیں یہ ایک عام گفتگو نہیں ہے، اور کسی انسان کا نتیجہ فکر نہیں ہے، بلکہ یہ آسمانی وحی ہے جس کا سرچشمہ خداوندعالم کا لامحدود علم وقدرت ہے، اور اسی وجہ سے چیلنج کرتی ہے اور تمام دنیا والوں کو مقابلہ کی دعوت دیتی ہے، لیکن خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ کے لوگ بلکہ آج تک بھی، اس کی مثل لانے سے عاجز ہیں، چنانچہ انھوں نے بہت سی مشکلات کو قبول کیا ہے لیکن قرآنی آیت سے مقابلہ نہ کیا، جس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ نوع بشر اس کا جواب نہیں لاسکتا تو اگر یہ معجزہ نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

قرآن کی یہ آواز اب بھی ہمارے کانوں میں گونج رہی ہے، اور یہ ہمیشہ باقی رہنے والا معجزہ اب بھی دنیا والوں کو اپنے مقابلہ کی دعوت دے رہا ہے اور دنیا کی تمام علمی محفلوں کو چیلنج کررہا ہے، اور یہی نہیں کہ صرف فصاحت وبلاغت یعنی تحریر کی حلاوت، اس کی جذابیت اور واضح مفہوم کو چیلنج کیا ہے بلکہ مضامین کے لحاظ سے بھی چیلنج ہے ایسے علوم جو اس وقت کے لوگوں کے سامنے نہیں آئے تھے، ایسے قوانین واحکام جو انسان کی سعادت اور نجات کا باعث ہیں، ایسا بیان جو ہر طرح کے تناقض اور ٹکراؤ سے خالی ہے، ایسی تاریخ جو ہر طرح کے خرافات اور بیہودہ باتوں سے خالی ہو۔(۳)

یہاں تک سید قطب اپنی تفسیر "فی ظلال" میں بیان کرتے ہیں کہ [سابق] روس کے مستشرقین نے ۱۹۵۴ء میں ایک کانفرس کی تو بہت سے مادیوں نے قرآن مجید میں عیب نکالنا چاہے

(۱) قرآن و آخرین پیغمبر صفحہ ۳۰۹۔

(۲) تفسیر نمونہ، جلد ۳، صفحہ ۲۸

(۳) تفسیر نمونہ، جلد ۹، صفحہ ۴۴۔

تو کہا: یہ کتاب ایک انسان (محمدؐ) کا نتیجہ فکر نہیں ہو سکتی بلکہ ایک بڑے گروہ کی کاوشوں کا نتیجہ ہے! یہاں تک کہ اس کے بارے میں یہ بھی یقین نہیں کیا جا سکتا کہ یہ جزیرۃ العرب میں لکھی گئی ہے بلکہ یقین کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اس کا کچھ حصہ جزیرۃ العرب سے باہر لکھا گیا ہے!!(۱)

چونکہ یہ لوگ خدا اور وحی کا انکار کرتے ہیں، دوسری طرف قرآن مجید کو جزیرۃ العرب کے انسانی افکار کا نتیجہ نہ مان سکے، لہٰذا انھوں نے ایک مضحکہ خیز بات کہی اور اس کو عرب اور غیر عرب لوگوں کا نتیجہ فکر قرار دے دیا، جبکہ تاریخ اس بات کا بالکل انکار کرتی ہے۔(۲)

---

(۱) تفسیر فی ظلال، جلد ۵، صفحہ ۲۸۲

(۲) تفسیر نمونہ، جلد ۱، صفحہ ۲۱۰.

۴۱۔ کیا قرآن کا اعجاز صرف فصاحت وبلاغت میں منحصر ہے؟

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ قرآن مجید کا اعجاز صرف فصاحت و بلاغت اور شیریں بیانی سے مخصوص نہیں ہے (جیسا کہ بعض قدیم مفسرین کا نظریہ ہے) بلکہ اس کے علاوہ دینی تعلیمات، اور ایسے علوم کے لحاظ سے جو اس زمانہ تک پہچانے نہیں گئے تھے، احکام وقوانین، گزشتہ امتوں کی تاریخ ہے کہ جس میں کسی طرح کی غلط بیانی اور خرافات نہیں ہے، اور اس میں کسی طرح کا کوئی اختلاف اور تضاد نہیں ہے، یہ تمام چیزیں اعجاز کا پہلو رکھتی ہیں۔

بلکہ بعض مفسرین کا تو یہ بھی کہنا ہے کہ قرآن مجید کے الفاظ اور کلمات کا مخصوص آہنگ اور لہجہ بھی اپنی قسم میں خود معجز نما ہے۔

اور اس موضوع کے لئے مختلف شواہد بیان کئے ہیں، منجملہ ان میں مشہور ومعروف مفسر سید قطب کے لئے پیش آنے والے واقعات ہیں، موصوف کہتے ہیں:

میں دوسروں کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کے بارے میں گفتگو نہیں کرتا بلکہ صرف اس واقعہ کو بیان کرتا ہوں جو میرے ساتھ پیش آیا، اور ۶ افراد اس واقعہ کے چشم دید گواہ ہیں (خود میں اور پانچ دوسرے افراد)

ہم چھ مسلمان ایک مصری کشتی میں "بحر اطلس" میں نیویورک کی طرف سفر کر رہے تھے، کشتی

میں ۱۲۰ ر عورت مرد سوار تھے، اور ہم لوگوں کے علاوہ کوئی مسلمان نہیں تھا، جمعہ کے دن ہم لوگوں کے ذہن میں یہ بات آئی کہ اس عظیم دریا میں ہی کشتی پر نماز جمعہ ادا کی جائے، ہم چاہتے تھے کہ اپنے مذہبی فرائض کو انجام دینے کے علاوہ ایک اسلامی جذبہ کا اظہار کریں، کیونکہ کشتی میں ایک عیسائی مبلغ بھی تھا جو اس سفر کے دوران عیسائیت کی تبلیغ کر رہا تھا یہاں تک کہ وہ ہمیں بھی عیسائیت کی تبلیغ کرنا چاہتا تھا۔

کشتی کا ''ناخدا'' ایک انگریز تھا جس نے ہم کو کشتی میں نماز جماعت کی اجازت دیدی، اور کشتی کا تمام اسٹاف افریقی مسلمان تھا، ان کو بھی ہمارے ساتھ نماز جماعت پڑھنے کی اجازت دیدی، اور وہ بھی اس بات سے بہت خوش ہوئے کیونکہ یہ پہلا موقع تھا کہ جب نماز جمعہ کشتی میں ہو رہی تھی!

حقیر (سید قطب) نے نماز جمعہ کی امامت کی، اور قابل توجہ بات یہ ہے کہ بھی غیر مسلم مسافر ہمارے چاروں طرف کھڑے ہوئے اس اسلامی فریضہ کے ادائیگی کو غور سے دیکھ رہے تھے۔

نماز جمعہ تمام ہونے کے بعد بہت سے لوگ ہمارے پاس آئے اور اس کامیابی پر ہمیں مبارک باد پیش کی، جن میں ایک عورت بھی تھی جس کو ہم بعد میں سمجھے کہ وہ عیسائی ہے اور یوگوسلاویہ کی رہنے والی ہے اور ٹیٹو اور کمیونیزم کے جہنم سے بھاگی ہے!!

اس پر ہماری نماز کا بہت زیادہ اثر ہوا یہاں تک کہ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور وہ خود پر قابو نہیں پا رہی تھی۔

وہ سادہ انگریزی میں گفتگو کر رہی تھی اور بہت ہی زیادہ متاثر تھی ایک خاص خضوع وخشوع میں بول رہی تھی، چنانچہ اس نے سوال کیا کہ یہ بتاؤ کہ تمہارا پادری کس زبان میں پڑھ رہا تھا، (وہ سوچ رہی تھی کہ نماز پڑھانے والا پادری کوئی روحانی ہونا چاہئے، جیسا کہ خود عیسائیوں کے یہاں ہوتا ہے، لیکن ہم نے اس کو سمجھایا کہ اس اسلامی عبادت کو کوئی بھی باایمان مسلمان انجام دے سکتا ہے) آخر کار ہم نے اس سے کہا کہ ہم عربی زبان میں نماز پڑھ رہے تھے۔

اس نے کہا: میں اگر چہ ان الفاظ کے معنی کو نہیں سمجھ رہی تھی، لیکن یہ بات واضح ہے کہ ان الفاظ کا ایک عجیب آہنگ اور لہجہ ہے اور سب سے زیادہ قابل توجہ بات مجھے یہ محسوس ہوئی کہ تمہارے امام کے خطبوں کے درمیان کچھ ایسے جملے تھے جو واقعاً دوسروں سے ممتاز تھے، وہ ایک غیر معمولی اور عمیق انداز کے محسوس ہو رہے تھے، جس سے میرا بدن لرز رہا تھا، یقیناً یہ کلمات کوئی دوسرے مطالب تھے، میرا نظریہ یہ ہے کہ جس وقت تمہارا امام ان کلمات کو ادا کرتا تھا تو اس وقت ”روح القدس“ سے مملو ہوتا تھا!!

ہم نے کچھ غور وفکر کیا تو سمجھ گئے کہ یہ جملے وہی قرآنی آیات تھے جو خطبوں کے درمیان پڑھے گئے تھے واقعاً اس موضوع نے ہمیں ہلا کر رکھ دیا اور اس نکتہ کی طرف متوجہ ہوئے کہ قرآن مجید کا مخصوص لہجہ اتنا موٴثر ہے کہ اس نے اس عورت کو بھی متاثر کر دیا جو ایک لفظ بھی نہیں سمجھ سکتی تھی لیکن پھر بھی اس پر بہت زیادہ اثر ہوا۔(۱)(۲)

(۱) تفسیر فی ظلال، جلد۳، صفحہ ۴۲۲

(۲) تفسیر نمونہ، جلد ۱۸، صفحہ ۴۸۹

۴۲۔قرآن کی مثل کیسے نہ لا سکے؟

جیسا کہ ہم سورہ بقرہ میں پڑھتے ہیں: ﴿وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِنْ مِثْلِهِ ...﴾ (۱)

"اگر تمہیں اس کلام کے بارے میں کوئی شک ہے جسے ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے تو اس کے جیسا ایک ہی سورہ لے آؤ"۔

یہاں پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ دشمنان اسلام قرآن کی مثل کیسے نہ لا سکے؟

اگر ہم اسلامی تاریخ پر ایک نظر ڈالیں تو اس سوال کا جواب آسانی سے روشن ہو جاتا ہے، کیونکہ اسلامی ممالک میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں اور آپ کی وفات کے بعد خود مکہ اور مدینہ میں بہت ہی متعصب دشمن، یہود اور نصاریٰ رہتے تھے جو مسلمانوں کو کمزور بنانے کے لئے ہر ممکن کوشش کرتے تھے، ان کے علاوہ خود مسلمانوں کے درمیان بعض "مسلمان نما" افراد موجود تھے جن کو قرآن کریم نے "منافق" کہا ہے، جو غیروں کے لئے "جاسوسی" کا رول ادا کر رہے تھے (جیسے "ابو عامر راہب" اور اس کے منافق ساتھی، جن کا رابطہ روم کے بادشاہ سے تھا اور تاریخ نے اس کو نقل

---

(۱)سورہ بقرہ، آیت ۲۳

کیا ہے یہاں تک کہ انھوں نے مدینہ میں ''مسجد ضرار'' بھی بنائی، اور وہ عجیب و غریب واقعہ پیش آیا جس کا اشارہ سورہ توبہ نے کیا ہے)۔

مسلّم طور پر منافقین کا یہ گروہ اور اسلام کے بعض دوسرے بڑے بڑے دشمن مسلمانوں کے حالات پر نظر رکھے ہوئے تھے اور مسلمانوں کے ہونے والے نقصان پر بہت خوش ہوا کرتے تھے، نیز مسلمانوں کو کمزور کرنے کے لئے اپنی پوری طاقت سے ان واقعات کو نشر کرتے تھے، یا کم از کم ان واقعات کو حفظ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں نے ذرا بھی قرآن سے مقابلہ کرنے کا ارادہ کیا ہے، تاریخ نے ان کا نام نقل کیا ہے، چنانچہ ان میں درج ذیل افراد کا نام لیا جاتا ہے:

''عبداللہ بن مقفع'' کا نام تاریخ نے بیان کیا ہے کہ اس نے ''الدرة الیتیمة'' نامی کتاب اسی وجہ سے لکھی ہے۔

جبکہ مذکورہ کتاب ہمارے یہاں موجود ہے اور کئی مرتبہ چھپ بھی چکی ہے لیکن اس کتاب میں اس طرف ذرا بھی اشارہ نہیں ہے، ہمیں نہیں معلوم کہ کس طرح اس شخص کی طرف یہ نسبت دی گئی ہے؟

احمد بن حسین کوفی ''متنبی'' جو کہ کوفہ کا مشہور شاعر تھا اس کا نام بھی اسی سلسلہ میں بیان کیا ہے کہ اس نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے، جب کہ بہت سے قرائن اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اس کی بلند پروازی، خاندانی پسماندگی اور جاہ و مقام کی آرزو اس میں سبب ہوئی ہے۔

ابو العلاء معری پر بھی اسی چیز کا الزام ہے، اگرچہ اس نے اسلام کے سلسلہ میں بہت سی نازیبا حرکتیں کی ہیں لیکن قرآن سے مقابلہ کرنے کا تصور اس کے ذہن میں نہیں تھا، بلکہ اس نے قرآن کی عظمت کے سلسلہ میں بہت سی باتیں کہی ہیں۔

لیکن ''مسیلمہ کذاب'' اہل یمامہ میں سے ایک ایسا شخص تھا جس نے قرآن کا مقابلہ کرتے

ہوئے اس جیسی آیات بنانے کی ناکام کوشش کی، جس میں تفریحی پہلو زیادہ پایا جاتا ہے، یہاں پر اس کے چند جملے نقل کرنا مناسب ہوگا

۱۔سورہ "الذاریات" کے مقابلہ میں یہ جملے پیش کئے:

"وَالمُبذِراتِ بذراً والحاصداتِ حصداً والذّاریات قمحاً والطاحاتِ طحناً والعاجناتِ عجناً والخابِراتِ خُبزاً والثاردات ثرداً واللاقماتِ لقماً إهالة وسَمناً" (۱)

"یعنی قسم ہے کسانوں کی، قسم ہے بیج ڈالنے والوں کی، قسم ہے گھاس کو گندم سے جدا کرنے والوں کی اور قسم ہے گندم کو گھاس سے جدا کرنے والوں کی، قسم ہے آٹا گوندھنے والیوں کی اور قسم ہے روٹی پکانے والیوں کی اور قسم ہے تر اور نرم لقمہ اٹھانے والوں کی"!!

۲۔یا صفدع بنت صفدع، نقيّ ما تنقين، نصفک فی الماء و نصفک في الطين لا الماء تکدرين و لا الشارب تمنعين" (۲) (۳)

"اے مینڈک بنت مینڈک! جو تو چاہے آواز دے! تیرا آدھا حصہ پانی میں اور آدھا کیچڑ میں ہے، تو نہ پانی کو خراب کرتی ہے اور نہ کسی کو پانی پینے سے روکتی ہے"۔

---

(۱)اعجاز القرآن رافعی.

(۲)قرآن و آخرین پیغمبر

(۳)تفسیر نمونہ جلد۱، صفحہ۱۳۳.

۴۳۔ قرآن کے حروف مقطّعات سے کیا مراد ہے؟

قرآن مجید کے ۲۹ سوروں کے شروع میں حروف مقطعات آئے ہیں، اور جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے کہ یہ الگ الگ حروف ہیں اور ایک دوسرے سے جدا دکھائی دیتے ہیں، جس سے کسی لفظ کا مفہوم نہیں نکلتا۔

قرآن مجید کے حروف مقطعات، ہمیشہ قرآن کے اسرار آمیز الفاظ شمار ہوئے ہیں، اور مفسرین نے اس مسئلہ میں متعدد تفسیریں بیان کی ہیں، آج کل کے دانشوروں کی جدید تحقیقات کے مدنظر ان کے معنی مزید واضح ہوجاتے ہیں۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ کسی بھی تاریخ نے بیان نہیں کیا ہے کہ دور جاہلیت کے عرب یا مشرکین نے قرآن کے بہت سے سوروں میں حروف مقطعات پر کوئی اعتراض کیا ہو، یا ان کا مذاق اڑایا ہو، جو خود اس بات کی بہترین دلیل ہے کہ وہ لوگ حروف مقطعات کے اسرار سے بالکل بے خبر نہیں تھے۔

بہر حال مفسرین کی بیان کردہ چند تفسیریں موجود ہیں، سب سے زیادہ معتبر اور اس سلسلہ میں کی گئی تحقیقات سے ہم آہنگ دکھائی دینے والی تفسیر کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۔ یہ حروف اس بات کی طرف اشارہ ہیں کہ یہ عظیم الشان آسمانی کتاب کہ جس نے تمام

عرب اور عجم کے دانشوروں کو تعجب میں ڈال دیا ہے اور بڑے بڑے سخنور اس کے مقابلہ سے عاجز ہو چکے ہیں، نمونہ کے طور پر یہی حروف مقطعات ہیں جو سب کی نظروں کے سامنے موجود ہیں۔

جبکہ قرآن مجید انھیں الفابیٹ اور معمولی الفاظ سے مرکب ہے، لیکن اس کے الفاظ اتنے مناسب اور اتنے عظیم معنی لئے ہوئے ہے جو انسان کے دل و جان میں اثر کرتے ہیں، روح پر ایک گہرے اثر ڈالتے ہیں، جن کے سامنے فنکار اور عقول تعظیم کرتی ہوئی نظر آتی ہیں، اس کے جملے عظمت کے بلند درجہ پر فائز ہیں اور اپنے اندر معنی کا گویا ایک سمندر سے ہوئے ہیں جس کی کوئی مثل و نظیر نہیں ملتی۔

حروف مقطعات کے سلسلے میں اس بات کی تائید یوں بھی ہوتی ہے کہ قرآن مجید کے جہاں سوروں کے شروع میں حروف مقطعات آئے ہیں ان میں سے ۲۴ مقامات پر قرآن کی عظمت بیان کی گئی ہے، جو اس بات کی بہترین دلیل ہے کہ ان دونوں (عظمت قرآن اور حروف مقطعہ) میں ایک خاص تعلق ہے۔

ہم یہاں پر چند نمونے پیش کرتے ہیں.

۱. ﴿الر ☆ كِتَابٌ أُحْكِمَتْ آيَاتُهُ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَدُنْ حَكِيمٍ خَبِيرٍ﴾(۱)

الر یہ وہ کتاب ہے جس کی آیتیں محکم بنائی گئی ہیں اور ایک صاحب علم و حکمت کی طرف سے تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں"۔

۲. ﴿طس ☆ تِلْكَ آيَاتُ الْقُرْآنِ وَكِتَابٍ مُبِينٍ﴾(۲)

"طس، یہ قرآن اور روشن کتاب کی آیتیں ہیں"۔

۳. ﴿الم ☆ تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْحَكِيمِ﴾(۳)

---

(۱) سورہ ہود، آیت ۱ (۲) سورۂ نمل، آیت ۱ (۳) سورۂ لقمان، آیت ۱،۲

"الم، یہ حکمت سے بھری ہوئی کتاب کی آیتیں ہیں"۔

۳. ﴿المص ☆ کِتَابٌ أُنْزِلَ إِلَيْکَ﴾(۱)

"المص، یہ کتاب آپ کی طرف نازل کی گئی ہے"۔

ان تمام مقامات اور قرآن مجید کے دوسرے سوروں کے شروع میں حروف مقطعہ ذکر ہونے کے بعد قرآن اور اس کی عظمت کی گفتگو ہوئی ہے۔(۲)

۲. ممکن ہے قرآن کریم میں حروف مقطعات بیان کرنے کا دوسرا مقصد یہ ہو کہ سننے والے متوجہ ہو جائیں اور مکمل خاموشی کے ساتھ سنیں، کیونکہ گفتگو کے شروع میں اس طرح کے جملے عربوں کے درمیان عجیب وغریب تھے، جس سے ان کی توجہ مزید مبذول ہو جاتی تھی، اور مکمل حور سے سنتے تھے، اور یہ بھی اتفاق ہے کہ جن سوروں کے شروع میں حروف مقطعات آئے ہیں وہ سب مکی سورے ہیں، اور ہم جانتے ہیں کہ وہاں پر مسلمان اقلیت میں تھے، دو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمن تھے، آپ کی باتوں کو سننے کے لئے بھی تیار نہیں تھے، کبھی کبھی اتنا شور وغل کیا کرتے تھے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز تک سنائی نہیں دیتی تھی، جیسا کہ قرآن مجید کی بعض آیات (جیسے سورہ فصلت، آیت نمبر ۲۶) اسی چیز کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

۳۔ اہل بیت علیہم السلام کی بیان شدہ بعض روایات میں پڑھتے ہیں کہ یہ حروف مقطعات، اسماء خدا کی طرف اشارہ ہیں جیسے سورہ اعراف میں "المص"، "انا اللہ المقتدر الصادق" (میں صاحب قدرت و سچا خدا ہوں) اس لحاظ سے چاروں حرف خداوند عالم کے ناموں کی طرف اشارہ ہیں۔

---

(۱) سورۂ اعراف، آیت ۱و۲

(۲) تفسیر نمونہ، جلد اول، صفحہ ۶۱

مختصر شکل [یا کوڈ ورڈ] کو تفصیلی الفاظ کی جگہ قرار دینا قدیم زمانہ سے رائج ہے، اگر چہ دور حاضر میں یہ سلسلہ بہت زیادہ رائج ہے، اور بہت ہی بڑی بڑی عبارتوں یا اداروں اور انجمنوں کے نام کا ایک کلمہ میں خلاصہ ہو جاتا ہے۔

ہم اس نکتہ کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں کہ "حروف مقطعات" کے سلسلہ میں یہ مختلف معنی آپس میں کسی طرح کا کوئی ٹکراؤ نہیں رکھتے، اور ممکن ہے کہ یہ تمام تفسیریں قرآن کے مختلف معنی کی طرف اشارہ ہوں۔(۱)

۲۔ ممکن ہے کہ یہ تمام حروف یا کم از کم ان میں ایک خاص معنی اور مفہوم کا حامل ہو، بالکل اسی طرح جیسے دوسرے الفاظ معنی و مفہوم رکھتے ہیں۔

اتفاق کی بات یہ ہے کہ سورہ طٰہٰ اور سورہ یٰس کی تفسیر میں بہت سی روایات اور مفسرین کی گفتگو میں ملتا ہے کہ "طٰہٰ" کے معنی یا رجل (یعنی اے مرد) کے ہیں، جیسا کہ بعض عرب شعرا کے شعر میں لفظ طٰہٰ آیا ہے اور اے مرد کے مشابہ یا اس کے نزدیک معنی میں استعمال ہوا ہے، جن میں سے بعض اشعار یا تو اسلام سے پہلے کے ہیں یا آغاز اسلام کے۔(۲)

یہاں تک کہ ایک صاحب نے ہم سے نقل کیا کہ مغربی ممالک میں اسلامی مسائل پر تحقیق کرنے والے دانشوروں نے اس مطلب کو تمام حروف مقطعات کے بارے میں قبول کیا ہے اور اس بات کا اقرار کیا ہے کہ قرآن مجید کے سوروں کی ابتداء میں جو حروف مقطعات بیان ہوئے ہیں وہ اپنے اندر خاص معنی لئے ہوئے ہیں جو گزشتہ زمانہ میں متروک رہے ہیں، اور صرف بعض ہم تک پہنچے ہیں، ورنہ تو یہ بات بعید ہے کہ عرب کے مشرکین حروف مقطعات کو سنیں اور ان کے معنی کو نہ سمجھیں اور

---

(۱) تفسیر نمونہ، جلد ۱، صفحہ ۷۸

(۲) تفسیر مجمع البیان سورہ طٰہٰ کی پہلی آیت کے ذیل میں۔

مقابلہ کے لئے نہ کھڑے ہوں، جبکہ کوئی بھی تاریخ یہ بیان نہیں کرتی کہ ان کم دماغ والے اور بہانہ باز لوگوں نے حروف مقطعات کے سلسلہ میں کسی ردّ عمل کا اظہار کیا ہو۔

البتہ یہ نظریہ عام طور پر قرآن مجید کے تمام حروف مقطعات کے سلسلے میں قبول کیا جانا مشکل ہے، لیکن بعض حروف مقطعات کے بارے میں قبول کیا جاسکتا ہے، کیونکہ اسلامی منابع ومصادر میں اس موضوع پر بحث کی گئی ہے۔

یہ مطلب بھی قابل توجہ ہے کہ حضرت امام صادق علیہ السلام سے منقول ایک حدیث میں بیان ہوا ہے کہ "طہ" پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک نام ہے، جس کے معنی "یا طالب الحق، الهادی الیہ" (اے حق کے طلب اور حق کی طرف ہدایت کرنے والے)

اس حدیث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ لفظ "طه" دو اختصاری حرف سے مرکب ہے ایک "طا" جو "طلب الحق" کی طرف اشارہ ہے اور دوسرے "ھا" جو "ہادی الیہ" کی طرف اشارہ ہے۔

اس سلسلہ میں آخری بات یہ ہے کہ ایک مدت گزرنے کے بعد لفظ "طہ"، لفظ "یٰس" کی طرح آہستہ آہستہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے "اسم خاص" کی شکل اختیار کر گیا ہے، جیسا کہ آل پیامبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو "آل طہ" بھی کہا گیا، جیسا کہ دعائے ندبہ میں حضرت امام زمانہ عجل اللہ تعالی فرجہ کو "یابن طٰہ" کہا گیا ہے۔(۱)

۵۔ علامہ طباطبائی (علیہ الرحمہ) نے ایک دوسرا احتمال دیا ہے جس کو حروف مقطعات کی ایک دوسری تفسیر شمار کیا جاسکتا ہے، اگرچہ موصوف نے اس کو ایک احتمال اور گمان کے عنوان سے بیان کیا ہے۔

ہم آپ کے سامنے موصوف کے احتمال کا خلاصہ پیش کررہے ہیں:

---

(۱)تفسیر نمونہ، جلد ۱۳، صفحہ ۱۵۷

جس وقت ہم حروف مقطعات سے شروع ہونے والے سوروں پر غور وفکر کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ مختلف سوروں میں بیان ہوئے حروف مقطعات سورہ میں بیان شدہ مطالب میں مشترک ہیں مثال کے طور پر جو سورے "حم" سے شروع ہوتے ہیں اس کے فوراً بعد جملہ ﴿تَنْزِيْلُ الْكِتَابِ مِنَ اللّٰهِ﴾ (سورہ زمر آیت ۱) یا اسی مفہوم کا جملہ بیان ہوتا ہے اور جو سورے "الر" سے شروع ہوتے ہیں ان کے بعد ﴿تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ﴾ یا اس کے مانند جملے بیان ہوئے ہیں۔

اور جو سورے "الم" سے شروع ہوتے ہیں اس کے بعد ﴿ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾ یا اس سے ملتے جلتے کلمات بیان ہوئے ہیں۔

اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حروف مقطعات اور ان سوروں میں بیان ہوئے مطالب میں ایک خاص رابطہ ہے مثال کے طور پر سورہ اعراف جو "المص" سے شروع ہوتا ہے اس کا مضمون اور سورہ "الم" اور سورہ "ص" کا مضمون تقریباً ایک ہی ہے۔

البتہ ممکن ہے کہ یہ رابطہ بہت عمیق اور دقیق ہو، جس کو ایک عام انسان سمجھنے سے قاصر ہو۔

اور اگر ان سوروں کی آیات کو یک جگہ رکھ کر آپس میں موازنہ کریں تو شاید ہمارے لئے ایک نیا مطلب کشف ہو جائے۔(۱)(۲)

---

(۱) تفسیر المیزان، جلد ۱۸، صفحہ ۵، ۶

(۲) تفسیر نمونہ، جلد ۲۰، صفحہ ۳۳۶.

۲۴۔ قرآن مجید پیغمبر اکرمؐ کے زمانہ میں مرتب ہو چکا تھا یا بعد میں ترتیب دیا گیا؟

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ قرآن مجید کے پہلے سورے کا نام ''فاتحۃ الکتاب'' ہے، ''فاتحہ الکتاب'' یعنی کتاب (قرآن) کی ابتدا اور پیغمبر اکرم ﷺ سے منقول بہت سی روایات کے پیش نظر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خود آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں اس سورہ کو اسی نام سے پکارا جاتا تھا۔

یہیں سے ایک دریچہ اسلام کے مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ کی طرف وا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ایک گروہ کے درمیان یہ مشہور ہے کہ (پیغمبر اکرم ﷺ کے زمانہ میں قرآن پراکندہ تھا بعد میں حضرت ابوبکر یا عمر یا عثمان کے زمانہ میں مرتب ہوا ہے)، قرآن مجید خود پیغمبر اکرم ﷺ کے زمانہ میں، ہی ترتیب سے موجود تھا جو آج ہمارے یہاں موجود ہے، اور جس کا سرآغاز یہی سورہ حمد تھا، ورنہ تو یہ پیغمبر اکرم ﷺ پر نازل ہونے والا سب سے پہلا سورہ نہیں تھا اور نہ ہی کوئی دوسری دلیل تھی جس کی بنا پر اسے ''فاتحۃ الکتاب'' کے نام سے یاد کیا جاتا۔

اس کے علاوہ اور بہت سے شواہد اس حقیقت کی تائید کرتے ہیں کہ قرآن کریم اسی موجودہ صورت میں پیغمبر اکرم ﷺ کے زمانہ میں جمع ہو چکا تھا۔

''علی بن ابراہیم'' حضرت امام صادق علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت رسول خداؐ

نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا: "قرآن کریم حریر کے کپڑوں، کاغذ اور ان جیسی دوسری چیزوں پر متفرق ہے لہٰذا اس کو ایک جگہ جمع کرلو" اس کے بعد مزید فرماتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام اس نشست سے اٹھے اور قرآن کو ایک زرد رنگ کے کپڑے پر جمع کیا اور اس پر مہر لگائی:

"وَانطَلَقَ عَلِیٌّ (ع) فَجمعهٗ فِی ثوبٍ اَصفرٍ ثُمَّ خَتَمَ عَلَیهِ"(۱)

ایک دوسرا گواہ: "خوارزمی" اہل سنت کے مشہور و معروف مؤلف اپنی کتاب "مناقب" میں "علی بن ریاح" سے نقل کرتے ہیں کہ قرآن مجید کو حضرت علی بن ابی طالب اور ابیّ بن کعب نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ ہی میں جمع کردیا تھا۔

تیسرا گواہ: اہل سنت کے مشہور و معروف مؤلف حاکم نیشاپوری اپنی کتاب "مستدرک" میں زید بن ثابت سے نقل کرتے ہیں:

زید کہتے ہیں: "ہم لوگ قرآن کے مختلف حصوں کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں جمع کرتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کے مطابق اس کی مناسب جگہ قرار دیتے تھے، لیکن پھر بھی یہ لکھا ہوا قرآن متفرق تھا، حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا کہ اس کو ایک جگہ جمع کردیں، وہ ہمیں اس کی حفاظت کے لئے تاکید کیا کرتے تھے"۔

عظیم الشان شیعہ عالم دین سید مرتضیٰ کہتے ہیں قرآن مجید پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں اسی موجودہ صورت میں مرتب ہو چکا تھا"(۲)

طبرانی اور ابن عساکر دونوں "شعبی" سے نقل کرتے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں انصار کے چھ افراد نے قرآن کو جمع کیا۔(۳) اور قتادہ نقل کرتے ہیں کہ میں نے انس سے سوال کیا

---

(۱) تاریخ القرآن، ابو عبد اللہ زنجانی صفحہ ۲۴۔ (۲) مجمع البیان، جلد اول، صفحہ ۱۵۔

(۳) منتخب کنز العمال، جلد ۲، صفحہ ۵۲

کہ پیغمبر اکرم صلى الله عليه وآله وسلم کے زمانہ میں کن لوگوں نے قرآن جمع کیا تھا؟ تو انھوں نے ․ ابی بن کعب، معاذ، زید بن ثابت اور ابوزید کا نام لیا جو سبھی انصار میں سے تھے(۱) اس کے علاوہ بھی بہت سی روایات ہیں جو اسی مطلب کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ اگر ہم ان سب کو بیان کریں تو ایک طولانی بحث ہوجائے گی۔

بہر حال شیعہ وسنی کتب میں نقل ہونے والی روایات جن میں سورہ حمد کو "فاتحۃ الکتاب" کا نام دیا جانا، اس موضوع کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔

سوال:

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کس طرح اس بات پر یقین کیا جاسکتا ہے جبکہ بہت سے علما کے نزدیک یہ بات مشہور ہے کہ قرآن کریم کو پیغمبر اکرم صلى الله عليه وآله وسلم کی وفات کے بعد ترتیب دیا گیا ہے (حضرت علیؑ کے ذریعہ یا دوسرے لوگوں کے ذریعہ)

اس سوال کے جواب میں ہم یہ کہتے ہیں․ حضرت علی علیہ السلام کا جمع کیا ہوا قرآن خالی قرآن نہیں تھا بلکہ قرآن مجید کے ساتھ ساتھ اس کی تفسیر اور شان نزول بھی تھی۔

البتہ کچھ ایسے قرائن وشواہد بھی پائے جاتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عثمان نے قرائت کے اختلاف کو دور کرنے کے لئے ایک قرآن لکھا جس میں قرائت اور نقطوں کا اضافہ کیا (چونکہ اس وقت تک نقطوں کا رواج نہیں تھا) بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ پیغمبر اکرم صلى الله عليه وآله وسلم کے زمانہ میں کسی بھی صورت میں قرآن جمع نہیں کیا گیا تھا بلکہ یہ افتخار خلیفہ دوم یا حضرت عثمان کو نصیب ہوا، تو یہ بات فضیلت سازی کا زیادہ پہلو رکھتی ہے لہٰذا اصحاب کی فضیلت بڑھانے کے لئے نسبت دیتے ہیں اور روایت نقل کرتے ہیں۔

---

(۱) صحیح بخاری، جلد ۶، صفحہ ۱۰۲۔

بہرحال اس بات پر کس طرح یقین کیا جا سکتا ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ اتنے اہم کام پر کوئی توجہ نہ کریں جبکہ آنحضرت ﷺ چھوٹے چھوٹے کاموں کو بہت اہمیت دیتے تھے، کیا قرآن کریم سلام کے بنیادی قوانین کی کتاب نہیں ہے؟! کیا قرآن کریم تعلیم وتربیت کی عظیم کتاب نہیں ہے؟! کیا قرآن کریم اعتقادات نیز سلامی منصوبوں کی بنیادی کتاب نہیں ہے؟! کیا پیغمبر اکرم ﷺ کے زمانہ میں قرآن کریم کے جمع نہ کرنے سے یہ خطرہ درپیش نہ تھا کہ اس کا کچھ حصہ نابود ہو جائے گا یا مسلمانوں کے درمیان اختلاف ہو جائے گا؟!

اس کے علاوہ مشہور ومعروف حدیث ''ثقلین'' جس کو شیعہ اور سنی دونوں فریقوں نے نقل کیا ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا ''میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جارہا ہوں: یک کتاب خدا [قرآن] اور دوسرے میری عترت [اہل بیتؑ] '' اس حدیث سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن کریم ایک کتاب کی شکل میں موجود تھا۔

اور اگر ہم دیکھتے ہیں کہ بعض روایت میں بیان ہوا ہے کہ خود آنحضرت ﷺ کی زیر نگرانی بعض اصحاب نے قرآن جمع کیا، اور وہ تعداد کے لحاظ سے مختلف ہیں تو اس سے کوئی مشکل پیدا نہیں ہوتی، کیونکہ ممکن ہے کہ ہر روایت ان میں سے کسی ایک کی نشاندہی کرتی ہو۔ (۱)

(۱) تفسیر نمونہ، جلد دوم، صفحہ ۸

۴۵۔ قرآن مجید کی آیات میں محکم اور متشابہ سے کیا مراد ہے؟

جیسا کہ ہم سورہ آل عمران میں پڑھتے ہیں: ﴿هُوَ الَّذِي أَنزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ﴾ (۱)

"اس نے آپ پر وہ کتاب نازل کی ہے جس میں سے کچھ آیتیں محکم ہیں جو اصل کتاب ہیں اور کچھ متشابہ ہیں"۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "محکم" اور "متشابہ" سے کیا مراد ہے؟

لفظ "محکم" کی اصل "احکام" ہے اسی وجہ سے مستحکم اور پائیدار موضوعات کو "محکم" کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ خود سے نابودی کے اسباب کو دور کرتے ہیں، اور اسی طرح واضح و روشن گفتگو جس میں احتمال خلاف نہ پایا جاتا ہو اس کو "محکم" کہا جاتا ہے، اس بنا پر "محکمات" سے وہ آیتیں مراد ہیں جن کا مفہوم اور معنی اس قدر واضح اور روشن ہو کہ جس کے معنی میں بحث و گفتگو کی کوئی گنجائش نہ ہو، مثال کے طور پر درج ذیل آیات:

﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ﴾ ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ ﴿اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ﴾ ﴿لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ﴾

اور اسی کی طرح دوسری ہزاروں آیات جو عقائد، احکام، وعظ و نصیحت اور تاریخ کے بارے

---

(۱) سورہ آل عمران، آیت ۷

میں موجود ہیں یہ سب آیت "محکمات" ہیں، ان محکم آیات کو قرآن کریم میں "ام الکتاب" کا نام دیا گیا ہے، یعنی یہی آیات اصل، اور مرجع و مفسر ہیں اور یہی آیات دیگر آیات کی وضاحت کرتی ہیں۔

لفظ "متشابہ" کے لغوی معنی یہ ہیں کہ اس کے مختلف حصے ایک دوسرے کے شبیہ اور مانند ہوں، اسی وجہ سے ایسے جملے جن کے معنی پیچیدہ ہوں اور جن کے بارے میں مختلف احتمالات دیئے جاسکتے ہوں ان کو "متشابہ" کہا جاتا ہے، اور قرآن کریم میں بھی یہی معنی مراد ہیں، یعنی ایسی آیات جن کے معنی ابتدائی نظر میں پیچیدہ ہیں شروع میں کئی احتمالات دئے جاتے ہیں اگر چہ آیات "محکمات" پر توجہ کرنے سے اس کے معنی واضح اور روشن ہو جاتے ہیں۔

اگر چہ "محکم" اور "متشابہ" کے سلسلہ میں مفسرین نے بہت سے احتمالات دئے ہیں لیکن ہمارا پیش کردہ مذکورہ نظریہ ان الفاظ کے اصلی معنی کے لحاظ سے بھی مکمل طور پر ہم آہنگ ہے اور شان نزول سے بھی، آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں بیان ہونے والی روایت سے بھی، اور محل بحث آیت سے بھی، کیونکہ مذکورہ آیت کے ذیل میں ہم پڑھتے ہیں کہ بعض خودغرض لوگ "متشابہ" آیات کو اپنی دلیل قرار دیتے تھے، یہ بات واضح ہے کہ وہ لوگ آیت سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتے تھے کہ متشابہ آیات سرسری نظر میں متعدد معنی کئے جانے کی صلاحیت رکھتی ہیں جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ "متشابہ" سے وہی معنی مراد ہیں جو ہم نے اوپر بیان کئے ہیں۔

"متشابہ" وہ آیات ہیں جو خداوند عالم کے صفات اور معاد کی کیفیت کے بارے میں ہیں ہم یہاں پر چند آیت کو نمونہ کے طور پر بیان کرتے ہیں ﴿یَدُ اللّٰہِ فَوقَ اَیدِیھِم﴾ (خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے) جو خداوند عالم کی قدرت کے بارے میں ہے، اسی طرح ﴿وَاللّٰہُ سَمِیعٌ عَلِیمٌ﴾ (خدا سننے والا اور عالم ہے) یہ آیت خداوند عالم کے علم کے بارے میں دلیل ہے، اسی طرح ﴿وَنَضَعُ المَوَازِینَ القِسطَ لِیَومِ القِیَامَۃِ﴾ (ہم روز قیامت عدالت کی ترازو قائم کریں گے) یہ آیت اعمال کے حساب کے بارے میں ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ نہ خداوند عالم کے ہاتھ ہیں اور نہ

ہی وہ آنکھ اور کان رکھتا ہے، اور نہ ہی اعمال کے حساب وکتاب کے لئے ہمارے جیسی ترازو رکھتا ہے بلکہ یہ سب خداوندعالم کی قدرت اوراس کے علم کی طرف اشارہ ہیں۔

یہاں اس نکتہ کی یاددہانی کرانا ضروری ہے کہ قرآن مجید میں محکم اور متشابہ دوسرے معنی میں بھی آئے ہیں جیسا کہ سورہ ہود کے شروع میں ارشاد ہوتا ہے۔ ﴿کتاب احکمت آیاتہ﴾ اس آیت میں تمام قرآنی آیات کو"محکم" قرار دیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کی آیت آپس میں ایک دوسرے سے تعلق رکھتی ہیں، اور سورہ زمر میں آیت نمبر۲۳ میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿کتاباً متشابھاً...﴾ اس آیت میں قرآن کی تمام آیت کو متشابہ قرار دیا گیا ہے کیونکہ یہاں متشابہ کے معنی حقیقت، صحیح اور درست ہونے کے لحاظ سے تمام آیت ایک دوسرے جیسی ہیں۔

لہٰذا محکم اور متشابہ کے حوالہ سے ہمارے بیان کئے ہوئے مطالب کے پیش نظر معلوم ہوجاتا ہے ایک حقیقت پسند اور حق تلاش کرنے والے انسان کے لئے خداوندعالم کے کلام کو سمجھنے کا یہی ایک راستہ ہے کہ تمام آیت کو پیش نظر رکھے اوران سے حقیقت تک پہنچ جائے، چنانچہ اگر بعض آیات میں ابتدائی حد سے کوئی ابہام اور پیچیدگی دیکھے تو دوسری آیت کے ذریعہ اس ابہام اور پیچیدگی کو دور کرکے اصل تک پہنچ جائے، درحقیقت "آیت محکمات" ایک شاہراہ کی طرح ہیں اور "آیات متشابہات" فرعی راستوں کی طرح ہیں، کیونکہ یہ بات واضح ہے کہ اگر انسان فرعی راستوں میں بھٹک جائے تو کوشش کرتا ہے کہ اصلی راستہ پر پہنچ جائے، اور وہاں پہنچ کر صحیح راستہ کو معین کرلے۔

چنانچہ آیات محکمات کو"ام الکتاب" کہا جانا بھی اس حقیقت کی تاکید کرتا ہے، کیونکہ عربی میں لفظ"امّ" کے معنی "اصل اور بنیاد" کے ہیں، اور اگر ماں کو"امّ" کہا جاتا ہے تو اسی وجہ سے کہ بچوں کی اصل اور اپنی اولاد کی مختلف مشکلات اور حوادث میں پناہ گاہ ہوتی ہے، اسی طرح آیات محکمات دوسری آیات کی اصل اور ماں شمار ہوتی ہیں۔(۱)

(۱)تفسیر نمونہ، جلد۲، صفحہ۳۲۰

۴۶۔ کیوں بعض قرآنی آیات متشابہ ہیں؟

لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں متشابہ آیات کی وجہ کیا ہے؟ جبکہ قرآن مجید نور، روشنی، کلام حق اور واضح ہے نیز لوگوں کی ہدایت کے لئے نازل ہوا ہے تو پھر قرآن مجید میں اس طرح کی متشابہ آیات کیوں ہیں اور قرآن مجید کی بعض آیات کا مفہوم پیچیدہ کیوں ہے کہ بعض اوقات شرپسندوں کو ناجائز فائدہ اٹھانے کا موقع مل جاتا ہے؟

یہ موضوع درحقیقت بہت اہم ہے جس پر بھرپور توجہ کرنے کی ضرورت ہے، کلی طور پر درج ذیل چیزیں قرآن میں متشابہ آیات کا راز اور وجہ ہو سکتی ہیں:

ا۔ انسان جو الفاظ اور جملے استعمال کرتا ہے وہ صرف روزمرہ کی ضرورت کے تحت ہوتے ہیں، اسی وجہ سے جب ہم انسان کی مادی حدود سے باہر نکلتے ہیں مثلاً خداوند عالم جو ہر لحاظ سے نامحدود ہے، اگر اس کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو ہم واضح طور پر دیکھتے ہیں کہ ہمارے الفاظ ان معانی کے لئے کما حقہ پورے نہیں اترتے، لیکن مجبوراً ان کو استعمال کرتے ہیں، کہ الفاظ کی یہی نارسائی قرآن مجید کی بہت سی متشابہ آیات کا سرچشمہ ہیں، ﴿یَدُ اللہِ فَوقَ اَیدِیھِم﴾ (سورہ فتح/۱۰) یا ﴿الرَّحمٰنُ عَلَی العَرشِ استَوٰی﴾ (سورہ طہ/۵) یا ﴿اِلٰی رَبِّھَا نَاظِرَۃ﴾ (سورہ قیامت/۲۳) یہ آیات اس چیز کا نمونہ ہیں نیز "سمیع" اور "بصیر" جیسے الفاظ بھی اسی طرح ہیں کہ آیات محکمات پر رجوع کرنے سے ان الفاظ اور آیات متشابہات کے معنی بخوبی واضح اور روشن ہو جاتے ہیں۔

۲۔ بہت سے حقائق دوسرے عالم یا ماورائے طبیعت سے متعلق ہوتے ہیں جن کو ہم سمجھنے سے قاصر ہیں، چونکہ ہم زمان ومکان میں مقید ہیں لہٰذا ان کی گہرائی کو سمجھنے سے قاصر ہیں، اور ہمارے افکار کی نارسائی اور ان معانی کا بلند وبالا ہونا ان آیات کے تشابہ کا باعث ہے جیسا کہ قیامت وغیرہ سے متعلق بعض آیات موجود ہیں۔

یہ بالکل اسی طرح ہے کہ اگر کوئی شخص شکم مادر میں موجود بچہ کو اس دنیا کے مسائل کی تفصیل بتانا چاہے، تو بہت ہی اختصار اور مجمل طریقہ سے بیان کرتے ہوں گے کیونکہ اس میں صلاحیت اور استعداد نہیں ہے۔

۳۔ قرآن مجید میں متشابہ آیات کا ایک راز یہ ہوسکتا ہے کہ اس طرح کا کلام اس لئے پیش کیا گیا تاکہ لوگوں کی فکر ونظر میں اضافہ ہو، اور یہ دقیق علمی اور پیچیدہ مسائل کی طرح ہیں تاکہ دانشوروں کے سامنے بیان کئے جائیں اور ان کے افکار پختہ ہوں اور مسائل کی مزید تحقیق کریں۔

۴۔ قرآن کریم میں متشابہ آیت کے سلسلہ میں ایک دوسرا نکتہ یہ ہے کہ جس کی تائید اہل بیت علیہم السلام کی احادیث سے بھی ہوتی ہے قرآن مجید میں اس طرح کی آیات کا موجود ہونا انبیاء اور ائمہ علیہم السلام کی ضرورت کو واضح کرتا ہے تاکہ عوام الناس مشکل مسائل سمجھنے کے لئے ان حضرات کے پاس آئیں، اور ان کی رہبری وقیادت کو رسمی طور پر پہچانیں، اور ان کے تعلیم دئے ہوئے دوسرے احکام اور ان کی رہنمائی پر بھی عمل کریں، اور یہ بالکل اس طرح ہے کہ تعلیمی کتابوں میں بعض مسائل کی وضاحت استاد کے اوپر چھوڑ دی جاتی ہے تاکہ شاگرد استاد سے تعلق ختم نہ کرے اور اس ضرورت کے تحت دوسری چیزوں میں استاد کے افکار سے الہام حاصل کرے، خلاصہ یہ کہ قرآن کے سلسلہ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مشہور وصیت کے مصداق پر عمل کریں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"إنّي تاركٌ فيكُمُ الثّقلين كتابَ اللّهِ وَ أهلَ بَيتي وَ إنّهما لن يفترقا حتّى

یَرِدَا عَلَیَّ الْحوضَ“

” یقیناً میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں: ایک کتاب خدا اور دوسرے میرے اہل بیت، اور [دیکھو!] یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر میرے پاس پہنچ جائیں“(۱)(۲)

(۱)مستدرک حاکم، جلد۳، صفحہ ۱۴۸

۲)تفسیر نمونہ، جلد۲، صفحہ ۲۳۴.

۴۷۔ کیا بسم اللہ تمام سوروں کا جز ہے؟

اس مسئلہ میں شیعہ علما ور دانشوروں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ''بسم اللہ'' سورہ حمد اور بقیہ دوسرے سوروں کا جز ہے، اور قرآن مجید کے تمام سوروں کے شروع میں ''بسم اللہ'' کا ذکر ہونا خود اس بات پر محکم دلیل ہے، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ قرآن مجید میں کوئی چیز اضافہ نہیں ہوئی ہے، اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ سے آج تک ہر سورہ کے شروع میں بسم اللہ کا ذکر ہوتا رہا ہے۔

لیکن اہل سنت علما میں سے مشہور و معروف مؤلف صاحب تفسیر المنار نے اس سلسلہ میں مختلف علما کے اقوال نقل کئے ہیں:

علما کے درمیان یہ بحث ہے کہ کیا ہر سورے کے شروع میں بسم اللہ سورہ کا جز ہے یا نہیں؟ مکہ کے قدیم علما (فقہا اور قاریان قرآن) منجملہ ابن کثیر اور اہل کوفہ سے عاصم اور کسائی قاریوں قرآن، اور اہل مدینہ میں بعض صحابہ اور تابعین اور اسی طرح امام شافعی اپنی کتاب جدید میں اور ان کے پیروکار، نیز ثوری اور احمد [بن حنبل] اپنے دو قول میں سے ایک قول میں: اسی نظریہ کے قائل ہیں کہ بسم اللہ تمام سوروں کا جز ہے، اسی طرح شیعہ علما اور (ان کے قول کے مطابق) اصحاب میں [حضرت] علی، ابن عباس، عبد اللہ بن عمر اور ابو ہریرہ، اور تابعین میں سے سعید بن جبیر، عطاء، زہری اور ابن المبارک نے بھی اسی عقیدہ کو قبول کیا ہے۔

اس کے بعد مزید بیان کرتے ہیں کہ ان کی سب سے اہم دلیل صحابہ اور ان کے بعد آنے والے حکمران کا اتفاق اور اجماع ہے کہ ان سب لوگوں نے سورہ توبہ کے علاوہ تمام سوروں کے شروع میں ''بسم اللہ'' کو ذکر کیا ہے، جبکہ یہ بھی حضرات اس بات پر تاکید کرتے تھے کہ جو چیز قرآن مجید کا جز نہیں ہے اس سے قرآن کو محفوظ رکھو، اور اسی وجہ سے ''آمین'' کو سورہ حمد کے آخر میں ذکر نہیں کیا ہے۔

اس کے بعد [امام] مالک اور ابو حنیفہ کے پیرو نیز دوسرے لوگوں سے نقل کیا ہے کہ وہ لوگ ''بسم اللہ'' کو ایک مستقل آیت مانتے تھے جو ہر سورے کے شروع میں سوروں کے درمیان فاصلہ کرنے کے لئے نازل ہوئی ہے۔

اور احمد [بن حنبل] (اہل سنت کے مشہور ومعروف فقیہ) اور بعض کوفی قاریوں سے نقل کرتے ہیں کہ وہ لوگ ''بسم اللہ'' کو صرف سورہ حمد کا جز مانتے تھے نہ کہ دوسرے سوروں کا۔(۱)

[قارئین کرام!] مذکورہ اقوال سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اہل سنت کے علماکی اکثریت بھی اسی نظریہ کی قائل ہے کہ بسم اللہ سورہ کا جز ہے، ہم یہاں شیعہ اور سنی دونوں فریقوں کی کتابوں میں منقول روایات کو بیان کرتے ہیں (اور اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ان تمام کا یہاں ذکر کرنا ہماری بحث سے خارج ہے، اور مکمل طور پر ایک فقہی بحث ہے)

ا۔ ''معاویہ بن عمار'' جو امام صادق علیہ السلام کے چاہنے والوں میں سے ہیں، کہتے ہیں کہ میں نے امام علیہ السلام سے سوال کیا کہ جب میں نماز پڑھنے کے لئے تیار ہوجاؤں تو کیا سورہ حمد کے شروع میں بسم اللہ پڑھوں؟ تو امام علیہ السلام نے فرمایا: ہاں، میں نے پھر سوال کیا کہ جس وقت سورہ حمد تمام ہوجائے اور اس کے بعد دوسرا سورہ پڑھنا چاہوں تو کیا بسم اللہ کا پڑھنا ضروری ہے؟ تو آپ نے فرمایا: ہاں۔(۲)

(۱) تفسیر المنار، جلد ا صفحہ ۳۹۔۴۰۔ (۲) اصول کافی، جلد ۳، صفحہ ۳۱۲۔

۲۔سنی عالم دین دار قطنی صحیح سند کے ساتھ حضرت علی علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ ایک شخص نے آپ سے سوال کیا کہ "السبع المثانی" سے مراد کیا ہے؟ تو امام علیہ السلام نے فرمایا: اس سے مراد سورہ حمد ہے، تو اس نے سوال کیا کہ سورہ حمد میں تو چھ آیتیں ہیں؟ تو امام علیہ السلام نے فرمایا: بسم اللہ الرحمن الرحیم بھی اس کی ایک آیت ہے۔(۱)

۳۔اہل سنت کے مشہور و معروف عالم بیہقی، صحیح سند کے ساتھ ابن جبیر اور ابن عباس سے اس طرح نقل کرتے ہیں: "اسْتَرَقَ الشَّيْطَانُ مِنَ النَّاسِ، أعظم آية من القرآن بسم الله الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ "(۲) شیطان صفت لوگوں نے قرآن کریم کی سب سے بڑی آیت یعنی "بسم الله الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" کو چوری کرلیا ہے" (اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ سوروں کے شروع میں بسم اللہ نہیں پڑھتے)

اس کے علاوہ ہمیشہ مسلمانوں کی یہ سیرت رہی ہے کہ ہر سورے کو شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ پڑھتے ہیں اور تواتر کے ساتھ یہ بات ثابت ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ہر سورے کے شروع میں بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھا کرتے تھے، اس صورت میں کیسے ممکن ہے کہ جو چیز قرآن کا حصہ نہ ہو خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کی امت اسے قرآن کے ساتھ ہمیشہ پڑھا کریں؟!۔

لیکن جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بسم اللہ ایک مستقل آیت ہے اور قرآن کا جز ہے مگر سوروں کا جز نہیں ہے، یہ نظریہ بھی بہت ضعیف ہے، کیونکہ بسم اللہ کے معنی کچھ اس طرح کے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کام کی ابتدا اور آغاز کے لئے ہے، نہ یہ کہ ایک مستقل اور الگ معنی، در حقیقت اس طرح کا شدید تعصب کہ اپنی بات پر اڑے رہیں اور کہیں کہ بسم اللہ ایک مستقل آیت

---

(۱)الاتقان، جلد اول، صفحہ ۳۶

(۲)بیہقی، جلد ۲، صفحہ ۵۰

ہے، جس کا ماقبل و ما بعد سے کوئی ربط نہیں ہے، لیکن بسم اللہ کے متعلق بلند آواز میں یہ اعلان کرتے ہیں کہ بعد میں شروع ہونے والی بحث کا سر آغاز ہے۔

صرف مخالفین کا ایک اعتراض قابل توجہ ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآن مجید کے سوروں میں (سورہ حمد کے علاوہ) بسم اللہ کو ایک آیت شمار نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے بعد والی آیت کو پہلی آیت شمار کیا جاتا ہے۔

اس اعتراض کا جواب "فخر الدین رازی" نے اپنی تفسیر کبیر میں واضح کردیا کہ کوئی ممانعت نہیں ہے کہ بسم اللہ صرف سورہ حمد میں ایک آیت شمار کی جائے اور قرآن کے دوسرے سوروں میں پہلی آیت کا ایک حصہ شمار کیا جائے، (اس لحاظ سے مثلاً سورہ کوثر میں ﴿بسم الله الرَّحمٰنِ الرَّحِيمِ إِنَّا أعطينكَ الكَوْثَرَ﴾ ایک آیت شمار ہو۔

بہر حال یہ مسئلہ اتنا واضح اور روشن ہے کہ تاریخ نے لکھا ہے کہ معاویہ نے اپنی حکومت کے زمانہ میں ایک روز نماز جماعت میں بسم اللہ نہیں پڑھی، تو نماز کے فوراً بعد مہاجرین اور انصار نے مل کر فریاد بلند کی: "اسرقت ام نسیت" (اے معاویہ! تو نے بسم اللہ کی چوری کی ہے یا بھول گیا ہے؟)(۱)(۲)

---

(۱) بیہقی نے جزء دوم کے صفحہ ۴۹ پر اور حاکم نے بھی مستدرک میں جزء اول کے صفحہ ۲۳۳ پر اس حدیث کو نقل کیا ہے اور اس حدیث کو صحیح جانا ہے۔

(۲) تفسیر نمونہ، جلد اول، صفحہ ۷

امامت

۴۸۔امامت سے مراد کیا ہے؟اور امامت اصول دین میں ہے یا فروع دین میں؟

امامت کی تعریف کے سلسلہ میں بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے، اور اختلاف ہونا بھی چاہئے کیونکہ شیعہ نظریہ (جو کہ مکتب اہل بیت علیہم السلام کے پیروکار ہیں) کے مطابق امامت اصول دین میں سے ہے، جبکہ اہل سنت کے یہاں امامت کو فروع دین اور عملی احکام میں شمار کیا جاتا ہے۔
اسی وجہ سے فریقین امامت کو ایک نگاہ سے نہیں دیکھتے لہٰذا اس کی تعریف الگ الگ کرتے ہیں

اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ ایک سنی عالم دین، امامت کی تعریف اس طرح کرتے ہیں
"الإمَامَةُ رِياسَةٌ عَامّةٌ فِي أمورِ الدِّينِ وَالدُّنيا، خلافَةٌ عَنِ النَّبِي"(۱)
"پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی جانشینی کے عنوان سے دین ودنیا کے امور میں عام سرپرستی کا نام "امامت" ہے۔

اس تعریف کے لحاظ سے امامت، حکومت کی حد تک ایک ظاہری ذمہ داری ہے، لیکن دینی

---

(۱)شرح تجرید قوشچی، ص ۴۷۲

اوراسلامی حکومت کی شکل میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی جانشینی کا عنوان (آنحضرت کی جانشینی یعنی حکومتی امور میں) رکھتی ہے، اور یہ بات ظاہر ہے کہ ایسے امام کو لوگوں کی طرف سے منتخب کیا جاسکتا ہے۔

لیکن بعض حضرات نے امامت کی تعریف اس طرح کی ہے: ''امامت یعنی پیغمبر اکرمؐ کی طرف سے دینی احکام وقوانین نافذ کرنے اور دین کی محافظت کرنے میں جانشین ہونا، اس طرح کہ تمام امت پر اس کی اطاعت واجب ہو''۔(۱)

چنانچہ یہ تعریف بھی پہلی تعریف سے الگ نہیں ہے بلکہ مفہوم ومعنی کے لحاظ سے تقریباً ایک ہی ہے۔

ابن خلدون نے بھی اپنی تاریخ [ابن خلدون] کے مشہور ومعروف مقدمہ میں امامت کی تعریف اسی طرح کی ہے۔(۲)

شیخ مفید (رحمۃ اللہ علیہ) کتاب ''اوائل المقالات'' میں عصمت کی بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں ''وہ ائمہ جو دینی احکام کے نافذ کرنے، حدود الٰہی کو قائم کرنے، شریعت کی حفاظت کرنے اور لوگوں کی تربیت کرنے میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے جانشین ہیں، ان کو (ہر گناہ اور خطاء سے) معصوم ہونا چاہئے، جس طرح انبیاء علیہم السلام معصوم ہوتے ہیں۔(۳)

چنانچہ اس تعریف کے لحاظ سے امامت، حکومت وریاست سے بالاتر ہے بلکہ انبیاء علیہم السلام کی طرح تمام ذمہ داریاں امام کی بھی ہوتی ہیں سوائے وحی کے، اسی وجہ سے جس طرح نبی کا معصوم ہونا ضروری ہوتا ہے اسی طرح امام کا بھی معصوم ہونا ضروری ہے۔

اسی وجہ سے شرح احقاق الحق میں شیعہ نقطہ نظر سے امامت کی تعریف یوں کی گئی ہے:

---

(۱) شرح قدیم تجرید، شمس الدین اصفہانی اشعری (توضیح المراد تعلیق بر شرح تجرید عقائد، تالیف سید ہاشم حسینی تہرانی صفحہ ۶۷۴ کی نقل کے مطابق)

(۲) مقدمہ ابن خلدون، صفحہ ۱۹۱

(۳) اوائل المقالات، صفحہ ۷۴، طبع مکتبۃ الداوری۔

"هِيَ مَنصبٌ إلهيٌ حائزٌ لِجميعِ الشؤونِ الكريمةِ والفضائلِ إلاَّ النّبوة و مايلازم تلك المرتبة السّامية" (۱)

"امامت ایک الٰہی منصب اور خدا کی طرف سے ایک ذمہ داری کا نام ہے جو نبوت اور اس سے متعلق دوسرے امور کے علاوہ تمام بلند امور اور فضائل کو شامل ہے"۔

چنانچہ اس تعریف کے مطابق "امام" خداوند عالم کی طرف سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ معین ہوتا ہے اور (مقام نبوت کے علاوہ) پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام امتیازات وخصوصیات رکھتا ہے، اوراس کا کام دینی حکومت کی ریاست میں منحصر نہیں ہے، اسی دلیل کی بنا پر امامت اصول دین میں شمار ہوتی ہے نہ کہ فروع دین اور عملی فرائض میں۔

امامت اصول دین میں سے ہے یا فروع دین میں سے؟

مذکورہ بحث سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے، کیونکہ امامت کے مسئلہ میں نظریات مختلف ہیں، متعصب سنی عالم "فضل بن روز بہان" "نہج الحق" (جس کا جواب "احقاق الحق" ہے) اس طرح کہتا ہے اشاعرہ کے نزدیک امامت اصول دین میں سے نہیں ہے بلکہ فروع دین میں سے ہے اوراس کا تعلق مسلمانوں کے افعال اور اعمال سے ہے۔ (۲)

اس لحاظ سے اہل سنت کے دوسرے فرقوں میں بھی کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ ان سب کے یہاں امامت عملی فرائض میں شمار ہوتی ہے، اور یہ لوگوں کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ امام یا خلیفہ کا انتخاب کرلیں، صرف مکتب اہل بیت علیہم السلام کے ماننے والے اور اہل سنت کے بہت کم افراد جیسے قاضی بیضاوی، اور ان کا اتباع کرنے والے، امامت کو اصول میں شمار کرتے ہیں۔ (۳)

---

(۱) احقاق الحق، جلد ۲، صفحہ ۳۰۰، (حاشیہ نمبر ایک) (۲) احقاق الحق، جلد ۲، صفحہ ۲۹۴۔ دلائل الصدق، جلد ۲، صفحہ ۴

(۳) دلائل الصدق، جلد ۲، صفحہ ۹

ان کی دلیل بھی واضح اور روشن ہے، کیونکہ ان کے نزدیک امامت ایک الٰہی منصب ہے، یعنی امام خدا کی طرف سے منصوب ہوتا ہے، جس کی ایک شرط معصوم ہونا ہے اور خدا کے علاوہ کوئی اس [کے معصوم ہونے] کو نہیں جانتا، اور ائمہ علیہم السلام پر ایمان رکھنا اسی طرح ضروری ہے جس طرح پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان رکھنا ضروری ہے کیونکہ امامت، نبوت کی طرح شریعت کا اصلی ستون ہے، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ شیعہ، امامت کے سلسلہ میں اپنے مخالفوں کو کافر شمار کرتے ہوں، بلکہ شیعہ تمام اسلامی فرقوں کو مسلمان شمار کرتے ہیں، اور انھیں اسلامی برادر سمجھتے ہیں، اگرچہ امامت کے سلسلے میں ان کے ہم عقیدہ نہیں ہیں، اسی وجہ سے کبھی پنجگانہ اصول دین کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں پہلے تین اصول یعنی خدا، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور قیامت کو اصول دین شمار کرتے ہیں اور ائمہ علیہم السلام کی امامت اور عدل الٰہی کو اصول مذہب شمار کرتے ہیں۔

ہم اپنی اس گفتگو کو حضرت امام علی بن موسی الرضا علیہما السلام کی حدیث پر ختم کرتے ہیں جو امامت کے مسئلہ میں ہمارے لئے الہام بخش ہے، "امامت یعنی زمام دین، نظام مسلمین، دنیا کی صلاح اور مومنین کی عزت ہے، امامت، اسلام کی بنیاد اور بلند شاخیں ہیں، امام کے ذریعہ نماز روزہ، حج، زکوٰۃ، اور جہاد کامل ہوتے ہیں، بیت المال میں اضافہ ہوتا ہے اور ضرورتمندوں کے لئے خرچ کیا جاتا ہے، احکام اور حدود الٰہی نافذ ہوتے ہیں امام ہی کے ذریعہ اسلامی ملک کے سرحدی علاقوں کی حفاظت ہوتی ہے۔

امام، حلال خدا کو حلال اور حرام خدا کو حرام شمار کرتا ہے (اور ان کو نافذ کرتا ہے) حدود الٰہی کو قائم کرتا ہے، دین خدا کا دفاع کرتا ہے، اور اپنے علم و دانش اور وعظ و نصیحت کے ذریعہ لوگوں کو راہ خدا کی دعوت دیتا ہے۔( )(۲)

( ) اصول کافی، جلد اول، صفحہ ۲۰۰ (۲) تفسیر پیام قرآن، جلد ۹، صفحہ ۱۸۔

۴۹۔امامت کی بحث کب سے شروع ہوئی؟

واضح رہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ کے فوراً بعد ہی آپ کی خلافت کے سلسلہ میں گفتگو شروع ہوگئی تھی، چنانچہ ایک گروہ کا کہنا تھا کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے بعد کے لئے کسی کو خلیفہ یا جانشین نہیں بنایا ہے، بلکہ اس چیز کو امت پر چھوڑ دیا ہے لہٰذا امت خود اپنے لئے کسی رہبر اور خلیفہ کا انتخاب کرے گی، جو اسلامی حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے اور لوگوں کی نمائندگی میں ان پر حکومت کرے، لیکن وفات رسول کے بعد نمائندگی کی صورت پیدا ہی نہیں ہوئی بلکہ چند اصحاب نے بیٹھ کر پہلے مرحلہ میں خلیفہ معین کردیا اور دوسرے مرحلہ میں خلافت انتصابی ہوگئی، اور تیسرے مرحلہ میں انتخاب کا مسئلہ چھ لوگوں پر مشتمل ایک کمیٹی کے سپرد کیا گیا تاکہ وہ آئندہ خلافت کے مسئلہ کو حل کریں۔

چنانچہ اس طرز فکر رکھنے والوں کو ''اہل سنت'' کہا جاتا ہے۔

لیکن اس کے مقابل دوسرے گروہ کا کہنا تھا کہ پیغمبر ﷺ کے جانشین کو خدا کی طرف سے معین ہونا چاہئے، اور وہ خود پیغمبر اکرم ﷺ کی طرح ہر خطا اور گناہ سے معصوم اور غیر معمولی علم کا مالک ہونا چاہئے، تاکہ مادی اور معنوی رہبری کی ذمہ داری کو نبھا سکے، اسلامی اصول کی حفاظت کرے، احکام کی مشکلات کو برطرف کرے، قرآن مجید کے دقیق مطالب کی تشریح فرمائے اور اسلام کو دوام بخشے۔

اس گروہ کو "امامیہ" یا "شیعہ" کہتے ہیں اور یہ لفظ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مشہور و معروف حدیث سے اقتباس کیا گیا ہے۔

تفسیر الدر المنثور (جس کا شمار اہل سنت کے مشہور منابع میں ہوتا ہے) میں آیہ شریفہ ﴿اُولٰئِکَ هُمْ خَیْرُ الْبَرِیَّةِ﴾ کے ذیل میں جابر بن عبد اللہ انصاری سے اس طرح نقل کیا ہے:

"ہم پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ حضرت علی علیہ السلام تشریف لائے، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا یہ اور ان کے شیعہ روز قیامت کامیاب ہیں، اور اس موقع پر یہ آیہ شریفہ نازل ہوئی:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ اُولٰئِکَ هُمْ خَیْرُ الْبَرِیَّةِ﴾(۱) (۲)

حاکم نیشاپوری (یہ چوتھی صدی کے مشہور و معروف سنی عالم ہیں) بھی اسی مضمون کو اپنی مشہور کتاب "شواہد التنزیل" میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مختلف طریقوں سے نقل کرتے ہیں جس کے راویوں کی تعداد ۲۰ سے بھی زیادہ ہے۔

منجملہ ابن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ جس وقت یہ آیہ شریفہ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ اُولٰئِکَ هُمْ خَیْرُ الْبَرِیَّةِ﴾(۳) نازل ہوئی تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا "هُوَ اَنْتَ وَ شِیْعَتُکَ" (اس آیت سے مراد آپ اور آپ کے شیعہ ہیں۔)(۴)

ایک دوسری حدیث میں ابو برزہ سے منقول ہے کہ جس وقت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس

---

(۱) سورۂ بینہ آیت ۷

(۲) الدر المنثور، جلد ۶، صفحہ ۳۷۹ (ذیل آیہ سورۂ بینہ)

(۳) سورۂ بینہ آیت ۷. (۴) شواہد التنزیل، جلد ۲، صفحہ ۳۵۷.

آیت کی تلاوت فرمائی تو فرمایا ''هُوَ اَنْتَ وَ شِیْعَتُکَ یَا عَلِیّ'' (وہ تم اور تمہارے شیعہ ہیں)(۱)

اس کے علاوہ بھی اہل سنت کے دیگر علما اور دانشوروں نے بھی اس حدیث کو ذکر کیا ہے جیسے صواعق محرقہ میں ابن حجر اور نور الابصار میں محمد شبلنجی نے۔(۲)

لہٰذا ان تمام روایات کے پیش نظر خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کے پیروؤں کا نام ''شیعہ'' رکھا ہے، لیکن اس کے باوجود بھی بعض لوگ اس نام سے خفا ہوتے ہیں اور اس کو برا سمجھتے ہیں نیز اس فرقہ کو رافضی کے نام سے یاد کرتے ہیں، کیا یہ تعجب کا مقام نہیں کہ پیغمبر اکرم تو حضرت علی علیہ السلام کے فرمانبرداروں کو ''شیعہ'' کہیں اور دوسرے لوگ اس فرقہ کو برے برے ناموں سے یاد کریں!!۔

بہرحال یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ لفظ شیعہ کا وجود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد نہیں ہوا بلکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں ہی ہو چکا تھا، اور آپ نے حضرت علی علیہ السلام کے دوستوں اور پیروؤں پر اس نام کا اطلاق کیا ہے، جو لوگ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ''خدا کا رسول'' مانتے ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی مرضی سے کلام نہیں کرتے بلکہ وہی کہتے ہیں جو وحی ہوتی ہے، ﴿وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوَیٰ☆اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُوْحَیٰ﴾ (۳) لہٰذا اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمائیں کہ اے علی آپ اور آپ کے شیعہ روز قیامت، کامیاب ہیں تو یہ ایک حقیقت ہے۔(۴)

---

(۱)شواہد التنزیل، جلد۲، صفحہ ۳۵۹

(۲)صواعق محرقہ، صفحہ ۹۶، اور نور الابصار، صفحہ ۷۰ و ۱۰۱، اس حدیث کے راویوں کی تعداد اور جن کتابوں میں یہ حدیث بیان ہوئی ہے، اس سلسلہ میں مزید معلومات کے لئے احقاق الحق، جلد سوم، صفحہ ۲۸۷، اور جلد ۱۴، صفحہ ۲۵۸ کی طرف رجوع فرمائیں۔

(۳)سورہ نجم آیت ۳ و ۴

(۴)تفسیر پیام قرآن، جلد ۹، صفحہ ۲۴

۵۰۔ اولواالامر سے مراد کون ہیں؟

جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُوْلِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ﴾(۱) ”اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو، رسول اور صاحبان امر کی اطاعت کرو جو تمہیں میں سے ہیں“۔

یہاں پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ اولوا الامر سے مراد کون حضرات ہیں؟

اولو الامر کے بارے میں اسلامی مفسرین کے درمیان بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے، ذیل میں ہم اس کا خلاصہ پیش کرتے ہیں:

۱۔ بعض اہل سنت مفسرین اس بات کا عقیدہ رکھتے ہیں کہ ”اولوا الامر“ سے مراد ہر زمانہ اور ہر مقام کے حکام وقت اور بادشاہ ہیں، اور اس میں کسی طرح کا کوئی استثنا نہیں ہے، جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہر حکومت کی پیروی کریں اگرچہ وہ مغل حکومت ہی کی کیوں نہ ہو۔

۲۔ صاحب تفسیر المنار اور صاحب تفسیر فی ظلال القرآن وغیرہ اس بات پر عقیدہ رکھتے ہیں کہ اولوا الامر سے مراد عوام الناس کے نمائندے، حکام وقت، علما اور صاحبان منصب ہیں، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ ان کا حکم اسلامی قوانین کے برخلاف نہ ہو۔

---

(۱) سورۂ نساء، آیت ۵۹

۳۔ بعض دیگر علما کے نزدیک اولوالامر سے معنوی اور فکری حکام یعنی علما ور دانشور مراد ہیں، ایسے دانشور جو عادل اور قرآن وسنت سے مکمل طور پر آگاہ ہوں۔

۴۔ اہل سنت کے بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ اولوالامر سے مراد صرف ابتدائی چار خلفاء ہیں، ان کے علاوہ کوئی دوسرا اولوالامر میں شامل نہیں ہے لہذا ان کے بعد دوسرے زمانہ میں کوئی اولوالامر نہیں ہوگا۔

۵۔ بعض دوسرے مفسرین نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب اور ان کے ناصروں کو اولوالامر مانا ہے۔

۶۔ بعض مفسرین نے ایک یہ بھی احتمال دیا ہے کہ اولوالامر سے مراد اسلامی لشکر کا سردار ہے۔

۷۔ تمام شیعہ مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ اولوالامر سے مراد "ائمہ معصومین علیہم السلام" ہیں جن کو خدا اور رسول کی طرف سے اسلامی معاشرے میں مادی اور معنوی رہبری کی ذمہ داری عطا کی گئی ہے، ان کے علاوہ کوئی دوسرا شخص اولوالامر میں شامل نہیں ہے، البتہ جو افراد ان کی طرف سے منصوب کئے جاتے ہیں اور اسلامی معاشرہ میں ان کو کوئی عہدہ دیا جاتا ہے تو معین شرائط کے ساتھ ان کی اطاعت بھی لازم ہے، البتہ اولوالامر کے عنوان سے نہیں بلکہ ان کی اطاعت اس لئے ضروری ہوتی ہے کہ وہ اولوالامر کے نائب اور نمائندے ہوتے ہیں۔

اب ہم یہاں مذکورہ تفاسیر کے سلسلہ میں تحقیق وتنقید کرتے ہیں

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ پہلی تفسیر کا آیت کے مفہوم اور تعلیمات اسلامی سے کوئی تعلق نہیں ہے، اور یہ بات ممکن نہیں ہے کہ کوئی بھی حکومت، خدا اور رسولؐ کے برابر قرار دے دی جائے اور اس کی اطاعت کی جائے اور اس میں کسی بھی طرح کی کوئی قید وشرط نہ ہو، اسی وجہ سے شیعہ مفسرین کے علاوہ خود اہل سنت کے مفسرین نے اس پہلی تفسیر کو قبول نہیں کیا ہے۔

دوسری تفسیر بھی آیہ شریفہ سے ہم آہنگ نہیں ہے، کیونکہ آیت میں اولوا لامر کی اطاعت کو بغیر کسی قید وشرط کے واجب قرار دیا گیا ہے۔

تیسری تفسیر یعنی جس میں عادل اور قرآن وسنت سے واقف علما اور دانشوروں کو اولوا الامر قرار دیا گیا ہے، وہ بھی آیت کے اطلاق سے ہم آہنگ نہیں ہے، کیونکہ علما اور دانشوروں کی پیروی کی شرط یہ ہے کہ ان کا حکم قرآن وسنت کے برخلاف نہ ہو، لہٰذا اگر وہ کسی خطا کے مرتکب ہو جائیں (کیونکہ وہ معصوم تو ہیں نہیں ان سے خطا ہو سکتی ہے) یا کسی دوسری وجہ کی بنا پر حق سے منحرف ہو جائیں تو پھر ان کی اطاعت ضروری نہیں ہے، لیکن آیہ شریفہ میں اولوا الامر کی اطاعت کو مطلق اور پیغمبر اکرمؐ کی طرح ضروری قرار دیا گیا ہے، اس کے علاوہ وہ علما اور دانشور افراد جنھوں نے قرآن وسنت سے احکام حاصل کئے ہیں ان کی اطاعت خدا ورسول کی اطاعت ہوگی، اور الگ سے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

چوتھی تفسیر (جس میں چاروں خلفا ہی کو اولوا الامر قرار دیا گیا) کا مطلب یہ ہے کہ آج مسلمانوں کے درمیان کوئی اولوا الامر نہ ہو، اس کے علاوہ اولوا الامر کو چاروں خلفا سے مخصوص کرنے پر بھی کوئی دلیل نہیں ہے۔

پانچویں اور چھٹی تفسیر یعنی صحابہ اور سرداران لشکر سے مخصوص کرنے میں بھی یہی مشکل ہے، یعنی ان لوگوں سے مخصوص کرنے پر بھی کوئی دلیل نہیں ہے۔

بعض علمائے اہل سنت جیسے مصر کے مشہور ومعروف دانشور ''شیخ محمد عبدہ'' نے مشہور ومعروف مفسر ''فخر الدین رازی'' کی پیروی کرتے ہوئے دوسرے احتمال (کہ اولوا الامر سے مراد، عوام الناس کے نمائندے، حاکم وقت، علما اور صاحب منصب افراد ہیں، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ ان کا حکم اسلامی قوانین کے برخلاف نہ ہو) میں چند شرائط کا اضافہ کرتے ہوئے قبول کیا ہے، ان میں سے ایک شرط یہ بیان کی ہے کہ حاکم وقت مسلمان ہو (جیسا کہ لفظ ''منکم'' سے نتیجہ نکلتا ہے) اور

اس کا حکم قرآن اور سنت کے برخلاف نہ ہو، مزید یہ کہ اس کا حکم اپنے اختیار سے ہو نہ کہ اس نے مجبوری کی حالت میں حکم دیا ہو اور یہ کہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے حکم کرے، نیز یہ مسائل میں حکم کرے جس میں دخالت کا حق رکھتا ہو (نہ عبادت جیسی چیزوں میں کہ جس کا حکم اسلام میں معین ہے) مزید یہ کہ جس مسئلہ میں حکم کر رہا ہو اس میں شریعت کی طرف سے کوئی خاص نص موجود نہ ہو، ان تمام چیزوں کے علاوہ اتفاقی طور پر نظریہ دے [یعنی ایسا نہ ہو کہ ایک حاکم کچھ کہہ رہا ہے تو دوسرا کچھ]۔

اور چونکہ یہ لوگ اس بات پر عقیدہ رکھتے ہیں کہ تمام امت یا امت کے تمام نمائندے خطا اور غلطی نہیں کر سکتے، یعنی معصوم ہوتے ہیں، اور ان شرائط کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسا حکم جس میں کوئی قید و شرط نہ ہو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کی طرح ہو جاتا ہے، (جس کا نتیجہ "اجماع" کو حجت ماننا اور اس کو قبول کرنا ہے) لیکن اس تفسیر پر بھی بہت سے اعتراضات ہیں، کیونکہ

۱۔ اجتماعی مسائل میں بہت ہی کم مقامات پر اتفاق ہوتا ہے جس کی بنا پر امت مسلمہ کے اکثر امور میں ہمیشہ ایک بے نظمی باقی رہے گی، اور اگر لوگ اکثریت کے نظریہ کو قبول کرنا چاہیں تو اس پر اعتراض یہ ہے کہ اکثریت معصوم نہیں ہے بلکہ پوری امت کا اجماع معصوم ہے، لہٰذا ان میں سے کسی ایک کی بھی اطاعت ضروری نہ ہوگی۔

۲۔ علم اصول میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ بغیر امام معصوم کے "تمام امت" کے معصوم ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے، [اگر امام معصوم اجماع میں شامل نہ ہو تو اس اجماع کا کوئی فائدہ نہیں ہے]

۳۔ اس تفسیر کے حامیوں کی ایک شرط یہ تھی کہ ان کا حکم قرآن وسنت کے برخلاف نہ ہو، لیکن قرآن و سنت کے خلاف ہے یا نہیں اس کو دیکھنے کی ذمہ داری کس پر ہوگی، تو یہ ذمہ داری مجتہد اور قرآن وسنت سے آگاہ علما کی ہوگی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مجتہدین اور علما کی اجازت کے بغیر اولوا الامر کی اطاعت جائز نہ ہوگی، بلکہ علما کی اطاعت اولوا الامر سے بلند ہوگی، جبکہ یہ نظریہ بھی آیت سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ انھوں نے علما و دانشوروں کو بھی اولوا الامر میں شمار کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس تفسیر کی بنا پر علما اور مجتہدین کا مرتبہ ان نمائندوں سے بلند ہوگا نہ کہ ان کے ہم پلہ، کیونکہ علما و دانشور حضرات ولوا الامر کے امور کے نگراں ہیں کہ کہیں ان کے نظریات قرآن و سنت کے مخالف تو نہیں ہیں، لہٰذا وہ ان سے بلند مرتبہ پر فائز ہیں جو کہ مذکورہ تفسیر سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

لہٰذا مذکورہ تفسیر پر متعدد اعتراض ہوتے ہیں۔

صرف ساتویں تفسیر مذکورہ اعتراضات سے خالی ہے یعنی اولوا الامر سے مراد ائمہ معصومین علیہم السلام ہے، کیونکہ یہ تفسیر مذکورہ آیت میں موجودہ وجوب طاعت کے اطلاق سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہیں، کیونکہ ''عصمت'' ان کو ہر طرح کی خطا و غلطی سے محفوظ رکھتی ہے، اسی لئے امام کا حکم پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کی طرح بغیر کسی قید و شرط کے واجب الاطاعت ہے، اور انھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کی صف میں قرار دیا جانا مناسب ہے، جیسا کہ لفظ ''اطیعوا'' کی تکرار کے بغیر ''رسول'' پر عطف ہوا ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اہل سنت کے بعض مشہور و معروف علما جیسے فخر الدین رازی نے مذکورہ آیت کے ذیل میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے، جیسا کہ موصوف تحریر کرتے ہیں

''خداوندعالم نے جس کی اطاعت کو قاطعانہ اور بغیر چون و چرا کے لازم اور ضروری قرار دیا ہے اس کا معصوم ہونا ضروری ہے، کیونکہ اگر خطا اور غلطی سے معصوم نہ ہو، اور گناہوں کے وقت خدا اس کی اطاعت کو لازم قرار دے اور خطا کی صورت میں بھی اس کی پیروی لازم ہو تو یہ تو خود خداوندعالم کے حکم میں تضاد اور ٹکراؤ ہوگا، کیونکہ ایک طرف تو خداوندعالم نے کسی کام کو ممنوع قرار دیا ہے اور دوسری طرف ''اولوا الامر'' کی پیروی لازم قرار دی ہے، لہٰذا یہاں ''امر'' اور ''نہی'' دونوں جمع ہوجائیں گے، [یعنی ایک طرف خدا کہہ رہا ہے کہ اس کام کو انجام دو، دوسری طرف اسی کام سے روک بھی رہا ہے]

ایک طرف خداوند عالم اولواالامر کی اطاعت کا مطلق طور پر حکم دے رہا ہے، دوسری طرف اگر اولوالامر معصوم نہ ہو اور خدا اس کی طاعت کا حکم دے تو یہ حکم صحیح نہیں ہے، اس مقدمہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مذکورہ آیت میں جس اولوالامر کی طرف اشارہ کیا گیا اس کا معصوم ہونا ضروری ہے۔

اس کے بعد فخرالدین رازی تحریر کرتے ہیں کہ یہ معصوم یا تو تمام امت ہے یا امت کے کچھ افراد ہیں، دوسرا احتمال صحیح نہیں ہے، کیونکہ ہم امت کے ان بعض افراد کو پہچانیں اور اس تک رسائی ممکن ہو، جبکہ ایسا نہیں ہے، (یعنی وہ معصوم کون ہے ہمیں معلوم نہیں ہے) اور جب یہ احتمال رد ہو جاتا ہے تو صرف پہلا احتمال باقی رہتا ہے کہ پوری امت معصوم ہے، اور یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ امت کا اجماع اور اتفاق حجت و قابل قبول ہے، اور یہ بہترین دلیل ہے۔(۱)

[قارئین کرام!] جیسا کہ آپ حضرات جانتے ہیں کہ فخر رازی مختلف علمی مسائل پر اعتراضات کرنے کے شوقین ہیں یہاں مذکورہ آیت میں اولوالامر کے معصوم ہونے کو قبول کرتے ہیں، لیکن مکتب اہل بیتؑ اور ائمہ علیہم السلام سے آشنائی نہ رکھنے کے سبب اس احتمال سے چشم پوشی کرلیتے ہیں کہ امت کے معین حضرات اولوالامر ہیں، اور مجبوراً اولوالامر کے معنی تمام امت (یا عام مسلمانوں کے نمائندے) مراد لیتے ہیں، جبکہ یہ احتمال قابل قبول نہیں ہے کیونکہ ہم نے پہلے بھی عرض کیا کہ اولوالامر اسلامی معاشرہ کے لئے رہبر ہے اور اسلامی حکومت نیز امت مسلمہ کی مشکلات کے فیصلے اسی کے ذریعہ ہوتے ہیں، جبکہ ہم یہ بات بھی جانتے ہیں کہ تمام حکومتی عہدہ داروں میں اتفاق ہونا ممکن نہیں ہے، کیونکہ مسلمانوں کو درپیش اجتماعی، سیاسی، ثقافتی، اخلاقی اور اقتصادی مسائل میں سب لوگوں کا ہونا غالباً ممکن نہیں ہے، اور اکثریت کی پیروی اولوالامر کی پیروی شمار نہیں ہوگی،

(۱)تفسیر کبیر فخر رازی، جلد ۱۰، صفحہ ۱۴۴، طبع مصر ۱۳۵۷ھ ش۔

لہٰذا فخر الدین رازی اور ان کی پیروی کرنے والے معاصرین کے عقیدہ کا لازمہ یہ ہوگا کہ اولوا الامر کی اطاعت کی جگہ باقی نہ رہے، اور صرف استثنائی صورت اختیار کرے۔

[قارئین کرام!] ہماری تمام باتوں کا خلاصہ یہ ہوا کہ آیہ شریفہ صرف ان معصوم حضرات کی رہبری کو ثابت کرتی ہے جو امت کا ایک حصہ ہیں۔ (غور کیجئے)

چند اعتراضات اور ان کے جوابات

مذکورہ تفسیر پر کچھ اعتراضات ہوئے ہیں، جن کو ہم بغیر طرفداری کے بیان کرتے ہیں۔

۱۔ اگر ''اولوا الامر'' سے مراد ائمہ معصومین علیہم السلام ہوں تو چونکہ لفظ ''اولی'' جمع کا صیغہ ہے، لہٰذا آیت سے ہم آہنگ نہیں ہے، کیونکہ ہر زمانہ میں امام معصوم صرف ایک ہوتا ہے۔

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ ہر زمانہ میں امام معصوم ایک سے زیادہ نہیں ہوتا لیکن ہر زمانہ میں ایک ہی امام ہوتا ہے اس کے بعد دوسرا امام، تا آخر، اور ہم جانتے ہیں کہ آیہ شریفہ ہر زمانہ کے افراد کو امام کی اطاعت کے لئے حکم دے رہی ہے۔

۲۔ اس معنی کے لحاظ سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں ولو الامر موجود نہیں تھے، تو پھر کس طرح ان کی اطاعت کا حکم دیا گیا؟

اس اعتراض کا جواب بھی مذکورہ جواب سے واضح اور روشن ہو جاتا ہے کیونکہ آیہ شریفہ کسی خاص زمانہ سے مخصوص نہیں ہے، لہٰذا ہر صدی کے مسلمانوں کا وظیفہ معین کرتی ہے، اور دوسرے الفاظ میں یوں کہیں کہ خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ولو الامر تھے، کیونکہ اس وقت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس دو منصب تھے ایک منصب ''رسالت'' جیسا کہ آیہ شریفہ میں ''اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ'' آیا ہے، دوسرے ''امت اسلامی کی رہبری اور سرپرستی'' اس آیت میں ''اولوا الامر'' سے یاد کیا گیا ہے، اس بنا پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں معصوم رہبر اور پیشوا خود آنحضرتؐ

تھے، یعنی منصب رسالت اور احکام اسلام کی تبلیغ کے علاوہ اس منصب پر بھی فائز تھے، اور شاید "رسول" اور "اولوالامر" کے درمیان "اطیعوا" کی تکرار نہ ہونا اس بات کی طرف اشارہ ہے، دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ منصب "رسالت" اور منصب "اولوالامر" دو مختلف منصب ہیں جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ایک ساتھ جمع تھے، لیکن امام کے سلسلہ میں جدا مسئلہ ہے اور امام صرف دوسرا منصب رکھتا ہے۔

۳۔ اگر "اولوالامر" سے مراد ائمہ معصومین اور معصوم رہبر ہوں تو درج ذیل آیہ شریفہ میں مسلمانوں کے اختلاف کی صورت میں صرف خدا و رسول کی طرف رجوع کرنے کا حکم کیوں دیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: ﴿فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا﴾(۱)

"پھر اگر آپس میں کسی بات میں اختلاف ہو جائے تو اُسے خدا اور رسول کی طرف پلٹا دو، اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھنے والے ہو، یہی تمہارے حق میں خیر اور انجام کے اعتبار سے بہترین بات ہے"۔

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا کہ اس آیت میں اولوالامر کی بات نہیں کی گئی ہے، اور اختلاف دور کرنے کے لئے صرف خدا و رسول کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا گیا ہے، یعنی کتاب خدا (قرآن کریم) اور سنت پیغمبر کے ذریعہ اختلاف حل کیا جائے گا۔

اس سوال کے جواب میں ہم عرض کرتے ہیں کہ اولاً یہ اعتراض شیعہ مفسرین پر نہیں ہے بلکہ اگر ذرا غور کریں تو دوسری تفسیروں پر بھی یہی اعتراض وارد ہوتا ہے، اور دوسرے یہ کہ اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ مذکورہ آیت میں اختلاف و تنازع سے مراد احکام کا اختلاف ہے، مسلمانوں

(۱)سورہ نساء، آیت ۵۹

کی رہبری اور حکومت کے جزئی مسائل کا اختلاف مراد نہیں ہے، کیونکہ ان مسائل میں قطعی طور پر اولوا الامر کی اطاعت ہونی چاہئے، (جیسا کہ آیت کے پہلے فقرہ میں بیان ہوا ہے) لہٰذا اختلاف سے مراد اسلام کے عام قوانین اور احکام کا اختلاف مراد ہے جس کا جواز خدا و پیغمبر سے مخصوص ہے، کیونکہ امام صرف احکام کو نافذ کرتا ہے، احکام کو وضع نہیں کرتا، اور نہ ہی اسلام کے کسی قانون کو نسخ کرتا، بلکہ ہمیشہ احکام خدا اور سنت پیغمبر کو نافذ کرتا ہے، اور اسی وجہ سے اہل بیت علیہم السلام سے منقول احادیث میں بیان ہوا ہے کہ اگر [کسی راوی کے ذریعہ] ہم سے کوئی بات کتاب خدا اور سنت پیغمبر کے برخلاف سنو تو اس کو ہرگز قبول نہ کرو، کیونکہ ہمارے لئے قرآن و سنت پیغمبر کے برخلاف حکم کرنا محال اور ناممکن ہے۔

مختصر یہ کہ احکام اور اسلامی قوانین لوگوں کے اختلاف کو حل کرنے کا پہلا مرجع خدا اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم ہیں، کیونکہ پیغمبر پر وحی ہوتی ہے، اور اگر امام معصوم کوئی حکم بیان کرتا ہے تو وہ اپنی طرف سے نہیں، بلکہ قرآن کریم یا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم سے حاصل ہوئے علم کی بنا پر ہوتا ہے، لہٰذا اختلاف حل کرنے والوں کی صف میں اولوا الامر کو درک نہ کرنے کی وجہ روشن ہو جاتی ہے۔(۱)

(۱) تفسیر نمونہ، جلد ۳، صفحہ ۳۳۵

۵۱۔ اہل بیتؑ سے مراد کون حضرات ہیں؟

سورۂ مبارکۂ احزاب میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا﴾(۱)

"بس اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ (اے اہل بیت پیغمبرؐ!) تم سے ہر برائی کو دور رکھے اور اس طرح پاک و پاکیزہ رکھے جو پاک و پاکیزہ رکھنے کا حق ہے"۔

آیۂ شریفہ کے پیش نظر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اہل بیتؑ سے مراد کون لوگ ہیں؟

یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ یہ آیۂ شریفہ ازواج پیغمبر کی شان میں نازل ہونے والی آیات کے درمیان واقع ہے، لیکن اس آیت کا انداز بدلا ہوا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس آیت کا ایک دوسرا مقصد ہے، کیونکہ اس سے پہلی اور بعد والی آیات میں "جمع مؤنث" کے صیغے استعمال ہوئے ہیں لیکن اس آیت میں "جمع مذکر" کا صیغہ استعمال ہوا ہے!

آیت کے شروع میں ازواج پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ کو خطاب کیا گیا اور ان کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے اپنے گھروں میں رہیں، اور عرب کی جاہلیت کے رسم و رواج کی طرح لوگوں کے سامنے نہ نکلیں، عفت کی رعایت کریں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں نیز خدا اور رسولؐ کی اطاعت کریں،

---

(۱) سورۂ احزاب، آیت ۳۳

﴿وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ وَأَقِمْنَ الصَّلَاةَ وَآتِينَ الزَّكَاةَ وَأَطِعْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ...﴾

آیت کے اس حصہ میں تمام چھ ضمیریں "جمع مؤنث" کی استعمال ہوئی ہیں۔ (غور کیجئے)

اس کے بعد لہجہ بدل جاتا ہے اور ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ کا "صرف" ارادہ یہ ہے کہ تم اہل بیت سے رجس کو دور رکھے اور تمہیں مکمل طور پر پاک رکھے"﴿إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا﴾(۱)

آیت کے اس حصہ میں دونوں ضمیریں جمع مذکر کے لئے استعمال ہوئی ہیں۔

یہ بات صحیح ہے کہ عام طور پر آیت کا سیاق وسباق ایک مطلب کو بیان کرتا ہے لیکن یہ اس وقت ہوتا ہے جب اس کے برخلاف کوئی قرینہ اور شاہد نہ ہو، لہٰذا جو لوگ آیت کے اس حصہ کو بھی ازواج پیغمبر ﷺ کی شان میں سمجھتے ہیں ان کا نظریہ ظاہر آیت اور اس میں موجود قرینہ کے برخلاف ہے، یعنی ان دونوں حصوں میں ضمیریں مختلف ہیں لہٰذا دو جدا جدا مطلب ہیں۔

اس کے علاوہ مذکورہ آیت کی تفسیر میں بڑے بڑے سنی اور شیعہ علما نے خود پیغمبر اکرم ﷺ سے متعدد احادیث نقل کی ہیں، اور فریقین کے معتبر منابع وماخذ میں اس کو قبول کیا گیا ہے، اور ان روایات کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔

یہ تمام روایات اس بات کی حکایت کرتی ہیں کہ مذکورہ آیہ شریفہ پیغمبر اکرم ﷺ، حضرت علی، حضرت فاطمہ زہرا، حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین علیہم السلام کی شان میں نازل ہوئی ہے، (نہ کہ ازواج پیغمبر کی شان میں) جیسا کہ بعد میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے گا۔

(۱) سورہ احزاب، آیت ۳۳

آیت میں لفظ ''انما'' استعمال کیا گیا جو حصر کے معنی میں ہے جس کے معنی ''صرف'' ہوتے ہیں جو اس بات کی دلیل ہے کہ اس آیہ شریفہ میں آل نبی ﷺ کے لئے جو خاص عظمت قرار دی گئی ہے وہ کسی دوسرے کے لیے نہیں ہے۔

بعض مفسرین اہل سنت نے اہل بیت میں ازواج نبی کو بھی شامل کیا ہے، لیکن جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے کہ اس آیت کا سیاق اور آیت کے پہلے اور بعد والے حصے میں استعمال ہونے والی ''جمع مونث'' کی ضمیروں کی جگہ اس حصہ میں ''جمع مذکر'' کی ضمیروں کا استعمال کیا گیا ہے جو ایک واضح دلیل ہے کہ اس حصہ کا ایک الگ مطلب ہے، اور اس سے مراد ایک دوسری چیز ہے، کیا خداوند عالم ''حکیم'' نہیں ہے، اور کیا قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت بلند و بالا نہیں ہے اور اس کے تمام الفاظ کوئی حساب و کتاب نہیں رکھتے؟

لیکن مفسرین کی ایک جماعت نے آیہ تطہیر کو پیغمبر اکرم، علی، فاطمہ، حسن و حسین (علیہم السلام) سے مخصوص کیا ہے، اس سلسلہ میں ہم شیعہ سنی منابع میں وارد ہونے والی روایات میں سے چند نمونے پیش کرتے ہیں جو اس تفسیر پر گواہ ہیں۔

اور شاید انھیں روایات کی وجہ سے بعض لوگوں نے آیہ شریفہ کو اہل بیتؑ سے مخصوص نہیں مانا، لیکن انھوں نے مذکورہ آیت کے ایک وسیع معنی بیان کئے ہیں جس میں اہل بیت بھی شامل ہوں اور ازواج رسول بھی، یہ آیت کی ایک تیسری تفسیر ہے۔

جو روایات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ یہ آیت پیغمبر اکرم ﷺ، حضرت علی مرتضی، حضرت فاطمہ زہرا، اور حضرت امام حسن اور امام حسین علیہم السلام سے مخصوص ہے، ان کی تعداد بہت زیادہ ہے، صرف تفسیر ''الدر المنثور'' میں ۱۸ حدیث نقل ہوئی ہیں جن میں سے پانچ روایت ام سلمہ سے، تین ابو سعید خدری سے، ایک عائشہ سے، ایک انس سے، دو روایت ابن عباس سے، دو روایت ابی الحمراء سے، ایک روایت واثلہ بن اسقع سے، ایک روایت سعد سے، ایک روایت ضحاک بن مزاحم

ہے اور ایک روایت زید بن ارقم سے نقل کی گئی ہے۔ (۱)

جناب علامہ طباطبائی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر ''میزان'' میں اس سلسلہ میں بیان ہونے والی روایات کی تعداد ۷۰ رتک بیان کی ہے، موصوف فرماتے ہیں اہل سنت کے ذریعہ اس سلسلہ میں نقل ہونے والی روایات شیعہ طریقہ سے بیان ہونے والی روایات سے بھی زیادہ ہیں! اس کے بعد موصوف نے مذکورہ ناموں کے علاوہ بہت سے نام شمار کرتے ہیں، یعنی تفسیر الدر المنثور کے علاوہ دوسری کتابوں میں بیان ہونے والے راویوں کے نام بیان کئے ہیں۔

بعض حضرات نے ان روایات اور جن کتابوں میں یہ روایت نقل ہوئی ان کی تعداد سیکڑوں تک بتائی ہے اور ایسا ہونا بعید بھی نہیں ہے۔

ہم یہاں پر ان روایات کے چند نمونے مع منابع وماخذ نقل کرتے ہیں تاکہ اسباب النزول میں ''وحدت'' کی بات روشن ہوجائے، جو واقعاً ایک حقیقت ہے، چنانچہ موصوف فرماتے ہیں:

﴿إِنَّ الآيةَ نزلتْ فِي النَّبيِّ (ص)، وعَلِيّ و فَاطِمَة والحسنين (ع) خاصة لايشاركهُم فيها غيرُهُم﴾

''یہ آیۂ شریفہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت علی مرتضیٰ، حضرت فاطمہ زہرا، اور حضرت امام حسن وامام حسین علیہم السلام سے مخصوص ہے اور کوئی دوسرا اس میں شامل نہیں ہے''۔(۲)

چنانچہ ان احادیث کا خلاصہ چار حصوں میں کیا جاسکتا ہے:

۱۔ جن احادیث کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعض ازواج نے نقل کیا ہے جو واضح طور پر کہتی ہیں

---

(۱) الدر المنثور، جلد ۵، صفحہ ۱۹۶و۱۹۹

(۲) المیزان، جلد ۱۶، صفحہ ۳۱۱

کہ جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آیہ شریفہ کی گفتگو فرمائی تو آپ سے سوال کیا کہ کیا ہم لوگ بھی اس آیت میں شامل ہیں؟ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تم خیر پر ہو لیکن اس آیت میں شامل نہیں ہو!

جیسا کہ ثعلبی اپنی تفسیر میں ''ام سلمیٰ (زوجہ پیغمبر) سے نقل کرتے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے حجرے میں تشریف فرما تھے کہ جناب فاطمہ (س) آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں کھانا لائیں تو آپ نے فرمایا اپنے شوہر نامدار اور دونوں بیٹوں حسن وحسین (علیہم السلام) کو بھی بلالاؤ، اور جب یہ سب حضرات جمع ہوگئے سب نے ساتھ میں کھانا تناول کیا اس کے بعد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان پر اپنی عبا ڈالی اور فرمایا

''اَللّٰھُمَّ اِنَّ ھٰولاءِ أھلُ بَیتِی وَ عِتْرتِی فَاَذْھِب عَنھُم الرِّجس وطھّرھُم تَطْھِیْراً''

''خداوندا! یہ میرے اہل بیت اور میری عترت ہیں، ان سے رجس اور برائی کو دور فرما، اور ہر طرح کے رجس سے پاک وپاکیزہ قرار دے''۔

اسی موقع پر آیہ ﴿إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ...﴾ نازل ہوئی، میں [ام سلمیٰ] نے کہا یا رسول اللہ! کیا میں آپ کے ساتھ ہوں؟ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا انکِ الی خیر ''تم خیر پر ہو'' (لیکن ان میں شامل نہیں ہو)(۱)

نیز اہل سنت کے مشہور ومعروف عالم دین ''ثعلبی'' (۲) جناب عائشہ سے اس طرح نقل

---

(۱) علامہ طبری نے مجمع البیان میں مذکورہ آیت کے ذیل میں، اور حاکم حسکانی نے شواہد التنزیل، جلد ۲ صفحہ ۵۶ میں مذکورہ حدیث کو ذکر کیا ہے

(۲) یہ چوتھی صدی کے آخر اور پانچویں صدی کے شروع میں زندگی بسر کرتے تھے جن کی تفسیر ''تفسیر کبیر'' کے نام سے مشہور ہے

کرتے ہیں جب لوگوں نے جنگ جمل اور اس جنگ میں آپ کی دخالت کے بارے میں سوال کیا تو (بہت افسوس کے ساتھ) جواب دیا یہ ایک تقدیر ہی تھی! اور جب حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں سوال کیا تو کہا

" تسألني عن أحب الناس كان إلىٰ رسولِ الله و زوجُ أحب النّاسِ كان إلى رسول الله، لقد رأيت علياً و فاطمة و حسناً وحسيناً و جمع رسول الله بثوب عليهم ثم قال : اللّهم هولاء أهل بيتي و حامتي فاذهب عنهم الرّجس و طهّرهم تطهيراً، قالت فقلتُ يا رسول الله ! أنا من أهلک قال تنحّي فإنّکِ إلى خير"(۱)

"کیا مجھ سے اس شخص کے بارے میں سوال کرتے ہو جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب تھا، اور اس کے بارے میں سوال کرتے ہو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چہیتی بیٹی کا شوہر ہے، میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی، فاطمہ، حسن وحسین [علیہم السلام] کو ایک چادر کے نیچے جمع کیا اور فرمایا: پالنے والے! یہ میرے اہل بیت اور میرے حامی ہیں ان سے رجس اور برائی کو دور فرما، اور ان کو پاک و پاکیزہ قرار دے، اس وقت میں نے کہا: یا رسول اللہ (ص) کیا میں بھی ان [اہل بیت] میں شامل ہوں تو آنحضرت نے فرمایا تم یہاں سے چلی جاؤ، تم خیر پر ہو (لیکن ان میں شامل نہیں ہو، اس طرح کی حدیثیں صراحت کے ساتھ بیان کررہی ہیں کہ ازواج پیغمبر اہل بیت میں شامل نہیں تھیں)"۔

۳۔حدیث کساء بہت سی کتابوں میں مختلف الفاظ میں بیان ہوئی ہے، جن کا مشترک بیان یہ ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی مرتضیٰ، حضرت فاطمہ زہراء، اور حضرت امام حسن وامام حسین علیہم السلام کو ایک جگہ جمع کیا (یا یہ حضرات خود آپ کی خدمت میں آئے) پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان

---

(۱) مجمع البیان، سورۂ احزاب آیت ۳۳ کے ذیل میں

پر اپنی عبا (یا چادر) اڑھائی اور دعا کی خداوندا! یہ میرے اہل بیت ہیں ان سے ہر قسم کے رجس اور برائی کو دور فرما، چنانچہ اسی موقع پر یہ آیت نازل ہوئی ﴿إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا﴾

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس حدیث کو صحیح مسلم، مستدرک حاکم، سنن بیہقی، تفسیر ابن جریر اور تفسیر سیوطی الدر المنثور میں نقل کیا گیا ہے۔(۱)

حاکم حسکانی نے بھی ''شواہد التنزیل'' میں اس حدیث کو بیان کیا ہے(۲) ''صحیح ترمذی'' میں بھی یہ حدیث بار ہا بیان ہوئی ہے، جن میں سے ایک جگہ ''عمر بن ابی سلمہ'' اور دوسری جگہ ''ام سلمہ'' سے نقل کیا گیا ہے۔(۳)

ایک دوسرا نکتہ یہ ہے کہ ''فخر رازی'' نے آیہ مباہلہ (سورہ آل عمران، آیت ۶۱) کے ذیل میں اس حدیث (حدیث کساء) کو نقل کرنے کے بعد اضافہ کیا ہے

''وَاعلَمْ إِنَّ هٰذِهِ الرِّوَايَةُ كَالْمُتَّفِقِ عَلَىٰ صِحَّتِهَا بَيْنَ أَهْلَ التَّفْسِيرِ وَالْحَدِيثِ''(۴)

''معلوم ہونا چاہئے کہ یہ اس روایت کی طرح ہے جو تمام مفسرین اور محدثین کے نزدیک متفق علیہ ہو''۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ امام ''احمد بن حنبل'' نے اپنی مسند میں اس حدیث کو مختلف طریقوں سے نقل کیا ہے۔(۵)

---

(۱) صحیح مسلم، جلد ۴، صفحہ ۱۸۸۳، حدیث ۲۴۲۴، (باب فضائل اہل بیت نبی ﷺ)
(۲) شواہد التنزیل، جلد ۲، صفحہ ۳۳ حدیث ۶۷۶
(۳) صحیح ترمذی، جلد ۵ صفحہ ۶۹۹ حدیث ۳۸۷۱، (باب فضل فاطمہؑ) مطبوعہ احیاء التراث
(۴) تفسیر فخر رازی، جلد ۸، صفحہ ۸۰
(۵) مسند احمد، جلد دوم، صفحہ ۳۳۰، جلد ۳، صفحہ ۲۵۹ اور جلد ۶، صفحہ ۲۹۲ (نقل از فضائل الخمسہ، جلد اول، صفحہ ۲۷۶)

۳۔ بہت سی روایت میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ اس آیہ شریفہ کے نازل ہونے کے بعد چند مہینے تک (بعض روایات میں ۶ مہینے، بعض میں ۸ مہینے اور بعض میں ۹ مہینے ذکر ہوئے ہیں) نماز صبح کے وقت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم جب در فاطمہ پر سلام اللہ علیہا سے گزرتے تھے تو فرمایا کرتے تھے

"الصلاۃ! یا اھل البیت! ﴿إِنَّمَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا﴾

"اے اہل بیت نماز کا وقت ہے، خداوند عالم کا ارادہ ہے کہ تم سے ہر قسم کے رجس اور برائی کو دور رکھے اور ایسا پاکیزہ قرار دے جیسا پاکیزہ رکھنے کا حق ہے"

اس حدیث کو مشہور و معروف مفسر حاکم حسکانی نے اپنی تفسیر "شواہد التنزیل" میں "انس بن مالک" سے نقل کیا ہے۔(۱)

اسی مذکورہ کتاب میں ایک دوسری حدیث کے ضمن میں "سات مہینے" کی روایت "ابی الحمراء" سے نقل کی ہے، [یعنی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم سات مہینے تک در فاطمہ پر آکر مذکورہ جملے فرمایا کرتے تھے]

نیز اسی کتاب میں آٹھ مہینے کی روایت "ابوسعید خدری" سے نقل کی گئی ہے۔(۲)

قارئین کرام! مدت میں فرق ہونا کوئی اہم بات نہیں ہے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ انس نے چھ ماہ، ابوسعید خدری نے آٹھ ماہ، اور ابن عباس نے نو ماہ تک اس چیز کا مشاہدہ کیا ہو(۳)

جس نے جتنی مدت دیکھا ہے اسی اعتبار سے نقل کیا ہے حالانکہ ان کی روایت میں کوئی

---

(۱)شواہد التنزیل، جلد۲، صفحہ ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۵۰، ۹۲، (توجہ کریں کہ شواہد التنزیل نے اس روایت کو متعدد طریقہ سے نقل کیا ہے)

(۲)شواہد التنزیل، جلد۲، صفحہ۲۸، و احقاق الحق، جلد۲، صفحہ ۵۰۲ سے ۵۴۸ تک۔

(۳)الدر المنثور، جلد۵، صفحہ ۹۹

دوسرا اختلاف نہیں ہے۔

بہرحال اتنی مدت تک پیغمبر کرم ﷺ کا ہر روز اسی عمل کی تکرار کرنا یک طے شدہ مسئلہ تھا، کیونکہ آنحضرت ﷺ اپنے اس عمل سے یہ بات بالکل واضح کرنا چاہتے تھے کہ "اہل بیت" سے مرد صرف اس گھر کے رہنے والے ہیں، تا کہ آنے والے زمانہ میں کسی کے لئے کوئی شک وشبہ باقی نہ رہے، اور یہ بات سب کو معلوم ہو جائے کہ یہ آیت صرف ور صرف ان حضرت کی شان میں نازل ہوئی ہے، لیکن واقعاً تعجب کی بات ہے کہ اس قدر تاکید کے باوجود بھی بعض لوگوں کے نزدیک یہ مسئلہ واضح نہ ہوسکا، کیا واقعاً یہ تعجب کا مقام نہیں ہے!؟

خصوصاً جب مسجد نبی ﷺ کی طرف کھلنے والے تمام دروازے بند کرادے گئے صرف پیغمبر کرم ﷺ ور حضرت علی علیہ السلام کے دروازے کھلے رہے (کیونکہ پیغمبر کرم ﷺ نے فرمان جاری کیا تھا کہ ان دو دروازوں کے علاوہ تمام دروازے بند کردئے جائیں)

یہ بات واضح ہے متعدد افر دپیغمبر اکرم ﷺ کی زبان مبارک سے یہ کلمات سنتے ہوں گے، لیکن پھر بھی بعض مفسرین یہ کوشش کرتے ہیں کہ آیت کے معنی میں وسعت کے قائل ہو جائیں تا کہ زوج پیغمبر کو بھی شامل کرلیا جائے، کیا یہ تعجب کا مقام نہیں ہے، اور جیسے کہ ہم نے عرض بھی کیا کہ تاریخی شواہد کے مطابق خود حضرت عائشہ پیغمبر کرم ﷺ سے متعلق اپنے تمام فضائل کو بیان کرنے سے نہیں کتراتی تھیں بلکہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کو بھی بیان کردیتی ہے، وہ خود کو اس آیت میں شامل نہیں جانتی، بلکہ وہ خود کہتی ہیں کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے مجھ سے فرمایا "تم اس آیت میں شامل نہیں ہو"!

۳۔ وہ متعدد روایات جو پیغمبر اکرم ﷺ کے مشہور ومعروف صحابی ابوسعید خدری کے ذریعہ نقل ہوئی ہیں، ور آیہ تطہیر کی طرف اشارہ ہیں، ان میں واضح طور پر بیان ہوا

"نَزَلَتْ فِی خَمسةٍ فِی رَسُولِ اللّٰهِ وَعَلِیٍّ وفاطمة والحَسنِ وَالحُسَینِ

علیہم السلام"(۱)

"یہ آیہ شریفہ رسول خدا، حضرت علی، فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا اور حسنین علیہما السلام کی شان میں نازل ہوئی ہے"

المختصر آیہ تطہیر کی شان نزول کے سلسلہ میں بیان ہونے والی وہ احادیث جو پیغمبر اکرمؐ، حضرت علی علیہ السلام، جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا اور امام حسن و امام حسین علیہم السلام سے مخصوص ہیں، اور یہ احادیث اسلامی معتبر کتابوں میں اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کو متواتر حدیثوں میں شمار کیا جاتا ہے، اور اس لحاظ سے ان میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی، یہاں تک کہ کتاب شرح احقاق الحق میں (شیعہ منابع کے علاوہ) خود اہل سنت کی مشہور و معروف ۷۰ معتبر کتابوں سے اس حدیث کو نقل کیا گیا ہے، اس کے بعد صاحب کتاب فرماتے ہیں: "اگر ان تمام منابع و مدارک کو جمع کیا جائے تو ان کی تعداد ہزار سے بھی زیادہ ہو جائے گی"۔(۲)(۳)

---

(۱) شواہد التنزیل میں اس سلسلے میں چالیس حدیثیں موجود ہیں جلد ۲، صفحہ ۲۴ سے ۳۷ تک (حدیث ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۹، ۷۷۴)

(۲) اقتباس از جلد دوم احقاق الحق، صفحہ ۵۰۲ تا ۵۶۳

(۳) تفسیر پیام قرآن، جلد ۹، صفحہ ۳۷

۵۲۔ واقعہ غدیر کیا ہے؟

﴿یَا اَیُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا اُنزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَبِّکَ وَاِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللّٰهُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ اِنَّ اللّٰهَ لَایَهْدِی الْقَوْمَ الْکَافِرِینَ﴾(۱)

"اے پیغمبر! آپ اس حکم کو پہنچا دیں جو آپ کے پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے، اور اگر یہ نہ کیا تو گویا اس کے پیغام کو نہیں پہنچایا اور خدا آپ کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا"۔

اہل سنت کی متعدد کتابوں نیز تفسیر و حدیث اور تاریخ کی (تمام شیعہ مشہور کتابوں میں) بیان ہوا ہے کہ مذکورہ آیت حضرت علی علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی ہے۔

اس حدیث کو بہت سے اصحاب نے نقل کیا ہے، منجملہ "ابوسعید خدری"، "زید بن ارقم"، "جابر بن عبد اللہ انصاری"، "ابن عباس"، "براء بن عازب"، "حذیفہ"، "ابوہریرہ"، "ابن مسعود" اور "عامر بن لیلی"، اور ان تمام روایات میں بیان ہوا ہے کہ یہ آیت واقعہ غدیر سے متعلق ہے اور حضرت علی علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان میں سے بعض روایات متعدد طریقوں سے نقل ہوئی ہیں، منجملہ

---

(۱) سورہ مائدہ، آیت ۶۷

حدیث ابوسعید خدری ۱۱ طریقوں سے۔

حدیث ابن عباس بھی ۱۱ طریقوں سے۔

اور حدیث براء بن عازب تین طریقوں سے نقل ہوئی ہے۔

جن افراد نے ان احادیث کو (مختصر یا تفصیلی طور پر) اپنی اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے ان کے اسما درج ذیل ہیں

حافظ ابونعیم اصفہانی نے اپنی کتاب "ما نزل من القرآن فی علیؑ" میں (الخصائص سے نقل کیا ہے، صفحہ ۲۹)

ابوالحسن واحدی نیشاپوری "اسباب النزول" صفحہ ۱۵۰۔

ابن عساکر شافعی (الدرالمنثور سے نقل کیا ہے، جلد دوم، صفحہ ۲۹۸)

فخر الدین رازی نے اپنی "تفسیر کبیر"، جلد ۳، صفحہ ۶۳۶۔

ابو اسحاق حموینی نے "فرائد السمطین" (خطی)

ابن صباغ مالکی نے "فصول المہمہ" صفحہ ۲۷۔

جلال الدین سیوطی نے اپنی تفسیر الدرالمنثور، جلد ۲، صفحہ ۲۹۸۔

قاضی شوکانی نے "فتح القدیر"، جلد سوم صفحہ ۵۷۔

شہاب الدین آلوسی شافعی نے "روح المعانی"، جلد ۶، صفحہ ۱۷۲۔

شیخ سلیمان قندوزی حنفی نے اپنی کتاب "ینابیع المودة" صفحہ ۱۲۰۔

بدر الدین حنفی نے "عمدة القاری فی شرح صحیح البخاری"، جلد ۸، صفحہ ۵۸۴۔

شیخ محمد عبدہ مصری "تفسیر المنار"، جلد ۶، صفحہ ۴۶۳۔

حافظ بن مردویہ (متوفی ۴۱۸ھ) (الدرالمنثور سیوطی سے نقل کیا ہے) اور ان کے علاوہ بہت سے دیگر علما نے اس حدیث کو بیان کیا ہے۔

البتہ اس بات کو نہیں بھولنا چاہئے کہ بہت سے مذکورہ علماء نے حالانکہ شان نزول کی روایت کو نقل کیا ہے لیکن بعض وجوہات کی بناپر (جیسا کہ بعد میں اشارہ ہوگا) سرسری طور سے گزر گئے ہیں یا ان پر تنقید کی ہے، ہم ان کے بارے میں آئندہ بحث میں مکمل طور پر تحقیق وتنقید کریں گے۔ (انشاء اللہ)

واقعۂ غدیر

مذکورہ بحث سے یہ بات اجمالاً معلوم ہوجاتی ہے کہ یہ آیہ شریفہ بے شمار شواہد کی بناپر امام علی علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی ہے، اور اس سلسلہ میں (شیعہ کتابوں کے علاوہ) خود اہل سنت کی مشہور کتابوں میں وارد ہونے والی روایت اتنی زیادہ ہیں کہ کوئی بھی ان کا انکار نہیں کر سکتا۔

ان مذکورہ روایت کے علاوہ بھی متعدد روایت ہیں جن میں وضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ یہ آیت غدیر خم میں اس وقت نازل ہوئی کہ جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خطبہ دیا اور حضرت علی علیہ السلام کو اپنا وصی وخلیفہ بنایا، ان کی تعداد گزشتہ روایت کی تعداد سے کہیں زیادہ ہے، یہاں تک محقق بزرگوار علامہ امینیؒ نے کتاب ''الغدیر'' میں ۱۱۰ اصحاب پیغمبر سے زندہ اسناد اور مدارک کے ساتھ نقل کیا ہے، اسی طرح ۸۴ تابعین اور مشہور ومعروف ۳۶۰ علماء ودانشوروں سے اس حدیث کو نقل کیا ہے۔

اگر کوئی خالی الذہن انسان ان اسناد ومدارک پر ایک نظر ڈالے تو اس کو یقین ہوجائے گا کہ حدیث غدیر یقیناً متواتر احادیث میں سے ہے بلکہ متواتر احادیث کا بہترین مصداق ہے، درحقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ان احادیث کے تواتر میں شک کرے تو پھر اس کی نظر میں کوئی بھی حدیث متواتر نہیں ہوسکتی۔

ہم یہاں اس حدیث کے بارے میں بحث مفصل طور پر بحث نہیں کر سکتے، حدیث کی سند

اور آیت کی شان نزول کے سلسلہ میں اسی مقدار پر اکتفاء کرتے ہیں، اور اب حدیث کے معنی کی بحث کرتے ہیں، جو حضرات حدیث غدیر کی سند کے سلسلہ میں مزید مطالعہ کرنا چاہتے ہیں وہ درج ذیل کتابوں میں رجوع کرسکتے ہیں:

۔عظیم الشان کتاب الغدیر جلد اول تالیف علامہ امینی علیہ الرحمہ۔

۲۔ احقاق الحق، تالیف، علامہ بزرگوار قاضی نور اللہ شوستری، مفصل شرح کے ساتھ آیت اللہ نجفی، دوسری جلد، تیسری جلد، چودھویں جلد، اور بیسویں جلد۔

۳۔ المراجعات، تالیف، مرحوم سید شرف الدین عاملی۔

۴۔عبقات الانوار، تالیف عالم بزرگوار میر سید حامد حسین ہندی (لکھنوی)۔

۵۔ دلائل الصدق، جلد دوم، تالیف، عالم بزرگوار مرحوم مظفر۔

حدیث غدیر کا مضمون

ہم یہاں تمام روایات کے پیش نظر واقعہ غدیر کا خلاصہ بیان کرتے ہیں، (البتہ یہ عرض کردیا جائے کہ بعض روایات میں یہ واقعہ تفصیلی اور بعض میں مختصر طور پر بیان ہوا ہے، بعض میں واقعہ کے ایک پہلو اور بعض میں کسی دوسرے پہلو کی طرف اشارہ ہوا ہے، چنانچہ ان تمام روایات کا خلاصہ یہ ہے:)

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کا آخری سال تھا "حجة الوداع" کے مراسم جس قدر باوقار اور باعظمت ہوسکتے تھے وہ پیغمبر اکرمؐ کی ہمراہی میں اختتام پذیر ہوئے، سب کے دل روحانیت سے سرشار تھے ابھی ان کی روح اس عظیم عبادت کی معنوی لذت کا ذائقہ محسوس کررہی تھی۔ اصحاب پیغمبرؐ کی کثیر تعداد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اعمال حج انجام دینے کی عظیم سعادت پر بہت زیادہ خوش نظر آرہے تھے۔(۱)

(۱) پیغمبر کے ساتھیوں کی تعداد بعض کے نزدیک ۹۰ ہزار اور بعض کے نزدیک ایک لاکھ بارہ ہزار اور بعض کے نزدیک ایک لاکھ بیس ہزار اور بعض کے نزدیک ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے

نہ صرف مدینہ کے لوگ اس سفر میں پیغمبرؐ کے ساتھ تھے بلکہ جزیرہ نمائے عرب کے دیگر مختلف حصوں کے مسلمان بھی یہ عظیم تاریخی اعزاز و افتخار حاصل کرنے کے لئے آپؐ کے ہمراہ تھے۔

سرزمین حجاز کا سورج در و دیوار اور پہاڑوں پر آگ برسا رہا تھا لیکن اس سفر کی بے نظیر روحانی حلاوت نے تمام تکلیفوں کو آسان بنا رہا تھا۔ زوال کا وقت نزدیک تھا، آہستہ آہستہ "جحفہ" کی سرزمین اور اس کے بعد خشک اور جلنے والے "غدیر خم" کا بیابان نظر آنے لگا۔

دراصل یہاں ایک چوراہا ہے جو حجاز کے لوگوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے، شمالی راستہ مدینہ کی طرف دوسرا مشرقی راستہ عراق کی طرف، تیسرا مغربی ممالک اور مصر کی طرف اور چوتھا جنوبی راستہ سرزمین یمن کو جاتا ہے یہی وہ مقام ہے جہاں آخری اور اس عظیم سفر کا اہم ترین مقصد انجام دیا جانا تھا اور پیغمبر مسلمانوں کے سامنے اپنی آخری اور اہم ذمہ داری کی بنا پر آخری حکم پہنچانا چاہتے تھے۔

جمعرات کا دن تھا اور ہجرت کا دسواں سال، آٹھ دن عید قربان کو گزرے تھے کہ اچانک پیغمبر کی طرف سے سب کو ٹھہرنے کا حکم دیا گیا، مسلمانوں نے بلند آواز سے قافلہ سے آگے چلے جانے والے لوگوں کو واپس بلایا اور اتنی دیر تک رکے رہے کہ پیچھے آنے والے لوگ بھی پہنچ گئے۔ آفتاب خط نصف النہار سے گزر گیا تو پیغمبرؐ کے مؤذن نے "اللہ اکبر" کی صدا کے ساتھ لوگوں کو نماز ظہر پڑھنے کی دعوت دی، مسلمان جلدی جلدی نماز پڑھنے کے لئے تیار ہو گئے، لیکن فضا اتنی گرم تھی کہ بعض لوگ اپنی عبا کا کچھ حصہ پاؤں کے نیچے اور باقی حصہ سر پر رکھنے کے لئے مجبور تھے ورنہ بیابان کی گرم ریت اور سورج کی شعاعیں ان کے سر اور پاؤں کو تکلیف دے رہی تھیں۔

اس صحرا میں کوئی سایہ نظر نہیں آتا تھا اور نہ ہی کوئی سبزہ یا گھاس صرف چند خشک جنگلی درخت تھے جو گرمی کا سختی کے ساتھ مقابلہ کر رہے تھے کچھ لوگ انہی چند درختوں کا سہارا لئے ہوئے تھے، انہوں نے ان برہنہ درختوں پر ایک کپڑا ڈال رکھا تھا اور پیغمبرؐ کے لئے ایک سائبان بنا رکھا تھا لیکن

سورج کی جلا دینے والی گرم ہوا اس سائبان کے نیچے سے گزر رہی تھی، بہرحال ظہر کی نماز ادا کی گئی۔

مسلمان نماز کے بعد فوراً اپنے چھوٹے چھوٹے خیموں میں جا کر پناہ لینے کی فکر میں تھے لیکن رسول اللہؐ نے انہیں آگاہ کیا کہ وہ سب کے سب خداوندتعالیٰ کا ایک نیا پیغام سننے کے لئے تیار ہو جائیں جسے ایک مفصل خطبہ کے ساتھ بیان کیا جائے گا۔

جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دور تھے وہ اس عظیم اجتماع میں پیغمبرؐ کا ملکوتی اور نورانی چہرہ دیکھ نہیں پا رہے تھے لہٰذا اونٹوں کے پالانوں کا منبر بنایا گیا، پیغمبرؐ اس پر تشریف لے گئے، پہلے پروردگار عالم کی حمد و ثنا بجا لائے اور خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے یوں خطاب فرمایا: میں عنقریب خداوندمتعال کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے تمہارے درمیان سے جانے والا ہوں، میں بھی جوابدہ ہوں اور تم لوگ بھی جوابدہ ہو، تم میرے بارے میں کیا کہتے ہو؟ سب لوگوں نے بلند آواز میں کہا

"نَشْهَدُ اَنَّکَ قَدْ بَلَّغْتَ وَ نَصَحْتَ وَ جَاهَدْتَ فَجَزَاکَ اللّٰهُ خَیْراً"

"ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپؐ نے فریضۂ رسالت انجام دیا اور خیر خواہی کی ذمہ داری کو انجام دیا اور ہماری ہدایت کی راہ میں سعی و کوشش کی، خدا آپ کو جزائے خیر دے"۔

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا: کیا تم لوگ خدا کی وحدانیت، میری رسالت اور روز قیامت کی حقانیت اور اس دن مردوں کے قبروں سے مبعوث ہونے کی گواہی نہیں دیتے؟

سب نے کہا: کیوں نہیں، ہم سب گواہی دیتے ہیں۔

آپؐ نے فرمایا: خدایا! گواہ رہنا۔

آپؐ نے مزید فرمایا: اے لوگو! کیا تم میری آواز سن رہے ہو؟

انہوں نے کہا: جی ہاں۔

اس کے بعد سارے بیابان پر سکوت کا عالم طاری ہو گیا، سوائے ہوا کی سنسناہٹ کے کوئی

چیز سنائی نہیں دیتی تھی، پیغمبرؐ نے فرمایا دیکھو! میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں بطور یادگار چھوڑے جا رہا ہوں تم ان کے ساتھ کیا سلوک کرو گے؟

حاضرین میں سے ایک شخص نے پکار کر کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہ دو گرانقدر چیزیں کونسی ہیں؟

تو پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا پہلی چیز تو اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے جو ثقل اکبر ہے، اس کا ایک سرا پروردگار عالم کے ہاتھ میں ہے اور دوسرا سرا تمہارے ہاتھ میں ہے، اس سے ہاتھ نہ ہٹانا ورنہ تم گمراہ ہو جاؤ گے، دوسری گرانقدر یادگار میرے اہل بیت علیہم السلام ہیں اور مجھے خدائے لطیف وخبیر نے خبر دی ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ بہشت میں مجھ سے آملیں گے۔

ان دونوں سے آگے بڑھنے (اور ان سے تجاوز کرنے) کی کوشش نہ کرنا اور نہ ہی ان سے پیچھے رہنا کہ اس صورت میں بھی تم ہلاک ہو جاؤ گے۔

اچانک لوگوں نے دیکھا کہ رسول اللہؐ اپنے اردگرد نگاہیں دوڑا رہے ہیں گویا کسی کو تلاش کر رہے ہیں جونہی آپ کی نظر حضرت علی علیہ السلام پر پڑی فوراً ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور انہیں اتنا بلند کیا کہ دونوں کی بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگی اور سب لوگوں نے انہیں دیکھ کر پہچان لیا کہ یہ تو اسلام کا وہی سپہ سالار ہے کہ جس نے کبھی شکست کا منہ نہیں دیکھا۔

اس موقع پر پیغمبرؐ کی آواز زیادہ نمایاں اور بلند ہو گئی اور آپؐ نے ارشاد فرمایا

"أيُّها النَّاس مَنْ أولى النَّاس بِالمُؤمِنِيْن مِنْ أنْفُسِهِم "

اے لوگو! بتاؤ وہ کون ہے جو تمام لوگوں کی نسبت مومنین پر خود ان سے زیادہ اولویت رکھتا ہے؟ اس پر سب حاضرین نے بیک آواز جواب دیا کہ خدا اور اس کا پیغمبرؐ بہتر جانتے ہیں۔

تو پیغمبرؐ نے فرمایا خدا میرا مولا اور رہبر ہے اور میں مومنین کا مولا اور رہبر ہوں اور میں ان کی نسبت خود ان سے زیادہ حق رکھتا ہوں (اور میرا ارادہ ان کے ارادے پر مقدم ہے)۔

اس کے بعد فرمایا:

"فَمَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا عَلِيٌّ مَوْلَاهُ"۔

"یعنی جس کا میں مولا ہوں علیؑ بھی اس کے مولا و رہبر ہیں"۔

پیغمبر اکرمؐ نے اس جملے کی تین مرتبہ تکرار کی، و بعض راویوں کے قول کے مطابق پیغمبرؐ نے یہ جملہ چار مرتبہ دہرایا و اس کے بعد آسمان کی طرف سر بلند کر کے بارگاہ خداوندی میں عرض کی

"اَللّٰهُمَّ وَالِ مَنْ وَالَاهُ وَعَادِ مَنْ عَادَاهُ وَاَحِبَّ مَنْ اَحَبَّهُ وَ اَبْغِضْ مَنْ اَبْغَضَهُ وَ انْصُرْ مَنْ نَصَرَهُ وَاخْذُلْ مَنْ خَذَلَهُ، وَاَدِرِ الْحَقَّ مَعَهُ حَيْثُ دَارَ"

یعنی بار الٰہا! جو اس کو دوست رکھے تو اس کو دوست رکھ اور جو اس سے دشمنی رکھے تو اس سے دشمنی رکھ، جو اس سے محبت کرے تو اس سے محبت کر اور جو اس سے بغض رکھے تو اس سے بغض رکھ، جو اس کی مدد کرے تو اس کی مدد کر، جو اس کی مدد سے کنارہ کشی کرے تو اسے اپنی مدد سے محروم رکھ اور حق کو ادھر موڑ دے جدھر وہ رخ کرے۔

اس کے بعد فرمایا:

"اَلَا فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ"

"تمام حاضرین آگاہ ہو جائیں کہ یہ سب کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس بات کو ان لوگوں تک پہنچائیں جو یہاں پر اس وقت موجود نہیں ہیں"۔

پیغمبرؐ کا خطبہ ختم ہو گیا پیغمبرؐ پسینے میں شرابور تھے حضرت علی علیہ السلام بھی پسینہ میں غرق تھے، دوسرے تمام حاضرین کے بھی سر سے پاؤں تک پسینہ بہہ رہا تھا۔

ابھی اس جمعیت کی صفیں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوئی تھیں کہ جبرئیل امین وحی لے کر نازل ہوئے اور پیغمبرؐ کو ان الفاظ میں تکمیل دین کی بشارت دی

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي﴾(۱)

"آج کے دن ہم نے تمہارے لئے تمہارے دین اور آئین کو کامل کر دیا اور اپنی نعمت کو تم پر تمام کر دیا"۔

اتمام نعمت کا پیغام سن کر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا

"اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ عَلٰى اِكْمَالِ الدِّيْنِ وَاِتْمَامِ النِّعْمَةِ وَرِضَى الرَّبِّ بِرِسَالَتِي وَالْوِلَايَةِ لِعَلِيٍّ مِنْ بَعْدِي"

"ہر طرح کی بزرگی و بڑائی خدا ہی کے لئے ہے کہ جس نے اپنے دین کو کامل فرمایا اور اپنی نعمت کو ہم پر تمام کیا اور میری نبوت و رسالت اور میرے بعد علیؑ کی ولایت کے لئے خوش ہوا۔"

پیغمبر کی زبان مبارک سے امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہما السلام کی ولایت کا اعلان سن کر حاضرین میں مبارکباد کا شور بلند ہوا لوگ بڑھ چڑھ کر اس عظیم منصب پر حضرت علیؑ کو اپنی طرف سے مبارکباد پیش کرنے لگے چنانچہ معروف شخصیتوں میں سے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی طرف سے مبارکباد کے یہ الفاظ تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں کہ انہوں نے کہا

"بَخٍ بَخٍ لَكَ يَا ابْنَ اَبِي طَالِبٍ اَصْبَحْتَ وَاَمْسَيْتَ مَوْلَايَ وَمَوْلَا كُلِّ مُؤْمِنٍ وَمُؤْمِنَةٍ"

"مبارک ہو مبارک! اے فرزند ابو طالب کہ آپ میرے اور تمام صاحبان ایمان مردوں اور عورتوں کے مولا اور رہبر ہو گئے"۔

اس وقت ابن عباس نے کہا بخدا یہ عہد و پیمان سب کی گردنوں میں باقی رہے گا۔

اس موقع پر مشہور شاعر حسان بن ثابت نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اجازت طلب کی کہ اس

(۱) سورۂ مائدہ، آیت ۳

موقع کی مناسبت سے کچھ شعر کہوں، چنانچہ انھوں نے یہ مشہور ومعروف اشعار پڑھے:

يُنَادِيْهِمْ يَوْمَ الْغَدِيْرِ نَبِيُّهُمْ ... بِخُمٍّ وَأَسْمِعْ بِالرَّسُوْلِ مُنَادِياً
فَقَالَ فَمَنْ مَوْلَاكُمْ وَنَبِيُّكُمْ؟ ... فَقَالُوا وَلَمْ يَبْدُو هُنَاكَ التَّعَامِيَا
إِلٰهُكَ مَوْلَانَا وَأَنْتَ نَبِيُّنَا ... وَلَمْ تَلْقَ مِنَّا فِي الْوَلَايَةِ عَاصِياً
فَقَالَ لَهُ قُمْ يَا عَلِيُّ فَإِنَّنِي ... رَضِيْتُكَ مِنْ بَعْدِي إِمَاماً وَ هَادِياً
فَمَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا وَلِيُّهُ ... فَكُوْنُوا لَهُ اَتْبَاعَ صِدْقٍ مَوَالِياً
هُنَاكَ دَعَا اَللّٰهُمَّ وَالِ وَلِيَّهُ ... وَكُنْ لِلَّذِي لَهُ اَتْبَاعَ عَلِيًّا مُعَادِياً(۱)

یعنی ''پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم روز غدیر خم یہ اعلان کر رہے تھے اور وہ واقعا کس قدر عظیم اعلان تھا۔

فرمایا تمہارا مولا اور نبی کون ہے؟ تو مسلمانوں نے صاف صاف کہا

''خداوند عالم ہمارا مولا ہے اور آپ ہمارے نبی ہیں، ہم آپ کی ولایت کے حکم کی مخالفت نہیں کریں گے۔

اس وقت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا یا علی اٹھو، کیونکہ میں نے تم کو اپنے بعد امام اور ہادی مقرر کیا ہے۔

اس کے بعد فرمایا: جس کا میں مولا وآقا ہوں اس کے یہ علی مولا اور رہبر ہیں، لہٰذا تم سچے دل سے اس کی اطاعت وپیروی کرنا۔

اس وقت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا پالنے والے! اس کے دوست کو دوست رکھ! اور اس کے دشمن کو دشمن۔

(۱) ان اشعار کو اہل سنت کے بڑے بڑے علماء نے نقل کیا ہے، جس میں سے حافظ ''ابو نعیم اصفہانی، حافظ ابو سعید سجستانی''، ''خوارزمی مالکی''، حافظ ''ابو عبد اللہ مرزبانی''، ''گنجی شافعی''، ''جلال الدین سیوطی''، ''سبط ابن جوزی'' اور ''صدر الدین حموی'' کا نام لیا جا سکتا ہے

قارئین کرام! یہ تھا اہل سنت اور شیعہ علما کی کتابوں میں بیان ہونے والی مشہور و معروف حدیث غدیر کا خلاصہ۔

آیہ بلغ کے سلسلہ میں ایک نئی تحقیق

اگر ہم مذکورہ آیت کی شان نزول کے بارے میں بیان ہونے والی احادیث اور واقعہ غدیر سے متعلق تمام روایت سے قطع نظر کریں اور صرف اور صرف خود آیہ بلغ اور اس کے بعد والی آیتوں پر غور کریں تو ان آیت سے امامت اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خلافت کا مسئلہ واضح و روشن ہو جائے گا۔

کیونکہ مذکورہ آیت میں بیان ہونے والے مختلف الفاظ اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اس مسئلہ کی تین اہم خصوصیت ہیں

۱۔ اسلامی نقطہ نظر سے اس مسئلہ کی ایک خاص اہمیت ہے، کیونکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ اس پیغام کو پہنچادو، اور اگر اس کام کو انجام نہ دیا تو گویا اپنے پروردگار کی رسالت کو نہیں پہنچایا! دوسرے الفاظ میں یوں کہیں کہ ولایت کا مسئلہ نبوت کی طرح تھا، کہ اگر اس کو انجام نہ دیا تو پیغمبر اکرم کی رسالت ناتمام رہ جاتی ہے ﴿وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ﴾

واضح رہے کہ اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ یہ خدا کا کوئی معمولی حکم تھا، اور اگر خدا کے کسی حکم کو نہ پہنچایا جائے تو رسالت خطرہ میں پڑ جاتی ہے، کیونکہ یہ بات بالکل واضح ہے اور اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے، حالانکہ آیت کا ظاہر یہ ہے کہ یہ مسئلہ ایک خاص اہمیت کا حامل ہے جو رسالت و نبوت سے خاص ربط رکھتا ہے۔

۲۔ یہ مسئلہ اسلامی تعلیمات جیسے نماز، روزہ، حج، جہاد اور زکوٰۃ وغیرہ سے متعلق نہیں تھا کیونکہ یہ آیت سورہ مائدہ کی ہے، اور ہم جانتے ہیں کہ یہ سورہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سب سے آخر میں نازل ہوا ہے، (یا آخری سوروں میں سے ہے) یعنی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر بابرکت کے آخری دنوں

میں یہ سورہ نازل ہوا ہے جس وقت اسلام کے تمام اہم ارکان بیان ہو چکے تھے۔(۱)

۳۔آیت کے الفاظ اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ یہ مسئلہ ایک ایسا عظیم تھا جس کے مقابلہ میں بعض لوگ سخت قدم اٹھانے والے تھے، یہاں تک کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی جان کو بھی خطرہ تھا، اسی وجہ سے خداوندعالم نے اپنی خاص حمایت کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا ﴿وَاللهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ ''اور خداوندعالم تم کو لوگوں کے (احتمالی) خطرے سے محفوظ رکھے گا''۔

آیت کے آخر میں اس بات کی تاکید کی گئی ہے ''خداوندعالم کافروں کی ہدایت نہیں فرماتا'' ﴿إِنَّ اللهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ﴾

آیت کا یہ حصہ خود اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ بعض مخالف آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے خلاف کوئی منفی قدم اٹھانے والے تھے۔

ہماری مذکورہ باتوں سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اس آیت کا مقصد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی جانشینی اور خلافت کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔

جی ہاں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی آخری عمر میں صرف یہی چیز مورد بحث واقع ہو سکتی ہے نہ کہ اسلام کے دوسرے ارکان، کیونکہ دوسرے ارکان تو اس وقت تک بیان ہو چکے تھے، صرف یہی مسئلہ رسالت کے ہم وزن ہو سکتا ہے، اور اسی مسئلہ پر بہت سی مخالفت ہو سکتی تھی اور اسی خلافت کے مسئلہ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی جان کو خطرہ ہو سکتا تھا۔

---

(۱) فخر رازی اس آیت کے ذیل میں تحریر کرتے ہیں: بہت سے علماء (محدثین و مورخین) نے لکھا ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم صرف ۸۱ روز یا ۸۲ روز زندہ رہے۔ (تفسیر کبیر، جلد ، صفحہ ۳۹) تفسیر المنار اور بعض دیگر کتابوں میں یہ بھی تحریر ہے کہ پورا سورہ مائدہ حجۃ الوداع کے موقع پر نازل ہوا ہے۔ (المنار، جلد ۶، صفحہ ۱۱۶) ، بعض مؤلفین نے مذکورہ روزوں کی تعداد کم لکھی ہے۔

اگر مذکورہ آیت کے لئے ولایت، امامت و رخلافت کے علاوہ کوئی دوسری تفسیر کی جائے تو وہ آیت سے ہم آہنگ نہ ہوگی۔

آپ حضرات ان تمام مفسرین کی باتوں کو دیکھیں جنھوں نے اس مسئلہ کو چھوڑ کر دوسری تاویلیں کی ہیں، ان کی تفسیر آیت سے بیگانہ دکھائی دیتی ہیں، حقیقت تو یہ ہے کہ یہ لوگ آیت کی تفسیر نہیں کر پائے ہیں۔

توضیحات

ا۔حدیث غدیر میں مولیٰ کے معنی

جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے کہ حدیث غدیر "فمن کنت مولاہ فعليٌّ مولاہ" تمام شیعہ ور سنی کتابوں میں نقل ہوئی ہے، اس سے بہت سے حقائق روشن ہو جاتے ہیں۔

اگرچہ بہت سے اہل سنت مولفین نے یہ بات باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ "مولی" کے معنی "ناصر یا دوست" کے ہیں، کیونکہ مولی کے مشہور معنی میں سے یہ بھی ہیں، ہم بھی اس بات کو مانتے ہیں کہ "مولیٰ" کے معنی دوست ورناصر ومددگار کے ہیں، لیکن یہاں پر بہت سے قرائن وشواہد ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے مذکورہ حدیث میں "مولیٰ" کے معنی "ولی، سرپرست ور رہبر" کے ہیں، ہم یہاں پر ان قرائن وشواہد کو مختصر طور پر بیان کرتے ہیں:

ا۔حضرت علی علیہ السلام سے تمام مومنین کی دوستی کوئی مخفی اور پیچیدہ چیز نہ تھی کہ جس کے لئے اس قدر تاکید اور بیان کی ضرورت ہوتی، اور اس بات کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ اس بے آب وگیاہ اور جلتے ہوئے بیابان میں اس عظیم قافلہ کو دوپہر کی دھوپ میں روک کر ایک طویل ومفصل خطبہ دیا جائے ورسب لوگوں سے اس دوستی کا اقرار لیا جائے۔

قرآن مجید نے پہلے ہی وضاحت کے ساتھ یہ اعلان فرمایا ہے: ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ

اِخوۃ﴾(۱)"مومنین آپس میں ایک دوسرے کے بھائی ہیں"

ایک دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے ﴿وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ﴾(۲)"مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے ولی اور مددگار ہیں"۔

خلاصہ یہ کہ اسلامی اخوت اور مسلمانوں کی ایک دوسرے سے دوستی اسلام کے سب سے واضح مسائل میں سے ہے جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے زمانہ سے چلی آرہی ہے، اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اس بات کو بارہا بیان فرمایا اور اس سلسلہ میں تاکید فرمائی ہے، اور یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں تھا جس سے آیت کا سیاق و لہجہ اس قدر شدید ہو جاتا، اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اس راز کے فاش ہونے سے کوئی خطرہ محسوس کرتے۔ (غور کیجئے)

۲۔"أَلَسْتُ اَوْلٰى بِكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ"(کیا میں تم لوگوں پر تمہارے نفسوں سے زیادہ اولیٰ اور سزاوار نہیں ہوں؟) حدیث کا یہ جملہ بہت سی کتابوں میں بیان ہوا ہے جو ایک عام دوستی کو بیان کرنے کے لئے بے معنی ہے، بلکہ اس جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح مجھے تم پر ولایت و اختیار حاصل ہے اور جس طرح میں تمہارا رہبر اور سرپرست ہوں بالکل اسی طرح علی علیہ السلام کے لئے بھی ثابت ہے، اور ہمارے عرض کئے ہوئے اس جملے کے معنی کے علاوہ دوسرے معنی انصاف اور حقیقت سے دور ہیں، خصوصاً "من انفسکم" کے پیش نظر جس میں تمہاری نسبت تم سے اولیٰ ہوں۔

۳۔اس تاریخی واقعہ پر تمام لوگوں کی طرف سے خصوصاً حضرت "عمر" اور حضرت "ابوبکر" کا امام علی علیہ السلام کی خدمت میں مبارکباد پیش کرنا اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ یہ مسئلہ صرف خلافت کا مسئلہ تھا، جس کی وجہ سے تبریک و تہنیت پیش کی جارہی تھی، کیونکہ حضرت علی علیہ السلام سے دوستی کا مسئلہ تو سب کو معلوم تھا اس کے لئے تبریک کی کیا ضرورت تھی؟!!

---

(۱) سورۂ حجرات، آیت ۱۰ (۲) سورۂ توبہ، آیت ۷۱

مسند احمد میں بیان ہوا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اعلان کے بعد حضرت عمر نے حضرت علی علیہ السلام کو ان الفاظ میں مبارک باد دی:

"هنيئاً يا بن أبي طالب أصبحت وأمسيت مولى كُلّ مؤمن و مؤمنة"(۱)

"مبارک ہو مبارک! اے ابوطالب کے بیٹے! آج سے تم ہر مومن اور مومنہ کے مولا بن گئے"۔

علامہ فخر الدین رازی نے ﴿يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ﴾ کے ذیل میں تحریر کیا ہے کہ حضرت عمر نے کہا: "هنيئاً يا بن أبي طالب أصبحت وأمسيت مولى كُلّ مؤمن و مؤمنة" جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کو خود حضرت عمر اپنا اور ہر مومن و مومنہ کا مولا سمجھتے تھے۔

تاریخ بغداد میں روایت کے الفاظ یہ ہیں: "بخ بخ لك يا بن أبي طالب أصبحت وأمسيت مولاي و مولا كُلّ مسلم"(۲) "اے ابوطالب کے بیٹے مبارک ہو مبارک! آپ آج سے میرے اور ہر مسلمان کے مولا ہو گئے"۔

فیض القدیر اور صواعق محرقہ دونوں کتابوں میں نقل ہوا ہے کہ حضرت ابوبکر اور عمر دونوں نے حضرت علی علیہ السلام سے کہا: "وأمسيت يابن أبي طالب مولى كُلّ مؤمن و مؤمنة"

یہ بات واضح ہے کہ ایک عام دوستی تو سبھی مومنین کے درمیان پائی جاتی تھی، تو پھر اتنا اہتمام کیسا؟! لہٰذا معلوم یہ ہوا کہ یہ اس وقت صحیح ہے جب مولیٰ کے معنی صرف اور صرف حاکم و خلیفہ ہوں۔

---

(۱) مسند احمد، جلد۴، صفحہ ۲۸۱، (فضائل الخمسہ، جلد اول، صفحہ ۴۳۲ کی نقل کے مطابق)

(۲) تاریخ بغداد، جلد ۸، صفحہ ۲۹۰

۳۔ حسان بن ثابت کے مذکورہ اشعار بھی اس بات پر بہترین گواہ ہیں کہ جن میں بلند مضامین اور واضح الفاظ میں خلافت کے مسئلہ کو بیان کیا گیا ہے، جن کی بنا پر مسئلہ کافی واضح ہے (آپ حضرات ان اشعار کو ایک مرتبہ پھر پڑھ کر دیکھیں)

۴۔ قرآن کی آیات واقعہ غدیر کی تائید کرتی ہیں

بہت سے مفسرین اور راویوں نے سورہ معارج کی ابتدائی چند آیت ﴿سَأَلَ سَائِلٌ بِعَذَابٍ وَاقِعٍ ☆ لِلْكَافِرِينَ لَيْسَ لَهُ دَافِعٌ ☆ مِنَ اللّٰهِ ذِي الْمَعَارِجِ﴾ (ایک سائل نے واقع ہونے والے عذاب کا سوال کیا جس کا کافروں کے حق میں کوئی دفع کرنے والا نہیں ہے، یہ بلندیوں والے خدا کی طرف سے ہے،) کی شان نزول کو بیان کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

''پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کو غدیر خم میں خلافت پر منصوب کیا، اور ان کے بارے میں فرمایا ''مَن كُنتُ مَولاهُ فَهذا عَلِيٌّ مَولاه'' تھوڑی ہی دیر میں یہ خبر عام ہوگئی، نعمان بن حارث فہری (۱) (جو کہ منافقوں میں سے تھا) پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرتا ہے آپ نے ہمیں حکم دیا کہ خدا کی وحدانیت اور آپ کی رسالت کی گواہی دیں ہم نے گواہی دی، لیکن آپ اس پر بھی راضی نہ ہوئے یہاں تک کہ آپ نے (حضرت علی علیہ السلام کی طرف اشارہ کرکے کہا) اس جوان کو اپنی جانشینی پر منصوب کردیا اور کہا ''مَن كُنتُ مَولاهُ فَهذا عَلِيٌّ مَولاه'' کیا یہ کام اپنی طرف سے کیا ہے یا خدا کی طرف سے؟ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اس خدا کی قسم جس کے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے، یہ کام میں نے خدا کی طرف سے انجام دیا ہے''۔

نعمان بن حارث نے اپنا منھ پھیر لیا اور کہا خداوندا! اگر یہ کام حق ہے اور تیری طرف سے ہے تو مجھ پر آسمان سے پتھر برسا۔

---

(۱) بعض روایات میں ''حارث بن نعمان'' اور بعض روایت میں ''نضر بن حارث'' آیا ہے۔

اچانک آسمان سے ایک پتھر آیا اور اس کے سر پر لگا، جس سے وہ وہیں ہلاک ہو گیا، اس موقع پر آیہ ﴿سَأَلَ سَائِلٌ بِعَذَابٍ وَاقِعٍ﴾ نازل ہوئی۔

[قارئین کرام!] مذکورہ روایت کی طرح مجمع البیان میں بھی یہ روایت ابوالقاسم حسکانی سے نقل ہوئی ہے ( )، اور اسی مضمون کی روایت بہت سے اہل سنت مفسرین اور راویان حدیث نے مختصر سے اختلاف کے ساتھ نقل کی ہے، منجملہ قرطبی نے پنی مشہور تفسیر میں (۲) آلوسی نے اپنی تفسیر روح المعانی میں (۳)، ور بو اسحاق ثعلبی نے اپنی تفسیر میں۔ (۴)

علامہ امینی علیہ رحمہ نے کتاب الغدیر میں تیس علما اہل سنت سے (مع منابع) اس روایت کو نقل کیا ہے، جن میں سے، سیرۂ حلبی، فرائد السمطین حموینی، درر السمطین شیخ محمد زرندی، السراج المنیر شمس الدین شافعی، شرح جامع الصغیر سیوطی، تفسیر غریب القرآن حافظ ابو عبید ہروی، اور تفسیر شفاء الصدور ابو بکر نقاش موصلی، وغیرہ بھی ہیں۔ (۵)

(۱) مجمع البیان، جلد ۹و۱۰، صفحہ ۳۵۲

(۲) تفسیر قرطبی، جلد ۱۰، صفحہ ۶۷۵۷

(۳) تفسیر آلوسی، جلد ۲۹، صفحہ ۵۲

(۴) نور الابصار شبلنجی، صفحہ ۷۱ کے نقل کے مطابق۔

(۵) تفسیر پیام قرآن، جلد ۹، صفحہ ۱۸۱

۵۳۔ ولایت تکوینی اور تشریعی سے کیا مراد ہے؟

ہم جانتے ہیں کہ ولایت کی دو قسمیں ہیں

۱۔ ولایت تکوینی۔

۲۔ ولایت تشریعی۔

ولایت تشریعی سے مراد وہی اسلامی اور قانونی حاکمیت اور سرپرستی ہے، جو کبھی محدود پیمانہ پر ہوتی ہے جیسے چھوٹے بچے پر باپ اور دادا کی ولایت، اور کبھی وسیع پیمانہ پر ہوتی ہے جیسے حکومت اور اسلامی ملک کے نظم وضبط میں حاکم شرعی کی ولایت۔

لیکن تکوینی ولایت سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص خدا کے حکم اور اس کی اجازت سے اس عالم خلقت اور اس کائنات میں تصرف کرے، اور اس دنیا کے اسباب و وسائل کے برخلاف کوئی عجیب واقعہ کر دکھائے، مثلاً لا علاج بیمار کو خدا کے اذن سے اور اس کی عطا کردہ طاقت سے شفا دیدے، یا مردوں کو زندہ کردے، یا اسی طرح کے دوسرے امور کو انجام دے، نیز کائنات اور انسانوں پر غیر معمولی معنوی تصرف کرے۔

''ولایت تکوینی'' کی چار صورتیں ہوسکتی ہیں جن میں سے بعض قابل قبول اور بعض نا قابل قبول ہیں۔

۱۔ خلقت اور تخلیق کائنات میں ولایت یعنی خداوند عالم چاہے کسی بندہ یا فرشتہ کو اتنی طاقت دیدے کہ دوسرے جہانوں کو پیدا کرے یا ان کو صفحۂ ہستی سے مٹا دے، تو یقیناً یہ کوئی محال کام نہیں ہے، کیونکہ خداوند عالم ہر چیز پر قادر ہے، اور کسی کو بھی ایسی قدرت دے سکتا ہے، لیکن تمام قرآنی آیات اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ نظام خلقت خداوند عالم کے ہاتھ میں ہے، چاہے وہ زمین وآسمان کی خلقت ہو یا جن وانس، فرشتوں کی خلقت ہو یا نباتات وحیوانات، پہاڑ ہوں یا دریا، سب کے سب خدا کی قدرت سے پیدا ہوئے ہیں، کوئی بندہ یا فرشتہ، خلقت میں شریک نہیں ہے اسی وجہ سے تمام مقامات پر خلقت کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے، اور کسی بھی جگہ یہ نسبت (وسیع پیمانہ پر) غیر خدا کی طرف نہیں دی گئی، اس بنا پر زمین وآسمان اور حیوان وانسان کا خالق صرف اور صرف خدا ہے۔

۲۔ ولایت تکوینی "فیض پہنچانے میں واسطہ" کے معنی میں، یعنی خداوند عالم کی طرف سے اپنے بندوں یا دوسری مخلوقات تک پہنچنے والی امداد، رحمت، برکت اور قدرت انھیں اولیاء اللہ اور خاص بندوں کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے، جیسے شہر میں پانی پہنچانے والا ایک ہی اصلی پائپ ہوتا ہے یہ اصلی پائپ کے مرکز سے پانی لیتا ہے اور ان کو سب جگہ پہنچا دیتا ہے، اس کو "واسطۂ فیض" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

یہ معنی بھی عقلی لحاظ سے محال نہیں ہیں، جس کی مثال خود عالم صغیر یعنی انسان کا جسم ہے کیونکہ صرف دل کی شہ رگ ہی کے ذریعہ تمام رگوں تک خون پہنچتا ہے، تو پھر عالم کبیر (کائنات) میں بھی اس طرح ہونے میں کیا ممانعت ہے؟

لیکن اس کے اثبات کے لئے بے شک دلیل وبرہان کی ضرورت ہے اور اگر ثابت بھی ہوجائے تو بھی خداوند عالم کے اذن سے ہے۔

۳۔ ولایت تکوینی، معین حدود میں جیسے مردوں کو زندہ کرنا یا لاعلاج بیماروں کو شفا دینا وغیرہ۔

قرآن مجید میں اس ولایت کے نمونے بعض انبیاء علیہم السلام کے بارے میں ملتے ہیں، اور اسلامی روایات بھی اس پر شاہد اور گواہ ہیں، اس لحاظ سے ولایت تکوینی کی یہ قسم نہ صرف عقلی لحاظ سے ممکن ہے بلکہ بہت سے تاریخی شواہد بھی موجود ہیں۔

۴۔ ولایت بمعنی دعا، یعنی اپنی حاجتوں کو خدا کی بارگاہ میں پیش کرے اور اس سے طلب کرے کہ فلاں کام پورا ہو جائے، مثلاً پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا امام معصوم دعا کریں اور خدا سے طلب کی ہوئی دعا قبول ہو جائے۔

ولایت کی اس قسم میں بھی کوئی عقلی اور نقلی مشکل نہیں ہے، قرآنی آیات، اور روایات میں اس طرح کے بہت سے نمونے موجود ہیں، بلکہ شاید ایک لحاظ سے اس قسم پر ولایت تکوینی کا اطلاق کرنا مشکل ہو کیونکہ دعا کا قبول کرنا خود خداوند عالم کا کام ہے۔

بہت سی روایات میں "اسم اعظم" کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ انبیاء اور ائمہ معصومین علیہم السلام یا بعض اولیاء اللہ (انبیاء اور ائمہ کے علاوہ) کے پاس اسم اعظم کا علم تھا جس کی بنا پر وہ عالم تکوین میں تصرفات کرتے تھے۔

اس بات سے صرف نظر کرتے ہوئے کہ اسم اعظم کیا ہے، اس طرح کی روایات بھی ولایت تکوینی کی اسی قسم کی طرف اشارہ کرتی ہیں، اور مکمل طریقہ سے اس پر صادق آتی ہیں۔(۱)

(۱) تفسیر پیام قرآن، جلد۹، صفحہ۹۱

۵۴۔ بیعت کی حقیقت کیا ہے؟ نیز انتخاب اور بیعت میں کیا فرق ہے؟

"حقیقت بیعت" بیعت کرنے والے اور جس کی بیعت کی جارہی ہے دونوں کی طرف سے ایک معاہدہ ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ بیعت کرنے والا بیعت لینے والے کی اطاعت، پیروی، حمایت اور دفاع کرے گا، اور اس میں ذکر شدہ شرائط کے لحاظ سے بیعت کے مختلف درجے ہیں۔

قرآن کریم اور احادیث نبوی کے پیش نظر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بیعت، بیعت کرنے والے کی طرف سے ایک "عقد لازم"[1] ہے اور اس کے مطابق عمل کرنا واجب ہوتا ہے، لہٰذا وہ قانون عام ﴿أَوْفُوا بِالْعُقُودِ﴾ (سورہ مائدہ پہلی آیت) کے تحت قرار پاتا ہے، اس بنا پر بیعت کرنے والا اس کو فسخ نہیں کرسکتا، لیکن صاحب بیعت اگر مصلحت دیکھے تو اپنی طرف سے بیعت اٹھا سکتا ہے اور اس کو فسخ کرسکتا ہے، اس صورت میں بیعت کرنے والا اطاعت اور پیروی سے آزاد ہوجاتا ہے۔(۲)

---

[۱] اسلام میں دو طرح کے معاہدات ہوتے ہیں ایک ایسا معاہدہ جس کو فسخ کیا جا سکتا ہے اس کو "عقد جائز" کہا جاتا ہے، اور دوسرا وہ جس کو فسخ نہیں کیا جا سکتا، اس کو "عقد لازم" کہا جاتا ہے (مترجم)

(۲) ہم واقعہ کربلا میں پڑھتے ہیں کہ امام حسین علیہ السلام نے شب عاشور ایک خطبہ دیا اور اپنے اصحاب اور ناصروں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان سے اپنی بیعت کو اٹھا لیا اور کہا جہاں چاہو چلے جاؤ (لیکن اصحاب نے وفاداری کا ثبوت پیش کیا) امام علیہ السلام نے فرمایا "فانطلقوا فی حل لیس علیکم منی ذمام" (کامل ابن اثیر، جلد ۴، صفحہ ۵۷)

بعض لوگوں نے بیعت کو "انتخاب" [ووٹ یا الیکشن] کے مشابہ قرار دیا ہے حالانکہ انتخابات کا مسئلہ اس کے بالکل برعکس ہے۔یعنی انتخاب کے معنی یہ ہیں کہ انتخاب ہونے والے شخص کو ایک ذمہ داری اور عہدہ دیا جاتا ہے یا دوسرے الفاظ میں اس کو مختلف امور انجام دینے کے لئے وکیل بنایا جاتا ہے، اگرچہ انتخاب کرنے والے کی بھی کچھ ذمہ داریاں ہوتی ہیں (تمام وکالتوں کی طرح) جبکہ بیعت میں ایسا نہیں ہے۔

یا یوں کہئے کہ انتخاب کسی کو عہدہ یا منصب دینے کا نام ہے جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ وکیل بنانے کی طرح ہے، جبکہ بیعت "اطاعت کا عہد" کرنے کا نام ہے۔

اگرچہ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ دونوں بعض چیزوں میں ایک دوسرے کے مشابہ ہوں، لیکن اس مشابہت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ دونوں ایک ہیں، لہٰذا بیعت کرنے والا بیعت کو فسخ نہیں کرسکتا، حالانکہ انتخابات کے سلسلہ میں یہ ہوتا ہے کہ انتخاب کرنے والے اپنے عہدہ سے معزول کرسکتے ہیں۔(۱)

اب یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی نبی یا امام کی مشروعیت میں بیعت کا کوئی کردار ہے یا نہیں؟ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور ائمہ معصومین علیہم السلام چونکہ خداوندعالم کی طرف سے منصوب ہوتے ہیں لہٰذا ان کو کسی بھی بیعت کی ضرورت نہیں ہوتی ۔یعنی خداوندعالم کی طرف سے منصوب نبی یا امام معصوم علیہم السلام کی اطاعت خدا کی طرف سے واجب ہوتی ہے، چاہے کسی نے بیعت کی ہو یا بیعت نہ کی ہو۔

دوسرے الفاظ میں: مقام نبوت اور امامت کا لازمہ اطاعت کا واجب ہونا ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

---

(۱) تفسیر نمونہ، جلد ۲۲، صفحہ ۷۱۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ﴾(۱)

"اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو، رسول اور صاحبان امر کی اطاعت کرو جو تمہیں میں سے ہیں"۔

لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس طرح ہے تو پھر پیغمبر اکرم ﷺ نے اپنے اصحاب یا نئے مسلمان ہونے والے افراد سے بیعت کیوں لی؟ جس کے دو نمونے تو خود قرآن مجید میں موجود ہیں، (بیعت رضوان، جیسا کہ سورہ فتح، آیت نمبر ۸ میں اشارہ ملتا ہے، اور اہل مکہ سے بیعت لی جیسا کہ سورہ ممتحنہ میں اشارہ ہوا ہے)

اس سوال کے جواب میں ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ اس طرح کی بیعت ایک طرح سے وفاداری کے عہد و پیمان جیسی ہوتی ہے جو خاص موقع پر انجام پاتی ہے، خصوصاً بعض سخت مقامات اور حوادث میں اس سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے، تاکہ اس کی وجہ سے مختلف لوگوں میں ایک نئی روح پیدا ہو جائے۔

لیکن خلفاء کے سلسلہ میں لی جانے والی بیعت کا مطلب ان کی خلافت کا قبول کرنا ہوتا تھا، اگرچہ ہمارے عقیدہ کے مطابق خلافت رسول ﷺ کوئی ایسا منصب نہیں ہے کہ جس کو بیعت کے ذریعہ حل کیا جا سکتا ہو، بلکہ حقیقی خلیفہ خداوند عالم کی طرف سے پیغمبر اکرم ﷺ یا پہلے والے امام کے ذریعہ معین ہوتا ہے۔

اسی دلیل کی بنا پر جن لوگوں نے حضرت علی علیہ السلام یا امام حسن علیہ السلام یا امام حسین علیہ السلام سے بیعت کی ہے وہ بھی وفاداری کے اعلان اور پیغمبر اکرم ﷺ سے کی گئی بیعتوں کی طرح تھی۔

نہج البلاغہ کے بعض کلمات سے اچھی طرح یہ معلوم ہوتا ہے کہ بیعت صرف ایک بار ہوتی

(۱)سورہ نساء، آیت ۵۹

ہے، اس میں تجدید نظر نہیں کی جا سکتی، جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں

"لِأَنَّها بیعةٌ واحدةٌ، لا یُثنی فیها النَّظر ولا یستأنف فیها الخیار، الخارجُ منها طاعن، والمروّي فیها مداهن" (۱)

"چونکہ یہ بیعت ایک مرتبہ ہوتی ہے جس کے بعد نہ کسی کو نظر ثانی کا حق ہوتا ہے اور نہ دوبارہ اختیار کرنے کا، اس سے باہر نکل جانے والا اسلامی نظام پر معترض شمار کیا جاتا ہے اور اس میں غور و فکر کرنے والا منافق کہا جاتا ہے"۔

امام علیہ السلام کے کلام سے یہ استفادہ ہوتا ہے کہ امام علیہ السلام نے ان لوگوں کے مقابلہ میں جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے منصوص خلافت کا عقیدہ نہیں رکھتے تھے اور بہانہ بازی کیا کرتے تھے، بیعت کے مسئلہ سے (جو خود ان کے نزدیک مسلم تھا) استدلال کیا ہے، تاکہ امام علیہ السلام کی نافرمانی نہ کریں، اور معاویہ یا اس جیسے دوسرے لوگوں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جس طرح [بیعت کے ذریعہ] تم تینوں خلفاء کی خلافت کے قائل ہو تو اسی طرح میری خلافت کے بھی قائل رہو، اور میرے سامنے تسلیم ہو جاؤ، (بلکہ میری خلافت تو ان سے زیادہ حق رکھتی ہے کیونکہ میری بیعت وسیع پیمانے پر ہوئی ہے اور تمام ہی لوگوں کی رغبت اور رضا سے ہوئی ہے۔)

اس بنا پر حضرت علی علیہ السلام کا بیعت کے ذریعہ استدلال کرنا خدا و رسول کی طرف سے منصوب ہونے کے منافی نہیں ہے۔

اسی وجہ سے امام علی علیہ السلام نہج البلاغہ میں حدیث ثقلین کی طرف اشارہ فرماتے ہیں (۲) جو آپ کی امامت پر بہترین دلیل ہے، اور دوسری جگہ وصیت اور وراثت کے مسئلہ کی طرف اشارہ فرماتے ہیں، (۳) (غور کیجئے)

(۱) نہج البلاغہ، مکتوب نمبر ۷، صفحہ ۳۶۹
(۲) نہج البلاغہ، خطبہ نمبر ۸۷
(۳) نہج البلاغہ، خطبہ نمبر ۲

ضمناً ان روایات سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو جاتی ہے کہ اگر کسی سے زبردستی بیعت لی جائے یا لوگوں سے غفلت کی حالت میں بیعت لی جائے تو اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی، بلکہ غور و فکر کے بعد اپنے اختیار و آزادی سے کی جانے والی بیعت کی اہمیت ہوتی ہے، (غور کیجئے)

اس نکتہ پر توجہ کرنا ضروری ہے کہ ولی فقیہ کی نیابت ایک ایسا مقام ہے جو ائمہ معصوم علیہم السلام کی طرف سے معین ہوتا ہے، اس میں کسی بھی طرح کی بیعت کی ضرورت نہیں ہوتی، البتہ "ولی فقیہ" کی اطاعت و پیروی سے استحکام آتا ہے تاکہ اس مقام سے استفادہ کرتے ہوئے دینی خدمات انجام دے سکے، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ یہ عہدہ لوگوں کی پیروی اور اطاعت کرنے پر موقوف ہے، اس کے علاوہ لوگوں کا پیروی کرنا بیعت کے مسئلہ سے الگ ہے بلکہ ولایت فقیہ کے سلسلہ میں حکم الٰہی پر عمل کرنا ہے۔ (غور کیجئے)(۱)

(۱) تفسیر نمونہ، جلد ۲۲، صفحہ ۷۷

۵۵۔ کیا دس سالہ بچہ کا اسلام قابل قبول ہے؟

یہ ایک مشہور و معروف سوال ہے جو قدیم زمانہ سے بہانہ باز لوگوں کے درمیان ہوتا آرہا ہے اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ ٹھیک ہے حضرت علی علیہ السلام نے سب سے پہلے اظہار اسلام کیا، لیکن اس دس سالہ اور نابالغ بچہ کا اسلام قابل قبول ہے یا نہیں؟ اور اگر آپ کے بلوغ کو معیار قرار دیں تو دوسرے بہت سے لوگ اس وقت اسلام یا مسلمان ہو چکے تھے۔

یہاں ''مامون عباسی'' اور اس کے زمانہ کے ایک مشہور و معروف سنی عالم دین ''اسحاق'' کی گفتگو کا بیان کرنا مناسب ہے، (اس واقعہ کو ''ابن عبد ربہ'' نے اپنی کتاب ''عقد الفرید'' میں تحریر کیا ہے)

مامون نے اس سے کہا: پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت میں سب سے افضل کونسا عمل ہے؟

اسحاق نے کہا: خدا کی توحید اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کی گواہی میں اخلاص سے کام لینا۔

مامون نے کہا: کیا تم کسی ایسے شخص کو پہچانتے ہو جو حضرت علی علیہ السلام سے پہلے مسلمان ہوا ہو؟

اسحاق نے کہا: علی اس وقت اسلام لائے جب وہ کم سن اور نابالغ تھے، اور شرعی ذمہ داریاں

بھی ان پر نافذ نہیں ہوتی تھیں۔

مامون نے کہا: حضرت علی علیہ السلام کا اسلام پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کی بنا پر تھا یا نہیں؟ اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے اسلام کو قبول کیا یا نہیں؟ یہ کس طرح ممکن ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی ایسے شخص کو اسلام کی دعوت دیں جس کا اسلام قابل قبول نہ ہو!

یہ سن کر اسحاق لاجواب ہوگیا۔(۱)

مرحوم علامہ امینی علیہ الرحمہ "عقد الفرید" سے واقعہ کو نقل کرنے کے بعد مزید فرماتے ہیں: ابوجعفر اسکافی معتزلی (متوفی ۲۴۰ھ) اپنے رسالہ میں لکھتے ہیں کہ سب مسلمان اس بات کو جانتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام سب سے پہلے اسلام لانے والوں میں سے تھے، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیر کے روز مبعوث برسالت ہوئے اور حضرت علی علیہ السلام نے منگل کے روز ظہار اسلام فرمایا، اور آپ فرماتے تھے کہ میں نے دوسروں سے سات سال پہلے نماز پڑھی ہے، اور ہمیشہ فرماتے تھے کہ "میں اسلام لانے والوں میں سب سے پہلا شخص ہوں" اور یہ ہر مشہور بات سے زیادہ مشہور ہے، ہم نے گزشتہ زمانہ میں کسی کو نہیں دیکھا جو آپ کے اسلام کو کم اہمیت قرار دے، یا یہ کہے کہ حضرت علی اس وقت اسلام لائے جب آپ کم سن تھے، عجیب بات تو یہ ہے کہ "عباس" اور "حمزہ" جیسے افراد اسلام قبول کرنے میں "جناب ابوطالب" کے عکس العمل کے منتظر تھے، لیکن فرزند ابوطالب [حضرت علی علیہ السلام] نے اپنے پدر بزرگوار کے اسلام کا انتظار نہ کیا اور فوراً ہی اظہار ایمان کردیا۔ (۲)

خلاصہ گفتگو یہ ہے

پہلی بات یہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کا اسلام قبول کیا، لہٰذا اگر

---

(۱) عقد الفرید، جلد ۳، صفحہ ۴۳ (تلخیص کے ساتھ)

(۲) الغدیر، جلد ۳، صفحہ ۲۳۷

کوئی شخص اس کم سنی میں حضرت کے اسلام کو قبول نہ کرے تو گویا وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اعتراض کرتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ دعوت ذوالعشیرہ کی مشہور و معروف روایت میں بیان ہوا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کھانا تیار کرایا اور قریش میں سے اپنے رشتہ داروں کی دعوت کی اور ان کو اسلام کا پیغام سنایا، فرمایا جو شخص سب سے پہلے اسلام کے پیغام میں میری نصرت و مدد کرے گا وہ میرا بھائی، وصی اور جانشین ہوگا، اس موقع پر حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کے علاوہ کسی نے رسول اسلامؐ کی دعوت پر لبیک نہیں کہی، آپ نے فرمایا یا رسول اللہؐ میں آپ کی نصرت و مدد کروں گا، اور آپ کے ہاتھوں پر بیعت کرتا ہوں، اس موقع پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا یا علیؑ! تم میرے بھائی، میرے وصی اور میرے جانشین ہو۔

کیا کوئی اس بات پر یقین کر سکتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک نابالغ شخص کو (جس کے لئے لوگ کہتے ہیں کہ ان کا اسلام قابل قبول نہیں ہے) اپنا بھائی، وصی اور جانشین قرار دیں اور دوسروں کو ان کی اطاعت کی دعوت دیں! یہاں تک کہ مشرکین مکہ ابوطالب کا مذاق اڑاتے ہوئے ان سے کہیں کہ تم اب اپنے بیٹے کی اطاعت کرنا، بے شک، اسلام قبول کرنے کے لئے بالغ ہونا شرط نہیں ہے، ہر وہ نوجوان جو صاحب عقل و شعور ہو اگر اسلام کو قبول کرے اور بالفرض اس کا باپ بھی مسلمان نہ ہو تو وہ اپنے باپ سے جدا ہو کر مسلمانوں میں شامل ہو جائے گا۔

تیسری بات یہ ہے کہ قرآن مجید سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حتی نبوت کے لئے بھی "بلوغ" کی شرط نہیں ہے اور بعض انبیاء کو یہ مقام بچپن میں ہی مل گیا تھا، جیسا کہ جناب یحییٰ علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَآتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا﴾ (۱) "اور ہم نے انھیں بچپنے ہی میں نبوت عطا کردی"۔

(۱) سورۂ مریم، آیت ۱۲۔

اور جناب عیسی علیہ السلام کے واقعہ میں بھی ملتا ہے کہ انھوں نے پیدائش کے بعد ہی واضح الفاظ میں کہا ﴿قَالَ إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ آتَانِيَ الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا﴾(۱)" [جناب] عیسی نے آواز دی کہ میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب دی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے"۔

ان دلیلوں میں سب سے بہترین دلیل یہی ہے کہ خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ نے حضرت علی علیہ السلام کے اسلام کو قبول کیا اور دعوت ذو العشیرہ میں یہ اعلان کیا کہ علی علیہ السلام میرے بھائی، میرے وصی اور میرے جانشین ہیں۔

بہر حال وہ روایت جس میں بیان ہوا کہ حضرت علی علیہ السلام سب سے پہلے اسلام لانے والوں میں ہیں، یہ حدیث حضرت علی علیہ السلام کے لئے ایک بہت عظیم فضیلت بیان کرتی ہے جس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہے، اسی دلیل کی بنا پر حضرت علی علیہ السلام پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ کی جانشینی کے لئے امت میں سب سے زیادہ حقدار اور مناسب شخص ہیں۔ (۲)

(۱)سورۂ مریم آیت ۳۰

(۲)تفسیر پیام قرآن، جلد ۹، صفحہ ۳۵۵

۵۶۔ امام حسنؑ نے زہر آلود کوزہ سے پانی کیوں پی لیا اور امام رضاؑ نے زہر آلود انگور کیوں تناول فرمایا؟

اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ معصومین علیہم السلام خداوند عالم کی طرف سے علم غیب جانتے ہیں۔

لیکن یہ علم کیسا ہے، اور اس کی وسعت اور حدود کہاں تک ہے یہ مسئلہ بہت پیچیدہ مسائل میں سے ہے جو اس طرح کی بحث و گفتگو میں دکھائی دیتا ہے، اس سلسلہ میں روایات بھی مختلف ہیں اور علما کے درمیان بھی اختلاف پایا جاتا ہے، درج ذیل مسئلہ انھیں بنیادی اور قابل توجہ احتمالات میں سے ہے۔

ائمہ علیہم السلام تمام چیزوں کو "بالقوۃ" جانتے ہیں نہ کہ "بالفعل" یعنی غیب کی باتوں کو جاننے کے لئے جب بھی ارادہ کریں تو خداوند عالم ان پر الہام فرما دیتا ہے، یا ان کے پاس ایسے قواعد اور اصول ہیں جن کے ذریعہ وہ ایک نیا باب کھول دیتے ہیں اور اسرار غیب سے آگاہ ہو جاتے ہیں، یا ان کے پیش نظر ایسی کتابیں ہیں کہ جب وہ ان پر نظر فرماتے ہیں تو اسرار غیب سے باخبر ہو جاتے ہیں، یا یہ کہ جب بھی خداوند عالم ارادہ فرمائے تو انھیں اسرار غیب سے باخبر کر دیتا ہے، اور جب خداوند عالم اپنے ارادہ سے صرف نظر کر لیتا ہے تو وقتی طور پر یہ علوم مخفی ہو جاتے ہیں۔

اس بات (پہلی صورت) پر شاہد وہ روایات ہیں جن میں بیان ہوا ہے کہ ائمہ معصومین علیہم السلام جب کسی چیز کے سلسلہ میں جاننا چاہتے تھے تو ان کو معلوم ہو جاتا تھا، شیخ کلینی علیہ الرحمہ نے اس مسئلہ میں مستقل طور پر ایک باب قائم کیا ہے جس کا عنوان "ان الائمة اذا شاؤا ان يعلموا علموا" (۱) ہے "جب ائمہ جاننا چاہتے ہیں تو جان لیتے ہیں"۔

اس بیان سے انبیاء اور ائمہ علیہم السلام کے سلسلہ میں متعدد مشکلوں کو بھی حل کیا جا سکتا ہے، جیسے یہ کہ امام حسنؑ نے زہر آلود کوزہ سے پانی کیوں پی لیا اور امام رضاؑ نے زہر آلود انگور کیوں تناول کرلیا؟ کیوں فلاں نا اہل شخص کو قضاوت یا گورنری کے لئے انتخاب کیا، یا جناب یعقوب علیہ السلام اس قدر کیوں پریشان ہوئے؟ جبکہ ان کے فرزند ارجمند [جناب یوسف علیہ السلام] بلند مقامات کو طے کر رہے تھے، اور آخر کار فراق کی گھڑیاں وصال میں تبدیل ہوگئیں، اور اسی طرح دوسرے سوالات حل ہو جاتے ہیں۔ ان تمام موارد میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ وہ جاننا چاہتے تو جان سکتے تھے لیکن یہ حضرات خود اس بات کو جانتے تھے کہ خداوند عالم کی طرف سے امتحان یا دوسرے مقاصد کے تحت ان کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ آگاہی پیدا کریں۔

ایک مثال کے ذریعہ اس مسئلہ کو واضح کیا جا سکتا ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کو ایک خط دے تاکہ فلاں شخص تک پہنچا دے، جس میں بہت سے افراد کا نام یا ان کا عہدہ لکھا ہوا ہے، تو یہاں بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ خط کے مضمون سے آگاہ نہیں ہے، لیکن کبھی صاحب خط کی طرف سے خط پڑھنے کی اجازت ہوتی ہے اس صورت میں وہ خط کے مضمون سے آگاہ ہو سکتا ہے، اور کبھی کبھی خط کے کھولنے کی اجازت نہیں ہوتی تو اسے خط کا مضمون معلوم نہیں ہوتا۔ (۲)

---

(۱) اصول کافی، جلد اول، صفحہ ۲۵۸، (اس باب میں تین روایتیں اسی مضمون کی نقل ہوئی ہیں)، مرحوم علامہ مجلسیؒ نے بھی مرآۃ العقول، جلد ۳، صفحہ ۱۱۸، میں ان احادیث کی طرف اشارہ کیا ہے۔

(۲) تفسیر پیام قرآن، جلد ۷، صفحہ ۲۲۹

۵۷۔ فلسفۂ انتظار کیا ہے؟

حضرت امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے ظہور کا انتظار اسلامی تعلیمات میں کسی دوسرے دین سے نہیں آیا بلکہ قطعی ترین مباحث میں سے ہے، جو خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے ثابت ہے، اور تقریباً اسلام کے تمام فرقے اس سلسلہ میں اتفاق نظر رکھتے ہیں، نیز اس سلسلہ میں احادیث بھی متواتر ہیں۔

اب ہم اس انتظار کے نتائج اور اسلامی معاشرہ کی موجودہ حالت کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں کہ کیا اس طرح کے ظہور کا انتظار انسان کو اس منزل فکر تک لے جاتا ہے کہ وہ اپنی حالت کو بھول جاتا ہے اور ہر طرح کے شرائط کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے؟

یا یہ کہ دراصل یہ عقیدہ انسان کو اپنی اور معاشرہ کی اصلاح کی دعوت دیتا ہے؟

کیا یہ عقیدہ انسان کے اندر تحرک ایجاد کرتا ہے یا اس میں انجماد پیدا کر دیتا ہے۔

اور کیا یہ عقیدہ انسان کی ذمہ داری میں مزید اضافہ کرتا ہے یا ذمہ داریوں سے آزاد کر دیتا ہے؟

کیا یہ عقیدہ انسان کو خواب غفلت کی دعوت دیتا ہے یا انسانیت کو بیدار کرتا ہے؟

لیکن ان سوالات کی تحقیق اور وضاحت سے پہلے اس نکتہ پر توجہ کرنا بہت ضروری ہے کہ اگر

بلند ترین مفاہیم اور اصلاح کے بہترین قوانین کسی نااہل یا ناجائز فائدہ اٹھانے والے کے ہاتھوں میں پہنچ جائے تو ممکن ہے کہ وہ ان سے غلط فائدہ اٹھائے یا ان کے بالکل برعکس مقصد تک پہنچائے، جیسا کہ اس سلسلہ میں ہمیں بہت سے نمونے ملتے ہیں، "انتظار" کا مسئلہ بھی اسی طرح ہے جیسا کہ ہم بعد میں بیان کریں گے۔

بہر حال اس طرح کی گفتگو میں ہر طرح کی غلط فہمی سے بچنے کے لئے پانی کو اس کے سرچشمہ سے لیا جائے تاکہ نہروں اور راستوں کی گندگی اس میں اثر نہ کر سکے، یعنی ہمیں "انتظار" کے مسئلہ میں اصلی اسلامی کتابوں کا مطالعہ کرنا اور "انتظار" کے سلسلہ میں بیان ہونے والی مختلف روایات کو غور و فکر سے پڑھنا چاہئے تاکہ ان کے اصلی مقصد سے آگاہی حاصل ہو سکے۔

محترم قارئین! آپ یہاں پر بیان ہونے والی چند روایات پر غور کیجئے

ا۔ کسی شخص نے حضرت امام صادق علیہ السلام سے سوال کیا کہ آپ اس شخص کے بارے میں کیا فرماتے ہیں کہ ائمہ علیہم السلام کی ولایت کا اقرار کرتا ہو اور "حکومت حق" کے ظہور کا انتظار کرتا ہو، اور اسی حال میں اس دنیا سے چل بسے؟

امام علیہ السلام نے اس کے جواب میں فرمایا "هُوَ بِمَنزِلَةِ مَن كَانَ مَعَ القَائِمِ فِي فِسطَاطِهُ ثُمَّ سَكَتَ هُنَيئَةً ثُمَّ قَالَ هُوَ كَمَن كَانَ مَعَ رَسُولِ اللهِ" (۱)

"وہ اس شخص کی مانند ہے جو حضرت کے ساتھ ان کی رکاب (محاذ) پر حاضر ہوا ہو، (اس کے بعد حضرت تھوڑی دیر خاموش رہے) اور فرمایا: وہ اس شخص کی مانند ہے جس نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی رکاب میں جہاد کیا ہو"۔

بالکل یہی مضمون دوسری بہت سی روایات میں بھی بیان ہوا ہے۔

---

(۱) محاسن برقی، بحار الانوار کے نقل کے مطابق طبع قدیم جلد ۱۳ صفحہ ۱۳۶

۲۔بعض روایات میں بیان ہوا ہے کہ "بِمنزلةِ الضَّارِبِ بِسَيْفِهِ فِي سَبِيلِ اللهِ" یعنی راہ خدا میں تلوار چلانے والے کی مانند ہے۔

۳۔بعض دوسری روایات میں یہ بیان ہوا ہے کہ "كَمَنْ قَارَعَ مَعَ رَسُولِ اللهِ بِسَيْفِهِ" یعنی اس شخص کی مانند ہے جس نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ دشمن کے سر پر تلوار چلائی ہو۔

۴۔بعض روایات میں یہ بیان ہوا ہے کہ "بِمَنْزِلَةِ مَنْ كَانَ قَاعِداً تَحْتَ لِوَاءِ الْقَائِمِ" یعنی اس شخص کی مانند ہے جو حضرت قائم (عج) کے پرچم کے نیچے ہو۔

۵۔اور دوسری روایت میں یہ بیان ہوا ہے کہ "بِمَنْزِلَةِ الْمُجَاهِدِ بَيْنَ يَدَيْ رَسُولِ اللهِ" یعنی اس مجاہد جیسا ہے، جس نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور میں جہاد کیا ہو۔

۶۔بعض دیگر روایات میں بیان ہوا ہے کہ "بِمَنْزِلَةِ مَنِ اسْتَشْهَدَ مَعَ رَسُولِ اللهِ" اس شخص کی مانند ہے جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ شہید ہوا ہو۔

حضرت امام مہدی عجل اللہ تعالیٰ فرجہ شریف کے انتظار کے سلسلہ میں ان چھ روایات میں یہ سات طرح کی شباہتیں اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ مسئلہ انتظار ایک طرف اور دوسری طرف دشمن [اسلام] سے جہاد اور اس سے مقابلہ میں ایک خاص رابطہ پایا جاتا ہے۔(غور کیجئے)

۷۔بہت سی روایت میں اس طرح کی حکومت کے انتظار کے ثواب کو سب سے بڑی عبادت کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت علی علیہ السلام سے منقول بعض احادیث میں یہ مضمون ملتا ہے، درج ذیل حدیث پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"أَفْضَلُ أَعْمَالِ أُمَّتِي اِنْتِظَارُ الْفَرَجِ مِنَ اللهِ عَزَّوَجَلَّ" ( )

(۱) کافی میں بحار سے نقل کیا ہے، جلد ۱۳، صفحہ ۱۳۷

"میری امت کا سب سے بہترین عمل "انتظار فرج" (کشادگی) ہے"۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک دوسری حدیث میں بیان ہوا ہے "أفضلُ العبادة إنتظار الفرج"(۱) یعنی انتظار فرج بہترین عبادت ہے۔

اس حدیث میں انتظار فرج کے معنی چاہے عام و وسیع لیں یا امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے ظہور کے انتظار کے معنی لیں انتظار کے مسئلہ کی اہمیت واضح اور روشن ہو جاتی ہے۔

یہ تمام الفاظ اس بات کی عکاسی کرتے ہیں کہ اس طرح کے انقلاب کا انتظار کرنا ہمیشہ وسیع پیمانہ پر جہاد کا تصور لئے ہوئے ہے، ہم یہاں پہلے انتظار کا مفہوم اور پھر اس کے تمام نتائج پیش کریں گے۔

مفہوم انتظار

"انتظار" عام طور پر اس حالت کو کہا جاتا ہے کہ جس میں انسان پریشان ہو اور اس سے بہتر حالت پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

مثال کے طور پر ایک بیمار اپنی شفا کا انتظار کرتا ہے، یا کوئی باپ اپنے بیٹے کی واپسی کا انتظار کرتا ہے، جس سے دونوں پریشان ہیں اور بہتر حالت کے لئے کوشش کرتے ہیں۔

اور جیسے کوئی تاجر بازار کی ناگفتہ بہ حالت سے پریشان ہو اور وہ اقتصادی بحران کے خاتمہ کا انتظار کرتا ہے لہٰذا اس میں یہ دو حالتیں پائی جاتی ہیں

۱۔ اپنی موجودہ حالت سے پریشانی۔

۲۔ حالت بہتر بنانے کے لئے کوشش۔

اس بنا پر امام مہدی (عج) کی حکومت عدالت اور آنحضرت کے قیام کا انتظار دو عنصر سے

---

(۱) کافی میں بحار سے نقل کیا ہے، جلد ۱۳، صفحہ ۱۳۶

مرکب ہے عنصر "نفی" اور عنصر "اثبات" عنصر نفی یعنی موجودہ حالت سے غمگین اور پریشان رہنا، اور عنصر اثبات یعنی حالات بہتر ہونے کے لئے سعی وکوشش کرنا۔

اگر یہ دونوں پہلو اس کی روح میں جڑ کی طرح ثابت ہو جائیں تو پھر اس کے اعمال میں قابل توجہ تبدیلی پیدا ہو جائے گی۔

اور انسان ظلم وستم، فتنہ وفساد اور برائی کرنے والوں کی کسی بھی طرح کی اعانت وہم آہنگی سے پرہیز کرے گا، اپنے نفس کی اصلاح کرے گا تاکہ جسمی اور روحانی، مادی اور معنوی لحاظ سے حضرت امام مہدی علیہ السلام کی حکومت کے لئے تیار ہو جائے۔

اگر ہم مزید غور وفکر کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ دونوں چیزیں انسان کی اصلاح اور اس کی بیداری کے لئے بہت مفید ہیں۔

قارئین کرام! اب اگر "انتظار" کے اصلی مفہوم کے پیش نظر گذشتہ روایت دیکھیں تو ان میں بیان ہونے والا ثواب صاف سمجھ میں آتا ہے، اور ہم سمجھ جاتے ہیں کہ ایک حقیقی انتظار کرنے والے کا مرتبہ اتنا کیوں بلند ہے جیسا کہ وہ خود حضرت امام زمانہ (عج) کے پرچم کے نیچے ہو یا جس نے راہ خدا میں جہاد کیا ہو یا اپنے خون میں نہایا یا شہید ہو گیا ہو۔

کیا یہ سب راہ خدا میں جہاد کے درجات کے مختلف مراحل نہیں ہیں جو انتظار کرنے والوں کے لحاظ سے پائے جاتے ہیں۔

یعنی جس طرح سے راہ خدا میں جہاد کرنے والوں میں قربانی کا جذبہ مختلف ہوتا ہے اور ان میں ادب واخلاق نیز آمادگی ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے، اگرچہ یہ دونوں "مقدمات" اور "نتیجہ" کے لحاظ سے مشابہ ہوتے ہیں، کیونکہ دونوں جہاد ہیں اور دونوں میں اصلاح نفس اور آمادگی کی ضرورت ہوتی ہے، لہٰذا ایسی عالمی حکومت کے موجد کو بے خبر وغافل نہیں ہونا چاہئے ایسے لشکر میں ہر کس وناکس شامل نہیں ہو سکتا؟

اسی طرح جو شخص اسلحہ لئے ہوئے ہے اور اس رہبر انقلاب کے دشمنوں سے جنگ کر رہا ہے، اور صلح وعدالت کی حکومت کے دشمنوں سے مقابلہ کر رہا ہے، تو اس کے لئے وسیع پیمانہ پر روحی، فکری اور جنگی تیاری کی ضرورت ہے۔

ظہور امام مہدی (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) کے انتظار کے واقعی اثر سے مزید آگاہی کے لئے درج ذیل مطلب پر توجہ فرمائیں:

انتظار یعنی مکمل آمادگی

میں اگر ظالم وستمگر ہوں تو پھر کسی ایسی حکومت کا انتظار کرنا کیسے ممکن ہے جس کی تلوار ظالم و جابر لوگوں کے سر پر چمکے گی۔

میں اگر گناہوں سے آلودہ اور ناپاک ہوں تو پھر کس طرح ممکن ہے کہ کسی ایسے انقلاب کا انتظار کروں جس کا پہلا شعلہ گناہوں سے آلودہ لوگوں کو جلا کر راکھ کر دے گا۔

عظیم الشان جہاد کے لئے آمادہ فوج کے افراد ہمیشہ اپنی طاقت وقوت بڑھاتے رہتے ہیں، اور ان میں انقلابی روح پھونکتے رہتے ہیں اور ہر طرح کے ضعف اور کمزوری کو دور کرتے رہتے ہیں۔

کیونکہ ''انتظار'' ہمیشہ اسی لحاظ سے ہوتا ہے کہ جس چیز کا انسان انتظار کر رہا ہے۔

ایک مسافر کے سفر سے واپسی کا انتظار۔

ایک بہت ہی عزیز دوست کے پلٹنے کا انتظار۔

پھلوں کے پکنے کی فصل کا انتظار یا فصل کاٹنے کے وقت کا انتظار۔

لیکن ہر انتظار میں ایک طرح کی آمادگی ضروری ہوتی ہے، ایک انتظار میں مہمان نوازی کا سامان فراہم کیا جائے، دوسرے میں بعض دوسرے وسائل جیسے لگی اور درانتی کی ضرورت ہوتی ہے۔

اب آپ غور کیجئے کہ جو لوگ ایک عالمی عظیم الشان اصلاح کرنے والے کا انتظار کرتے ہیں، وہ لوگ دراصل ایک بہت بڑے انقلاب کا انتظار کرتے ہیں جو تاریخ بشریت کا سب سے بڑا انقلاب ہوگا۔

یہ انقلاب گزشتہ انقلابات کے برخلاف کوئی علاقائی انقلاب نہ ہوگا بلکہ ایک عام انقلاب ہوگا جس میں انسانوں کے تمام پہلوؤں پر نظر ہوگی اور یہ انقلاب سیاسی، ثقافتی، اقتصادی اور اخلاقی ہوگا۔

پہلا فلسفہ۔ اصلاح نفس

اس طرح کے انقلاب کے لئے ہر دوسری چیز سے پہلے مکمل طور پر آمادگی کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ اس طرح کی صلاحیت کے بھاری بوجھ کو اپنے شانوں پر اٹھا سکے، اس چیز کے لئے سب سے پہلے علم و اندیشہ، روحانی فکر اور آمادگی کی سطح کو بلند کیا جاتا ہے تاکہ اس کے اہداف و مقاصد تک پہنچ جا سکے، تنگ نظری، کج فکری، حسد، بچکانا اختلافات، بیہودہ چیزیں اور عام طور پر ہر طرح کا نفاق و اختلاف "سچے منتظرین" کی شان میں نہیں ہے۔

ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ حقیقی طور پر انتظار کرنے والا شخص ایک تماشائی کا کردار ادا نہیں کر سکتا، بلکہ سچا منتظر وہ ہے جو ابھی سے انقلابیوں کی صف میں آجائے۔

اس انقلاب کے نتائج پر ایمان رکھنا ہرگز اس کو مخالفوں کی صفوں میں رہنے کی اجازت نہیں دیتا اور موافقین کی صف میں آنے کے لئے "نیک اعمال، پاک روح، شجاعت و بہادری اور علم و دانش" کی ضرورت ہے۔

میں، اگر گنہگار اور فاسد ہوں تو پھر کس طرح اس حکومت کا انتظار کروں جس میں نااہل اور گنہگاروں کا کوئی کردار نہ ہوگا، بلکہ ان کو قبول نہ کیا جائے گا اور ان کو سزا دی جائے گی۔

کیا یہ انتظار انسان کی فکر و روح اور جسم و جان سے آمادگی کو دور کرنے کے لئے کافی نہیں ہے؟!

جو فوج آزادی بخش جہاد کا انتظار کر رہی ہو اور بالکل تیار ہو، تو اس کے لئے ایسے اسلحہ کی ضرورت ہوتی ہے جو اس جہاد کے لئے مناسب اور کارگر ہو، اسی لحاظ سے مورچہ بنائے، اور لشکر کے ساز و سامان میں اضافہ کرے۔

لشکر کا حوصلہ بلند کرے، اور ہر فوجی کے دل میں مقابلہ کے شوق و رغبت کو بڑھائے، اگر فوج میں اس طرح کی آمادگی نہیں ہے تو وہ منتظر نہیں ہے اور اگر فوج آمادگی کا دعویٰ کرتی ہے تو جھوٹی ہے۔

ایک عالمی مصلح کے انتظار کے معنی یہ ہیں کہ انسان معاشرہ کی اصلاح کے لئے مکمل طور پر فکری، اخلاقی اور مادی و معنوی لحاظ سے تیار رہے، اس وقت سوچیں کہ اس طرح کی یہ آمادگی اور تیاری کس طرح انسان ساز اور اصلاح کنندہ ہوگی۔

پوری دنیا کی اصلاح کرنا اور ظلم و ستم کا خاتمہ کرنا کوئی مذاق کام نہیں ہے، یہ عظیم مقصد ایک آسان کام نہیں ہو سکتا، ایسے عظیم مقصد کے لئے اسی لحاظ سے تیاری بھی ہونی چاہئے۔

ایسا انقلاب لانے کے لئے بہت ہی عظیم انسان، مصمم، بہت بہادر، غیر معمولی طور پر طیب و طاہر، بلند فکر اور گہری نظر کے ساتھ مکمل طور پر آمادگی رکھنے والا ہونا چاہئے۔

ایسے مقصد کے لئے اپنی اصلاح کے لئے ضروری ہے کہ فکری، اخلاقی اور اجتماعی طور پر ایک بہترین منصوبہ بندی کی جائے، اور حقیقی انتظار کا یہی مطلب ہے، کیا پھر بھی کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ انتظار اصلاح کرنے والا نہیں ہے؟!

دوسرا فلسفہ: معاشرہ کی اصلاح کے لئے کوشش کرنا

صحیح طور پر انتظار کرنے والے افراد کی ذمہ داری یہ نہیں ہے کہ صرف اپنی اصلاح کریں بلکہ

لئے، اور بس، بلکہ دوسروں کی حالت بھی دیکھنی ہوگی، اپنی اصلاح کے علاوہ دوسروں کی اصلاح کے لئے کوشش کرنا ہوگی، کیونکہ جس عظیم انقلاب کا انتظار کر رہے ہیں وہ ایک انفرادی منصوبہ نہیں ہے بلکہ ایک ایسا منصوبہ ہے جس میں تمام پہلوؤں سے انقلاب آتا ہے، جس کے لئے پورے معاشرہ کے لئے کام کرنا ہوگا، سب کی سعی و کوشش میں ہم آہنگی ہو، اس انقلاب کے لئے کوشش اسی عظیم الشان پیمانہ پر ہو جس کا ہم انتظار کر رہے ہیں۔

ایک مقابلہ کرنے والے لشکر میں کوئی بھی ایک دوسرے سے غافل نہیں ہوسکتا، بلکہ ہر فوجی کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ جہاں بھی کمی دیکھے تو فوراً اس کی اصلاح کرے، جس جگہ سے نقصان کا احتمال پایا جاتا ہو اس کا سدباب کرے اور ہر طرح کے ضعف و ناتوانی کو تقویت پہنچائے، کیونکہ بہترین کارکردگی اور تمام لشکر میں یکسوئی اور ہم آہنگی کے بغیر یہ عظیم منصوبہ عملی کرنا ممکن نہیں ہے۔

لہٰذا حقیقی منتظرین پر اپنی اصلاح کے علاوہ دوسروں کی اصلاح کرنے کی بھی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

فلسفہ انتظار کا ایک دوسرا ثمرہ یہ ہے کہ انسان اپنی اصلاح کے علاوہ دوسروں کی اصلاح کے لئے بھی کوشش کرے، جس پر مذکورہ روایات میں اس قدر ثواب کا وعدہ دیا گیا ہے۔

تیسرا فلسفہ: حقیقی منتظرین برے ماحول میں رنگے نہیں جاتے

حضرت امام زمانہ [عجل اللہ تعالی فرجہ الشریف] کے انتظار کا ایک اہم فلسفہ یہ ہے کہ انسان گناہوں اور برے ماحول میں گم نہ ہونے پائے، اور اپنے کو گناہوں اور آلودگیوں سے محفوظ رکھے۔

وضاحت: یعنی جب ظلم و ستم اور گناہوں کا بازار گرم ہو، اکثر لوگ گناہوں اور برائیوں میں پھنسے ہوئے ہوں، تو ایسے ماحول میں نیک کردار افراد [بھی] فکری بحران کا شکار ہوجاتے ہیں، اور ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ وہ عوام الناس کی اصلاح سے مایوس ہوجاتے ہیں۔

کیونکہ کبھی کبھی ایسے افراد یہ سوچتے ہیں کہ اب تو کام ختم ہو چکا ہے اور اصلاح کا کوئی راستہ ہی باقی نہیں رہ گیا ہے، اور اپنے کو پاک وپاکیزہ رکھنے کا کوئی فائدہ ہی نہیں ہے، چنانچہ یہی ناامیدی اور مایوسی ان کو آہستہ آہستہ گناہوں اور برائیوں کی طرف کھینچتی ہے اور ان پر ماحول کا اثر ہونے لگتا ہے، وہ آلودہ اکثریت کے مقابلہ میں صحیح وسالم اقلیت کے عنوان سے اپنے کو محفوظ نہیں کرپاتے، اور ماحول کے رنگ کو نہ اپنانے کو ایک ذلت ورسوائی سمجھتے ہیں!

ایسے موقع پر فقط ایک ہی چیز ان کے لئے ”امید کی کرن“ ہوتی ہے اور پرہیزگاری کی دعوت دیتی ہے، نیز ان کو برے ماحول سے محفوظ رہنے کی دعوت دیتی ہے اور وہ آخری صورت میں اصلاح کی امید ہے، صرف اسی صورت میں انسان اپنی اور معاشرہ کی اصلاح کے لئے سعی وکوشش سے ہاتھ نہیں روک سکتا۔

اگر ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی تعلیمات میں گناہوں کی بخشش سے مایوسی کو گناہ کبیرہ شمار کیا گیا ہے اور ممکن ہے کہ بعض لوگ تعجب کریں کہ کیوں رحمت خدا سے مایوسی کو اس قدر عظیم اور اہم شمار کیا گیا ہے، یہاں تک کہ بہت سے گناہوں سے بھی اہم قرار دیا گیا ہے تو دراصل اس کا فلسفہ یہی ہے کہ رحمت خدا سے مایوس گنہگار ہرگز اپنی اصلاح کی فکر نہیں کرتا، یا کم از کم وہ اپنے گناہوں میں مزید اضافہ کرنے سے نہیں رکتا، اس کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ اب تو پانی سر سے گزر گیا ہے چاہے ایک بالشت ہو یا سو بالشت؟! میں تو بدنام زمانہ ہو گیا ہوں اب مجھے دنیا کا کوئی غم نہیں ہے!! سیاہی سے زیادہ تو کوئی رنگ نہیں ہے، آخر کار جہنم ہے، جہنم تو میں نے خرید ہی لیا ہے اب مجھے کسی چیز کا ڈر کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ

لیکن جب اس کے لئے امید کی کرن پھوٹتی ہے، رحمت پروردگار کی امید، موجودہ حالت کے بدلنے کی امید، تو پھر اس کی زندگی میں ایک نیا رخ آجاتا ہے، اور یہ امید اس کو گناہوں کے راستہ پر چلنے سے روک دیتی ہے اور اسے اپنی اصلاح، توبہ اور پاکیزگی کی دعوت دیتی ہے۔

اسی وجہ سے برے لوگوں کے لئے ''امید کی کرن'' کو ایک تربیتی سبب شمار کیا جاتا ہے، اسی طرح نیک اور صالح افراد جو برے ماحول میں پھنسے رہتے ہیں وہ بھی بغیر امید کے اپنی اصلاح نہیں کرسکتے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایسے اصلاح کرنے والے کے ظہور کے منتظر کی بنا پر دنیا جتنی زیادہ فاسد ہوتی جارہی ہے امام زمانہ کے ظہور کی امید بھی زیادہ ہوتی جارہی ہے، اور انتظار کرنے والوں کے لئے موثر ہے، جو ماحول کی تیز آندھیوں کے مقابل محفوظ کردیتی ہے، یہ لوگ نہ صرف یہ کہ معاشرے میں ظلم وفساد اور برے ماحول سے نا امید نہیں ہوتے بلکہ جس طرح وعدہ وصال جب نزدیک ہوجاتا ہے تو آتش عشق مزید بھڑک جاتی ہے اسی طرح جب انسان اپنے مقاصد کو نزدیک دیکھتا ہے تو اصلاح معاشرہ نیز ظلم وفساد سے مقابلہ کے لئے کوشش میں مزید عشق پیدا ہوجاتا ہے۔

[قارئین کرام] ہماری گزشتہ بحث وگفتگو سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ انتظار کا غلط اثر اسی صورت میں ہوتا ہے جب اس کو مسخ کردیا جائے، یا اس میں تحریف کردی جائے جیسا کہ بعض مخالفین نے اس میں تحریف کی ہے اور موافقین نے اس کو مسخ کردیا ہے، لیکن اگر واقعی طور پر معاشرہ اور خود انسان میں انتظار ظہور کا صحیح مفہوم پیدا ہوجائے تو یہ اصلاح، تربیت اور امید کا بہترین سبب ہے۔

اس موضوع کے واضح کرنے کے لئے بہترین دلیل درج ذیل آیہ شریفہ ہے، ارشاد خداوندی ہے:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ...﴾(۱)

''اللہ نے تم میں سے صاحبان ایمان وعمل صالح سے وعدہ کیا ہے کہ انھیں روئے زمین پر اسی طرح اپنا خلیفہ بنائے گا جس طرح پہلے والوں کو بنایا ہے''۔

(۱)سورہ نور، آیت ۵۵

اس آیہ شریفہ کے ذیل میں معصومین علیہم السلام سے نقل ہوا ہے کہ اس سے مراد "هُوَ القَائِمُ وَأَصحَابُه" "قائم آل محمد اور آپ کے اصحاب و انصار ہیں"۔(۱)

ایک دوسری حدیث میں بیان ہوا ہے کہ "نَزَلَتْ فِي المَهْدِيِّ عليه السّلام" یہ آیہ شریفہ حضرت امام مہدی علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی ہے۔

اس آیت میں حضرت امام مہدی (عج) اور آپ کے اصحاب "الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ" کے عنوان سے یاد کئے گئے ہیں، لہٰذا یہ عالمی انقلاب، مستحکم ایمان (جس میں کسی طرح کا ضعف اور کمزوری نہ پائی جاتی ہو) اور عمل صالح (جس سے دنیا بھر کی اصلاح کا راستہ کھل جاتا ہو) کے بغیر ممکن نہیں ہے، اور جو لوگ اس انقلاب کے انتظار میں ہیں ان کو چاہئے کہ اپنے علم و ایمان کی سطح کو بھی بڑھائیں اور اپنے عمل کی اصلاح کے لئے بھی کوشش کرتے رہیں۔ صرف اسی طرح کے افراد اپنے کو اس حکومت کی بشارت دے سکتے ہیں، نہ کہ ظلم و ستم کی مدد کرنے والے! اور نہ ہی وہ لوگ جو ایمان اور عمل صالح سے دور ہیں۔

اور نہ ہی وہ بزدل انسان جو ایمان کی کمزوری کی وجہ سے اپنے سایہ سے بھی ڈرتے ہیں۔

اور نہ ہی سست، کاہل اور ناکارہ انسان جو فقط ہاتھ پر ہاتھ رکھے معاشرہ میں پھیلنے والے گناہ و فساد پر خاموشی اختیار کئے ہوئے ہیں، اور معاشرہ میں موجودہ برائیوں کو ختم کرنے کے لئے ایک قدم بھی اٹھانے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

اسلامی معاشرہ میں حضرت امام مہدی (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) کے ظہور کے انتظار کا یہی فلسفہ ہے۔(۲)

---

(۱) بحار الانوار، قدیم، جلد ۱۳، صفحہ ۱۴۔

(۲) تفسیر نمونہ، جلد ۷، صفحہ ۴۷۸۔

قیامت

۵۸۔ قیامت کے عقلی دلائل کیا ہیں؟

قرآن مجید میں قیامت کے سلسلہ میں سیکڑوں آیات بیان ہوئی ہیں، ان کے علاوہ قیامت کے بارے میں بہت سے عقلی دلائل بھی موجود ہیں ہم ان میں سے بعض کو خلاصہ کے طور پر بیان کرتے ہیں

الف۔ برہان حکمت: اگر قیامت کے بغیر اس زندگی کا تصور کریں تو بے معنی اور فضول دکھائی دیتی ہے، بالکل اسی طرح کہ شکم مادر میں بچہ کو اس دنیوی زندگی کے بغیر تصور کریں۔

اگر قانون خلقت یہ ہوتا کہ بچہ شکم مادر میں پیدا ہوتے ہی مرجایا کرتا تو پھر تصور کریں کہ کسی ماں کا حاملہ ہونا کتنا بے مفہوم تھا؟ اسی طرح اگر قیامت کے بغیر اس دنیا کا تصور کریں تو یہی پریشانی دکھائی دے گی۔

کیونکہ کیا ضرورت ہے کہ ہم کم وبیش ۷۰ برس تک اس دنیا کی سختیوں کو برداشت کریں؟ اور ایک مدت تک بے تجربہ رہیں، "و تا پخته شود خامی، عمر تمام است" یعنی جب تک انسان تجربات حاصل کرتا ہے تو عمر تمام ہو جاتی ہے!

ایک مدت تک تحصیل علم ودانش کرتے رہیں، اور جب معلومات کے لحاظ سے کسی مقام پر پہنچ جائیں تو موت ہماری طرف دوڑنے لگے۔

اس کے علاوہ ہم کس چیز کے لئے زندگی کریں؟ چند لقمہ کھانا کھانا، چند جوڑے لباس پہننا،

سونا اور بیدار ہونا، دسیوں سال تک ہر روز یہی تھکا دینے والے کام انجام دینا؟!

یہ عظیم الشان آسمان، وسیع و عریض زمین، اور ان میں پائی جانے والی تمام چیزیں، یہ ساتید، مربی، یہ بڑے بڑے کتب خانے اور ہماری وردوسری موجودات کی خلقت میں یہ باریک بینی، اور ظرفت کیا واقعا یہ سب کچھ کھانے پینے، پہننے اور مادی زندگی بسر کرنے کے لئے ہیں؟

اس سوال کی بنا پر معاد ور قیامت کا نکار کرنے والے اس زندگی کے پیچ ہونے کا اقرار کرتے ہیں، اور ان میں سے بعض لوگ اس بے معنی زندگی سے نجات پانے کے لئے خودکشی کو اپنے لئے افتخار سمجھتے ہیں!

کیسے ممکن ہے کہ جو شخص خداوند عالم اور اس کی بے نہایت حکمت پر ایمان رکھتا ہو لیکن اس دنیا کو عالم آخرت کے لئے مقدمہ شمار نہ کرے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ﴾(۱)

"کیا تمہارا خیال یہ تھا کہ ہم نے تمہیں بیکار پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف پلٹا کر نہیں لائے جاؤ گے"۔

اس کا مطلب یہ ہو کہ اگر عالم آخرت نہ ہو تو اس دنیا کا خلق کرنا فضول تھا۔

جی ہاں! یہ دنیوی زندگی اسی صورت میں بامعنی اور حکمت خداوندی سے ہم آہنگ ہوتی ہے کہ جب اس دنیا کو عالم آخرت کی کھیتی قرار دیں "الدُّنْيا مَزْرَعَةُ الآخِرَةِ"، یا اس کو عالم آخرت کے لئے پل قرار دیں "الدنیا قنطرة" یا اس عالم کے لئے یونیورسٹی اور تجارت خانہ تصور کریں، جیسا کہ حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام اپنے عظیم کلام میں فرماتے ہیں

---

(۱) سورۂ مومنون، آیت ۱۱۵

"یاد رکھو کہ دنیا باور کرنے والے کے لئے سچائی کا گھر ہے، سمجھ دار کے لئے امن وعافیت کی منزل ہے، اور نصیحت حاصل کرنے والے کے لئے نصیحت کا مقام ہے، یہ دوستان خدا کے سجود کی منزل اور آسمان کے فرشتوں کا مصلیٰ ہے، یہیں وحی الٰہی کا نزول ہوتا ہے اور یہیں اولیاء خدا آخرت کا سودا کرتے ہیں، رحمت الٰہی حاصل کر لیتے ہیں اور جنت کو فائدہ میں لے لیتے ہیں"۔(۱)

خلاصہ گفتگو یہ ہے کہ اس جہان کے حالات کا مطالعہ اور تحقیق کے بعد یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے بعد ایک دوسرا جہان بھی موجود ہے ﴿وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْأَةَ الْأُولَىٰ فَلَوْلَا تَذَكَّرُونَ﴾(۲) "اور تم پہلی خلقت کو تو جانتے ہو تو پھر اس میں غور کیوں نہیں کرتے ہو"۔

ب۔ برہان عدالت: اس کائنات و رقوانین خلقت میں غور وفکر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تمام چیزیں حساب و کتاب سے ہیں۔

خود ہمارے بدن میں ایک ایسا عادلانہ نظام حاکم ہے کہ اگر ذرا بھی تبدیلی یا نامناسب تغیر پیدا ہو جائے تو بیماری یا موت کا سبب ہو جاتا ہے، ہمارے دل کی دھڑکنیں، خون کی روانی، آنکھوں کے پردے، ہمارے اعضائے بدن کے تمام خلیے (Cells) اور جز اسی دقیق نظام کی طرح ہیں جس کی حکومت پورے جہان پر ہے، "وَبِالْعَدْلِ قَامَتِ السَّمٰوٰاتُ وَالْأَرْضُ"(۳) "عدل ہی کے ذریعہ زمین وآسمان باقی ہیں"، کیا انسان اس وسیع وعریض کائنات میں ایک ناموزوں پیوند ہو سکتا ہے؟!

یہ بات صحیح ہے کہ خداوند عالم نے انسان کو آزادی، ارادہ اور اختیار دیا ہے تاکہ اس کا امتحان

(۱) نہج البلاغہ، کلمات قصار کلمہ ۱۳۱

(۲) سورۂ واقعہ، آیت ۶۲

(۳) تفسیر صافی، سورۂ رحمن کی ساتویں آیت کے ذیل میں

سے سکے، اور جس کے زیر سایہ وہ کمال کی منزلوں کو طے کرسکے، لیکن اگر انسان آزادی سے ناجائز فائدہ اٹھائے تو پھر کیا کیا جاسکتا ہے؟ اگر ظالم وستم گر، گمراہ اور گمراہ کرنے والے ان خداداد نعمتوں سے ناجائز فائدہ اٹھائیں تو خداوندعالم کی عدالت کا تقاضا کیا ہے؟

یہ ٹھیک ہے کہ بعض ظالم اور مجرم لوگوں کو اس دنیا میں سزا مل جاتی ہے اور وہ اپنے کیفر کردار تک پہنچ جاتے ہیں، لیکن مسلّم طور پر یہ نہیں ہے کہ تمام مجرموں کو پوری سزا مل جاتی ہو، یا تمام نیک اور پاک افراد کو اپنے اعمال کی جزا اسی دنیا میں مل جاتی ہو، کیا یہ ہوسکتا ہے کہ یہ دونوں گروہ، عدالت خدا کی میزان میں برابر قرار پائیں؟ قرآن مجید کے فرمان کے مطابق ہرگز ایسا نہیں ہوسکتا، ارشاد ہوتا ہے

﴿أَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ ☆ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ﴾(۱)

"کیا ہم اطاعت گزاروں کو مجرموں جیسا بنادیں؟ تمہیں کیا ہوگیا ہے کیسا فیصلہ کررہے ہو"۔

نیز ارشاد ہوتا ہے: ﴿أَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِينَ كَالْفُجَّارِ﴾(۲) (کیا ہم پرہیزگاروں کو بدکاروں کے برابر قرار دیدیں؟)

بہر حال اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ خداوندعالم کے احکام کی اطاعت کرنے والوں کے لحاظ سے انسانوں میں فرق ہے، جس طرح سے "مکافات جہان"، "محکمہ وجدان"، اور "گناہوں کا عکس العمل" نامی عدالتیں اس دنیا میں عدالت برقرار کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں، لہٰذا یہ بات ماننا پڑے گی کہ عدالت الٰہی نافذ ہونے کے لئے خداوندعالم کی طرف سے ایک عام عدالت

---

(۱) سورۂ قلم، آیت ۳۵و۳۶

(۲) سورۂ ص، آیت ۲۸

[میزان] قائم ہو، جس میں نیک اور برے لوگوں کے سوئی کی نوک کے برابر عمل کا بھی حساب کتاب کیا جائے، ورنہ عدالت خداوندی پر حرف آتا ہے، اس بنا پر قبول کرنا چاہئے کہ اگر ہم خداوند عالم کی عدالت کو مانتے ہیں تو پھر روز قیامت پر بھی ایمان رکھیں، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ بِالْقِسْطِ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ﴾ (۱) ”اور ہم قیامت کے دن انصاف کی ترازو قائم کریں گے“۔

نیز ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ﴾ (۲) ”لیکن ان کے درمیان حساب کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا اور ان پر کسی طرح کا ظلم نہ کیا جائے گا“۔

ج۔ برہان ہدف: مادہ پرستوں کے نظریہ کے برخلاف الٰہی تصور کائنات کے مطابق انسان کی خلقت میں ایک ہدف اور مقصد کارفرما ہے جسے فلسفی اصطلاح میں ”تکامل و ارتقا“ کہتے ہیں اور قرآن و حدیث کی زبان میں کبھی ”قرب خداوندی“ اور کبھی ”عبادت و بندگی“ سے تعبیر کیا جاتا ہے، جیسا کہ ارشاد خداوند متعال ہے: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ (۳) ”اور ہم نے جنات اور انسان کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے“۔ اگر ان تمام کی انتہا ”موت“ ہو تو کیا یہ مقصد پورا ہو سکتا ہے؟! بے شک اس سوال کا جواب منفی ہے، تو پھر اس زندگی کے بعد دوسری زندگی ہونا چاہئے جہاں ”کمال“ کی منزلیں طے ہوتی رہیں، اور اس کھیتی کی فصل کٹتی رہے، اور جیسا کہ ہم نے ایک موقع پر عرض کیا ہے کہ اس زندگی میں بھی آخری مقصد تک پہنچنے کے لئے یہ تکاملی راستہ طے ہوتا رہے گا۔

خلاصہ یہ کہ یہ مقصد قیامت پر ایمان کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا، اور اگر اس دنیا کا تعلق عالم آخرت سے ختم ہو جائے تو سب چیزیں معمہ بن کر رہ جائیں گی اور ان سوالات کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکے گا۔ (۴)

---

(۱) سورۂ انبیاء، آیت ۴۷ (۲) سورۂ یونس، آیت ۵۴
(۳) سورۂ ذاریات، آیت ۵۶ (۴) تفسیر نمونہ، جلد ۱۸، صفحہ ۴۷۹

۵۹۔ معاد؛ جسمانی ہے یا روحانی؟

معاد جسمانی سے مراد یہ نہیں ہے کہ روز قیامت صرف جسم دوبارہ لوٹایا جائے گا، بلکہ مراد یہ ہے کہ روح اور جسم دونوں حاضر کئے جائیں گے، یا دوسرے الفاظ میں یہ کہا جائے کہ روح کا پلٹنا تو مسلم ہے صرف جسم کے بارے میں اختلاف اور بحث ہے۔

بعض گزشتہ فلاسفہ "معاد روحانی" پر عقیدہ رکھتے تھے، اور جسم کو ایسی سواری مانتے تھے جو صرف اس دنیا میں انسان کے ساتھ ہے، ور انسان مرنے کے بعد اس جسم سے بے نیاز ہو جاتا ہے، جسم کو ترک کر دیتا ہے اور "عالم ارواح" کی طرف کوچ کر جاتا ہے۔

لیکن عظیم علمائے اسلام کا عقیدہ یہ ہے کہ معاد، روحانی اور جسمانی دونوں پہلوؤں کے ساتھ ہوگی، اگرچہ بعض حضرات اس دنیوی جسم کے قائل نہیں ہیں بلکہ کہتے ہیں کہ خداوند عالم ہماری روح کو یک جسم عطا کرے گا، کیونکہ نسان کی حقیقت اس کی روح ہوتی ہے اور یہ عطا کردہ جسم اس کا جسم شمار کیا جائے گا

جبکہ صاحبان تحقیق کا عقیدہ یہ ہے کہ یہی جسم جو خاک میں مل کر ذرہ ذرہ ہو گیا، حکم خدا سے اس جسم کے تمام ذرات جمع ہو جائیں گے اور اس کو یک نئی زندگی کا لباس پہنایا جائے گا، اور یہی وہ عقیدہ ہے جو قرآن مجید کی آیات سے حاصل کیا گیا ہے۔

معاد جسمانی پر قرآن مجید میں اس قدر شواہد موجود ہیں کہ یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے جو افراد صرف "معاد روحانی" کے قائل ہوئے ہیں انھوں نے قرآن مجید کی اکثر آیات میں ذرا بھی غور وفکر نہیں کیا ہے ورنہ معاد جسمانی کے سلسلہ میں قرآن مجید میں اتنی زیادہ آیات موجود ہیں کہ شک وشبہ کی ذرا بھی گنجائش نہیں رہتی۔

سورہ یس کی آخری آیات اس حقیقت کو مکمل طور پر واضح کر دیتی ہیں کیونکہ اس عرابی شخص کو تعجب اسی بات پر تھا کہ میرے ہاتھ میں موجود اس گلی ہوئی ہڈی کو کون دوبارہ زندہ کر سکتا ہے؟

قرآن مجید نے اس کے جواب میں واضح طور پر اعلان کیا ﴿قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ (١) "آپ کہہ دیجئے کہ جس نے پہلی مرتبہ پیدا کیا ہے وہی زندہ بھی کرے گا"۔

معاد کے سلسلہ میں تمام مشرکین کو اس بات پر تعجب تھا کہ جب ہم خاک ہو جائیں گے اور ہمارے ذرات بھی ادھر اُدھر خاک میں پھیل جائیں گے تو پھر ہمیں کس طرح دوبارہ زندہ کیا جا سکتا ہے؟! جیسا کہ انھیں کی زبانی قرآن مجید نے نقل کیا ہے: ﴿وَقَالُوا أَإِذَا ضَلَلْنَا فِي الْأَرْضِ أَإِنَّا لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ﴾ (٢) "اور یہ کہتے ہیں کہ اگر ہم زمین میں گم ہو گئے تو کیا نئی خلقت میں پھر ظاہر کئے جائیں گے!!"۔

یہ لوگ کہتے تھے ﴿أَيَعِدُكُمْ أَنَّكُمْ إِذَا مِتُّمْ وَكُنتُمْ تُرَابًا وَعِظَامًا أَنَّكُم مُّخْرَجُونَ﴾ (٣) "کیا یہ تم سے اس بات کا وعدہ کرتا ہے کہ جب تم مرجاؤ گے اور خاک اور ہڈی ہو جاؤ گے تو پھر دوبارہ نکالے جاؤ گے"۔

---

(١) سورہ یس، آیت ٧٩۔

(٢) سورۂ الم سجدہ، آیت ١٠۔

(٣) سورۂ مومنون، آیت ٣٥۔

کفار ومشرکین روز قیامت کے سلسلہ میں اس قدر تعجب کرتے تھے کہ اس مسئلہ کے قائل [پیغمبر اکرم ﷺ] کو مجنون یا خدا پر بہتان باندھنے والا سمجھتے تھے، جیسا کہ قرآن میں انھیں لوگوں کی زبانی نقل ہوا ہے ﴿ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلَىٰ رَجُلٍ يُنَبِّئُكُمْ إِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ إِنَّكُمْ لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ ﴾(۱) ''اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان کا کہنا ہے کہ ہم تمہیں ایسے آدمی کا پتہ بتائیں جو یہ خبر دیتا ہے کہ جب تم مرنے کے بعد ٹکڑے ٹکڑے ہو جاؤ گے تو تمہیں نئے جسم میں دیا جائے گا''، اسی دلیل کی وجہ سے ''معاد کے سلسلہ میں قرآنی دلائل'' اسی ''معاد جسمانی'' پر زور دیتے ہیں، اس کے علاوہ قرآن مجید نے بارہا اس بات کی یاد دہانی کرائی ہے کہ تم لوگ روز قیامت اپنی قبروں سے نکلو گے، (سورہ یس، آیت نمبر ۵، سورہ قمر، آیت نمبر ۷) ''قبریں'' اسی معاد جسمانی سے تعلق رکھتی ہیں۔

قرآن مجید میں جنت کے بہت سے معنوی اور مادی صفات بیان کئے گئے ہیں، جو سب اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ قیامت کے دن جسم کو بھی حاضر کیا جائے اور روح کو بھی، ورنہ نعمتوں کے ساتھ ساتھ حور وغلمان، قصر ومحل، بہشتی غذائیں اور مادی لذتیں کیا معنی رکھتی ہیں؟!

بہر حال یہ بات ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی قرآن مجید کی منطق اور ثقافت سے تھوڑی بہت آشنائی رکھتا ہو اور معاد جسمانی کا انکار کرے، یا دوسرے الفاظ میں یوں کہیں کہ قرآنی نظریہ کے لحاظ سے معاد جسمانی کا انکار خود اصل معاد کے انکار کے برابر ہے اس سلسلہ میں قرآن وحدیث میں بیان شدہ دلائل کے علاوہ خود عقلی دلائل بھی موجود ہیں کہ اگر ان کو بیان کرنا چاہیں تو بحث طولانی ہو جائے گی، البتہ ہم یہاں پر معاد جسمانی کے سلسلہ میں ہونے والے سوالات اور اعتراضات کو بیان کرتے ہیں جیسے ''شبہ آکل و ماکول'' وغیرہ جن کو اسلامی محققین نے بیان کیا ہے۔(۲)

---

(۱) سورۂ سباء آیت ۷ (۲) تفسیر نمونہ، جلد ۱۸، صفحہ ۳۸۰

۶۰۔ شبہ آکل و ماکول کیا ہے؟

بہت سے مفسرین اور مورخین نے درج ذیل آیت کے ذیل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ واقعہ لکھا ہے

﴿وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَى﴾ (۱)

"اور اس موقع کو یاد کرو جب ابراہیم نے التجا کی کہ پروردگارا مجھے یہ دکھا دے کہ تو مردوں کو کس طرح زندہ کرتا ہے"۔

ایک دن حضرت ابراہیمؑ دریا کے کنارے سے گزر رہے تھے، آپ نے دریا کے کنارے ایک مردار دیکھا، جس کا کچھ حصہ دریا کے اندر اور کچھ باہر تھا، دریا اور خشکی کے جانور دونوں طرف سے کھا رہے تھے، بلکہ کھاتے کھاتے ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے، اس منظر نے حضرت ابراہیمؑ کو ایک ایسے مسئلہ کی فکر میں ڈال دیا جس کی کیفیت کو سب ہی تفصیل سے جاننا چاہتے ہیں اور وہ ہے موت کے بعد مردوں کا زندہ ہونے کی کیفیت، جناب ابراہیمؑ سوچنے لگے کہ اگر یہی انسانی جسم کے ساتھ ہو اور انسان کا بدن جانوروں کے بدن کا جز بن جائے تو اس کو قیامت میں کیسے اٹھایا جائے گا، جبکہ وہاں انسان کو اسی بدن کے ساتھ اٹھنا ہے

---

(۱) سورہ بقرہ، آیت ۲۶۰

حضرت ابراہیمؑ نے کہا: پروردگار! مجھے دکھا کہ تو مردوں کو کیسے زندہ کرے گا؟ خداوند عالم نے فرمایا کیا تم اس بات پر یقین نہیں رکھتے، انھوں نے کہا ایمان تو رکھتا ہوں لیکن چاہتا ہوں کہ دل کو تسلی ہو جائے۔

خداوند عالم نے حکم دیا کہ چار پرندے لے لو اور ان کو ذبح کر کے ان کا گوشت ایک دوسرے سے ملا دو پھر اس سارے گوشت کے کئی حصے کر دو ہر حصہ ایک پہاڑ پر رکھ دو، اس کے بعد ان پرندوں کو پکارو تا کہ میدان حشر کا منظر دیکھ سکو، انھوں نے ایسا ہی کیا تو انتہائی حیرت کے ساتھ دیکھا کہ پرندوں کے اجزا مختلف مقامات سے جمع ہو کر ان کے پاس آگئے اور ان کی ایک نئی زندگی کا آغاز ہو گیا۔

شبہ آکل و ماکول

مردوں کے زندہ ہونے کے منظر کا مشاہدہ کرنے کا تقاضا حضرت ابراہیم نے جس وجہ سے کیا تھا اس کی تفصیل بیان ہو چکی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تقاضا زیادہ تر اس وجہ سے تھا کہ ایک جانور کا بدن دوسرے جانوروں کے بدن کا جز بننے کے بعد وہ اپنی اصلی صورت میں کیسے پلٹ سکتا ہے، علم عقائد میں اسی بحث کو "شبہ آکل و ماکول" کہا جاتا ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ قیامت میں خدا انسان کو اسی مادی جسم کے ساتھ پلٹائے گا اصطلاحی الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ جسم اور روح دونوں پلٹ آئیں گے۔

اس صورت میں یہ اشکال پیش آتا ہے کہ اگر ایک انسان کا بدن خاک ہو جائے اور درختوں کی جڑوں کے ذریعہ کسی سبزی یا پھل کا جز بن جائے تو پھر کوئی دوسرا انسان اسے کھا لے اور اب یہ اس کے بدن کا جز بن جائے، یا مثال کے طور پر قحط سالی میں ایک دوسرے انسان کا گوشت کھائے تو میدان حشر میں کھائے ہوئے اجزا ان دونوں میں سے کس بدن کے جز بنیں گے، اگر پہلے بدن کا

جز بنیں تو دوسرا بدن ناقص اور دوسرے کا بنیں تو پہلا ناقص رہ جائے گا۔

[جواب]

فلسفہ اور علم عقائد کے علماء نے اس قدیم اعتراض کے مختلف جوابات دئے ہیں یہاں پر سب کے بارے میں گفتگو کرنا ضروری نہیں ہے بعض علما ایسے بھی ہیں جو قابل اطمینان جواب نہیں دے سکے اس لئے انھیں معاد جسمانی سے متعلق آیات کی توجیہ وتاویل کرنا پڑی اور انھوں نے انسان کی شخصیت کو روح اور روحانی صفات میں منحصر کردیا، حالانکہ انسانی شخصیت صرف روح پر منحصر نہیں ہے ورنہ ہی معاد جسمانی سے متعلق آیات ایسی ہیں کہ ان کی تاویل کی جاسکے، بلکہ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ وہ کاملاً صریح آیات ہیں۔

بعض لوگ ایک ایسی معاد کے بھی قائل ہیں جو ظاہراً جسمانی ہے لیکن معاد روحانی سے اس کا کوئی خاص فرق بھی نہیں ہے۔

ہم یہاں قرآن کی آیات کے ذریعہ ایک ایسا واضح راستہ اختیار کریں گے جو دور حاضر کے علوم کی نظر میں بھی صحیح ہے البتہ اس کی وضاحت کے لئے چند پہلوؤں پر غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔

۱۔ہم جانتے ہیں کہ انسانی بدن کے جز بچپن سے لے کر موت تک بار بار بدلتے رہتے ہیں یہاں تک کہ دماغ کے خلیے اگرچہ تعداد کے لحاظ سے کم یا زیادہ نہیں ہوتے پھر بھی جز کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں کیونکہ ایک طرف سے وہ غذا حاصل کرتے ہیں اور دوسری طرف ان کی تحلیل ہوتی رہتی ہے اور وقت کے ساتھ ایک مکمل تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ دس سال سے کم عرصے میں انسانی بدن کے گزشتہ ذرات میں سے کچھ باقی نہیں رہ جاتا، لیکن توجہ رہے کہ پہلے ذرات جب موت کی وادی کی طرف روانہ ہوتے ہیں تو اپنے تمام

خواص اور آثار نئے اور تازہ خلیوں کے سپرد کر جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ انسانی جسم کے تمام خصوصیت رنگ، شکل اور قیافہ سے کر دیگر جسمانی کیفیت تک زمانہ گزرنے کے باوجود اپنی جگہ قائم رہتی ہیں اور اس کی وجہ یہی ہے کہ پرانے صفات نئے خلیوں میں منتقل ہو جاتے ہیں (غور کیجئے)

اس بنا پر انسان کے بدن کے آخری اجزا جو موت کے بعد خاک میں تبدیل ہو جاتے ہیں وہ سب ان صفات کے حامل ہوتے ہیں جو اس نے پوری عمر میں کسب کئے ہیں اور یہ صفات انسانی جسم کی تمام عمر کی سرگزشت کی بولتی ہوئی تاریخ ہوتی ہیں۔

۲۔ یہ صحیح ہے کہ انسانی شخصیت کی بنیاد روح سے ہوتی ہے لیکن توجہ رہنا چاہئے کہ روح کی پرورش جسم کے ساتھ ہوتی ہے اور جسم کے ساتھ ہی روح تکامل و ارتقا کی منزل طے کرتی ہے اور دونوں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں، اسی لئے ایک جیسے دو جسم تمام جہات سے ایک دوسرے سے شباہت نہیں رکھتے دو روحیں بھی تمام پہلوؤں سے ایک دوسرے سے مشابہ نہیں ہوتی ہیں۔

اسی بنا پر کوئی روح اس جسم کی مکمل اور وسیع مفاہمت اور کارکردگی کے بغیر باقی نہیں رہ سکتی جس کے ساتھ اس نے پرورش پائی ہو اور تکامل و ارتقاء حاصل کیا ہو لہٰذا ضروری ہے کہ قیامت میں وہی سابق جسم لوٹ آئے، تاکہ اس سے وابستہ ہو کر روح عالی ترین مرحلے میں نئے سرے سے اپنی فعالیت کا آغاز کرے اور اپنے انجام دئے ہوئے اعمال کے نتائج سے فیضیاب ہو۔

۳۔ انسانی بدن کا ہر روز اس کے تمام جسمانی مشخصات کا حامل ہوتا ہے یعنی اگر واقعاً ہم بدن کے ہر خلیے کی پرورش کر کے اُسے ایک مکمل انسان بنائیں تو وہ انسان اس شخص کے تمام صفات کا حامل ہوگا جس کا جز لیا گیا تھا۔ (یہ امر بھی قابل غور ہے)

پہلے دن انسان ایک خلیے سے زیادہ نہ تھا پہلے نطفہ، خلیہ تھا، اسی میں انسان کی تمام صفات موجود تھیں، تدریجاً وہ تقسیم ہو اور دو خلیے بن گئے پھر دو سے چار ہوئے اور رفتہ رفتہ انسانی بدن کے تمام خلیے وجود میں آ گئے اسی بنا پر انسانی جسم کے تمام خلیے پہلے خلیے کی طرح ہیں اگر ان کی بھی پہلے

خلیے کی طرح پرورش ہوتو ہرایک ہرلحاظ سے یک پورا انسان ہوگا جو عینہ پہلے خلیے سے وجود میں آنے والے انسان کی سی صفات کا حامل ہوگا۔

ان مذکورہ تین مقدمات کو سامنے رکھتے ہوئے اب ہم اصل اعتراض کا جواب پیش کرتے ہیں

قرآنی آیات صاف طور پر کہتی ہیں کہ آخری ذرات جو موت کے وقت انسانی بدن میں ہوتے ہیں قیامت کے دن انسان انہی کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔ (۱)

اس بنا پر اگر کسی دوسرے انسان نے کسی کا گوشت کھایا ہو تو وہ اجزا اس کے بدن سے خارج ہوکر اصلی شخص کے بدن میں پلٹ آئیں گے، اب یہاں پر یہ سوال رہ جاتا ہے کہ پھر دوسرے کا بدن تو ضرور ناقص رہ جائے گا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ناقص نہیں ہوگا، بلکہ چھوٹا ہو جائے گا کیونکہ اس کے اجزا بدن سارے جسم میں چھپے ہوئے ہیں اب جب وہ اس سے لے لئے جائیں گے تو اس کی نسبت دوسرا بدن مجموعی طور پر لاغر اور چھوٹا ہو جائے گا، مثال کے طور پر ایک انسان کا وزن ساٹھ کلو ہے اس میں سے چالیس کلو دوسرے کے بدن کا حصہ لے لیا گیا تو باقی بیس کلو کا چھوٹا سا بدن رہ جائے گا۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس طرح کوئی مشکل تو پیدا نہیں ہوگی؟ جواب: یقیناً کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی کیونکہ یہ چھوٹا سا بدن بھی وہی دوسرے شخص کی تمام صفات کا حامل ہے، روز قیامت ایک چھوٹے بچے کی طرح اس کی پرورش ہوگی اور وہ بڑا ہو کر مکمل انسان کی شکل میں محشور ہوگا، حشر و نشر کے موقع پر ایسی پرورش و تکامل اور ارتقاء میں عقلی اور نقلی طور پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔

یہ پرورش محشور ہوتے وقت فوری ہوگی یا تدریجی؟ یہ ہمارے لئے واضح نہیں ہے لیکن ہم اتنا جانتے ہیں کہ جو بھی صورت ہو اس سے کوئی اعتراض پیدا نہیں ہو سکتا، اور دونوں صورتوں میں مسئلہ حل ہے۔

(۱) ان آیات کا مطالعہ کیجئے کہ جن میں فرمایا گیا ہے کہ لوگ اپنی قبروں سے زندہ اٹھیں گے

اب یہاں پر ایک یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ اگر کسی شخص کا سارا جسم دوسرے شخص کے اجزا سے تشکیل پایا ہو تو اس صورت میں کیا ہوگا؟

اس سوال کا جواب بھی واضح ہے کہ اصولی طور پر ایسا ہونا محال ہے کیونکہ مسئلہ آکل و ماکول کی بنیاد یہ ہے کہ ایک بدن پہلے موجود ہو اور وہ دوسرے بدن سے کھائے اور یوں پرورش پائے، لہٰذا یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کسی بدن کے تمام اجزا دوسرے بدن سے تشکیل پائیں، پہلے ایک بدن فرض کرنا ہوگا جو دوسرے بدن کو کھائے، اس طرح دوسرے بدن کا جز بنے گا نہ کل۔ (غور کیجئے)

ہمارے بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ بدن سے معاد جسمانی کے مسئلہ پر کوئی اعتراض پیدا نہیں ہوتا اور جن آیات میں اس مفہوم کی صراحت کی گئی ہے ان کی کوئی توجیہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔(۱)

---

(۱) تفسیر نمونہ، جلد ۲، صفحہ ۲۴۳

۶۱۔روح کیا ہے؟ اور یہ کیسے ثابت کیا جا سکتا ہے کہ روح ہی اصل ہے؟

جیسا کہ ہم قرآن مجید کے سورہ اسراء، آیت نمبر ۸۵ میں پڑھتے ہیں ﴿ وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي ﴾ "اور پیغمبر یہ آپ سے روح کے بارے میں دریافت کرتے ہیں تو کہہ دیجئے کہ یہ میرے پروردگار کا ایک امر ہے"۔

گزشتہ اور موجودہ دور کے مفسرین نے "روح" کے معنی اور اس آیت کی تفسیر کے بارے میں بہت کچھ کہا ہے، ہم پہلے لغت کے اعتبار سے "روح" کے معنی کے بارے میں گفتگو کریں گے اس کے بعد قرآن میں یہ لفظ جہاں جہاں آیا ہے اسے دیکھیں گے اور اس سلسلہ میں وارد شدہ روایات بھی بیان کریں گے۔

۱۔لغت میں: لغت کے لحاظ سے "روح" دراصل "نفس" اور "دوڑنے" کے معنی میں ہے، بعض لغویوں نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ "روح" اور "ریح" (ہوا) ایک ہی معنی سے مشتق ہیں اور روح انسان جو مستقل اور مجرد گوہر ہے اسے اس نام سے اس لئے موسوم کیا گیا کہ یہ تحرک، حیات آفرینی اور ظاہر نہ ہونے کے لحاظ سے نفس اور ہوا کی طرح ہے۔

۲۔قرآنی آیات میں: قرآن حکیم میں یہ لفظ مختلف اور متنوع صورت میں آیا ہے، کبھی یہ لفظ انبیاء و مرسلین کو ان کی رسالت کی انجام دہی میں تقویت پہنچانے والی مقدس روح کے معنی میں آیا ہے، مثلاً سورہ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ﴾(۱)

''اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو کھلی ہوئی نشانیاں دی ہیں اور روح القدس کے ذریعہ ان کی تائید کی ہے''۔

کبھی یہ لفظ مومنین کو تقویت بخشنے والی اللہ کی روحانی اور معنوی قوت کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے، جیسا کہ سورہ مجادلہ میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُمْ بِرُوحٍ مِنْهُ﴾(۲)

''اللہ نے صاحبان ایمان کے دلوں میں ایمان لکھ دیا ہے اور ان کی اپنی خاص روح کے ذریعہ تائید کی ہے''۔

اور کبھی وحی سے خاص فرشتہ کے مفہوم میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے، اور ''امین'' کے لفظ سے اس کی توصیف کی گئی ہے مثلاً سورہ شعراء میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ☆ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنْذِرِينَ﴾(۳)

''یہ آپ کے قلب پر نازل ہوا ہے تاکہ آپ لوگوں کو عذاب الٰہی سے ڈرائیں''۔

کبھی یہ لفظ خدا کے خاص فرشتوں میں سے ایک عظیم فرشتہ یا فرشتوں سے برتر ایک مخلوق کے معنی میں آیا ہے، مثلاً سورہ قدر میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ مِنْ كُلِّ أَمْرٍ﴾(۴)

''اس میں ملائکہ اور روح القدس اذن خدا کے ساتھ تمام امور کو لے کر نازل ہوتے ہیں''۔

---

(۱) سورہ بقرہ، آیت ۲۵۳

(۲) سورۂ مجادلہ، آیت ۲۲

(۳) سورۂ شعراء، آیت ۱۹۳، ۱۹۴

(۴) سورۂ قدر، آیت ۴

نیز سورہ نباء میں بھی آیا ہے ﴿يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلائِكَةُ صَفًّا﴾(۱)

''جس دن روح القدس اور ملائکہ صف بستہ کھڑے ہوں گے''۔

کبھی یہ لفظ قرآن اور وحی آسمانی کے معنی میں آیا ہے مثلاً ﴿وَكَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِنْ أَمْرِنَا﴾(۲)

''اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف اپنے حکم سے روح [قرآن] کی وحی کی ہے''۔

کبھی یہ لفظ روح انسانی کے معنی میں آیا ہے جیسا کہ خلقت آدم سے متعلق آیات میں بیان ہوا ہے

﴿ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِنْ رُوحِهِ﴾(۳)

''اس کے بعد اسے برابر کر کے اس میں اپنی روح پھونک دی ہے''۔

اسی طرح سورہ حجر میں ارشاد ہوتا ہے ﴿فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ﴾(۴)

''پھر جب مکمل کرلوں اور اس میں اپنی روح حیات پھونک دوں تو سب کے سب سجدہ میں گر پڑنا''۔(۵)

۳۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ روح سے کیا مراد کیا ہے؟ یہ کس روح کا تذکرہ ہے کہ جس کے بارے میں کچھ لوگوں نے رسول اکرمؐ سے سوال کیا ہے اور آپ نے ان کے جواب میں فرمایا کہ روح میرے رب کے امر میں سے ہے اور تمہارے پاس صرف تھوڑا سا علم ہے۔

---

(۱) سورۂ نباء، آیت ۳۸ (۲) سورۂ شوریٰ آیت ۵۲

(۳) سورۂ سجدہ، آیت ۹ (۴) سورہ حجر آیت ۲۹

(۵) یہاں پر روح کی صفت خدا کی طرف اظہار عظمت کے لئے ہے اور مراد یہ ہے کہ خدا نے انسان کو ایک عظیم اور الٰہی مقدس روح بخشی ہے۔

آیت کے اندرونی و بیرونی قرائن سے ایسا لگتا ہے کہ سوال کرنے والوں نے انسان کی روح سے متعلق سوال کیا ہے، وہی عظیم روح جو انسان کو حیوانات سے جدا کرتی ہے جو ہمارا افضل ترین شرف ہے جو ہماری تمام تر طاقت اور فعالیت کا سرچشمہ ہے، جس کی مدد سے ہم زمین و آسمان کو اپنی جولان گاہ بنائے ہوئے ہیں، جس کے ذریعہ ہم علمی اسرار کی گتھیاں سلجھاتے ہیں، جس کے ذریعہ ہم موجودات کی گہرائیوں تک پہنچنے کا راستہ پاتے ہیں، چنانچہ وہ لوگ عالم خلقت کے اس عجوبہ کی حقیقت معلوم کرنا چاہتے تھے۔

روح کی ساخت، مادہ کی ساخت سے مختلف ہے اس پر حاکم اصول، مادہ پر حاکم اصولوں اور طبیعی اور کیمیائی خواص سے مختلف ہیں، لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ وہ مختصر و پُر معنی جملہ کہیں کہ: "روح عالم امر میں سے ہے" یعنی اس کی خلقت پر اسرار ہے۔

اس کے بعد اس بنا پر کہ انھیں اس جواب پر تعجب نہ ہو مزید فرمایا: تمہارا علم بہت کم ہے لہٰذا کون سے تعجب کی بات ہے کہ تم روح کے اسرار نہ جان سکو اگرچہ وہ ہر چیز کی نسبت تم سے زیادہ قریب ہے۔

تفسیر عیاشی میں حضرت امام محمد باقر اور امام صادق علیہما السلام سے منقول ہے کہ آپ نے آیہ ﴿وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ﴾ کی تفسیر کے سلسلہ میں فرمایا: "إنّما الرُّوح خلق من خلقه، له بصر و قوة و تأييد ينفخه في قلوب الرّسل والمؤمنين"(۱) (روح مخلوقات خدا میں سے ہے اور بینائی کی قوت رکھتی ہے خدا اسے انبیاء اور مومنین کے دلوں میں قرار دیتا ہے۔)

ایک حدیث انھیں دونوں ائمہ میں سے ایک سے منقول ہے اس میں بیان ہوا ہے "هي من الملكوت من القدرة"(۲) (روح عالم ملکوت اور خدا کی قدرت میں سے ہے۔)

---

(۱) نور الثقلین، جلد ۳، صفحہ ۲۱۶۔ (۲) نور الثقلین، جلد ۳، صفحہ ۲۱۶

شیعہ اور سنی کتاب کی متعدد روایات میں ہے کہ مشرکین قریش نے یہ سوال علمائے اہل کتاب سے حاصل کیا وہ اس کے ذریعہ رسول اللہؐ کو آزمانا چاہتے تھے ان سے کہا گیا تھا کہ اگر (محمدؐ) نے روح کے بارے میں تمہیں کچھ بتادیا تو یہ اس کی عدم صداقت کی دلیل ہوگی۔ لیکن آپ نے ایک مختصر اور پُرمعنی جواب دے کر انہیں حیران کردیا۔

مگر اہل بیت علیہم السلام کے ذریعہ جو روایات نقل ہوئی ہیں کہ ان میں روح کو ایک ایسی مخلوق بتایا ہے جو جبرئیل اور میکائیل سے افضل ہے جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ معصومین علیہم السلام کے ساتھ رہتی ہے، اور انھیں ان کے احکام میں انحراف سے دور رکھتی ہے(۱)

آیت کی تفسیر کے بارے میں ہم نے جو کچھ کہا ہے وہ روایات نہ فقط اس کے منافی نہیں ہیں بلکہ اس سے ہم آہنگ ہیں کیونکہ انسانی روح کے مختلف درجے اور مراتب ہیں، انبیاء اور ائمہ علیہم السلام کی روح کا مرتبہ غیر معصوم اور بہت بلند ہے، اور گناہ وخطا سے معصوم ہونا جس کے آثار میں سے ہے، بہت زیادہ علم وآگاہی بھی اس کے آثار میں سے ہے اور مسلّم ہے کہ روح کا یہ مرتبہ تمام فرشتوں سے افضل ہوگا یہاں تک کہ جبرئیل اور میکائیل سے بھی (غور کیجئے)

روح کی اصالت اور اس کا استقلال

علم انسان کی تاریخ گواہ ہے کہ روح، اس کی ساخت اور اس کی اسرار آمیز خصوصیات کا مسئلہ ہمیشہ علماء کے غور وفکر کا عنوان رہا ہے، ہر عالم نے روح کی وادیٔ اسرار میں قدم رکھنے کی اپنی بساط بھر کوشش کی ہے، یہی وجہ ہے کہ روح کے بارے میں علماء کے نظریات بہت زیادہ اور متنوع ہیں، ہوسکتا ہے کہ ہمارا آج کا علم بلکہ آئندہ آنے والوں کا علم بھی روح کے تمام اسرار ورموز تک پہنچنے کے لئے کافی نہ ہو اگرچہ ہماری روح اس دنیا کی ہر چیز سے ہمارے قریب تر ہے، اور اس کا گوہر ہر چیز

(۱) تفسیر نور الثقلین، جلد۳، صفحہ ۲۱۵

سے بالکل مختلف ہے جس سے ہمیں اس عالم مادہ میں سروکار رہتا ہے۔

اس پر زیادہ تعجب بھی نہیں کرنا چاہئے کہ ہم اس عجوبۂ روزگار اور مافوق مادہ مخلوق کے اسرار اور حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے، بہر حال یہ صورت حال اس چیز میں مانع نہیں ہے کہ ہم روح کو دور سے نظر آنے والے منظر کو عقل کی تیز بین نگاہ سے دیکھ سکیں، اس پر حکم فرما اصول اور عمومی نظام سے آگاہی حاصل کر سکیں، اس سلسلہ میں اہم ترین روح کی اصالت واستقلال کا مسئلہ ہے جسے جاننا چاہئے۔

مادہ پرست روح کو مادی اور دماغ کے مادی خواص اور نسوں کے خلیے (Nerve Calls) میں سمجھتے ہیں اس کے علاوہ ان کی نظر میں روح کچھ نہیں ہے، ہم یہاں زیادہ تر اسی نکتے پر بحث کریں گے بجائے روح کی بحث اور تجرد کامل یا تجرد مثالی کی گفتگو کا انحصار اسی مسئلے پر ہے، لیکن پہلے اس نکتہ کا ذکر ضروری ہے کہ انسانی بدن سے روح کا تعلق یہ نہیں ہے جیسا کہ بعض نے گمان کر رکھا ہے، روح نے بدن میں حلول نہیں کر رکھا ہے اور نہ یہ مشک میں ہوا کی طرح انسانی جسم میں موجود ہے بلکہ بدن اور روح کے مابین ایک قسم کا ارتباط ہے اور یہ ارتباط روح کی بدن پر حاکمیت، تصرف اور اس کی تدبیر کی بنیاد پر ہے، بعض افراد نے اس ارتباط کو لفظ اور معنی کے مابین تعلق سے تشبیہ دی ہے، جبکہ ہم استقلال روح کے مسئلہ میں بحث کریں گے تو یہ بات بھی واضح ہو جائے گی۔

اب ہم اصل گفتگو کی طرف آتے ہیں:

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انسان پتھر اور لکڑی سے مختلف ہے کیونکہ ہم اچھی طرح محسوس کرتے ہیں کہ ہم بے جان موجودات بلکہ نباتات سے بھی مختلف ہیں ہم سوچتے ہیں، ارادہ کرتے ہیں، محبت اور نفرت کرتے ہیں، وغیرہ۔

لیکن پتھر اور نباتات میں یہ احساسات نہیں ہیں لہٰذا ہمارے اور ان کے درمیان ایک بنیادی فرق موجود ہے اور اس کی وجہ انسان کی روح ہے۔

مادہ پرست یا کوئی اور نفس اور روح کے وجود کے منکر نہیں ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ علم

نفسیات(Psychology) اور (Psychoanalism)کو یک مثبت علم سمجھتے ہیں، یہ دونوں علم اگرچہ کئی جہت سے اپنے ابتدائی مراحل طے کررہے ہیں تاہم دنیا کی بڑی سے بڑی یونیورسٹی میں اساتذہ اور طلباء اس کے بارے میں مطالعہ وتحقیق میں مصروف ہیں۔

جیسا کہ ہم بیان کریں گے کہ نفس اور روح دو الگ الگ حقائق نہیں ہیں بلکہ ایک ہی حقیقت کے دو مختلف مراحل ہیں، جہاں جسم سے روح کے رابطے کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے اور ان دونوں کے متقابل تاثیر بیان ہوتی ہے وہاں ''نفس'' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے اور جہاں جسم سے الگ روح سے ظاہر ہونے والے آثار پر گفتگو ہوتی ہے وہاں لفظ ''روح'' استعمال ہوتا ہے، مختصر یہ کہ کوئی شخص انکار نہیں کرتا ہے کہ ہم میں روح اور نفس نام کی یک حقیقت موجود نہیں ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ مادہ پرستوں (Materialists) اور ماوراء طبیعت کے فلاسفہ اور روحیوں (Spirtulists) کے درمیان کیا نزاع ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ دینی علماء اور روحانی فلاسفہ کا یہ نظریہ ہے کہ جس مواد سے انسانی جسم بنتا ہے، اس کے علاوہ اس میں ایک اور حقیقت اور جوہر مخفی ہے کہ جو مادہ نہیں ہے لیکن انسانی بدن بلاواسطہ اس کے زیر اثر ہے۔

دوسرے لفظوں میں روح ایک ماوراء طبعی حقیقت ہے اس کی ساخت اور فعالیت مادی دنیا کی ساخت اور فعالیت سے مختلف ہے، یہ ٹھیک ہے کہ یہ ہمیشہ مادی دنیا سے مربوط رہتی ہے لیکن یہ خود مادہ یا خاصیت مادہ نہیں ہے۔

ان کے مدمقابل مادیت کے فلاسفہ کہتے ہیں کہ ہمارے وجود میں روح نام کے مادہ کے علاوہ کوئی مستقل وجود نہیں اور مادہ سے ہٹ کر روح نام کی کوئی چیز نہیں جو کچھ بھی ہے یہی جسمانی مادہ ہے، یا اس کے طبیعی اور کیمیائی (Physical and chemical) آثار ہیں ہمارے اندر دماغ اور اعصاب نام کی یک مشینری ہے جو ہماری زندگی کے اعمال کا یک اہم حصہ ہے وہ بھی باقی مادی

بدن کی مشینریوں کی طرح ہے اور مادی قوانین کے تحت کام کرتی ہے۔

ہماری زبان کے نیچے کچھ غدود ہوتے ہیں جنہیں غدودہائے بزاق (لعاب دہن کے غدے) (S.ve Glands) کہا جاتا ہے، یہ طبیعی عمل بھی کرتے ہیں اور کیمیائی بھی جس وقت غذا منھ میں جاتی ہے تو یہ "Artes.ens" کی طرح خود بخود کام شروع کر دیتے ہیں، یہ حساب میں اتنے ماہر ہیں کہ پانی کی بالکل تی مقدار جتنی غذا کو چبانے اور نرم کرنے کے لئے ضروری ہے اس پر چھڑ کتے ہیں پانی والی غذا، کم پانی والی غذا، یا خشک غذا ہر ایک اپنی ضرورت کے مطابق لعاب دہن سے اپنا حصہ لیتی ہے۔

تیزابی مواد خصوصاً جس وقت زیادہ سخت ہوں ان غدود کی کارکردگی بڑھا دیتے ہیں، تاکہ زیادہ مقدار میں پانی سے اور یہ خوب باریک ہو جائے اور معدہ کی دیواروں کو نقصان نہ پہنچائے۔

جس وقت انسان غذا کو نگل لیتا ہے ان کنوؤں کا عمل خود بخود رک جاتا ہے، مختصر یہ کہ ان اپنے ان چشموں پر ایک عجیب وغریب نظام حکم فرما ہے ایسا نظام کہ اگر اس کا توازن بگڑ جائے یا ہمیشہ لعاب دہن ہمارے منہ سے گرتا رہے یا ہماری زبان اور حلق کسی قدر خشک ہو جائے تو ہمارے حلق میں لقمہ پھنس جائے۔

یہ لعاب دہن کا طبیعی کام ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس کا زیادہ اہم کام کیمیائی ہے، اس میں مختلف طرح کا مواد مخلوط ہوتا ہے اور یہ غذا سے مل کر نئی ترکیب کو جنم دیتا ہے جس سے معدہ کی زحمت کم ہو جاتی ہے۔

مادہ پرست کہتے ہیں کہ ہمارے اعصاب اور مغز کا سلسلہ لعاب دہن کے غدوں کی مانند ہے اور یہ اسی طرح کے طبیعی اور کیمیائی عمل کا حامل ہے کہ جسے مجموعی طور پر طبیعی کیمیائی (Physical and chem cal) کہا جاتا ہے، اور یہی طبیعی اور کیمیائی فعالیتیں ہیں جنھیں ہم آتما روح یا روح کہتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ جب ہم سوچ رہے ہوتے ہیں تو ایک خاص برقی سلسلہ ہمارے دماغ سے

اٹھتا ہے، دور حاضر میں مشینوں کے ذریعہ ان لہروں کو کاغذ پر ثبت کر دیا جاتا ہے خصوصاً نفسیاتی بیماروں کے اسپتالوں میں ان لہروں کے مطالعہ سے نفسیاتی بیماریوں کی تشخیص اور علاج کیا جاتا ہے، یہ ہمارے دماغ کی طبیعی (Physical) فعالیت ہے۔

اس کے علاوہ غور و فکر کرتے وقت اور نفسیاتی فعالیت کے موقع پر ہمارے دماغ کے خلیے ایک کیمیائی فعالیت بلند کرتے ہیں لہٰذا روح اور آثار روح ہمارے دماغ اور اعصاب کے خلیوں کے کیمیائی تفاعل و انفعال کے طبیعی خواص کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہے۔

اس بحث سے اہل مادہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں

۱۔ جیسے حاب دہن کے غدود کی فعالیت اور ان کے مختصر اثرات بدن سے پہلے نہ تھے اور نہ اس کے بعد ہوں گے، اسی طرح ہماری روح کی کارکردگی بھی دماغ اور اعصاب کی مشینری کے پیدا ہونے سے وجود میں آتی ہے اور اس کے مرنے سے مرجاتی ہے۔

۲۔ روح جسم کے خواص میں سے ہے لہٰذا وہ مادی شئے ہے اور ماوراء طبیعت کا پہلو نہیں رکھتی۔

۳۔ روح پر بھی وہی قوانین حکم فرما ہیں جو جسم پر حکومت کرتے ہیں۔

۴۔ روح بدن کے بغیر کوئی مستقل وجود نہیں رکھتی اور نہ ہی رکھ سکتی ہے۔

روح کے عدم استقلال پر مادہ پرستوں کے دلائل

مادہ پرستوں کا نظریہ ہے کہ روح فکر اور روح کے تمام آثار مادی ہیں یعنی دماغ اور اعصاب کے خلیوں کے طبیعی اور کیمیائی خواص ہیں، انھوں نے اپنے دعویٰ کے اثبات کے لئے کچھ شواہد پیش کئے ہیں، مثلاً:

۱۔ بہت ہی آسانی کے ساتھ نشاندہی کی جا سکتی ہے کہ اگر مراکز کا ایک حصہ یا اعصاب کا

ایک سلسلہ بے کار ہو جائے تو آثارِ روح کا ایک حصہ معطل ہو جاتا ہے۔(۱)

مثلاً تجربہ کیا گیا ہے کہ کبوتر کے مغز کا ایک خاص حصہ الگ کر دیا جائے تو کبوتر مرتا نہیں لیکن اس کی معلومات کا بہت سا حصہ ختم ہو جاتا ہے، اگر اسے غذا ئیں کھلائیں تو کھاتا ہے اور ہضم کرتا ہے اور اگر نہ کھلائیں صرف دانہ اس کے سامنے ڈال دیں تو نہیں کھاتا اور بھوک سے مر جاتا ہے'

اسی طرح اگر انسان کے دماغ پر کچھ ضربات لگائی جائیں یا بعض بیماریوں کی وجہ سے اس کے دماغ کا کچھ حصہ بیکار ہو جائے تو دیکھا جاتا ہے کہ انسان بہت سی چیزوں کو بھول جاتا ہے۔

کچھ عرصہ پہلے ہم نے جرائد اور اخباروں میں پڑھا تھا کہ ایک تعلیم یافتہ نوجوان کو اہواز کے قریب ایک واقعہ پیش آیا اس واقعہ میں اس کے دماغ پر ضرب آئی، وہ اپنی زندگی کے تمام گزشتہ واقعات بھول گیا یہاں تک وہ اپنے ماں باپ تک کو نہیں پہچانتا تھا، اسے اس کے گھر لے جایا گیا اس نے اسی گھر میں پرورش پائی تھی مگر وہ وہاں اپنے کو بالکل اجنبی محسوس کر رہا تھا۔

ایسے واقعات نشاندہی کرتے ہیں کہ دماغ کے خلیوں کی فعالیت اور آثارِ روح کے درمیان ایک قریبی ربط ہے۔

۲۔ غور و فکر کرتے وقت دماغ کی سطح پر مادی تغیرات زیادہ ہوتے ہیں، دماغ زیادہ غذا لیتا ہے اور فاسفورس (Phosphore) واپس کرتا ہے، سوتے وقت جبکہ دماغ فکری کام نہیں کرتا، تھوڑی غذا لیتا ہے، یہ امر آثارِ فکر کے مادی ہونے کی دلیل ہے۔(۲)

۳۔ مشاہدات سے معلوم ہوتا ہے کہ غور و فکر کرنے والوں کے دماغ کا وزن عام لوگوں کی

---

(۱) سائیکالوجی (Phychology) ڈاکٹر ارانی صفحہ ۲۳

(۲) آثار فکر مادی، ڈاکٹر ارانی صفحہ ۲

نسبت زیادہ ہوتا ہے (اوسطاً مردوں کے دماغ کا وزن ۱۴۰۰ گرام ہوتا ہے اور عورتوں کے دماغ کا اوسطاً وزن اس سے کچھ کم ہوتا ہے)، یہ امر بھی روح کے مادی ہونے کی نشاندہی کرتا ہے۔

۴۔ اگر قوائے فکری و مظاہر روح، روح کے ایک مستقل وجود ہونے کی دلیل ہیں تو یہ بات ہمیں حیوانات کے لئے بھی ماننا چاہئے کیونکہ وہ بھی اپنی حد تک ادراک رکھتے ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہماری روح موجود مستقل نہیں ہے اور انسان شناسی کے علم نے جو ترقی کی ہے وہ بھی اس حقیقت کی تائید کرتی ہے۔

ان دلائل سے مجموعی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسانی اور حیوانی فیزیالوجی کی ترقی اور وسعت روز بروز اس حقیقت کو زیادہ واضح کر رہی ہے کہ آثار روح اور دماغی خلیوں کے درمیان قریبی تعلق ہے۔

اس استدلال کے کمزور پہلو

مادہ پرستوں کے اس استدلال میں ایک بہت بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ انھوں نے آلات کارکو کام کا فاعل سمجھ لیا ہے۔

یہ واضح کرنے کے لئے کہ انھوں نے آلات کو فاعل کیسے سمجھ لیا ہے ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں، اس مثال پر غور کیجئے

"گیلیلیو" کے بعد آسمان کی وضع و کیفیت کے مطالعہ میں ایک انقلاب پیدا ہوا ہے، "گیلیلیو" (ایٹالین) نے عینک ساز کی مدد سے ایک چھوٹی سے دوربین بنائی اور وہ اس پر بہت خوش ہو جب اس نے رات کے وقت اس کی مدد سے آسمانی ستاروں کا مطالعہ شروع کیا تو اس نے حیرت انگیز منظر دیکھا، ایسا منظر اس سے پہلے کسی انسان نے نہیں دیکھا تھا، اس نے سمجھ کہ میں نے ایک اہم انکشاف کیا ہے، اس طرح اس دن کے بعد انسان عالم بالا کے اسرار کا مطالعہ کرنے کے قابل ہوگیا۔

اس وقت تک انسان ایک ایسے پروانے کی طرح تھا جس نے فقط اپنے اردگرد کی چند شاخیں دیکھی تھیں لیکن جب اس نے دوربین کے ذریعہ جھانکا تو اسے فطرت کا ایک عظیم جہان دکھائی دیا۔

اس سلسلہ میں ترقی و تکامل جاری رہا یہاں تک کہ ستاروں کو دیکھنے کے لئے بڑی بڑی دوربینیں ایجاد ہوگئیں جن کا لینس پانچ میٹر یا اس سے بھی زیادہ تھا، انھیں پہاڑوں کی ایسی بلند چوٹیوں پر نصب کیا گیا جو صاف وشفاف ہوا کے اعتبار سے مناسب تھیں، ایسی ایسی دوربینیں بنیں جو کئی منزلہ عمارت کے برابر تھیں، ان کے ذریعہ انسان کو عالم بالا میں کئی جہان دکھائی دئے، ایسے ایسے جہان کہ عام نظر سے انسان کو ہزارواں حصہ بھی نظر نہیں آتا تھا۔

اب آپ سوچیں کہ اگر ایک دن علم اتنی ترقی کر جائے کہ انسان ایسی دوربین بنائے جس کے عدسے کا قطر ۱۰۰ میٹر ہو اور جس کا ساز وسامان اور وسعت ایک شہر کے برابر ہو تو ہم پر کتنے جہان منکشف ہوں گے۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ دوربینیں ہم سے لے لی جائیں تو یقینی طور پر آسمان کے بارے میں ہماری معلومات اور مشاہدات کا ایک حصہ معطل ہو جائے گا، لیکن کیا حقیقی طور پر دیکھنے والے ہم ہیں یا دوربینیں؟

کیا ٹیلسکوپ ہمارے لئے آلۂ کار ہے یا خود عامل کار اور خود دیکھنے والی؟

دماغ کے بارے میں بھی کوئی شخص انکار نہیں کرتا کہ دماغ کے خلیے کے بغیر غور وفکر نہیں کی جا سکتا، لیکن کیا دماغ روح کے کام کا آلہ ہے یا خود روح؟!

مختصر یہ کہ مادہ پرستوں نے جو تمام دلائل پیش کئے ہیں وہ صرف یہ ثابت کرتے ہیں کہ دماغ کے خلیے اور ہمارے ادراک کے درمیان ربط موجود ہے لیکن ان میں سے کوئی دلیل یہ ثابت نہیں کرتی کہ دماغ خود غور وفکر کرتا ہے نہ کہ ادراک کا آلہ ہے۔ (غور کیجئے)

یہاں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مردے اگر کچھ نہیں سمجھتے تو اس کی وجہ روح کا بدن سے رابطہ کا ختم ہو جانا ہے، نہ کہ روح فنا ہوگئی ہے، یہ بات بالکل اسی طرح ہے جیسے کسی بحری یا ہوائی جہاز کا وائرلیس خراب ہو جائے اور اس کا ساحل یا ایرپورٹ سے رابطہ نہ ہو سکے کیونکہ رابطہ کا ذریعہ منقطع ہو گیا ہے۔

استقلال روح کے دلائل

بات یہ ہو رہی تھی کہ مادہ پرستوں کا اصرار ہے کہ روح سے ظاہر ہونے والے آثار وافعال کو دماغی خلیوں کے خواص سمجھنا چاہئے اور فکر، حافظہ، ایجاد، محبت، نفرت، غصہ اور علم و دانش سب کو ایسے امور سمجھنا چاہئے جنھیں تجربہ گاہ میں دیکھا اور پرکھا جا سکتا ہے، اور جنھیں بھی عالم مادہ کے قوانین کے تحت سمجھنا چاہئے، اس کے برعکس استقلال روح کے فلاسفہ اس کی نفی پر مستحکم دلائل بیان کرتے ہیں جن میں سے ہم ذیل میں بعض کی طرف اشارہ کرتے ہیں

۱۔روح کا کام حقیقت نمائی ہے

مادہ پرستوں سے پہلا سوال یہ کیا جا سکتا ہے کہ روح کے افکار و آثار دماغ کے طبیعی اور کیمیائی (Phys co chemical) خواص ہیں تو پھر دماغ، معدہ، دل اور جگر وغیرہ کے کاموں میں کوئی اصولی فرق نہیں ہونا چاہئے۔

مثلاً معدے کا کام طبیعی اور کیمیائی کارکردگی کا مرکب ہے معدہ اپنی خاص حرکات کے ذریعہ اور تیزاب کے ترشح سے غذا کو ہضم اور اسے بدن میں جذب کرنے کے لئے تیار کرتا ہے، اسی طرح جیسے کہ کہا گیا ہے کہ لعاب دہن کا کام طبیعی اور کیمیائی عمل کی ترکیب ہے حالانکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ روح کے کام ان سب سے مختلف ہیں۔

بدن کی تمام مشینریوں کے کام ایک دوسرے سے تھوڑی بہت شباہت رکھتے ہیں لیکن دماغ

کی کیفیت استثنائی ہے، تمام مشینریوں کے کام اندرونی پہلو رکھتے ہیں جبکہ روح سے ظاہر ہونے والے کام بیرونی پہلو رکھتے ہیں اور ہمیں ہمارے وجود سے باہر کی کیفیت سے آگاہ کرتے ہیں۔

اس گفتگو کی وضاحت کے لئے چند نکات کی طرف توجہ کرنا چاہئے:

پہلا نکتہ یہ ہے کہ کیا ہمارے وجود سے باہر کوئی جہان ہے یا نہیں؟ مسلّم ہے کہ باہر بھی ایک جہان ہے، آئیڈیالسٹ حضرات (Idealists) خارجی جہان کا انکار کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہے بس ہم ہی ہیں اور ہمارے تصورات، ورخارجی جہاں بالکل ان مناظر کی طرح ہیں جنھیں ہم عالم خواب میں دیکھتے ہیں ور سب کچھ تصورات ہی ہیں اور کچھ نہیں ہے۔

یہ لوگ بہت بڑی غلطی پر ہیں، ہم نے متعلقہ بحث میں ان کی غلط فہمی کو ثابت کیا ہے کہ کس طرح سے آئیڈیالسٹ عمل میں ریلیسٹ (Realists) ہوجاتے ہیں اور جو کچھ وہ کتابی دنیا میں سوچتے ہیں سے کوچہ و بازار اور عام زندگی کے ماحول میں قدم رکھتے ہی بھول جاتے ہیں۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ کیا ہم اپنے وجود سے باہر کے جہان سے آگاہ ہیں یا نہیں؟ یقیناً اس سوال کا جواب بھی مثبت ہے کیونکہ ہم اپنے وجود سے باہر کے جہان کے بارے میں بہت سا علم رکھتے ہیں اور ان موجودات کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں کہ جو ہمارے آس پاس سے بہت دور ہیں۔

اس وقت یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا خارجی جہان ہمارے وجود میں آسکتا ہے؟ مسلم ہے کہ ایسا نہیں ہوسکتا، بلکہ اس کا نقشہ ہمارے پاس ہے اور ہم واقع نمائی کی خاصیت سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے وجود سے باہر کے جہان کو معلوم کرسکتے ہیں کیونکہ یہ واقع نمائی دماغ کے صرف طبیعی کیمیائی (Phys.co chemical) عمل کے خواص نہیں ہوسکتے کیونکہ یہ خواص بیرونی دنیا کے بارے میں ہمارے تاثرات کی پیداوار ہیں یعنی ان کے معلول ہیں، جیسے غذا ہمارے معدہ پر اثرات چھوڑتی ہے تو کیا غذا کے معدہ پر تاثرات کا طبیعی، ور کیمیائی فعل وانفعال سبب بن سکتا ہے کہ معدہ غذا

کے بارے میں آگاہی رکھتا ہو؟ تو پھر کس طرح ہمارا دماغ اپنے سے باہر کی دنیا سے باخبر ہو سکتا ہے؟

دوسرے لفظوں میں خارجی اور عینی موجودات سے آگاہی کے لئے ان پر ایک قسم کا احاطہ ضروری ہے اور یہ احاطہ کرنا دماغ کے خلیوں کا کام نہیں ہے، دماغ کے خلیے تو صرف خارج سے متاثر ہوتے ہیں، اور تاثر بدن کی مشینوں کی طرح ہے جو خارجی کیفیت سے ان پر مرتب ہوتا ہے، یہ بات ہم اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔

اگر خارجی جہان سے متاثر ہونا خارج کے بارے میں آگاہی کی دلیل ہوتا تو پھر ضروری تھا کہ ہم اپنے معدے اور زبان کے ذریعہ بھی آگاہی حاصل کرتے، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

مختصر یہ ہے کہ ہمارے ادراکات کی استثنائی کیفیت اس بات کی دلیل ہے کہ اس میں ایک دوسری حقیقت چھپی ہوئی ہے جس کا نظام طبیعی اور کیمیائی نظام سے بالکل مختلف ہے۔ (غور کیجئے)

۲۔ وحدتِ شخصیت

مستقل روح کے بارے میں جو دوسری دلیل ذکر کی جا سکتی ہے وہ انسان کی پوری زندگی میں وحدتِ شخصیت کا مسئلہ ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ ہم ہر چیز میں شک و تردید رکھتے ہیں تب بھی اس بات میں شک نہیں رکھتے کہ "ہم وجود رکھتے ہیں"۔

"میں ہوں" اور اپنی ہستی کے بارے میں مجھے کوئی شک نہیں ہے اور اپنے وجود کے بارے میں میرا علم حضوری ہے حصولی نہیں، یعنی میں اپنے آپ کے سامنے حاضر ہوں اور اپنے آپ سے جدا نہیں ہوں۔

بہرحال اپنے آپ سے آگاہی ہماری واضح ترین معلومات میں سے ہے اور اس کے لئے کسی استدلال کی احتیاج نہیں، مشہور فرانسیسی "ڈیکارٹ" نے اپنے وجود کے لئے یہ معروف

استدلال کیا ہے "میں سوچ رہا ہوں پس میں ہوں"۔

یہ ایک اضافی اور غیر صحیح استدلال نظر آتا ہے کیونکہ اس نے اپنے وجود کو ثابت کرنے سے پہلے دو مرتبہ اپنے وجود کا اعتراف کیا ہے، ایک مرتبہ "میں" کہہ کر اور دوسری مرتبہ "رہا ہوں" کہہ کر۔

دوسری طرف دیکھا جائے تو یہ "میں" ابتدائے عمر سے آخر عمر تک ایک اکائی سے زیادہ نہیں ہے، آج کا "میں" وہی کل کا "میں"، وہی بیس سال پہلے کا "میں"، بچپن سے لے کر اب تک میں ایک شخص سے زیادہ کچھ نہیں ہوں، "میں" وہی شخص ہوں جو پہلے تھا اور آخر عمر تک یہی شخص رہوں گا، نہ کہ کوئی اور شخص، البتہ "میں" نے تعلیم حاصل کی اور "میں" پڑھا لکھا ہو گیا، "میں" نے کمال وترقی کی منزل طے کی اور پھر طے کروں گا، لیکن "میں" کوئی دوسرا آدمی نہیں ہو گیا، لہٰذا سب لوگ ابتدائے عمر سے لے کر آخر عمر تک مجھے ایک ہی آدمی جانتے ہیں میرا ایک ہی نام ہے اور یہ میں ہی کسی کا شناختی کارڈ وغیرہ ہوتا ہے۔

اب ہم سوچیں اور دیکھیں کہ یہ موجودہ حد جس میں ہماری ساری عمر پوشیدہ ہے کیا ہے؟ یہ ہمارے بدن کے ذرات یا دماغی خلیوں اور ان کے فعل وانفعالات کا مجموعہ ہے؟ یہ تو ہماری زندگی میں بارہا بدلتے رہتے ہیں اور تقریباً ہر سات سال کے بعد ایک مرتبہ تمام خلیے بدل جاتے ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں ایک شب وروز میں ہمارے بدن کے لاکھوں خلیے مرتے ہیں اور ان کی جگہ نئے خلیے لے لیتے ہیں جیسے کسی پرانی عمارت کی پرانی اینٹیں نکالتے رہیں اور ان کی جگہ نئی اینٹیں لگاتے رہیں تو ایک عرصہ بعد یہ عمارت بالکل بدل جائے گی اگرچہ عام لوگوں کو اس کا اندازہ نہ ہو، جیسے کسی ایک بڑے تالاب کا پانی ایک تالاب سے نکلتا رہتا ہے اور دوسری طرف سے تازہ پانی داخل ہوتا رہتا ہے، واضح ہے کہ کچھ عرصے بعد سارا پانی بدل جائے گا، گرچہ ظاہر میں افراد توجہ نہ کریں اور اسے پہلے والا ہی سمجھتے رہیں۔

کلی طور پر ہر موجود جو غذا حاصل کرتا ہے اور غذا کا مصرف رکھتا ہے اس کی تعمیر نو کا سلسلہ

جاری رہے گا اور وہ بدل جائے گا۔

لہٰذا ایک ستر سالہ انسان کے تمام اجزائے بدن تقریباً دس مرتبہ بدل چکے ہوتے ہیں۔ اگر ہم مادہ پرستوں کی طرح انسان کو وہی جسم اور وہی دماغ و عصاب اور وہی اس کے طبیعی اور کیمیائی خواص سمجھیں تو یہ "میں" تو ستر سال کی عمر میں دس مرتبہ بدل چکا ہوگا، اور یہ وہی پہلے والا شخص نہیں ہوگا، حالانکہ کوئی عقل اس بات کو قبول نہیں کرے گی۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ مادی اجزاء کے بجائے کوئی ایک واحد ثابت حقیقت ہے جو ساری عمر میں موجود رہتی ہے جو مادی اجزاء کی طرح بدلتی نہیں ہے، وہی دراصل وجود کی بنیاد ہے وہ وہی ہماری شخصیت کی وحدت کا عامل اور باعث ہے۔

ایک غلط فہمی سے اجتناب

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دماغ کے خلیے نہیں بدلتے، وہ کہتے ہیں کہ فیزیالوجی کی کتابوں کے مطابق دماغ کے خلیوں کی تعداد آغاز عمر سے آخر عمر تک ایک ہی رہتی ہے یعنی وہ بالکل کم یا زیادہ نہیں ہوتے، البتہ بڑے ہو جاتے ہیں لیکن یہ نہیں ہوتا کہ ان جیسے اور خلیے پیدا ہوتے ہوں، یہی وجہ ہے کہ انہیں کوئی نقصان پہنچے تو ان کی جگہ نئے خلیے پیدا نہیں ہوتے، لہٰذا ہمارے بدن میں ایک "واحد ثابت" موجود رہتا ہے اور یہ دماغ کے خلیے ہیں، یہی ہماری شخصیت کی وحدت کا محافظ ہے۔

یہ خیال ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے کیونکہ یہ خیال کرنے والوں نے دو مسئلوں کو آپس میں ملا دیا ہے، دور حاضر کی سائنس نے یہ ثابت کیا ہے کہ دماغ کے خلیے آغاز سے آخر تک تعداد کے لحاظ سے اتنے ہی رہتے ہیں، اور ان کی تعداد میں کمی بیشی نہیں ہوتی، نہ یہ کہ ان خلیوں کے ذرات نہیں بدلتے، کیونکہ ہم کہہ چکے ہیں کہ انسانی بدن کے تمام خلیوں کو ہمیشہ غذا کی ضرورت رہتی ہے نیز پرانے خلیے مرتے رہتے ہیں جیسے کوئی شخص ایک طرف کماتا رہتا ہے اور دوسری طرف خرچ کرتا رہتا ہے، مسلم

ہے کہ اس شخص کا سرمایہ آہستہ آہستہ بدل جائے گا، اگرچہ اس کی مقدار نہ بدلے، جیسے کسی تالاب سے ایک طرف سے پانی نکلتا رہے اور دوسری طرف سے نیا پانی آتا رہے، ایک عرصہ بعد اس کا سارا پانی بدل جائے گا اگرچہ اس کی مقدار وہی رہے۔

(فیزیولوجی کی کتابوں میں بھی اس بات کا ذکر موجود ہے نمونہ کے طور پر کتاب ''ہورموفز'' صفحہ ۱۱۱، اور کتاب ''فیزیالوجی حیوانی'' از ڈاکٹر محمود بہزاد و ہمراہان صفحہ نمبر ۳۲ پر رجوع کریں۔)

لہٰذا دماغ کے خلیوں میں ثبات نہیں ہیں بلکہ دوسرے خلیوں کی طرح بدلتے رہتے ہیں۔

۳۔ بڑے کا چھوٹے پر منطبق نہ ہونا

فرض کریں کہ ہم دریا کے ایک خوبصورت کنارے پر بیٹھے ہیں، چند چھوٹی چھوٹی کشتیاں پانی کی موجوں پر تیر رہی ہیں، ایک بڑی کشتی بھی ہے ایک طرف سورج غروب ہو رہا ہے اور دوسری طرف چاند طلوع ہو رہا ہے، خوبصورت آبی پرندے پانی پر آکر بیٹھتے ہیں اور اڑ جاتے ہیں، ایک طرف بہت بڑا پہاڑ ہے اس کی چوٹی آسمان سے باتیں کر رہی ہے۔

ہم ساحل پر بیٹھے چند لمحوں کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں جو کچھ دیکھا ہے اسے اپنے ذہن میں مجسم کر لیتے ہیں وہی بڑا سا پہاڑ، دریا کی وہی وسعت، وہی بڑی سی کشتی، سب ہمارے صفحہ ذہن پر ابھر آتے ہیں یعنی جیسے ایک بہت بڑا منظر ہماری روح کے سامنے یا ہماری روح کے اندر موجود ہو۔

اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اس منظر کی جگہ کہاں ہے کیا چھوٹے سے دماغ کے خلیوں میں اتنا بڑا نقشہ سما سکتا ہے، یقیناً نہیں، اس لئے ضروری ہے کہ ہمارے وجود کا ایک اور حصہ ہو جو اس جسمانی وجود سے ماوراء ہو اور اس قدر وسیع ہو کہ تمام مناظر اور نقشے اس میں سما سکیں۔

کیا ایک ۵۰۰ مربع میٹر عمارت کا نقشہ اسی لمبائی چوڑائی کے ساتھ چند مربع ملی میٹر زمین پر

بنایا جاسکتا ہے؟ مسلّم ہے کہ اس سوال کا جواب منفی ہے کیونکہ کوئی بہت بڑا موجود اپنی وسعت کے ساتھ کسی چھوٹے موجود پر منطبق نہیں ہوسکتا، انطباق کے لئے ضروری ہے کہ جسے منطبق کرتا ہے وہ اس کے مساوی ہو یا اس سے چھوٹا۔

لہٰذا ہم نہائی بڑے بڑے خیالی نقشوں کو اپنے دماغ کے چھوٹے چھوٹے خلیوں میں جگہ کیسے دے سکتے ہیں، کرہ زمین تقریباً پانچ کروڑ مربع میٹر ہے ہم اپنے ذہن میں اس کی تصویر کھینچ سکتے ہیں، کرہ آفتاب، زمین سے بارہ لاکھ گنا ہے دو کہکشائیں ہمارے آفتاب کی نسبت کئی ملین گنا ہیں، ہم اپنی فکر میں ان کی تصویر کشی کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر ہم چاہیں کہ اپنے دماغ کے چھوٹے چھوٹے خلیوں میں یہ نقشے اسی وسعت کے ساتھ بنائیں تو بڑے کے چھوٹے پر منطبق نہ ہوسکنے کے قانون کے مطابق ممکن نہیں ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ ہم اس جسم سے مافوق ایک وجود کا اعتراف کریں جس میں یہ بڑے بڑے نقشے سما سکتے ہوں۔

ایک اہم سوال اور اس کا جواب

یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہمارے ذہنی نقشے مائیکرو فلم یا جغرافیائی نقشوں کی طرح ہیں، مثلاً یا جس کے کنارے یک کسری عدد لکھا جاتا ہے جس سے اس کے چھوٹے ہونے کا اندازہ ہوتا ہے جغرافیائی نقشوں یا مائیکرو فلموں میں ہم اس طرح کا تناسب معین کرلیتے ہیں یہ اسکیل (Scsle) ہمیں بتاتا ہے کہ اس نقشے کو ہم اسی نسبت بڑا کریں گے تو اصل پیمائش کا اندازہ ہوسکتا ہے، نیز ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ کسی دیو ہیکل جہاز کی یک تصویر سے ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ کتنا بڑا ہے لہٰذا اس کی تصویر لینے سے پہلے کسی انسان کو اس کے عرشے پر کھڑا کرکے دونوں کی تصویر لیتے ہیں تاکہ موازنے سے اندازہ ہو جائے کہ جہاز کتنا بڑا ہے۔

یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ہمارے ذہنی نقشے بھی چھوٹی چھوٹی تصویریں ہیں جنھیں معین اسکیل کے تحت چھوٹا کیا گیا ہے اور اگر انھیں اسی نسبت سے بڑا کردیا جائے تو ایک حقیقی نقشہ بن جائے گا، اور مسلم ہے کہ یہ چھوٹے نقشے دماغ کے خلیوں میں بن سکتے ہیں۔ (غور کیجئے)

اب ہم اس سوال کا جواب پیش کرتے ہیں،

اہم بات یہی ہے کہ مائیکرو فلموں کو عام پروجیکٹروں کے ذریعہ بڑا کرکے پردۂ سکرین پر منعکس کرتے ہیں، اسی طرح جغرافیائی نقشوں میں دی گئی اسکیل کے مطابق ہم نقشے کو ضرب دے کر اپنے ذہن میں منعکس کرتے ہیں، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ بڑا پردہ جس پر ہماری بڑی بڑی ذہنی فلمیں منعکس ہوتی ہیں، کہاں ہیں؟

کیا وہ بڑا پردہ دماغ کے خلیے ہیں؟ وہ تو بالکل نہیں ہے اور وہ چھوٹا جغرافیائی نقشہ کہ جسے ہم بڑے عدد سے ضرب دے کر بڑے نقشہ میں تبدیل کرتے ہیں یقیناً اس کے لئے کوئی جگہ چاہئے، کیا دماغ کے چھوٹے چھوٹے خلیے اس کی جگہ لے سکتے ہیں؟

واضح الفاظ میں یوں کہیں مائیکرو فلم اور جغرافیائی نقشہ میں جو کچھ خارج میں ہے وہ تو وہی چھوٹی فلم اور نقشہ ہے لیکن ہمارے ذہنی نقشوں میں تو بعینہ وہ نقشے اپنے خارجی وجود کی مقدار کے مطابق ہیں، لہٰذا انھیں، خود انھیں کے برابر اور انھیں کی مقدار کے مطابق جگہ چاہئے، اور ہم جانتے ہیں کہ دماغ کے خلیے اس سے کہیں چھوٹے ہیں کہ انھیں اسی مقدار کے مطابق ان پر منعکس کیا جاسکے، مختصر یہ کہ ان ذہنی نقشوں کو ہم ان کے خارجی وجود کے مطابق تصور کرتے ہیں اور یہ بڑی تصویر چھوٹے سے خلیوں میں منعکس نہیں ہوسکتی، لہٰذا ان کے لئے کسی جگہ کی ضرورت ہے، یہیں سے ہمیں خلیوں سے مافوق ایک حقیقی وجود کا پتہ چل جاتا ہے۔

۴۔ روح کے مادی مظاہر کیفیات کے مانند نہیں؟

یہ دلیل بھی استقلال روح اور اس کے غیر مادی ہونے کی طرف ہماری رہنمائی کر سکتی ہے کہ مظاہر روح میں کچھ خواص و کیفیت ایسی دکھائی دیتی ہیں جو مادی موجودات کے خواص و کیفیت سے کوئی شباہت نہیں رکھتیں، کیونکہ

۱۔ موجودات کے لئے زمانہ درکار ہوتا ہے اور وہ تدریجی پہلو رکھتے ہیں۔

۲۔ وقت اور زمانہ کے ساتھ وہ کہنہ اور فرسودہ ہو جاتے ہیں۔

۳۔ ان کا متعدد اجزا میں تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔

لیکن ذہنی موجودات اور اس میں پیدا ہونے والی چیزوں میں یہ آثار و خواص نہیں ہوتے، ہم اپنے ذہن میں موجودہ جہاں کی طرح ایک جہان تصور کر سکتے ہیں بغیر اس کے کہ زمانہ گزرے اور اس کے لئے تدریجی پہلو کی ضرورت ہو۔

اس بات سے قطع نظر وہ مناظر کہ مثلاً جو بچپن میں ہمارے صفحۂ ذہن پر نقش ہو گئے تھے، زمانہ گزرنے کے باوجود فرسودہ نہیں ہوتے اور ان کی شکل اسی طرح محفوظ رہتی ہے، ہو سکتا ہے کہ انسان کا دماغ کہنہ ہو گیا ہو لیکن اس کے کہنہ پن سے وہ گھر جس کا نقشہ بیس سال قبل ہمارے ذہن میں ثبت ہوا تھا اسی طرح باقی رہتا ہے، اس میں ایک طرح کا ثبات پیدا ہو جاتا ہے جو ماوراء، وہ جہان کی خاصیت ہے۔

نقشوں اور تصویروں کے بارے میں ہماری روح عجیب و غریب صلاحیت رکھتی ہے، ہم لمحہ بھر میں کسی تمہید کے بغیر ہر قسم کا نقشہ اپنے ذہن میں بنا سکتے ہیں، مثلاً آسمانی کرات، کہکشائیں یا زمینی موجودات، دریا اور پہاڑ وغیرہ، ان سب کا تصور ہمارے ذہن میں آن واحد میں ابھر سکتا ہے، یہ خاصیت ایک مادی موجود کی نہیں ہے بلکہ مافوق، وہ موجود کی نشانی ہے۔

اس کے علاوہ ہم جانتے ہیں کہ ۲ اور ۲ چار ہوتے ہیں. س میں کوئی شک نہیں ہے. ور ان کی مس وت کو ہر طرف ہم جز جز کر سکتے ہیں یعنی دو کا تجزیہ کریں یا چار کا لیکن اس مس وات کا تجزیہ نہیں کر سکتے، اور یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ مساوات دو آدھے رکھتی ہے، اور ہر آدھا دوسرے آدھے کا غیر ہے، مس وت کا ایک ہی مفہوم ہے جو قابل تجزیہ نہیں ہے یعنی دو اور دو یا چار ہے یا نہیں ہے، اسے دو نیم ہرگز نہیں کیا جا سکتا، لہٰذا اس قسم کے ذہنی مفاہیم قابل تقسیم و تجزیہ نہیں ہیں، اسی بنا پر وہ مادی نہیں ہو سکتے، کیونکہ اگر وہ ودی ہوتے تو ان کا تجزیہ ممکن تھا اور انھیں تقسیم کیا جا سکتا تھا، یہی وجہ ہے کہ ہماری روح جو یسے غیر ودی مفاہیم کا مرکز ہے ودی نہیں ہو سکتی، اس لئے وہ ،فوق مادہ ہے۔ (غور کیجئے)(۱)(۲)

( ) کتاب "معاد و جہان پس از مرگ" کے حصہ "استقلال روح" کی تلخیص

(۲) تفسیر نمونہ، جلد ۱۲، صفحہ ۲۵۰

۶۲۔ اجل مسمیٰ (حتمی) اور اجل معلق (غیر حتمی) سے مراد کیا ہے؟

اس میں شک نہیں ہے کہ انسان کے لئے دو طرح کی موت ہوتی ہے

یک حتمی اور یقینی موت ہے کہ جب انسان کا جسم باقی رہنے کی صلاحیت کھو بیٹھتا ہے یا یقینی موت کے وقت آنے پر تمام چیزیں حکم الٰہی سے انتہا کو پہنچ جاتی ہیں۔

اجل معلق یا غیر حتمی موت حالات کی تبدیلی سے بدل جاتی ہے، مثال کے طور پر انسان خود کشی کر لیتا ہے، کہ اگر یہ گناہ کبیرہ نہ کرتا تو برسوں زندہ رہ سکتا تھا، یا انسان شراب اور دیگر منشیات کے ستعمال یا بے حساب و کتاب شہوت رانی کے ذریعہ بہت ہی دنوں میں اپنی جسمانی طاقت کھو بیٹھتا ہے، جبکہ گر انسان یہ نہ کرے تو بہت دنوں تک زندہ رہ سکتا ہے۔

چنانچہ یہ چیزیں ایسی ہیں جن کو سبھی دیکھتے رہتے ہیں اور کوئی شخص بھی اس کا انکار نہیں کر سکتا۔

تفاقی حوادث بھی سی اجل معلق سے مربوط ہیں س کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

سی بنا پر احادیث میں بیان ہوا ہے کہ راہ خدا میں صدقہ دینے، نفاق کرنے ور صلہ رحم کرنے سے عمر طولانی اور بلائیں دور ہوتی ہیں، دراصل یہ چیزیں نھیں سباب کی طرف اشارہ ہیں۔

ور اگر ہم ان دو طرح کی موت کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کریں گے تو پھر "قضا وقدر" اور "انسانوں کی زندگی میں سعی و کوشش کے اثرات" وغیرہ جیسے مسائل کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔

اس بحث کو ایک آسان مثال کے ذریعہ واضح کیا جاسکتا ہے مثلاً کوئی شخص ایک نئی گاڑی خریدے، جس کا انجن اور باڈی میں لگایا گیا مختلف سامان بیس سال تک کام کرتا ہو، لیکن شرط یہ ہے کہ اس کی صحیح طریقہ سے دیکھ بھال کی جائے، تو اس صورت میں اس گاڑی کی عمر وہی بیس سال ہوگی۔

لیکن اگر صحیح طور پر اس کی دیکھ بھال نہ کی جائے یا اس کو نااہل لوگوں کے حوالہ کر دیا جائے، یا اس کی طاقت کے لحاظ سے زیادہ کام لیا جائے یا ہر روز نامناسب راستہ پر چلایا جائے، تو اس کی عمر آدھی یا اس سے بھی کم ہوسکتی ہے، یہ وہی ''اجل معلق'' ہے۔

ہمیں تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ بعض مفسرین نے اس قدر واضح اور روشن مسئلہ پر توجہ نہیں کی ہے۔(۱)

وضاحت:

بہت سی ایسی موجودات ہیں جو فطری طور پر ایک طولانی مدت تک باقی رہنے کی صلاحیت رکھتی ہیں، لیکن اس مدت میں موانع پیش آسکتے ہیں جن سے وہ اپنی آخری عمر تک نہیں پہنچ سکتیں، مثال کے طور پر ایک چراغ (تیل کی مقدار بھر) مثلاً ۱۰ ر گھنٹے روشنی دے سکتا ہے، لیکن اگر آندھی یا بارش آجائے تو وہ ۱۰ ر گھنٹے نہیں جل سکتا۔

یہاں پر اگر چراغ جلنے میں کوئی مانع پیش نہ آئے تو تیل کے آخری قطرے تک جلتا رہے گا اور تیل ختم ہونے پر ہی بجھے گا، تو گویا یہ اپنی ''حتمی اجل'' تک پہنچ گیا ہے، اور اگر اس سے پہلے کوئی مانع پیش آجائے اور چراغ خاموش ہوجائے تو اس کی عمر کو ''غیر حتمی اجل'' کہا جائے گا۔

---

(۱)تفسیر نمونہ جلد ۱۸، صفحہ ۲۰۹

انسان کے سلسلے میں بھی یہی بات ہے، اگر اس کی بقا کے لئے تمام شرائط جمع ہو جائیں اور موانع پیش نہ آئیں تو اس کی استعداد و صلاحیت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ وہ طولانی عمر پائے (اگر چہ اس کی بھی ایک حد اور انتہا ہے) لیکن ممکن ہے کہ یہی انسان نامناسب غذاؤں، یا منشیات کے استعمال یا خودکشی کے ذریعہ اس سے پہلے ہی مرجائے، تو اس پہلی صورت میں اس کی موت کو "اجل حتمی" اور دوسری صورت میں "غیر حتمی اجل" کہا جاتا ہے۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہیں کہ "حتمی اجل" اس صورت میں ہے کہ ہم تمام "علل تامہ" کا لحاظ کریں، اور "غیر حتمی اجل" اس صورت میں ہے کہ ہم صرف "مقتضیات" کو مد نظر رکھیں۔

ان دو طرح کی موت کے پیش نظر بہت سی چیزیں روشن ہو جاتی ہیں، مثال کے طور پر جیسے کہ ہم روایات میں پڑھتے ہیں کہ صلۂ رحم سے عمر میں اضافہ ہوتا ہے یا قطع رحم سے عمر کم ہو جاتی ہے، (اس طرح کے موارد میں "غیر حتمی اجل" مراد ہوتی ہے)

یا جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ﴾ (۱) "ہر قوم کے لئے ایک وقت مقرر ہے جب وہ وقت آجائے گا تو ایک گھڑی کے لئے نہ پیچھے ٹل سکتا ہے، ورنہ آگے بڑھ سکتا ہے"۔

اس آیت میں "حتمی اجل" مراد ہے۔

مذکورہ آیت صرف یہ بیان کر رہی ہے کہ انسان اپنی آخری عمر کو پہنچ جائے، لیکن اس میں جلد آنے والی موت بالکل شامل نہیں ہے۔

بہر حال توجہ رکھنا چاہئے کہ موت کی دونوں قسمیں خداوند عالم کی طرف سے معین ہوتی ہیں، ایک مطلق طور پر اور دوسری مشروط یا معلق طور پر، بالکل اس طرح جیسے یہ چراغ بغیر کسی قید و شرط کے ۱۰

---

(۱) سورۂ اعراف، آیت ۳۴

گھنٹے بعد خاموش ہو جائے گا، بالکل اسی طرح انسان اور قوم وملت بھی ہے، مثلاً خداوندعالم نے ارادہ فرمایا ہے کہ فلاں شخص یا فلاں قوم اتنی عمر کے بعد یقینی طور پر ختم ہو جائے گی، اور اگر ظلم و ستم، نفاق اور سستی سے کام لیں گے تو ایک تہائی مدت میں ختم ہو جائے گی، دونوں موتیں خداوندعالم کی طرف سے ہیں، ایک مطلق اور دوسری مشروط۔

مذکورہ آیت کے ذیل میں حضرت امام صادق علیہ السلام سے نقل ہوا ہے کہ "هُمَا أجلان أجلٌ محتومٌ وأجلٌ موقوفٌ"(۱) اس میں "حتمی اجل" اور "مشروط اجل" کی طرف اشارہ ہے، اور اس سلسلہ میں ایک دوسری حدیث میں بیان ہوا ہے کہ "غیر حتمی" (مشروط) کو مقدم یا موخر کیا جا سکتا ہے، لیکن "حتمی اجل" کو مقدم یا موخر نہیں کیا جا سکتا۔ (نورالثقلین، جلد اول صفحہ ۷۰۵)

---

(۱) تفسیر نمونہ، جلد ۵، صفحہ ۱۴۹

۶۳۔ کیا سائنس تجسم اعمال کی تائید کرتا ہے

قرآن مجید کی آیات سے واقف افراد اس بات کو بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ قرآن مجید کی متعدد آیات میں روز قیامت "تجسم اعمال" کے بارے میں خبر دی گئی ہے، یعنی روز قیامت ہر شخص کے اعمال چاہے اچھے ہوں یا برے اس کے سامنے حاضر ہو جائیں گے، اور انسان کے لئے خوشی و مسرت کا سامان بن جائیں گے یا عذاب اور شکنجہ کا باعث ہوں گے، یا اس کے لئے باعث افتخار ہوں گے یا ذلت و رسوائی کا سبب ہوں گے۔

کیا انسان کے عمل کا باقی رہنا ممکن ہے جبکہ انسان کے اعمال صرف کچھ حرکات و سکنات ہوتے ہیں اور انجام پانے کے بعد ختم ہو جاتے ہیں؟ اس کے علاوہ انسان کے عمل جو انسانی وجود کے عوارض ہیں کیا یہ مادہ اور جسم میں تبدیل ہو سکتے ہیں اور مستقل شکل و صورت میں ظاہر ہو سکتے ہیں؟

چونکہ بہت سے مفسرین کے پاس ان دونوں سوالوں کا جواب نہیں تھا لہٰذا وہ لوگ مجبوراً قرآنی آیات میں "حذف و تقدیر" کے قائل ہو گئے اور کہتے ہیں کہ "اعمال کے حاضر ہونے" یا "اعمال کے مشاہدہ" سے اعمال کی جزا یا سزا مراد ہے۔

لیکن آج ہم دیکھتے ہیں کہ مذکورہ دونوں سوال کا جواب موجود ہے، لہٰذا قرآن مجید کی جن آیات میں "تجسم اعمال" کا بیان موجود ہے، اس کا انکار کرنے کے لئے ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں متعدد روایات موجود ہیں انھیں میں سے حدیث معراج بھی ہے، جس میں بیان

ہوا ہے کہ جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے جنت و دوزخ کو دیکھا تو بدکاروں کو اپنے اعمال کی بنا پر عذاب جہنم میں مبتلا دیکھا، اور نیک لوگوں کو دیکھا کہ اپنے اعمال کی بنا پر جنت میں بہترین نعمتوں سے مالا مال ہیں۔

غیبت کے سلسلہ میں بیان ہونے والی آیت میں غیبت کرنے والے کو اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانے والا قرار دیا ہے، یہ بھی ہمارے مدعا پر ایک دوسری دلیل ہے۔

لہٰذا گزشتہ آیات و روایات سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ عالم برزخ اور قیامت میں انسان کے اعمال مناسب شکل میں مجسم ہوں گے، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا﴾(۱) ''جو لوگ ظالمانہ انداز سے یتیموں کا مال کھا جاتے ہیں وہ درحقیقت اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں''۔

یہ آیۂ شریفہ بیان کرتی ہے کہ انسان کا عمل دنیا ہی میں ایک طرح سے جسم رکھتا ہے، اس طرح کہ یتیم کا مال کھانا ایک جلا دینے والی آگ کی طرح ہے، اگرچہ حقیقت کو نہ دیکھنے والی آنکھیں اس کو نہیں دیکھ سکتیں۔

ان آیات و روایات کو مجازی اور تمثالی معنی پر حمل کرنے کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے لہٰذا ان کی تاویل و توجیہ کریں، جبکہ ان کے ظاہر پر عمل کرنے میں کوئی مانع نہیں ہے، اور کوئی مشکل پیش نہیں آتی، اس کی مزید تفصیل آئندہ بیان کی جائے گی۔

منطق عقل میں تجسم اعمال:

تجسم اعمال کے سلسلہ میں یہ اہم شکال طبرسی علیہ الرحمہ نے اپنی تفسیر مجمع البیان میں بیان کیا ہے کہ عمل ایک ''عرض'' ہے، اور ''جوہر'' نہیں ہے (یعنی نہ مادہ کی خاصیت رکھتا ہے اور نہ خود مادہ ہے) اور دوسرے یہ کہ عمل انجام پانے کے بعد محو اور نابود ہو جاتا ہے، لہٰذا ہماری گفتگو اور ہمارے

(۱)سورۂ نساء، آیت۱۰

گزشتہ اعمال کے آثار دکھائی نہیں دیتے، وہ عمل جو بعض چیزوں میں تبدیلی پیدا کرتے ہیں مثال کے طور پر اینٹ اور سیمنٹ کے ذریعہ مکان بناتے ہیں، یہ تو تجسم اعمال نہیں ہے، بلکہ عمل کے ذریعہ ایک تبدیلی انجام پائی ہے۔ (غور کیجئے)

لیکن دو نکتوں کے پیش نظر ان دو اعتراضات کا جواب، اور تجسم اعمال کی کیفیت بھی روشن ہو جاتی ہے۔

سب سے پہلے یہ عرض کیا جائے کہ آج کل یہ بات ثابت ہے کہ دنیا میں کوئی چیز بھی ختم نہیں ہوتی، ہمارے اعمال مختلف طاقت کی شکل میں موجود رہتے ہیں، اگر ہم بولتے ہیں تو ہماری آواز یں فضا میں مختلف امواج کی شکل میں پھیل جاتی ہیں، اور ذروں کی لہروں میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور ممکن ہے کہ یہ طاقت بھی کئی مرتبہ تبدیل ہو جائے، لیکن کسی بھی صورت میں بالکل ختم نہیں ہوتیں، ہمارے ہاتھوں اور پیروں کی حرکات بھی ایک طرح کی طاقت ہے، اور یہ "مکینک طاقت" ہر گز ختم نہیں ہوتی، ممکن ہے کہ ایک حرارتی طاقت میں تبدیل ہو جائے، خلاصہ یہ کہ صرف اس دنیا کے مواد جن کی طاقت ثابت و پائیدار ہے اگرچہ شکل بدلتی رہتی ہے۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی دانشوروں اور آزمائشوں کے ذریعہ قطعی طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ "مادہ" اور "طاقت" کے درمیان ایک قریبی تعلق ہے، یعنی مادہ اور طاقت ایک ہی حقیقت کے دو مظہر ہیں، "مادہ" طاقت کا خلاصہ ہے اور "طاقت" مادہ کی تفصیل ہے، اور دونوں معین شرائط و حالات کے تحت ایک دوسرے میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

ایٹمی طاقت، مادہ کا طاقت میں تبدیل ہونے کا نام ہے، یہ دوسرے الفاظ میں ایٹمی ذرہ کا پھٹنا اور اس کی طاقت کا آزاد ہونا ہے۔

آج سائنس نے یہ بات ثابت کی ہے کہ سورج کی حرارتی طاقت ایک ایٹمی طاقت ہے جو سورج کے ایٹم پھٹنے پر نکلتی ہے، اسی وجہ سے ہر روز سورج کا وزن کم سے کم تر ہوتا جا رہا ہے، اگر چہ یہ

وزن سورج کے وزن کے مقابلہ میں بہت ہی ناچیز ہے۔

اس بات میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ جس طرح مادہ طاقت میں تبدیل ہوسکتا ہے اسی طرح طاقت بھی مادہ میں تبدیل ہوسکتی ہے، یعنی اگر پھیلی ہوئی طاقت دوبارہ جمع ہو جائے اور جسم وجرم کی حالت پیدا کرے تو پھر یک جسم کی شکل میں ظاہر ہوسکتی ہے۔

اس بنا پر کوئی منع نہیں ہے کہ ہمارے اعمال اور گفتگو جو مختلف طاقت کی شکل میں موجود رہتے ہیں ورنابود نہیں ہوتے، وہ حکم خدا سے دوبارہ جمع ہو جائیں ورایک جسم کی شکل اختیار کریں، اور یہ بات بھی مسلم ہے کہ ہر عمل اپنے لحاظ سے جسم حاصل کرے گا، جو طاقت اصلاح نفس، خدمت دین، تقوی ورپرہیزگاری میں خرچ کی گئی ہے وہ یک خوبصورت جسم میں ظاہر ہوگی، اور جو طاقت ظلم وستم، فساد وربرائیوں میں خرچ کی گئی ہے وہ بدشکل اور متنفر صورت میں ظاہر ہوگی!

اس بنا پر "تجسم اعمال" کو قرآن مجید کے علمی معجزات میں شمار کیا جاسکتا ہے، کیونکہ اس زمانہ میں طاقت کی بقا، یا مادہ کا طاقت میں تبدیل ہونا یا اس کے برعکس طاقت کا مادہ میں تبدیل ہونا، دانشوروں اور صاحبان علم کے ذہنوں تک میں نہ تھا، لیکن قرآن مجید اور روایات میں وضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

لہٰذا نہ تو "عرض" ہونے کے لحاظ سے کوئی مشکل ہے اور نہ اعمال کے نابود ہونے کے لحاظ سے، کیونکہ اعمال نابود نہیں ہوتے، ورعرض وجوہر ایک ہی حقیقت کے دو جلوے ہیں، یہ بات جوہری حرکت کے پیش نظر واضح تر ہو جاتی ہے! کیونکہ "جوہری حرکت" کے قائل اس بات کا عقیدہ رکھتے ہیں کہ عرض وجوہر ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں، جس کی بنا پر وہ عرض میں جوہری حرکت کے ذریعہ حرکت جوہری سے استدلال کرتے ہیں (غور کیجئے)

پنی بات کو مکمل کرنے کے لئے اس نکتہ کی طرف اشارہ مناسب ہے

مشہور ومعروف فرانسوی دانشور "لاوازی" نے قانون "بقائے مادہ" کو بہت سعی وکوشش

کے بعد کشف کیا اور یہ ثابت کیا ہے کہ اس دنیا کے تمام مادے نابود نہیں ہوتے بلکہ ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔

اس کے کچھ مدت بعد "پیر کوری اور اس کی زوجہ" نے پہلی بار "ریڈیو اکیٹو" (جن جسموں میں ناپائیدار ایٹم پائے جاتے ہیں اور وہ آہستہ آہستہ طاقت میں تبدیل ہوجاتے ہیں) پر مادہ اور طاقت کے تعلق سے ایک ریسرچ کرنے کے بعد کشف کیا اور "قانون بقائے مادہ" کو "قانون بقائے مادہ اور طاقت" میں تبدیل کردیا، اور اس لحاظ سے قانون "بقائے مادہ" متزلزل ہوگیا اور قانون "بقائے مادہ اور طاقت" نے اس کی جگہ لے لی، اور ایٹم کو توڑنے سے مادہ، طاقت میں تبدیل ہونے کو مختلف دانشوروں نے قبول کرلیا، معلوم ہوا کہ یہ دونوں (مادہ اور طاقت) آپس میں ایک دوسرے سے گہرا تعلق رکھتے ہیں، اور ایک دوسرے کی جگہ لے لیتے ہیں، یا دوسرے لفظوں میں یہ دونوں ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔

سائنس میں اس چیز کے کشف ہونے کی وجہ سے دانشوروں کی ریسرچ میں ایک عظیم انقلاب برپا ہوگیا ہے اور عالم ہستی کی وحدت کو پہلے سے زیادہ ثابت کردیا۔

اس قانون نے قیامت اور انسان کے تجسم اعمال کے سلسلہ میں گزشتہ لوگوں کے بہت سے اعتراضات کا حل پیش کردیا جس سے تجسم اعمال کے سلسلہ میں حق موانع برطرف ہوگئے۔(۱)

(۱)تفسیر پیام قرآن، جلد ۶، صفحہ ۱۱۵ اور ۱۱۷

۶۴۔ عالمِ برزخ کیا ہے اور وہاں کی زندگی کیسی ہے؟

عالم برزخ کون عالم ہے؟ وہ کہاں ہے؟ اور دنیا و آخرت کے درمیان قرار پانے والے اس عالم کو ثابت کرنے کی کیا دلیل ہے؟

کیا برزخ سب کے لئے ہے یا خاص گروہ کے لئے ہے؟

اس مسئلہ میں یہ تمام سوالات موجود ہیں، قرآن مجید اور احادیث میں ان کی طرف اشارہ ہوا ہے، اس کتاب کے لحاظ سے ہم ان کے جوابات پیش کرتے ہیں:

لفظ ''برزخ'' لغوی لحاظ سے دو چیزوں کے درمیان حائل چیز کو کہا جاتا ہے اس کے بعد ہر دو چیز کے درمیان حائل ہونے والی چیز کو برزخ کہا جانے لگا، اسی وجہ سے دنیا و آخرت کے درمیان قرار پانے والے عالم کو ''برزخ'' کہا جاتا ہے۔

اس عالم کو کبھی ''عالم قبر'' یا ''عالم ارواح'' بھی کہا جاتا ہے، اس پر قرآن کریم کی بہت سی آیات دلالت کرتی ہیں جن میں سے بعض اس معنی میں ظاہر ہیں اور بعض واضح طور پر دلالت کرتی ہیں۔

آیۂ شریفہ ﴿وَمِن وَرَائِهِم بَرْزَخٌ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ﴾ اس عالم کے بارے میں ظاہر ہے، اگرچہ بعض مفسرین نے اس آیت کے معنی یوں کئے ہیں کہ عالم آخرت سے دنیا میں نہیں

پٹنا جا سکتا، کیونکہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کے پیچھے ایک ایسا مانع ہے جو انسان کو دنیا میں لوٹنے سے روک دے گا، لیکن یہ معانی بہت ہی بعید نظر آتے ہیں کیونکہ "الی یوم یبعثون" (روز قیامت تک) کا جملہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ برزخ دنیا اور آخرت کے درمیان موجود ہے نہ کہ انسان اور دنیا کے درمیان۔

جن آیات سے واضح طور پر عالم برزخ کا اثبات ہے وہ شہداء کی حیات کے بارے میں ہیں جیسا کہ ارشاد ہے ﴿وَلَاتَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوا فِی سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْیَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ یُرْزَقُوْنَ﴾ (۱) "اور خبردار راہ خدا میں قتل ہونے والوں کو مردہ خیال نہ کرنا وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے یہاں رزق پارہے ہیں"۔

یہاں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب ہوا ہے لیکن سورہ بقرہ آیت نمبر ۱۵۴ میں تمام مومنین سے خطاب ہوا ہے: ﴿وَلَاتَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَاءٌ وَّلٰکِنْ لَّاتَشْعُرُوْنَ﴾ "اور جو لوگ راہ خدا میں قتل ہو جاتے ہیں انھیں مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تمھیں ان کی زندگی کا شعور نہیں ہے"

نہ صرف یہ کہ بلند مرتبہ مومنین مثل شہداء راہ خدا کے لئے برزخ موجود ہے بلکہ فرعون اور اس کے ساتھی جیسے سرکش کفار کے لئے بھی برزخ موجود ہے، جیسا کہ سورہ مومن میں ارشاد ہوتا ہے ﴿اَلنَّارُ یُعْرَضُوْنَ عَلَیْهَا غُدُوًّا وَّعَشِیًّا وَیَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْا آلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ﴾ (۲) "وہ جہنم جس کے سامنے ہر صبح وشام پیش کئے جاتے ہیں اور جب قیامت برپا ہوگی تو فرشتوں کو حکم ہوگا کہ فرعون والوں کو بدترین عذاب کی منزل میں داخل کردو"۔ (۳)

(۱) سورۂ آل عمران، آیت ۱۶۹۔ (۲) سورہ مومن [غافر] آیت ۴۶

(۳) تفسیر نمونہ، جلد ۱۴، صفحہ ۳۱۴

اس بنا پر عالم برزخ کے موجود ہونے پر تو کوئی بحث نہیں ہے، لیکن اہم بات یہ ہے کہ وہاں کی زندگی کیسی ہے، اگرچہ اس مسئلہ میں مختلف صورتیں بیان ہوئی ہیں لیکن سب سے واضح اور روشن یہ ہے کہ انسان کی روح اس دنیوی زندگی کے خاتمہ کے بعد لطیف جسم میں قرار پاتی ہے اور اس مادہ کے بہت سے عوارض سے آزاد ہوجاتی ہے، اور چونکہ ہمارے اس جسم کے مشابہ ہے تو اس کو "قالب مثالی" یا "بدن مثالی" کہا جاتا ہے، جو نہ بالکل مجرد ہے اور نہ صرف مادی، بلکہ ایک طرح سے "تجرد برزخی" ہے۔

بعض محققین نے روح کی اس حالت کو خواب سے تشبیہ دی ہے، مثلاً اگر انسان خواب میں بہترین نعمتیں دیکھے تو واقعاً محظوظ ہوتا ہے اور ان سے لذت حاصل کرتا ہے، یا ہولناک مناظر کو دیکھ کر غمگین اور غم زدہ ہوتا ہے، اور کبھی کبھی اس کے بدن پر بھی اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے اور خطرناک خواب دیکھ کر چیختا اور چلاتا ہے، کروٹیں بدلتا ہے اور اس کا بدن پسینہ میں شرابور ہوجاتا ہے۔

یہاں تک کہ بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ عام خواب میں انسان کی روح بدن مثالی کے ساتھ فعالیت کرتی ہے بلکہ اس کے علاوہ بھی معتقد ہیں کہ طاقتور ارواح بیداری کی حالت میں بھی تجرد برزخی حاصل کرلیتی ہیں یعنی جسم سے جدا ہوکر بدن مثالی میں اپنی مرضی کے مطابق یا مقناطیسی خواب کے ذریعہ دنیا کی سیر کرلیتی ہیں اور دنیا کے مختلف مسائل سے باخبر ہوجاتی ہیں۔(۱)

بلکہ بعض حضرات اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ ہر انسان کے بدن میں ایک مثالی بدن ہوتا ہے، لیکن موت کے وقت اور برزخی زندگی کے آغاز میں الگ ہوجاتا ہے اور یہی مادی

---

(۱) علامہ مجلسی علیہ الرحمہ نے بحار الانوار میں اس مطلب کو بیان کرتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ متعدد روایات میں عالم برزخ کو عالم خواب سے مشابہ قرار دیا گیا ہے، یہاں تک کہ بعض طاقتور روحیں (ارواح) متعدد مثالی بدن رکھتے ہیں، اسی بنا پر جن روایات میں بیان ہوا ہے کہ ائمہ معصومین ہر شخص کی موت کے وقت حاضر ہوتے ہیں، اس کی توجیہ اور تفسیر کی ضرورت نہیں ہے۔ (بحار الانوار، جلد ۶، صفحہ ۲۷)

دنیا میں بھی جدا ہونے کا امکان ہوتا ہے، (جیسا کہ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں)

اب اگر ہم مثالی بدن کی ان تمام خصوصیات کو قبول [بھی] نہ کریں تو اصل مطلب سے انکار نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ بہت سی روایات میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اور عقلی لحاظ سے بھی کوئی مانع نہیں ہے۔

ضمناً ہماری گزشتہ گفتگو سے اس اعتراض کا جواب بھی واضح ہو جاتا ہے، جیسا کہ بعض لوگ کہتے ہیں بدن مثالی کا قائل ہونا گویا تناسخ کا قائل ہونا، کیونکہ تناسخ بھی اس کے علاوہ کوئی چیز نہیں ہے کہ ایک روح مختلف بدن میں منتقل ہوتی رہے۔

اس اعتراض کا جواب شیخ بہائی علیہ الرحمہ نے واضح طور پر پیش کیا ہے، چنانچہ موصوف فرماتے ہیں جس تناسخ کے باطل ہونے پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے اس سے مراد یہ ہے کہ انسان کی روح جسم سے نکلنے کے بعد اسی دنیا میں کسی دوسرے بدن میں منتقل ہو جائے، لیکن قیامت تک کے لئے عالم برزخ میں روح کا مثالی بدن میں بدل جانا جو پھر خدا کے حکم سے اسی پہلے بدن میں منتقل ہونا، اس کا تناسخ سے کوئی تعلق نہیں ہے، اور اگر ہم شدت کے ساتھ تناسخ کا انکار کرتے ہیں اور تناسخ کے قائل افراد کو کافر جانتے ہیں تو اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ لوگ روح کو قدیم مانتے ہیں اور قائل ہیں کہ یہی روح ایک بدن سے دوسرے بدن میں منتقل ہوتی رہتی ہے، جس کی بنا پر روز قیامت معاد جسمانی کا انکار کرتے ہیں۔(۱)

جس طرح سے بعض لوگ کہتے ہیں کہ بدن مثالی اسی مادی بدن کے اندر ہوتا ہے تو پھر تناسخ کا جواب روشن تر ہو جاتا ہے، کیونکہ روح اپنے بدن سے دوسرے بدن میں منتقل نہیں ہوئی ہے بلکہ بدن کے ایک حصہ سے جدا ہو کر دوسرے حصہ کے ساتھ عالم برزخ میں زندگی بسر کرتی ہے۔(۲)

(۱) بحار الانوار، جلد ۶، صفحہ ۲۷۰ (۲) تفسیر نمونہ، جلد ۳، صفحہ ۳۲۲

۶۵۔ کیا دنیا اور آخرت میں تضاد پایا جاتا ہے؟

قرآن مجید کی متعدد آیات میں دنیا کی بہت سی مادی امکانات کے ساتھ تعریف و تمجید کی گئی ہے بعض آیات میں مال کو "خیر" کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ﴾ (۱) "تمہارے اوپر بھی لکھ دیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت سامنے آجائے تو اگر کوئی [خیر] مال چھوڑا ہے تو اپنے ماں باپ اور قرابتداروں کے لئے وصیت کر دے یہ صاحبان تقویٰ پر ایک طرح کا حق ہے"۔

بہت سی آیات میں مادی نعمتوں کو فضل خدا کا عنوان دیا گیا ہے، ﴿وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ﴾ (۲) "اور فضل خدا کو تلاش کرو"۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے "روئے زمین کی تمام نعمتیں تمہارے لئے پیدا کی گئی ہیں، ﴿خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا﴾ (سورۂ بقرہ، آیت ۲۹)

بہت سی آیت میں ان تمام چیزوں کے لئے کہا گیا ہے ﴿سَخَّرَ لَكُمْ﴾ (یہ سب

---

(۱) سورۂ بقرہ، آیت نمبر ۱۸۰

(۲) سورۂ جمعہ، آیت ۱۰

تمہارے لئے مسخر کردی گئی ہیں)، اور اگر تمام ان آیات کو یک جگہ جمع کیا جائے کہ جن میں مادی امکانات کو محترم شمار کیا گیا ہے تو ان کی کثیر تعداد ہو جائے گی۔

لیکن مادی نعمتوں کی اس قدر اہمیت ہونے کے بعد بھی قرآن مجید میں ایسے الفاظ ملتے ہیں جن میں ان مادی چیزوں کو تحقیر اور ذلت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔

ایک جگہ متاع فانی اور عرض شمار کیا گیا ہے ﴿تَبْتَغُونَ عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾ (سورۂ نساء، آیت ۹۴)

ایک دوسری جگہ اس کو غرور اور غفلت کا سبب شمار کیا گیا ہے ﴿وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ﴾ (سورۂ حدید، آیت ۲۰)

ایک دوسرے مقام پر دنیا کو لہو ولعب اور کھیل کود سے تعبیر کیا گیا ہے ﴿وَمَا هَٰذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَهْوٌ وَلَعِبٌ﴾ (سورۂ عنکبوت، آیت ۶۴)

ایک دوسری جگہ یاد خدا سے غفلت کا سبب قرار دیا گیا ہے ﴿رِجَالٌ لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ﴾ (سورۂ نور، آیت ۳۷)

اسی طرح یہ مختلف نظریہ روایت میں بھی بیان ہوا ہے:

ایک طرف تو دنیا کو آخرت کی کھیتی نیک اور صالح افراد کے لئے تجارت گاہ، دوستان حق کے لئے مسجد، وحی الٰہی کے نزول کی جگہ، اور وعظ ونصیحت کا مقام شمار کیا گیا ہے، جیسا کہ حدیث میں وارد ہوا ہے "مَسجدُ احباء الله و مُصَلّٰی ملائکة الله و مهبط وحيّ الله و متجر اولياء الله"(۱)

دوسری طرف اسی دنیا کی مذمت کی گئی ہے اور اس کو غفلت و بے خبری اور یاد خدا سے غافل

(۱) نہج البلاغہ کلمات قصار، جملہ ۱۳۱

ہونے کا سبب قرار دیا گیا ہے۔

کیا اس طرح کی تمام آیات و روایات میں تضاد ہے؟

اس سوال کا جواب بھی خود قرآن مجید سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

دنیا اور اس کی نعمتوں کی مذمت اس جگہ کی گئی ہے جہاں ان لوگوں کو مخاطب قرار دیا گیا ہے کہ جن کا ہدف اور مقصد صرف یہی دنیاوی زندگی ہے، جیسا کہ سورہ نجم میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيَوٰةَ الدُّنْيَا﴾ (سورۂ نجم، آیت ۲۹) ''اور زندگی دنیا کے علاوہ کچھ نہ چاہے''۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ یہ گفتگو ان لوگوں کے بارے میں ہے جو آخرت کو دنیا کے بدلے بیچ ڈالتے ہیں اور دنیاوی مادیت تک پہنچنے کے لئے کسی بھی ظلم و ستم اور خلاف ورزی کی پرواہ نہیں کرتے۔

سورۂ توبہ میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿أَرَضِيتُم بِالْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ﴾ (سورۂ توبہ، آیت ۳۸) ''کیا تم آخرت کے بدلے زندگانی دنیا سے راضی ہو گئے ہو؟''۔

محل بحث آیات خود اس بات پر شاہد ہیں جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿من كان يريد العاجلة﴾ (یعنی صرف ان کا ہدف اور مقصد یہی جلد ہی ختم ہو جانے والی مادی زندگی ہے۔)

اصولاً ''کھیتی'' یا ''تجارت گاہ'' وغیرہ جیسے الفاظ اس سلسلہ میں زندہ گواہ ہیں۔

مختصر یہ کہ مادی نعمتیں سب خداوند عالم کی طرف سے ہیں اور نظام خلقت میں ان کا موجود ہونا ضروری تھا اور اگر انسان ان کے ذریعہ معنوی کمال اور سعادت تک پہنچنے میں مدد حاصل کرے تو ہر لحاظ سے قابل تحسین ہیں۔

لیکن اگر صرف دنیا ہی کو مقصد بنا لیا جائے اور اس کو آخرت کا وسیلہ نہ قرار دیا جائے تو اس صورت میں یہی مادی نعمتیں، غفلت و غرور، طغیان و سرکشی اور ظلم و ستم کا عنوان حاصل کریں گی، جس کی ہر لحاظ سے مذمت کی جائے گی۔

واقعاً حضرت علی علیہ السلام نے اپنے مختصر اور پُر معنی کلام میں کیا بہترین ارشاد فرمایا: "مَنْ أَبْصَرَ بِهَا بَصَّرَتْهُ وَمَنْ أَبْصَرَ إِلَيْهَا أَعْمَتْهُ" (۱) (جس نے اس دنیا کو چشم بصیرت کے ساتھ دیکھا (اور اس کو بینائی کا وسیلہ قرار دیا) تو دنیا اس کو بصیرت اور آگاہی عطا کرتی ہے، اور اگر کسی نے خود دنیا کو دیکھا تو دنیا اس کو نابینا کر دیتی ہے۔)

دراصل مذموم اور ممدوح دنیا میں یہی فرق ہے کہ اگر اس کو ہدف قرار دیا جائے تو مذموم ہے اور اگر اس کو ذریعہ اور وسیلہ قرار دیا جائے تو ممدوح ہے۔ (۲)

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے ایک حدیث میں بیان ہوا ہے "نِعْمَ الْعَوْنُ الدُّنْيَا عَلَى طَلَبِ الْآخِرَةِ" (۳) (آخرت تک پہنچنے کے لئے دنیا بہترین مددگار ہے۔)

سورہ قصص کی آیات میں مالدار اور مغرور "قارون" کی بہت زیادہ مذمت کی گئی ہے، جو اس موضوع کے لئے بہترین شاہد ہے، لیکن اسلام اس مال و دولت کو پسند کرتا ہے جو "آخرت کے لئے کام آئے"، جس کے ذریعہ آخرت حاصل کی جائے، جیسے کہ بنی اسرائیل کے علما قارون سے کہتے تھے "وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ" (خدا کی عطا کردہ نعمتوں کے ذریعہ آخرت حاصل کرنے کی فکر کر)۔

اسلام اس مال کو پسند کرتا ہے جس کے ذریعہ سب کے ساتھ نیکی کی جائے "أَحْسِنْ كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ"

اسلام اس مال و دولت کی مدح و ثنا کرتا ہے جس میں انسان دنیا سے صرف اپنے حق کو نہ بھولے "لَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا"

---

(۱) نہج البلاغہ، خطبہ نمبر ۸۲ (۲) تفسیر نمونہ، جلد ۲، صفحہ ۱۶

(۳) "وسائل الشیعہ" جلد ۱۲ صفحہ ۱۷، حدیث ۵ باب ۱۶ ابواب مقدمات تجارت)

خلاصہ اسلام ایسے مال ودولت کو پسند کرتا ہے جس کے ذریعہ ظلم وفساد برپا نہ کیا جائے، انسانی اقدار کی پامالی نہ ہو، اور مال زیادہ کرنے کے جنون میں مبتلا نہ ہو، نیز مال ''خود پسندی'' اور دوسرے کو ذلیل سمجھنے کا باعث نہ ہو یہاں تک کہ انسان مال ودولت کے نشہ میں خدا ورسول کے مقابلہ میں نہ آجائے۔

اس مال کے ذریعہ سب کی مشکلات دور کرنا چاہئے، یہ مال اگر غریبوں کے زخم کا مرہم بن جائے محتاج لوگوں کے درد کی دوا بن جائے تو واقعاً اسلام اس مال کو پسند کرتا ہے۔

ان مقاصد کے تحت مال ودولت حاصل کرنا دنیا کی محبت نہیں ہے، بلکہ یہ آخرت کی لگن ہے، جیسا کہ حدیث میں وارد ہوا ہے حضرت امام صادق علیہ السلام کے دوستوں میں سے ایک شخص آپ کی خدمت میں آیا اور اس نے شکایت کی کہ ہم دنیا سے محبت کرتے ہیں اور اس کی آرزو کرتے ہیں لیکن میں ڈرتا ہوں کہ کہیں دنیا پرست نہ ہوجاؤں!)

امام علیہ السلام (اس شخص کے تقوی اور پاکیزگی سے باخبر تھے، آپ) نے فرمایا تم مال ودولت سے کیا کیا کام انجام دیتے ہو؟ اس نے عرض کی اپنے اور اپنے اہل وعیال کا خرچ پورا کرتا ہوں، اپنے رشتہ داروں کی مدد کرتا ہوں، راہ خدا میں خرچ کرتا ہوں اور حج وعمرہ بجا لاتا ہوں، اس وقت امام علیہ السلام نے فرمایا: 'لَیسَ هذا طَلَبُ الدُّنیَا هذَا طَلَبُ الآخِرَةِ'' (۲) (یہ دنیا طلبی اور دنیا پرستی نہیں ہے، بلکہ یہ آخرت کا سودا ہے)

اور یہیں سے ان دو گروہوں کے نظریہ کا باطل ہونا بھی واضح ہوجاتا ہے پہلا گروہ ایسے مسلمانوں کا ہے جن کو تعلیمات اسلامی کی کوئی خبر نہیں ہے اور اسلام کو مستکبرین کا حامی قرار دیتے ہیں، اور دوسرا گروہ ان دشمنوں کا ہے جو اسلام کی صورت بگاڑ کر پیش کرتے ہیں، اور اسلام کو مال و

---

(۲) وسائل الشیعہ، جلد۱۲، صفحہ۱۹ (حدیث۳، باب ۷، ابواب مقدمات التجارۃ)

دولت کا مخالف اور فقر و غربت کا طرفدار قرار دیتے ہیں۔

اصولی طور پر کوئی غریب قوم آزادی اور سربلندی کی زندگی نہیں گزار سکتی۔

فقر و غربت وابستگی کا وسیلہ ہے۔

فقر و غربت دنیا و آخرت کی ذلت کا نام ہے۔

فقر و غربت، انسان کو گناہ اور آلودگی کی دعوت دیتے ہیں۔

جیسا کہ حضرت امام صادق علیہ السلام سے منقول حدیث میں وارد ہوا ہے "غنیً یحجزک عن الظُّلم خیرٌ من فقرٍ یحمِلُک علی الاثم" (۱) (ایسی بے نیازی جو دوسروں پر ظلم کرنے سے روک دے، اس فقر و غربت سے بہتر ہے جو تجھے گناہوں کی دعوت دے)۔

تمام ملت اسلام کو اس بات کی کوشش کرنی چاہئے کہ غنی بنیں اور دوسروں سے بے نیاز ہو جائیں، خود کفائی کی منزل تک پہنچیں اور اپنے پیروں پر کھڑے ہوں، اور اپنی عزت و شرافت اور استقلال کو فقر و غربت اور دوسرے سے وابستگی پر قربان نہ کریں، یہی اسلام کا اصلی راستہ ہے۔ (۲)

(۱) وسائل الشیعہ، جلد ۱۲، صفحہ ۱۷ (حدیث ۶، باب ۶، ابواب مقدمات التجارۃ)

(۲) تفسیر نمونہ، جلد ۹، صفحہ ۳۴۷

۲۶۔ نامۂ اعمال کیا ہے اور اس کا فلسفہ کیا ہے؟

جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے

﴿وَكُلَّ إِنسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ مَنشُورًا﴾(۱)

''اور ہم نے ہر انسان کے نامہ اعمال کو اس کی گردن میں آویزاں کردیا ہے اور روز قیامت اسے ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح پیش کردیں گے''۔(یہ وہی نامہ عمل ہے اور ہم اس سے کہیں گے اپنی کتاب پڑھو)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ نامہ اعمال کیا ہے اور اس کا مقصد کیا ہے؟

اس سلسلہ میں بیان شدہ آیات و روایات کے پیش نظر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان کے تمام چھوٹے بڑے اعمال اس کی کتاب میں لکھے جاتے ہیں اور اگر انسان نیک ہے تو روز قیامت اس کا نامہ عمل داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا، اور اگر برے لوگوں میں سے ہے تو اس کا نامہ اعمال بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔

بے شک یہ کتاب اور نامہ اعمال ہمارے گھر میں موجود کتاب و کاپی کی طرح بالکل نہیں

---

(۱)سورۂ اسراء، آیت ۱۳

ہے، اسی وجہ سے بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ نامہ اعمال ''انسانی روح'' کے علاوہ کچھ نہیں ہے، کیونکہ اسی روح میں انسان کے تمام اعمال ثبت ہوجاتے ہیں،(۱) کیونکہ ہم جو عمل بھی انجام دیتے ہیں اس کا اثر ضرور ہماری روح وجان پر ہوتا ہے۔

یا یہ کہ یہ نامہ اعمال ہمارے اعضا وجوارح ہمارے ہاتھ پیر، آنکھ کان وغیرہ اور اس سے بالاتر وہ ہوا اور فضا ہے جس میں ہم نے وہ عمل انجام دیا ہے، کیونکہ ہمارے اعمال ہمارے جسم اور تمام اعضا پر اثر کرنے کے علاوہ ہوا اور زمین میں منعکس ہوجاتے ہیں۔

اگرچہ ہم اس دنیا میں ان آثار کو محسوس نہیں کرسکتے، لیکن بے شک وہ موجود ہیں، اور جس دن ہماری آنکھوں میں نئی روشنی پیدا ہوجائے گی ان سب کو دیکھیں گے اور ان کو پڑھیں گے۔

مذکورہ آیت میں ﴿اقْرَأْ كِتَابَكَ﴾ (اپنی کتاب پڑھو) کا جملہ بیان ہوا ہے۔

لیکن یہ جملہ، مذکورہ تفسیر سے کہیں دور نہ کردے کیونکہ پڑھنے کے وسیع معنی ہوتے ہیں جس میں ہر طرح کا مشاہدہ آتا ہے، مثال کے طور پر ہم اپنی روزمرہ کی گفتگو میں کہتے ہیں کہ میں نے فلاں کی آنکھوں کو پڑھ کر اس کا کیا ارادہ ہے یا فلاں کام کرنے والے کے قیافہ وچہرہ کو پڑھ لیا ہے، اسی طرح بیماروں کے ایکسرے کو آج کل پڑھنا ہی کہتے ہیں۔

اسی وجہ سے ہم قرآنی آیات، میں پڑھتے ہیں کہ اس نامہ اعمال کی سطروں کا کسی بھی صورت میں انکار نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ یہ خود عمل کے واقعی وتکوینی آثار ہیں اور بالکل انسان کی ریکارڈ کی ہوئی آواز یا فوٹو یا انگوٹھے کے نشان کی طرح ہیں۔(۲)

---

(۱) تفسیر صافی۔

(۲) تفسیر نمونہ، جلد ۱۲، صفحہ ۵۵۔

نامہ اعمال کا فلسفہ

قرآنی آیات اور روایت میں نامہ اعمال کی تفصیل بیان ہونا خصوصاً جبکہ اعمال، گفتگو اور نیت کی تمام جزئیات اس میں لکھی جاتی ہیں تو سب سے پہلے اس پر تربیتی آثار مرتب ہوتے ہیں، جیسا کہ ہم نے بارہا اس بات کو عرض کیا ہے کہ قرآن کریم کی تمام تعلیمات انسان کے لئے تہذیب نفس، روح کی پاکیزگی، طہارت روحانی اور اخلاق و پرہیز گاری، اصول کو مضبوط بنانے کے لئے ہے، اور یہ تمام انسانوں کے لئے ایک چیلنج ہے تا کہ اپنی رفتار و گفتار پر نظر رکھیں کیونکہ تمام چیزیں لکھی جارہی ہیں، اور روز قیامت ہو بہو دکھا دی جائیں گی۔

یہ صحیح ہے کہ خداوند عالم کا علم تمام چیزوں پر احاطہ کئے ہوئے ہے اور جو شخص خداوند عالم کے علمی احاطہ پر ایمان رکھتا ہو کہ خداوند عالم ہر جگہ موجود ہے اور سب چیزوں کو دیکھ رہا ہے تو ایسے شخص کے لئے نامہ اعمال کی کوئی ضرورت نہیں ہے لیکن اس حقیقت پر توجہ کرنے سے اکثر لوگوں میں بہت مفید آثار مرتب ہوتے ہیں۔

اگر کوئی یہ جانتا ہو کہ اس کے ساتھ ایک ایسا کیمرہ موجود ہے جو اس کی آواز بھی ریکارڈ کر رہا ہے اور اس کی فلم بھی بنا رہا ہے، چاہے وہ گھر کے اندر ہو یا گھر سے باہر، گویا اپنے اعضا و جوارح کے ذریعہ جو کچھ بھی انجام دے رہا ہے وہ سب ریکارڈ ہو رہا ہے، اور ایک روز ایسا آئے گا جب خداوند عالم کی عدالت میں یہ سب فلم اور کیسٹ زندہ گواہ کی شکل میں اس کے سامنے پیش کی جائیں گی، تو یقیناً ایسا انسان اپنی رفتار و گفتار پر مکمل توجہ دیتا ہے، اور پھر اس کے ظاہر و باطن پر تقویٰ اور پرہیز گاری کی ہی حکومت ہوگی۔

نامۂ اعمال پر ایمان رکھنا کہ اس میں ہر چھوٹا بڑا عمل لکھا جارہا ہے اور دو فرشتے انسان کے عمل لکھنے کے لئے ہر وقت اس کے ساتھ ہیں، اور یہ عقیدہ رکھنا کہ اس کا نامہ اعمال سب کے

سامنے روز قیامت پیش کیا جائے گا اور تمام چھپے ہوئے گناہ اس میں ظاہر ہو جائیں گے جس سے دوست و دشمن سبھی کے سامنے ندامت اور رسوائی ہوگی۔ لہذا یہ ایمان انسان کو گناہوں سے روکنے کے لئے بہترین سبب ہے۔

نیک افراد کا نامہ عمل ان کے لئے باعث افتخار اور عزت کا سبب ہوگا، ان کے اعمال بہتر اور موثر تر دکھائی دیں گے، اور یہ چیز نیک عمل انجام دینے کے لئے بہترین علت ہے، لیکن بعض لوگوں کا ایمان ضعیف ہوتا ہے اور کبھی کبھی غفلت کا پردہ ان کو ان اہم حقائق سے دور کر دیتا ہے، ورنہ قرآن کی یہ اصل ہر انسان کی تربیت کے لئے کافی ہے۔(۱)

(۱) تفسیر پیام قرآن، جلد ۶، صفحہ ۱۰۷

۶۷۔ روز قیامت اعمال کو کس قسم کی ترازو میں تولے جائیں گے؟

جن لوگوں نے روز قیامت کی میزان کو دنیا کی ترازو کی طرح قرار دیا ہے وہ اس بات پر مجبور ہیں کہ انسان کے اعمال کے لئے ایک قسم کا وزن قرار دیں تا کہ اس کو ترازو میں تولا جا سکے۔

لیکن بہت سے قرائن وشواہد اس بات کی عکاسی کرتے ہیں کہ ”میزان“ سے مراد عام ناپ تول کے معنی میں ہے، کیونکہ ہم یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہر چیز کی ناپ تول کے لئے ایک الگ آلہ ہوتا ہے، درجہ حرارت کو معین کرنے کے لئے ”تھرما میٹر“ ہوتا ہے، ہوا کا اندازہ لگانے کے لئے ”ایرمیٹر“ ہوتا ہے۔

لہٰذا میزان اعمال سے مراد وہ افراد ہیں جن کے اعمال کے ذریعہ نیک و بد سے لوگوں کے اعمال کا موازنہ کیا جائے، جیسا کہ علامہ مجلسی علیہ الرحمہ شیخ مفیدؒ سے نقل کرتے ہیں: ”ان امیر المؤمنین والائمة من ذريته (ع) هم الموازين“( ) (امیر المومنین اور ائمہ [علیہم السلام] قیامت میں عدل الٰہی کی میزان ہیں)

”اصول کافی“ اور ”معانی الاخبار“ میں بھی حضرت امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ ایک شخص نے آیہ شریفہ ﴿وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ﴾ (ہم روز قیامت

( ) بحار الانوار جلد ۷ صفحہ ۲۵۲

عدل وانصاف کی ترازو قرار دیں گے) کے بارے میں سوال کیا تو امام علیہ السلام نے فرمایا، "هم الانبیاء و الاوصیاء"(۱) (میزان اعمال سے مراد انبیاء اور ان کے جانشین ہیں)

حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی زیارات مطلقہ میں سے ہم ایک زیارت میں پڑھتے ہیں "السَّلام علی میزانُ الأعمال" (سلام ہو تم پر اے میزان عمل!)(۲)

دراصل یہ عظیم شان شخصیات اعمال کے لئے نمونہ اور معیار ہیں، اور ہر شخص کے اعمال اگر ان حضرات کے اعمال سے شباہت رکھتے ہیں تو ان کا وزن ہے، اور اگر ان کے اعمال سے شباہت نہیں رکھتے تو ان کا کوئی وزن نہیں ہے، یہاں تک کہ اس دنیا میں بھی اولیاء اللہ، اعمال کے لئے معیار ہیں، لیکن روز قیامت یہ مسئلہ بالکل واضح ہو جائے گا۔(۳)

---

(۱) تفسیر برہان، جلد۳، صفحہ۲۶۱ اصول کافی، جلد اول، صفحہ ۴۱۹، اس حدیث کا تذکرہ دوسری تفسیروں میں بھی ہوا ہے

(۲) محدث قمی علیہ الرحمہ نے مفاتیح الجنان میں زیارات مطلقہ میں چھٹی زیارت قرار دی ہے

(۳) تفسیر پیام قرآن، جلد ۶، صفحہ ۱۵۹

۶۔ پُل صراط کی حقیقت کیا ہے؟

اگرچہ عالم بعد از مرگ اور حقائق قیامت کے سلسلہ میں تفصیلی معلومات اس دنیا والوں کے لئے ناممکن ہے، لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ ہمیں اجمالی اور مختصر معلومات کا علم بھی نہ ہو سکے۔

آیات و روایات کے پیش نظر یہ معلوم ہوتا ہے کہ "پل صراط" جنت کے راستہ میں جہنم کے اوپر ایک پُل ہے جس سے سب نیک اور بُرے لوگ گزریں گے، نیک افراد بہت تیزی سے گزر جائیں گے اور خدا کی بے انتہا نعمتوں تک پہنچ جائیں گے، لیکن بُرے لوگ اس پُل سے جہنم میں گر جائیں گے! یہاں تک کہ بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ "پل صراط" سے گزرنے کی رفتار نیک لوگوں کے ایمان و خلوص اور عمل صالح کے لحاظ سے ہوگی۔

حضرت امام صادق علیہ السلام سے منقول ایک روایت میں پڑھتے ہیں:

"فَمِنْهُم مَن يمرّ مثل البراق، وَمِنْهُم مَن يَمرّ مثل عدو الفرس، وَمِنْهُم مَن يمرّ حبواً، ومِنْهُم من يَمرّ مشياً، ومنهم من يمرّ متعلقاً، قد تأخذ النار منه شيئاً وتترك شيئاً" (۱)

"پل صراط" سے کچھ لوگ بجلی کی طرح گزر جائیں گے، اور کچھ لوگ تیز رفتار گھوڑے کی

---

(۱) امالی صدوق، مجلس ۳۳

طرح، کچھ لوگ پیدل، کچھ لوگ رینگتے ہوئے اور کچھ لوگ آہستہ گزریں گے، اور کچھ لوگ ہوں گے جو صراط کو پکڑے ہوئے چلیں گے جب کہ ان کے پیر ادھر ادھر ڈگمگاتے ہوں گے، جہنم کی آگ ان میں سے کچھ کو اپنے اندر کھینچ لے گی اور کچھ کو چھوڑ دے گی"۔

لیکن یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ جنت میں جانے کے لیے دوزخ کے اوپر سے کیوں گزرنا پڑے گا؟ اس کے جواب میں ہم اہم نکات بیان کرتے ہیں

اس سے ایک طرف تو اہل بہشت دوزخ کو دیکھ کر عافیت اور بہشت کی قدر کو بہتر سمجھ لیں گے، دوسری طرف "پل صراط" ہمارے لئے ایک نمونہ ہے تاکہ ہم دنیا میں شہوت کے بھڑکتے ہوئے جہنم سے گزر کر بہشت تقویٰ تک پہنچ سکیں، اور تیسری طرف سے مجرم اور گناہگاروں کے لئے ایک چیلنج ہے کہ آخرکار ایک باریک اور خطرناک راستہ سے ان کا گزر ہوگا۔

اسی وجہ سے "مفضل بن عمر" سے منقول ایک حدیث میں بیان ہوا ہے کہ جب میں نے امام علیہ السلام سے "صراط" کے بارے میں سوال کیا تو حضرت نے فرمایا صراط معرفت خدا کا راستہ ہے۔

اس کے بعد امام علیہ السلام نے مزید فرمایا صراط دو ہیں ایک صراط دنیا میں اور ایک صراط آخرت میں، اور صراط دنیا سے مراد "واجب الاطاعت امام" ہے، جو شخص اپنے امام کو پہچان سے، اس کی اقتدا کرے اور اس کے نقش قدم پر چلے تو جہنم پر بنے ہوئے پل صراط سے گزر جائے گا، لیکن جو شخص دنیا میں اپنے امام کو نہ پہچانے تو آخرت میں پل صراط پر ڈگمگاتے ہوئے جہنم میں گر جائے گا۔(۱)

تفسیر امام حسن عسکری علیہ السلام میں ان دو صراط (صراط دنیا اور صراط آخرت) سے مراد

---

(۱)معانی الاخبار صفحہ ۳۲ پہلی حدیث

"صراط مستقیم" (یعنی "غلو" اور "تقصیر" کے درمیان معتدل راستہ) اور "صراط آخرت" ہے۔(۱)

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ اسلامی روایات میں پُل صراط سے گزرنے کو بہت مشکل مرحلہ قرار دیا گیا ہے، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم (اور حضرت امام صادق علیہ السلام) سے منقول حدیث میں بیان ہوا ہے: "إنّ علی جهنّم جسراً أدقّ من الشّعر وأحدّ من السّیف"(۲) (جہنم کے اوپر ایک پُل ہے جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے۔)

اس دنیا میں صراط "مستقیم" اور حقیقت "دینیت" اور "عدالت" بھی اسی طرح ہے، بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے کیونکہ سیدھی لکیر باریک ہی ہوتی ہے اور اس کے علاوہ دائیں بائیں انحرافی لکیریں ہوتی ہیں۔

ظاہری بات ہے کہ صراط آخرت بھی اسی طرح ہے۔

لیکن جیسا کہ پہلے بھی اشارہ ہو چکا ہے بعض لوگ اپنے ایمان اور عمل صالح کی بدولت اس خطرناک راستہ سے بہت تیز گزر جائیں گے۔

اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور آپ کی عترت طاہرہ سے محبت اس خطرناک راستہ کو آسان بنا سکتی ہے، جیسا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے منقول ایک روایت میں پڑھتے ہیں: "إذا کان یوم القیامة ونُصب الصّراط علی جهنّم لم یجز علیه إلاّ من کان معه جواز فیه ولایة علیّ بن أبي طالب"(۳) روز قیامت جس وقت جہنم کے اوپر پُل قرار دیا جائے گا اس سے صرف وہی شخص گزر سکے گا جس کے پاس اجازت نامہ ہوگا، اور وہ اجازت نامہ "علی

(۱) بحار الانوار، جلد ۸، صفحہ ۶۹، حدیث ۸

(۲) میزان الحکمہ، جلد ۵، صفحہ ۳۳۸، امام جعفر صادق علیہ السلام کی حدیث میں "إنّ علی جهنّم جسر" کی جگہ لفظ "الصراط" آیا ہے۔(بحار الانوار، جلد ۸، صفحہ ۶۴، حدیث ۱)

(۳) بحار الانوار، جلد ۸، صفحہ ۶۸، حدیث ۱

بن ابی طالب علیہ السلام کی ولایت" ہوگی، اسی طرح کے الفاظ جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے سلسلہ میں بھی بیان ہوئے ہیں۔ یہ بات واضح ہے حضرت علی علیہ السلام اور جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا کی ولایت، پیغمبر اکرم کی ولایت اور قرآن واسلام اور دیگر ائمہ معصومینؑ سے الگ نہیں ہے، دراصل جب تک ایمان، اخلاق اور نیک عمل کے ذریعہ معصومین علیہم السلام سے رابطہ مضبوط نہ ہو جائے، اس وقت تک پل صراط سے گزرنا ممکن نہیں ہے، اس سلسلہ میں متعدد روایات بیان ہوئی ہیں، (محترم قارئین اس سلسلہ میں مزید آگاہی کے لئے بحار الانوار، جلد ۸ فصل صراط کا مطالعہ فرمائیں، خصوصاً حدیث نمبر ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۰)

اس پل صراط کے عقیدہ پر ایمان کا ایک تربیتی پہلو یہ ہے کہ یہ خطرناک وہولناک اور بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے تیز ایک ایسا راستہ ہے جس میں متعدد مقامات پر روکا جائے گا اور ہر مقام پر کچھ سوالات کئے جائیں گے، ایک مقام پر نماز کے بارے میں سوال ہوگا، دوسری جگہ امانت اور صلۂ رحم کے بارے میں سوال ہوگا، اور آگے بڑھیں گے تو عدالت وغیرہ کے بارے میں سوال ہوگا، اور یہ ایک ایسا راستہ ہے جس سے گزرنا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کی ولایت اور ان حضرات کے اخلاق کو اپنائے بغیر ممکن نہیں ہے، اور آخر کار ایک ایسا راستہ ہے کہ ہر شخص اپنے ایمان اور عمل صالح کے نور کے ذریعہ تیزی سے گزر سکتا ہے، اور اگر کوئی شخص پل صراط سے صحیح وسالم نہیں گزر پائے گا تو دوزخ میں گر جائے گا، اور کسی بھی صورت میں معنوی ومادی نعمتوں سے مستفید نہیں ہو پائے گا یعنی جنت میں نہیں پہنچ پائے گا۔

لہٰذا اس معنی پر توجہ اور اس پر ایمان رکھنے سے بے شک تربیتی لحاظ سے انسان کے عمل پر بہت زیادہ اثر ہوتا ہے، اور انسان کو راستہ کے انتخاب اور حق و باطل میں جدائی کرنے نیز اولیاء اللہ کے کردار کو اپنانے میں مدد کرتا ہے۔(۱)

(۱) تفسیر پیام قرآن، جلد ۶، صفحہ ۱۹۱۔

۷۹۔ فلسفۂ شفاعت کیا ہے؟ اور کیا شفاعت کی امید، گناہ کی ترغیب نہیں دلاتی؟

شفاعت، نہ تو گناہ کی ترغیب ہے، نہ گنہگار کے لئے گرین لائٹ، نہ عقب ماندگی کا سبب اور نہ ہی آج کل کی دنیا میں رائج پارٹی بازی، بلکہ تربیت کا اہم مسئلہ ہے جو مختلف لحاظ سے مثبت اور مفید آثار لئے ہوئے ہے، منجملہ

الف۔ امید کی کرن اور مایوسی سے مقابلہ. بعض اوقات انسان پر ہوائے نفس کا غلبہ ہو جاتا ہے اور بہت سے اہم گناہوں کا مرتکب ہو جاتا ہے جس سے گنہگار انسان مایوسی اور ناامیدی کا شکار ہو جاتا ہے، جس سے گنہگار کو مزید گناہ انجام دینے میں مدد ملتی ہے کیونکہ ایسے موقع پر یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اب تو پانی سر سے گزر گیا ہے چاہے یک بالشت ہو یا سو بالشت؟!

لیکن شفاعتِ اولیاء اللہ ان کو بشارت دیتی ہے کہ بس یہیں رک جاؤ اور اپنی اصلاح کی کوشش کرو، ممکن ہے ان کے گزشتہ گناہ شافعین کی شفاعت پر بخش دئے جائیں، لہٰذا شفاعت کی امید انسان کو مزید گناہ سے روکتی ہے اور تقویٰ و اصلاح نفس میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔

ب۔ اولیاء اللہ سے معنوی تعلق پیدا ہونا شفاعت کے معنی کے پیش نظر یہ نتیجہ حاصل کرنا آسان ہے کہ شفاعت اسی وقت ممکن ہے جب "شفیع" اور "شفاعت ہونے والے شخص" کے

درمیان ایک قسم کا رابطہ ہو، لہذا شفاعت کے لئے ایمان اور عمل صالح کے ذریعہ معنوی رابطہ ہونا ضروری ہے۔

اگر کوئی شخص کسی کی شفاعت کی امید رکھتا ہو تو اس کی کوشش یہ ہونی چاہئے کہ شفاعت کرنے والے سے بہترین تعلقات قائم رکھے، اور ایسے عمل انجام دے جن سے وہ خوش رہے، برے کاموں سے اجتناب کرے، اس کی محبت و دوستی کو بالکل ختم نہ کر ڈالے۔

یہ تمام چیزیں انسانی تربیت کے لئے بہترین اسباب ہیں، جن کے ذریعہ انسان آہستہ آہستہ گناہوں کی گندگی سے باہر نکل آتا ہے، یا کم از کم بعض برائیوں کے ساتھ ساتھ نیک کام بھی انجام دیتا ہے، اور شیطان کے جال میں مزید پھنسنے سے بچ جاتا ہے۔

ج۔ شفاعت کے شرائط حاصل کرنا قرآن مجید کی متعدد آیات میں شفاعت کے لئے بہت سے شرائط ذکر ہوئے ہیں ان میں سب سے اہم خداوند عالم کی طرف سے اذن و اجازت ہے، اور یہ بات مسلم ہے کہ جو شخص شفاعت کا امیدوار ہے تو اسے خداوند عالم کی رضایت حاصل کرنی ہوگی، یعنی اسے ایسے اعمال انجام دینے ہوں گے جن سے خداوند عالم راضی و خوشنود ہو جائے

بعض آیات میں بیان ہوا ہے کہ روز قیامت صرف ان ہی لوگوں کے بارے میں شفاعت قبول کی جائے گی جن کے بارے میں خدا نے اجازت دی ہو، اور اس کی باتوں سے راضی ہو گیا ہے۔ (سورہ طہ، آیت ۱۰۹)

سورہ انبیاء، آیت نمبر ۲۸ میں بیان ہوا ہے کہ شفاعت کے ذریعہ صرف انھیں لوگوں کی بخشش ہوگی جو "مقام ارتضاء" (یعنی خوشنودی خدا) تک پہنچ چکے ہوں گے، اور سورہ مریم، آیت ۸۷ کے مطابق جن لوگوں نے خدا سے عہد کر لیا ہو، اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ یہ تمام مقامات اس وقت حاصل ہوتے ہیں جب انسان خداوند عالم اور اس کی عدالت پر ایمان رکھتا ہو، نیکیوں اور برائیوں میں حکم خدا کو قبول کرتا ہو، اور خدا کی طرف سے نازل شدہ تمام قوانین کے صحیح ہونے پر گواہی دے۔

اس کے علاوہ بعض آیت میں بیان ہوا ہے کہ ظالمین کو شفاعت نصیب نہ ہوگی، لہٰذا شفاعت کی امید رکھنے والے کے لئے ظالمین کی صف سے باہر نکل آنا ضروری ہے، (چاہے وہ کسی بھی طرح کا ظلم ہو، دوسروں پر ظلم ہو یا اپنے نفس پر ظلم ہو)۔

[قارئین کرام!] یہ تمام چیزیں باعث بنتی ہیں کہ شفاعت کی امید رکھنے والا شخص اپنے گزشتہ اعمال پر تجدید نظر کرے اور آئندہ کے لئے بہتر طور پر منصوبہ بندی کرے، یہ خود انسان کی تربیت کے لئے بہترین اور مثبت پہلو ہے۔

د۔ **شافعین پر توجہ** قرآن کریم میں شافعین کے سلسلہ میں بیان شدہ مطالب پر توجہ، اسی طرح احادیث معصومین علیہم السلام میں بیان شدہ وضاحت پر توجہ کرنا مسئلہ شفاعت کا ایک دوسرا تربیتی پہلو ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا:

"الشفعاءُ خمسةٌ: القرآن، والرّحم، والأمانة، ونبيكم، وأهلُ بيتِ نبيكم." ( )

"روز قیامت شفاعت کرنے والے پانچ ہیں: قرآن، صلہ رحم، امانت، تمہارے پیغمبر اور اہل بیت پیغمبر [علیہم السلام]"۔

ایک دوسری حدیث جو مسند احمد میں نقل ہوئی ہے، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "تعلّموا القرآن فَانّهُ شافعٌ يومَ القيامة" (۲) "قرآن کی تعلیم حاصل کرو کیونکہ وہ روز قیامت تمہاری شفاعت کرنے والا ہے"۔

( ) میزان الحکمۃ، جلد ۵، صفحہ ۱۲۲

(۲) مسند احمد، جلد ۵، صفحہ ۲۵۱ (طبع بیروت دار صادر)

یہی معنی نہج البلاغہ میں امام المتقین حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام سے بیان ہوئے ہیں "فَإِنَّهُ شَافِعٌ مُشَفَّعٌ" (۱) "قرآن کریم ایسا شفاعت کرنے والا ہے جس کی شفاعت بارگاہ الٰہی میں قبول ہے"۔

متعدد روایت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شفاعت کرنے والوں میں سب سے بہترین شفاعت کرنے والا "توبہ" ہے "لاشَفِيعَ أنجح مِن التَّوبة" (۲) "توبہ سے زیادہ کامیاب کوئی شفیع نہیں ہے"۔

بعض احادیث میں انبیاء، اوصیاء، مومنین اور ملائکہ کی شفاعت کی تصریح کی گئی، جیسے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے:

"الشَّفَاعَةُ لِلأَنبِيَاءِ وَالأَوْصِيَاءِ وَالمؤمنين وَالمَلائِكَة، وفِي المُؤمِنِين مَنْ يَشفَعُ مِثلَ رَبِيعَةَ و مُضَر، و أَقَلُّ المُؤمِنِينَ شَفَاعَةً مَن يَشفَعُ لِثَلاثِينَ إِنسَاناً" (۳)

انبیاء، اوصیاء، مومنین اور فرشتے شفاعت کرنے والے ہیں، اور مومنین کے درمیان شفاعت کرنے والے ایسے بھی ہوں گے جو قبیلہ "ربیعہ" اور "مضر" کے برابر شفاعت کریں گے، اور سب سے کم شفاعت کرنے والے مومنین [بھی] تیس افراد کی شفاعت کریں گے"۔

حضرت امام صادق علیہ السلام سے ایک دوسری حدیث میں بیان ہوا ہے کہ خداوند عالم روز قیامت "عابد" اور "عالم" کو مبعوث کرے گا، اور جس وقت یہ دونوں عدل الٰہی کے مقابل کھڑے ہوں "قِيلَ لِلعَابِدِ انطَلِقْ إِلَى الجَنَّة، وَقِيلَ لِلعَالِمِ قِفْ، تَشفَعُ لِلنَّاسِ بِحُسْنِ تَأدِيبِكَ لَهُم" (۴) (عابد سے کہا جائے گا کہ تم جنت میں چلے جاؤ، اور عالم کو روک لیا جائے گا، اور اس سے کہا جائے گا کہ تم ان لوگوں کی شفاعت کرو جن کی تم نے نیک تربیت کی ہے"۔

---

(۱) نہج البلاغہ، خطبہ ۱۷۶۔
(۲) نہج البلاغہ، کلمات قصار، کلمہ ۳۷۱
(۳) بحار الانوار، جلد ۸، صفحہ ۵۸، حدیث ۷۵
(۴) بحار الانوار، جلد ۸، ۵۶، حدیث ۶۶

محترم قارئین! گزشتہ روایات خصوصاً آخری روایات میں ایسے الفاظ بیان ہوئے ہیں جن سے صاف صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ شفاعت کی امید رکھنے والے کے لئے نیک افراد، مومنین اور علماء سے ایک معنوی رابطہ ہونا ضروری ہے۔

شہداء راہ خدا کے بارے میں بھی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

''وَيَشْفَعُ الرَّجُلُ مِنْهُم فِي سَبْعِيْنَ اَلفاً مِنْ اَهلِ بَيتِهِ وَجِيرانِهِ'' ( ) (شہداء میں سے ہر شہید اپنے خاندان اور پڑوسیوں میں سے ۷۰؍ہزار افراد کی شفاعت کرے گا''۔

یہاں تک بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ''شفیع انسان، خداوندعالم کی اطاعت اور عمل حق ہے'' ''شَافِعُ الخَلْقِ: اَلعَمَلُ بِالحَقِّ وَلُزُومُ الصِّدقِ'' (۲)

خلاصہ گفتگو یہ ہے کہ اسلامی معتبر کتابوں میں بیان شدہ ان تمام روایات کے پیش نظر صاف طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شفاعت اسلام کے اہم ترین تربیتی مسائل میں ہے، جس کی شفاعت کرنے والوں کی قسموں کے اعتبار سے، بہت زیادہ اہمیت ہے، اور تمام مسلمانوں کو شفاعت کی اس عظیم منزلت کی طرف اور شفاعت کرنے والوں سے معنوی رابطہ قائم کرنے کی دعوت دی گئی ہے، اور مسئلہ شفاعت کے غلط اور تحریف شدہ شفاعت کے معنی کو الگ کر دیتی ہے۔ (۳) (۴)

( ) مجمع البیان، جلد۲، صفحہ ۵۳۸، (سورہ آل عمران آیت ۱۷۱ کے ذیل میں) (۲) غرر الحکم۔

(۳) تفسیر المیزان میں علامہ طباطبائی علیہ الرحمہ شفاعت کے معنی 'مسببات میں اسباب کی تاثیر' کرتے ہوئے شافعین کی دو قسم بیان کرتے ہیں ('عالم تکوین' اور 'عالم تشریع')، اور تشریعی شافعین میں توبہ، ایمان، عمل صالح، قرآن، انبیاء، ملائکہ اور مومنین کا شمار کرتے ہیں، پھر اس سلسلہ میں دلالت کرنے والی ان آیات کو بیان کرتے ہیں جو گناہوں کی بخشش میں مذکورہ چیزوں یا ان حضرات کی تاثیر کو بیان کرتی ہیں، (اگر چہ ان آیات میں شفاعت کا لفظ نہیں ہے) جیسے سورہ زمر، آیت ۵۴، سورہ حدید، آیت ۲۸، سورہ مائدہ، آیت ۹، سورہ اسراء آیت ۹، سورہ نساء آیت ۶۴، سورہ مومن [غافر] آیت ۷، اور سورہ بقرہ آیت ۲۸۶

(۴) تفسیر پیام قرآن، جلد ۶، صفحہ ۵۲۳۔

۶۹۔ کیا ”شفاعت“ توحید کے منافی ہے؟

شفاعت کے سلسلہ میں سب سے اہم اعتراض یہ ہے کہ شفاعت کا عقیدہ توحید کے بر خلاف ہے، البتہ یہ اعتراض وہابیوں کی طرف سے بہت زیادہ پروپیگنڈے اور کافی خرچ کی بنا پر وسیع پیمانے پر ہوتا آیا ہے، لہٰذا اس سلسلے میں مزید توجہ کی ضرورت ہے۔

وہابیوں کے عقائد کا محور عمدہ طور پر چند چیزیں ہیں، جن میں سب سے اہم ”توحید افعالی“ اور ”توحید عبادی“ ہے، یہ لوگ توحید کی اس قسم کے معنی اس طرح کرتے ہیں جس سے شفاعت شافعین، انبیاء اور اولیاء اللہ کی ارواح سے مدد مانگنا، یا خدا کی بارگاہ میں ان کو شفیع قرار دینا، توحید خدا کے منافی ہے، اور اسی وجہ سے یہ لوگ (وہابیوں کے علاوہ) ان چیزوں کا عقیدہ رکھنے والے تمام فرقوں کو مشرک جانتے ہیں! اور اگر آپ تعجب نہ کریں تو یہ بھی عرض کر دیا جائے کہ یہ لوگ ان عقائد رکھنے والوں کی جان، مال اور ناموس کو زمانہ جاہلیت کے مشرکین کی طرح مباح مانتے ہیں!

ان لوگوں نے اسی عقیدہ کی بنا پر حجاز اور عراق [وغیرہ] کے بہت سے مسلمانوں کا خون بہایا، ان کے اموال کو تاراج کیا اور ایسا ظلم و ستم کیا ہے جس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔

اس سلسلہ میں محمد بن عبد الوہاب (متوفی ۱۲۰۶ھ) اس فرقہ کے بانی نے اپنی مشہور کتاب ”رسالہ اربع قواعد“ میں بہت سی باتیں تحریر کی ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے

شرک سے نجات صرف ”چار قواعد“ کے ذریعہ ہی ممکن ہے

۱۔جن مشرکین سے پیغمبراکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگ کی ہے وہ سب خداوندعالم کو خالق، رازق اوراس جہان کا مدبر مانتے تھے جیسا کہ سورہ یونس آیت نمبر۳۱ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿قُلْ مَنْ یَرْزُقُکُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أَمَّنْ یَمْلِکُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَمَنْ یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَیُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ وَمَنْ یُدَبِّرُ الْأَمْرَ فَسَیَقُولُونَ اللهُ فَقُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ﴾(۱)

''پیغمبرذراان سے پوچھئے کہ تمہیں زمین اورآسمان سے کون رزق دیتا ہے اورکون تمہاری سماعت وبصارت کا مالک ہے اورکون مردہ سے زندہ اور زندہ سے مردہ کونکالتا ہے اورکون سارے امور کی تدبیر کرتا ہے تو یہ سب یہی کہیں گے کہ اللہ! تو آپ کہہ دیجئے کہ پھراس سے کیوں نہیں ڈرتے''۔

اس آیت کی بنا پر وہ لوگ خداوندعالم کی رزّاقیت، خالقیت، مالکیت اورمدبریت کا عقیدہ رکھتے تھے۔

۲۔مشرکین کی اصل مشکل یہ تھی کہ وہ کہتے تھے ہم بتوں کی عبادت وران پرتوجہ صرف اس وجہ سے کرتے ہیں کہ وہ خدا کے نزدیک ہماری شفاعت کریں اوران کے ذریعہ ہمیں قرب خدا حاصل ہوجائے، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَیَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللهِ مَا لَا یَضُرُّهُمْ وَلَا یَنْفَعُهُمْ وَیَقُولُونَ هٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللهِ﴾(۲)

''اور یہ لوگ خداکو چھوڑکران کی پرستش کرتے ہیں، جو نہ نقصان پہنچاسکتے ہیں اورنہ فائدہ اوریہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ خدا کے یہاں ہماری سفارش کرنے والے ہیں''۔

---

(۱)سورہ یونس، آیت۳۱ (۲)سورہ یونس، آیت۱۸

۳۔ جولوگ غیر خدا کی عبادت کیا کرتے تھے ان تمام سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگ کی ہے، چاہے وہ درختوں کی پوجا کرتے ہوں یا پتھروں اور چاند وسورج کی پوجا کرتے ہوں، یا ملائکہ، انبیاء اور صالحین کی عبادت کرتے ہوں، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے درمیان کوئی فرق نہیں رکھا، [یعنی آنحضرت نے ان سب سے جنگ کی ہے]

۴۔ ہمارے زمانہ کے مشرکین (یعنی وہابیوں کے علاوہ تمام فرقے) زمانہ جاہلیت کے مشرکین سے بدتر ہیں! کیونکہ وہ سب چین وسکون کے وقت بتوں کی عبادت کیا کرتے تھے لیکن سخت حالات میں صرف خدا کو پکارتے تھے جیسا کہ سورہ عنکبوت کی آیت نمبر ۶۵ میں بیان ہوا ہے:

﴿فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ يُشْرِكُونَ﴾(۱)(۲)

''پھر جب یہ لوگ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو ایمان وعقیدہ کے پورے اخلاص کے ساتھ خدا کو پکارتے ہیں پھر جب وہ نجات دے کر خشکی تک پہنچا دیتا ہے تو فوراً شرک اختیار کر لیتے ہیں''۔

عجیب بات تو یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے اس نظریہ میں اتنے محکم ہیں گرچہ ان کا نظریہ حقیقت میں سفسطہ اور مغالطہ ہے، لیکن پھر بھی یہ لوگ دیگر مسلمانوں کے خون کو مباح جانتے ہیں اور ان کے قتل کو جائز جانتے ہیں، جیسا کہ شیخ ''سلیمان'' اس گمراہ فرقہ کا سربراہ اپنی کتاب ''الہدایۃ السنیہ'' میں کہتا ہے قرآن وسنت اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ جو شخص ملائکہ یا انبیاء یا (مثلاً) ابن عباس اور ابوطالب وغیرہ کو اپنے اور خدا کے درمیان واسطہ قرار دے تاکہ وہ خدا کی بارگاہ میں شفاعت کریں، جیسا کہ بادشاہوں کے قریبی لوگ ان سے سفارش کرتے ہیں، تو ایسے لوگ کافر اور مشرک ہیں، ان کا

(۱) سورۂ عنکبوت، آیت ۶۵

(۲) ''رسالہ اربع قواعد'' تالیف محمد بن عبد الوہاب، بانی وہابیت، صفحہ ۲۴ سے ۲۷ تک، کشف الارتیاب سے نقل کیا ہے، صفحہ ۱۹۳

خون اور مال و دولت مباح ہے، اگرچہ یہ لوگ اپنی زبان سے کلمہ شہادتین کا اقرار کرتے ہوں نماز پڑھتے ہوں اور روزہ رکھتے ہوں۔(۱)

چنانچہ ان لوگوں نے اپنے اس شرمناک عقیدہ پر پابند رہتے یعنی مسلمانوں کی جان ومال کو مباح قرار دینے کو بہت سے مقامات پر ثابت کردکھایا ہے جن میں سے حجاز میں طائف کا مشہور و معروف قتل عام (صفر ۱۳۴۳ھ میں) اور (۸ ذی الحجہ ۱۲۱۶ھ میں) کربلا کا قتل عام بہت کی تواریخ میں موجود ہے۔

اس استدلال کے انحرافی نکات

۱۔قرآنی آیات کے پیش نظر یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ شفاعت ایک قرآنی اور اسلامی مسلم حقیقت ہے، اور قرآن مجید میں ''شفاعت کرنے والے'' اور ''شفاعت کئے جانے والوں'' کے شرائط بیان ہوئے ہیں، لہٰذا یہ بات ممکن نہیں ہے کہ کوئی قرآن و اسلام کا دم بھرے اور ان تمام واضح وروشن مدارک کے باوجود اس اسلامی عقیدہ کا انکار کرے، ہمیں اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ یہ لوگ کس طرح اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں؟ جبکہ یہ اس عقیدہ کا انکار کرتے ہیں جو قرآن اور اسلام کی ضروریات میں سے ہے کیا کوئی مسلمان اسلام اور قرآن کے ضروریات کا انکار کرسکتا ہے؟

۲۔جس شفاعت کو قرآن بیان کرتا ہے اور اس کا دفاع کرتا ہے اس کا اصل مرجع ''اذن خدا'' ہے اور جب تک وہ اجازت نہ دے گا اس وقت تک کسی کو شفاعت کرنے کا حق نہیں ہے، دوسرے الفاظ میں یوں کہیں کہ شفاعت اوپر سے اور اذن پروردگار سے ہے، بادشاہ اور حکام کے حواریوں کی سفارش کی طرح نہیں ہے جو نیچے سے اور اپنے ذاتی تعلقات کی بنا پر ہوتی ہے۔

---

(۲) الھدیۃ السنیۃ صفحہ ۶۶

اس طرح کی شفاعت توحید کے مسئلہ پر مزید تاکید کرتی ہے، کیونکہ اس کا اصلی مرکز ذات خداوند عالم ہے، اور ایسی توحید ہے جس میں کسی طرح کا شرک نہیں پایا جاتا، لیکن وہابیوں نے قرآنی شفاعت کو شیطانی شفاعت اور حکام کے نزدیک سفارش سے مخلوط کر دیا ہے اور اس کے منکر ہو گئے ہیں، وراس کو اصل توحید کے متضاد اور مخالف گردانتے ہیں، دراصل انھوں نے اس مسئلہ میں خود اپنے اوپر اعتراض کیا ہے نہ کہ قرآنی شفاعت پر۔

۳۔ شفاعت دراصل نجات کا ایک سبب ہے، جس طرح سے عالم خلقت اور عالم تکوین میں اسباب (جیسے درختوں اور فصلوں کے لئے نور آفتاب و بارش) کو موثر ماننا اصل توحید کے منافی نہیں ہے، کیونکہ ان تمام اسباب کی تاثیر اذن الٰہی کی بنا پر ہوتی ہے، دراصل ان تمام کا نام یک قسم کی شفاعت تکوینی ہے، ی طرح عالم شریعت میں مغفرت وبخشش ورنجات کے لئے کچھ اسباب پائے جاتے ہیں وہ بھی خدا کی اجازت سے، اور یہ توحید کے منافی ہی نہیں ہے بلکہ توحید پر مزید تاکید کرتے ہیں، اور اس کا نام "شفاعت تشریعی" ہے۔

۴۔ بتوں کے بارے میں قرآن کریم نے جس شفاعت کی نفی کی ہے، س کی وجہ یہ ہے کہ بت پرست ہر لحاظ سے بے خاصیت موجودات [بتوں] کو بارگاہ خداوندی میں پنا شفیع قرار دیتے تھے، لہذا سورہ یونس، آیت نمبر ۸ میں ان کے بارے میں رشاد ہوتا ہے ﴿وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هَٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللَّهِ﴾

"اور یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر ان کی پرستش کرتے ہیں، جو نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ فائدہ اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ خدا کے یہاں ہماری سفارش کرنے والے ہیں"۔

یقینی طور پر انبیاء وراولیاء اللہ کی شفاعت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، یہ آیت بتوں سے مخصوص ہے، جو کہ بے عقل وشعور پتھر اور دھات ہیں۔

دوسری طرف قرآن کریم اس شفاعت کی مذمت کرتا ہے جس میں شفاعت کرنے والے

کے استقلال اور اذن الٰہی کے بغیر اس کی تاثیر کو قبول کیا جائے، اسی وجہ سے قرآن کریم میں ایک دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَى إِنَّ اللَّهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيمَا هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ﴾(۱)

"اور جن لوگوں نے اس کے علاوہ سرپرست بنائے ہیں یہ کہہ کر کہ ہم ان کی پرستش صرف اس لئے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ سے قریب کردیں گے، اللہ ان کے درمیان تمام اختلافی مسائل میں فیصلہ کردے گا"۔

اس آیہ شریفہ کے مطابق مشرکین اپنے معبودوں کو اپنا ولی اور سرپرست اپنا حامی اور اپنا محافظ مانتے تھے، اور ان کی پوجا کرتے تھے، اور ان کے یہ دونوں کام غلط تھے، (بتوں کو اپنا ولی سمجھنا اور ان کی عبادت کرنا)

لیکن اگر کوئی شخص اولیاء اللہ، انبیاء علیہم السلام اور ملائکہ کی عبادت نہ کرے بلکہ ان کا احترام کرے ان کو بارگاہ خدا میں شفیع قرار دے وہ بھی خدا کے اذن سے، تو یہ مذکورہ آیت ہرگز اس کو شامل نہ ہوگی۔

وہابی لوگ چونکہ آیات شفاعت، کفر و ایمان اور شفاعت کرنے والے نیز شفاعت ہونے والے کے شرائط کے بیان کرنے والی آیات پر مہارت نہیں رکھتے، جس کی وجہ سے انھوں نے بت پرستوں کے عقیدہ کو شفاعت سے ملادیا اور یہ اس مثال کی طرح ہے "چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند" (جب حقیقت تک نہیں پہنچ سکے تو قصہ اور کہانی کی راہ اختیار کرلی۔)

۵۔ وہابیوں کا کہنا یہ بھی ہے کہ عرب کے بت پرست، خالقیت، مالکیت اور رازقیت کو

---

(۱) سورۂ زمر، آیت ۳

خداوندعالم سے مخصوص جانتے تھے ،لیکن وہ لوگ صرف بتوں کی وساطت اور شفاعت کو مانتے تھے، یہ بھی ان کی دوسری غلط فہمی ہے، جس کی وجہ بھی قرآنی آیات سے واضح ہے، کیونکہ قرآن مجید کی متعدد آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ بعض ان صفات کے بتوں کے لئے بھی قائل تھے، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے ﴿فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ يُشْرِكُونَ﴾(۱)

”پھر جب یہ لوگ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو ایمان وعقیدہ کے پورے اخلاص کے ساتھ خدا کو پکارتے ہیں پھر جب وہ نجات دے کر خشکی تک پہنچا دیتا ہے تو فوراً شرک اختیار کر لیتے ہیں“۔

(یعنی مشکلات کا حل بھی غیر خدا سے چاہتے تھے)

ان الفاظ سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ کفار و مشرکین عام حالات میں اپنی مشکلوں کا حل بتوں سے چاہتے تھے، اگرچہ سخت حالات میں صرف خدا کے لطف و کرم کے امیدوار ہوتے تھے۔

سورہ فاطر میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب ہو رہا ہے

﴿قُلْ أَرَأَيْتُمْ شُرَكَاءَكُمُ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَرُونِي مَاذَا خَلَقُوا مِنَ الْأَرْضِ أَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمَاوَاتِ﴾(۲)

”آپ کہہ دیجئے کہ کیا تم لوگوں نے ان شرکاء کو دیکھا ہے جنھیں خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو ذرا مجھے بھی دکھلاؤ کہ انھوں نے زمین میں کس چیز کو پیدا کیا ہے یا ان کی کوئی شرکت آسمان میں ہے“۔

اگر مشرکین صرف خداوندعالم ہی کو خالق مانتے تھے اور بتوں کو صرف شافع کے عنوان سے

---

(۱)سورۂ عنکبوت، آیت ۶۵

(۲)سورۂ فاطر، آیت ۴۰

مانتے تھے، تو اس سوال کا کوئی مطلب ہی نہیں ہوتا کیونکہ وہ جواب میں کہہ سکتے تھے کہ ہم ان کو خالق نہیں مانتے، صرف خالق و مخلوق کے درمیان واسطہ مانتے ہیں، کیا اگر کسی کو واسطہ مانا جائے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسے خالق بھی ماننا ضروری ہے؟!

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ بتوں کے خلقت میں شرکت کے قائل تھے، اور پیغمبر اکرمؐ کو حکم دیا گیا کہ ان کے جھوٹ کو ثابت کرنے کے لئے ان سے سوال کریں کہ ان بتوں نے کیا چیز خلق کی ہے؟

سورہ اسراء، آیت نمبر ۱۱۱ بھی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مشرکین بتوں کو مالکیت اور حاکمیت میں خدا کا شریک قرار دیتے تھے، یہاں تک کہ یہ عقیدہ بھی رکھتے تھے کہ جب خدا کو کوئی مشکل پیش آتی ہے تو یہی بت اس کی مدد کرتے ہیں، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے

﴿وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَلَمْ يَكُنْ لَهُ شَرِيكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ وَلِيٌّ مِنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيرًا﴾(۱)

"اور کہو کہ ساری حمد اس اللہ کے لئے ہیں جس نے نہ کسی کو فرزند بنایا ہے اور نہ کوئی اس کے ملک میں شریک ہے [اور مددگار] اور نہ کوئی اس کی کمزوری کی بنا پر اس کا سرپرست ہے اور پھر باقاعدہ اس کی بزرگی کا اعلان کرتے رہو"۔

آیت کے تینوں جملوں میں سے ہر جملہ بت پرستوں کے ایک عقیدہ کی نفی کرتا ہے کہ "فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں مانتے تھے" (توجہ رہے کہ "ولد" بیٹے اور بیٹی دونوں کے لئے بولا جاتا ہے) (۲) اور ان کو خلقت میں "شریک" نیز ان کو خدا کا "مددگار" مانتے تھے!

(۱) سورۂ اسراء آیت ۱

(۲) ولد مولود کے معنی میں ہے، اور بڑے، چھوٹے لڑکا، لڑکی، مفرد اور جمع سب کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ (دیکھئے مفردات راغب)

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن مجید نے تمام مقامات پر بت پرستوں کو ''مشرکین'' اور ان کے اعمال کو ''شرک'' کے عنوان سے یاد کیا ہے، اگر وہ لوگ ''خدا'' اور ''بتوں'' کے درمیان کسی شرک کے قائل نہ تھے اور ان بتوں کو صرف خدا کی بارگاہ میں شفیع مانتے تھے، تو قرآن کریم کے یہ الفاظ صحیح نہیں ہیں (معاذ اللہ)، ''شرک اور مشرک'' کے معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ بتوں کو خدا کی ربوبیت یا حل مشکلات یا حفاظت وغیرہ میں شریک قرار دیتے تھے، (البتہ پتھر یا لکڑی کے بت ان کی نظر میں صالح اور فرشتوں کا نمونہ تھے)

دوسرے لفاظ میں یوں کہیں کہ یہ لوگ بتوں کے لئے تدبیر جہان میں ایک طرح کے استقلال کے قائل تھے، اور ایک طرح سے خدا کے برابر قرار دیتے تھے، نہ فقط بارگاہ خدا میں واسطہ۔

خصوصاً قرآن کریم کی مختلف آیات میں بہت سے ایسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جن سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ﴾(۱) ''اور اس کے علاوہ تمہارا کوئی سرپرست اور مددگار بھی نہیں ہے''۔

یہ بت پرستوں کے عقیدہ کی طرف اشارہ ہے کہ یہ لوگ بتوں کو اپنا ولی وناصر مانتے تھے، جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَلَا يُغْنِي عَنْهُمْ مَا كَسَبُوا شَيْئًا وَلَا مَا اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللهِ أَوْلِيَاءَ﴾(۲) ''اور جن لوگوں نے خدا کو چھوڑ کر سرپرست بنایا ہے، کوئی کام آنے والا نہیں ہے''۔

قرآنی آیات میں متعدد بار مشرکین کے بارے میں ''من دون اللہ'' کا جملہ استعمال ہوا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ خدا کے علاوہ دوسری موجودات [بتوں، درختوں اور پتھروں] کی عبادت کیا کرتے تھے تاکہ وہ ان کے ولی وناصر اور مددگار رہوں، یہ وہی ''ربوبیت میں شرک'' ہے نہ کہ شفاعت۔

(۱)سورۂ عنکبوت، آیت ۲۲ (۲)سورۂ جاثیہ، آیت ۱۰

الحتصر قرآن کریم کی طرف سے مختلف آیت میں مشرکین پر دو اعتراض ملتے ہیں: پہلا اعتراض یہ لوگ ایسی موجودات کو مبداٴ اثر قرار دیتے ہیں جو نہ سننے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور نہ دیکھنے کی اور نہ ہی ان میں عقل وشعور پایا جاتا ہے، اور دوسرے یہ لوگ خدا کی تدبیر کے مقابل بتوں کے لئے "ربوبیت" کے قائل تھے۔

البتہ زمانہ جاہلیت کے بت پرستوں کی باتیں ضد ونقیض ہوتی تھیں، ایسا نہیں تھا کہ ایک منطقی انسان کی طرح اپنی باتوں کو بغیر کسی تضاد اور ٹکراؤ کے بیان کرتے ہوں، اگرچہ وہ بتوں کو مشکلات کے حل کے لئے خدا کا شریک قرار دیتے تھے اور ان کو "مـــن دون اللہ" خدا کے علاوہ اپنا ناصر و مددگار تصور کرتے تھے، لیکن کبھی کبھی بتوں کو خدا کے نزدیک شفاعت کرنے والا بھی قرار دیتے تھے، اور یہ بات ہرگز شرک افعال پر اعتقاد کی دلیل نہیں ہے، یہ مطلب تمام قرآنی آیات کی تحقیق اور کفار ومشرکین کے تمام حالات سے حاصل ہوتا ہے، اس کے علاوہ وہ لوگ شفاعت کو خدا کی اجازت پر موقوف نہیں جانتے تھے۔

[قارئین کرام!] ان تمام باتوں کے پیش نظر، یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ اگر انسان صرف اور صرف اولیاء اللہ کو شفیع قرار دے (نہ کہ پتھر اور لکڑی کے بتوں کو) اور صرف ان کو خدا کی بارگاہ میں "شفیع" مانے (نہ خدا کی ربوبیت اور تدبیر میں شریک) نیز ان کی شفاعت کو خدا کی اجازت پر موقوف مانے (نہ مستقل طور پر) اس صورت میں شفاعت پر کوئی اعتراض نہیں ہے، مشکل اس وقت پیدا ہوگی جب ان تینوں اصول میں سے کسی ایک یا تینوں کو نظر انداز کردیا جائے، اور غلط راستہ کا انتخاب کیا جائے۔ (۱)

(۱) تفسیر پیام قرآن، جلد ۶، صفحہ ۵۳۴.

فروع دین

نماز

۱۷۔ وضو، غسل اور تیمّم کا فلسفہ کیا ہے؟

اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ وضو کے دو فائدے واضح اور روشن ہیں، ایک پاکیزگی اور صفائی کا فائدہ دوسرے اخلاقی ومعنوی فائدہ، شب وروز میں پانچ بار یا کم از کم تین بار چہرے اور ہاتھوں کو دھونا انسان کے جسم کے لئے بہت مفید ہے، کیونکہ سر اور پیروں کی کھال پر مسح کرنے سے یہ عضا بھی پاک وصاف رہتے ہیں، جیسا کہ آئندہ فلسفہ غسل میں بیان کیا جائے گا کہ کھال تک پانی کا پہنچنا سمپاتھٹیک (Syapathetic) اور پیرا سمپاتھٹیک (Para Syapathetic) اعصاب کو کنٹرول کرنے میں بہت متاثر ہے۔

سی طرح اخلاقی اور معنوی لحاظ سے بھی چونکہ یہ کام قربت خدا کے لئے ہوتا ہے، جو تربیتی لحاظ سے موثر ہے، جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ سر سے لے کر پاؤں تک تیری اطاعت وبندگی میں حاضر ہوں، لہٰذا اس خداقی ومعنوی فلسفہ کی تائید ہوتی ہے، چنانچہ حضرت امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے ایک حدیث میں اس طرح ذکر ہوا ہے

"وضو کا حکم اس وجہ سے دیا گیا ہے کہ اس سے عبادت کا آغاز ہوتا ہے، [کیونکہ] جس وقت بندہ خدا کی بارگاہ میں حاضر ہوتا ہے، وراس سے مناجات کرتا ہے تو اسے اس وقت پاک ہونا چاہئے، اوراس کے احکام پر عمل کرنا چاہئے اور گندگی اور نجاست سے دور رہے، اس کے علاوہ وضو باعث ہوتا ہے کہ نسان کے چہرہ سے نیند ور تھکن کے آثار دور ہو جائیں اور انسان کا دل خدا کی بارگاہ میں حاضر

ہوکر نور پاکیزگی حاصل کرے"۔(۱)

فلسفہ غسل میں بیان ہونے والی وضاحت سے فلسفہ وضو بھی مزید واضح ہو جائے گا۔

فلسفہ غسل

بعض لوگ سوال کرتے ہیں کہ انسان کے مجنب ہونے پر اسلام نے غسل کا حکم کیوں دیا ہے جبکہ صرف مخصوص عضو گندہ ہوتا ہے؟ نیز پیشاب اور منی میں کیا فرق ہے جبکہ پیشاب میں صرف پانی سے دھونا لازم ہے اور مجنب ہونے کی صورت میں تمام بدن کو دھونا [یعنی غسل کرنا] ہوتا ہے؟

اس سوال کا ایک مختصر جواب ہے اور دوسرا تفصیلی۔

مختصر جواب یہ ہے کہ انسان کے جسم سے منی نکلنے سے صرف مخصوص عضو پر اثر نہیں ہوتا (پیشاب اور پاخانہ کی طرح نہیں ہے) بلکہ اس کا اثر بدن کے تمام دوسرے اعضا پر بھی ہوتا ہے منی کے نکلنے سے بدن کے تمام اعضا سست پڑ جاتے ہیں، جو اس بات کی نشانی ہے کہ اس کا اثر تمام بدن پر ہوتا ہے۔

وضاحت:

دانشوروں کی تحقیق کے مطابق انسان کے بدن میں دو طرح کے نباتی اعصاب ہوتے ہیں جن سے بدن کا سارا نظام کنٹرول ہوتا ہے، "سمپاتھیٹک (Syapathetic)" اور "پیرا سمپاتھیٹک (Para Syapathetic)، عصاب" دو طرح کے اعصاب پورے بدن میں پھیلے ہوئے ہیں اور بدن کے تمام نظام کو، اپنے کنٹرول میں رکھتے ہیں، بدن "سمپاتھیٹک اعصاب" کا کردار بدن کے نظام میں تیزی پیدا کرنا ہے اور "پیرا سمپاتھیٹک اعصاب" کا کردار بدن میں سستی

(۱) وسائل الشیعہ جلد ۲ صفحہ ۲۵۷

پیدا کرنا ہے، دراصل ان دونوں کا کام گاڑی میں ریس اور بریک کی طرح ہے۔ اس سے بدن میں توازن قائم رہتا ہے۔

کبھی بدن میں ایسے حادثات پیش آتے ہیں جن سے یہ توازن ختم ہو جاتا ہے، انھیں میں سے ایک مسئلہ ''Climax'' (اوج لذت جنسی) ہے، اور اکثر اوقات منی کے نکلتے وقت یہ مسئلہ پیش آتا ہے۔

اس موقع پر ''اعصاب پیرا سمپاتھٹیک (Para Syapathet.c) ''سمپاتھٹیک (Syapathetic) اعصاب'' پر غلبہ کر لیتے ہیں اور انسان کا توازن منفی صورت میں بگڑ جاتا ہے۔

یہ موضوع بھی ثابت ہو چکا ہے کہ ''سمپاتھٹیک (Syapathetic) عصاب'' کے بگڑے ہوئے توازن کو دوبارہ برقرار کرنے کے لئے بدن کا پانی سے مس کرنا بھی موثر ہے، اور چونکہ جنسی لذت کا عروج ''Cl.max'' بدن کے تمام عضاء پر حسی طور پر اثر انداز ہوتا ہے، لہٰذا جنسی ملاپ یا منی نکلنے کے بعد اسلام نے حکم دیا ہے کہ سارے بدن کو پانی سے دھویا جائے تاکہ پورے بدن کا بگڑا ہوا توازن دوبارہ صحیح حالت پر پلٹنے میں مدد مل سکے۔(۱)

البتہ غسل کا فائدہ اسی چیز میں منحصر نہیں ہے، بلکہ غسل اس کے علاوہ ایک طرح کی عبادت بھی ہے جس کے اخلاقی اثر کا انکار نہیں کیا جا سکتا، اور اسی وجہ سے اگر نیت اور قصد قربت کے بغیر غسل انجام دیا جائے تو انسان کا غسل صحیح نہیں ہے، دراصل ہمبستری کرنے یا منی کے نکلنے سے انسان کا جسم

---

(۱) جیسا کہ حضرت امام علی رضا علیہ السلام سے منقول ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا "ان الجنابة خارجة من کل جسده فلذلک وجب علیه تطهیر جسده کُلّه" (جنابت پوری بدن سے باہر نکلتی ہے لہٰذا پورے بدن کو پانی سے دھونا [یعنی غسل کرنا] واجب ہے) (وسائل الشیعہ جلد ۱، صفحہ ۴۶۶) یہ حدیث گواہ اسی چیز کی طرف اشارہ ہے

بھی گندا ہو جاتا ہے اور اس کی روح بھی مادی شہوات کی طرف متحرک ہوتی ہے اور جسم سستی اور کاہلی کی طرف، غسل جنابت سے انسان کا جسم بھی پاک و صاف ہو جاتا ہے اور چونکہ قربت کی نیت سے انجام دیا جاتا ہے اس کی روح بھی پاک ہو جاتی ہے، گویا غسل جنابت کا دوہرا اثر ہوتا ہے، ایک جسم پر اور دوسرا انسان کی روح پر، تاکہ روح کو خدا اور معنویت کی طرف حرکت دے اور جسم کو پاکیزگی اور نشاط کی طرف۔

ان سب کے علاوہ، غسل جنابت کا وجوب بدن کو پاک و صاف رکھنے کے لئے ایک اسلامی حکم ہے، کیونکہ بہت سے لوگ ایسے مل جائیں گے جو پاکیزگی اور صفائی کا خیال نہیں کرتے، لیکن اس اسلامی حکم کی بنا پر وہ گاہ بگاہ اپنے بدن کی گندگی کو دور کرتے ہیں، اور اپنے بدن کو پاک و صاف رکھتے ہیں، اور یہ چیز گزشتہ زمانہ سے مخصوص نہیں ہے [کہ لوگ گزشتہ زمانہ میں مدتوں بعد نہایا کرتے تھے] بلکہ آج کل کے زمانہ میں بھی بہت سے ایسے لوگ موجود ہیں جو بعض وجوہات کی بنا پر صفائی کا بالکل خیال نہیں رکھتے، (البتہ اسلام کا یہ حکم ایک عام قانون ہے یہاں تک کہ جن لوگوں نے ابھی اپنے بدن کو دھویا ہو ان کو بھی شامل ہے)، [یعنی اگر نہانے کے بعد مجنب ہو جائے تو بھی غسل کرنا واجب ہے۔]

مذکورہ تینوں وجوہات کی بنا پر یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ منی نکلنے کے بعد (چاہے سوتے وقت یا بیداری کی حالت میں) اور اسی طرح ہمبستری کے بعد (اگرچہ منی بھی نہ نکلی ہو) غسل کرنا کیوں ضروری ہے (۱)

فلسفہ تیمم کیا ہے؟

بہت سے لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ مٹی پر ہاتھ مارنے اور ان کو پیشانی اور ہاتھوں پر ملنے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟ خصوصاً جبکہ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اکثر مٹی گندی ہوتی ہے اور اس سے

(۱) تفسیر نمونہ، جلد ۴، صفحہ ۲۹

جراثیم منتقل ہوتے ہیں۔

اس سوال کے جواب میں دو نکات کی طرف توجہ ضروری ہے

الف: اخلاقی فائدہ: تیمّم یک عبادت ہے، اس میں حقیقی عبادت کی عکاسی پائی جاتی ہے، کیونکہ انسان حکم خدا کے پیش نظر اپنے شریف ترین عضو یعنی پیشانی پر مٹی بھر ہاتھ پھیرتا ہے تاکہ خدا کے سامنے پنی تواضع اور انکساری کا ظہار کر سکے، یعنی میری پیشانی ور میرے ہاتھ تیرے سامنے تواضع وانکساری کی آخری حد پر ہیں، ور پھر انسان نماز یا دوسری ان عبادتوں میں مشغول ہو جاتا ہے جن میں وضو یا غسل کی شرط ہوتی ہے، اس بنا پر نسان کے ندر تواضع و نکساری، بندگی ور شکر گزاری کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔

ب۔حفظان صحت کا فائدہ. آج کل یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ مٹی میں بہت سے جراثیم (Bacterias) پائے جاتے ہیں جن کے ذریعہ بہت سی گندگیاں دور ہوتی ہیں، یہ جراثیم جن کا کام آلودہ کرنے والے مواد کا تجزیہ ورطرح طرح کی بد بو کو ختم کرنا ہے' یادہ تر زمین کی سطح پر معمولی گہرائی میں جہاں سے ہوا اور سورج کی روشنی سے بخوبی زندہ رہ سکیں، بکثرت پائے جاتے ہیں، سی وجہ سے جب مردہ جانوروں کی لاشیں زمین میں دفن کردی جاتی ہیں اور اسی طرح دوسری چیزیں جو گندگی سے بھری ہوئی ہوتی ہیں زمین پر پڑی ہوں تو کچھ عرصہ بعد ان کے بدن کے جزا بکھر جاتے ہیں ور جراثیم کی وجہ سے وہ بدبو کا مرکز نیست و نابود ہو جاتا ہے، یہ طے ہے کہ اگر زمین میں یہ خاصیت نہ پائی جاتی تو کرہ زمین تھوڑی سی مدت میں بدبو کے ڈھیروں میں بدل جاتا، اصولی طور پر مٹی ینٹی بیوٹک ثر رکھتی ہے، جو جراثیم مارنے کے لئے بہترین چیز ہے۔

اس بنا پر پاک مٹی نہ صرف آلودہ نہیں ہے بلکہ آلودگی کو ختم کرنے والی ہے، ور س لحاظ سے ایک حد تک پانی کا کام کر سکتی ہے، اس فرق کے ساتھ کہ پانی جراثیم کو بہا لے جاتا ہے اور مٹی

جراثیم کو مارڈالتی ہے۔

لیکن توجہ رہے کہ تیمّم کی مٹی مکمل طور پر پاک وصاف ہو جیسا کہ قرآن کریم نے بہترین لفظ استعمال کیا ہے "طیباً"

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن کریم میں تیمم کے حوالے سے لفظ "صعید" استعمال ہوا ہے جو "صعود" سے لیا گیا ہے [جس کے معنی بلندی کے ہیں] جو اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ تیمّم کے لئے زمین کی سطحی مٹی لی جائے جس پر سورج کی روشنی پڑتی ہو اور جس میں جراثیم کو مارنے والی بیکٹری پائی جاتی ہوں، اگر اس طرح کی پاک وپاکیزہ مٹی سے تیمّم کیا جائے تو یہ تاثیر رکھتی ہے اور اس میں ذرا بھی نقصان نہیں ہے۔(۱)

وضو میں ہاتھوں کو کس طرح دھویا جائے نیز سر اور پیر کا مسح کس طرح کیا جائے؟

سورہ مائدہ کی آیت نمبر ۶ میں روح کی پاکیزگی کے طریقہ کی طرف اشارہ ہوا ہے، اور روح کی پاکیزگی کے لئے احکام وضو، غسل اور تیمّم بیان ہوئے ہیں، پہلے مومنین سے خطاب ہوا اور وضو کے احکام اس ترتیب سے بیان کئے

﴿ یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلاَةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَیْدِیَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَیْنِ ﴾(۲)

"اے ایمان والو! جب بھی نماز کے لئے اٹھو تو پہلے اپنے چہروں کو اور کہنیوں تک اپنے ہاتھوں کو دھوؤ اور سر اور گٹوں تک پیروں کا مسح کرو"۔

---

(۱) تفسیر نمونہ، جلد ۳، صفحہ ۴۰۰

(۲) سورہ مائدہ، آیت ۶

اس آیۂ شریفہ میں ہاتھوں کے دھونے کی حد ''کہنی'' تک قرار دی گئی ہے کیونکہ قرآن مجید میں لفظ ''مرافق'' ہے جس کے معنی ''کہنیاں'' ہیں، لیکن جب کسی انسان سے کہا جائے کہ ''اپنے ہاتھوں کو دھو لیجئے'' تو ممکن ہے کہ وہ شخص صرف کلائیوں تک ہاتھوں کو دھوئے، کیونکہ اکثر اوقات ہاتھوں کو یہیں تک دھویا جاتا ہے، لہٰذا اس غلطی کو دور کرنے کے لئے ارشاد ہوتا ہے کہنیوں تک دھوئیں ﴿إِلَى الْمَرَافِقِ﴾

اس تفصیل کی بنا پر یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ آیت میں لفظ ''الی'' [یعنی کہنیوں تک] ہاتھوں کے دھونے کی حد کو بیان کرنے کے لئے ہے نہ ہاتھوں کو دھونے کی کیفیت کے لئے، جیسا کہ بعض لوگوں کا گمان ہے اور مذکورہ آیت کے اس طرح معنی کرتے ہیں

ہاتھوں کو انگلیوں کے سرے سے کہنیوں تک دھوئیں، (جیسا کہ اہل سنت کے یہاں پایا جاتا ہے)

اس کی مثال بالکل اسی طرح ہے کہ اگر آپ کسی پینٹر سے کہیں کہ ہماری دیوار کو فرش سے ایک میٹر تک رنگ کر دیں، تو یہ بات واضح ہے کہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دیوار پر نیچے سے اوپر کی طرف رنگ کیا جائے بلکہ مقصد یہ ہے کہ اس مقدار میں رنگ ہونا ہے نہ اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ۔

اس بنا پر مذکورہ آیت میں ہاتھوں کے دھونے کی مقدار معین کی گئی ہے، لیکن اس کی کیفیت سنت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اہل بیت علیہم السلام کے ذریعہ بیان ہوئی ہے، کہ ہاتھوں کو کہنیوں سے انگلیوں کے سرے تک دھویا جائے۔

''بِرُءُوسِكُمْ'' میں لفظ ''بِ'' بعض اہل لغت اور بعض احادیث کی بنا پر ''بعض'' کے معنی میں آیا ہے یعنی سر کے ''بعض حصہ'' کا مسح کرو، جیسا کہ احادیث میں ملتا ہے کہ سر کے اگلے حصہ کا ہاتھ سے مسح کیا جائے، لیکن جیسا کہ بعض اہل سنت کے یہاں رائج ہے کہ پورے سر کا مسح کرتے ہیں، یہ

مذکورہ آیت کے مفہوم کے موافق نہیں ہے۔

"بِرُءُوسِکُمْ" کے بعد "أَرْجُلَکُمْ" کا آنا خود اس بات پر گواہ ہے کہ پیروں کا بھی مسح کیا جائے نہ کہ ان کو دھویا جائے، (اور اگر ہم دیکھتے ہیں کہ "أَرْجُلَکُمْ" کے لام پر زبر آیا ہے تو "بِرُءُوسِکُمْ" کے محل پر عطف ہوا ہے نہ کہ "وُجُوهَکُمْ" پر)(۱)(۲)

---

(۱) واضح ہے کہ "وجوهکم" اور "أرجلکم" میں کافی فاصلہ ہے، جس کی بنا پر اس پر عطف ہونا بعید نظر آتا ہے، اس کے علاوہ بہت سے مشہور قاریوں نے "ارجلکم" کو زیر کے ساتھ پڑھا ہے

(۲) تفسیر نمونہ، جلد ۴، صفحہ ۲۸۵

۷۲۔ فلسفہ نماز کیا ہے؟

سورہ عنکبوت میں نماز کا سب سے اہم فلسفہ بیان کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے کہ نماز انسان کو برائیوں اور منکرات سے روکتی ہے ﴿إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ﴾ (۱)

"[اور نماز قائم کرو کہ] یقیناً نماز ہر برائی اور بدکاری سے روکنے والی ہے"

حقیقت نماز چونکہ انسان کو قدرتمند روکنے والے عامل یعنی خدا اور قیامت کے اعتقاد کی یاد دلاتی ہے، لہٰذا انسان کو فحشا و منکرات سے روکتی ہے۔

جب انسان نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو پہلے تکبیر کہتا ہے، خدا کو تمام چیزوں سے بلند و بالا مانتا ہے، پھر اس کی نعمتوں کو یاد کرتا ہے، اس کی حمد و ثنا کرتا ہے، اس کو رحمن اور رحیم کے نام سے پکارتا ہے، اور پھر قیامت کو یاد کرتا ہے، خدا کی بندگی کا اعتراف کرتا ہے، اور اسی سے مدد چاہتا ہے، صراط مستقیم پر چلنے کی درخواست کرتا ہے اور غضب خدا نازل ہونے والے اور گمراہوں کے راستہ سے خدا کی پناہ مانگتا ہے (مضمون سورہ حمد)

بے شک ایسے انسان کے دل و جان میں خدا، پاکیزگی اور تقویٰ کی طرف رغبت ہوتی ہے۔

---

(۱) سورہ عنکبوت، آیت ۴۵

خدا کے لئے رکوع کرتا ہے، اس کے سامنے سجدہ ریز ہوجاتا ہے اس کی عظمت میں غرق ہوجاتا ہے، اور خود غرضی اور تکبر کو بھول جاتا ہے۔

خدا کی وحدانیت اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کی گواہی دیتا ہے۔

اپنے نبی پر درود وسلام بھیجتا ہے، اور خدا کی بارگاہ میں دست بدعا ہوتا ہے کہ پالنے والے! مجھے اپنے نیک اور صالح بندوں میں قرار دے۔ (تشہد وسلام کا مضمون)

چنانچہ یہ تمام چیزیں انسان کے وجود میں معنویت کی لہر پیدا کردیتی ہیں، ایک ایسی لہر جو گناہوں کا سد باب کرتی ہے۔

اس عمل کو انسان رات دن میں کئی مرتبہ انجام دیتا ہے جب صبح اٹھتا ہے تو خدا کی یاد میں غرق ہوجاتا ہے، دوپہر کے وقت جب انسان مادی زندگی میں غرق رہتا ہے اور اچانک مؤذن کی آواز سنتا ہے تو اپنے کاموں کو چھوڑ دیتا ہے اور خدا کی بارگاہ کا رخ کرتا ہے، یہاں تک دن کے اختتام اور رات کی شروع میں بستر استراحت پر جانے سے پہلے خدا سے راز و نیاز کرتا ہے، اور اپنے دل کو اس کے نور کا مرکز قرار دیتا ہے۔

اس کے علاوہ جب نماز کے مقدمات فراہم کرتا ہے تو اپنے اعضا بدن کو دھوتا ہے ان کو پاک کرتا ہے، حرام چیزیں اور غصبی چیزوں سے دوری کرتا ہے اور اپنے محبوب کی بارگاہ میں حاضر ہوجاتا ہے، یہ تمام چیزیں اس کو برائی سے روکنے کے لئے واقعاً مؤثر واقع ہوتی ہیں۔

لیکن نماز میں جس قدر شرائط کمال اور روح عبادت پائی جائے گی اسی مقدار میں برائیوں سے روکے گی، کبھی مکمل طور پر برائیوں سے روکتی ہے اور کبھی جزئی طور پر، [یعنی نماز کی کیفیت کے لحاظ سے انسان برائیوں سے پرہیز کرتا ہے]

یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی شخص نماز پڑھے اور اس پر کوئی اثر نہ ہو، اگرچہ اس کی نماز صرف ظاہری لحاظ سے ہو یا نمازی گنہگار بھی ہو، البتہ اس طرح کی نماز کا اثر کم ہوتا ہے، کیونکہ اگر اس طرح

کے لوگ اس طرح نماز نہ پڑھتے تو اس سے کہیں زیادہ گناہوں میں غرق ہو جاتے۔

واضح الفاظ میں یوں کہیں کہ فحشا و منکر سے نہی کے مختلف درجے ہوتے ہیں، نماز میں جتنی شرائط کی رعایت کی جائے گی اسی لحاظ سے وہ درجات حاصل ہوں گے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول حدیث میں وارد ہوا ہے کہ قبیلۂ انصار کا ایک جوان آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نماز ادا کرتا تھا لیکن وہ گناہوں سے آلودہ تھا، اصحاب نے پیغمبر کرمؐ کی خدمت میں اس کے حالات بیان کیے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **"إنَّ صَلاتَهُ تَنهاهُ يَوماً"** (آخرکار ایک روز اس کی یہی نماز اس کو ان برے کاموں سے پاک کر دے گی)(۱)

نماز کا یہ اثر اس قدر اہمیت کا حامل ہے کہ بعض احادیث میں نماز کے قبول ہونے یا قبول نہ ہونے کا معیار قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ حضرت امام صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے: "مَنْ اَحَبَّ اَنْ يَعلمَ أقُبِلَت صَلوتُه امْ لَم تُقبل؟ فَليَنظُر هَلْ مَنَعَتْ صلوتُهُ عنِ الفَحشاءِ والمُنكرِ؟ فبقدرِ ما منعته قُبِلَت منه"(۲) (اگر کوئی یہ جاننا چاہے کہ اس کی نماز بارگاہ الٰہی میں قبول ہوئی یا نہیں؟ تو اس کو دیکھنا چاہیے کہ نماز اس کو برائیوں سے روکتی ہے یا نہیں؟ جس مقدار میں برائیوں سے روکا ہے اسی مقدار میں نماز قبول ہوئی ہے)۔

اور اس کے بعد مزید ارشاد فرمایا کہ "ذکر خدا اس سے بھی بلند و بالاتر ہے" "وَلَذِكْرُ اللهِ أكبَر"

مذکورہ جملہ کا ظاہر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ نماز کے لئے یہ اہم ترین فلسفہ ہے، یہاں تک فحشا و منکر کی نہی سے بھی زیادہ اہم ہے اور وہ اہم فلسفہ یہ ہے کہ انسان کو خدا کی یاد دلائے کہ جو تمام خیر و سعادت کا سرچشمہ ہے، بلکہ برائیوں سے روکنے کی اصلی وجہ یہی "ذکر اللہ" ہے، دراصل اس

(۲،۱) مجمع البیان، سورۂ عنکبوت، آیت نمبر ۴۵ کے ذیل میں۔

ذکر کی برتری اور عظمت اسی وجہ سے ہے کیونکہ یہ اس کی علت شمار ہوتا ہے۔

اصولی طور پر خدا کی یاد انسان کے لئے باعث حیات ہے اور اس سلسلہ میں کوئی بھی چیز اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی، ﴿اَلاَ بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ﴾ "آگاہ ہو جاؤ کہ یادِ خدا دل کو اطمینان و سکون عطا کرتی ہے"۔

حقیقت تو یہ ہے کہ تمام عبادتوں (چاہے نماز ہو یا اس کے علاوہ) کی روح یہی ذکر خدا ہے، اقوال نماز، افعال نماز، مقدمات نماز اور تعقیبات نماز سب کے سب دراصل انسان کے دل میں یاد خدا زندہ کرتے ہیں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ سورہ طہٰ، آیت نمبر ۱۴ میں نماز کے اس بنیادی فلسفہ کی طرف اشارہ ہوا ہے، جناب موسیٰ علیہ السلام سے خطاب ہوتا ہے ﴿اَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي﴾، (میری یاد کے لئے نماز قائم کرو)

معاذ بن جبل سے منقول ایک حدیث میں وارد ہوا ہے کہ "عذاب الٰہی سے بچانے والے اعمال میں "ذکر اللہ" سے بڑھ کر کوئی عمل نہیں ہے، سوال کیا گیا راہ خدا میں جہاد بھی نہیں؟ جواب دیا ہاں، کیونکہ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے (وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ)

انسان اور معاشرہ کی تربیت میں نماز کا کردار

اگرچہ نماز کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کا فلسفہ کسی پر پوشیدہ ہو لیکن قرآنی آیات اور احادیث معصومین علیہم السلام میں مزید غور و فکر کرنے سے بہت ہی اہم چیزوں کی طرف رہنمائی ہوتی ہے

۱۔ روح نماز اور نماز کا فلسفہ ذکر خدا ہی ہے، وہی "ذکر اللہ" جو مذکورہ آیت میں بلندترین نتیجہ کے عنوان سے بیان ہوا ہے۔

البتہ ایسا ذکر جو غور و فکر کا مقدمہ، اور ایسی فکر جو عمل کا سبب بنے، جیسا کہ حضرت امام صادق

علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے ﴿ولذکر اللہ اکبر﴾ کی تفسیر میں فرمایا "ذکر اللہ عند ما احل و حرم "(۱)"حلال و حرام کے وقت یاد خدا کرنا" (یعنی یاد خدا کریں اور حلال کام انجام دیں اور حرام کاموں سے پرہیز کریں)

۲۔نماز، گناہوں سے دوری اور خدا کی طرف سے رحمت و مغفرت حاصل ہونے کا سبب ہے، کیونکہ نماز انسان کو توبہ و اصلاح نفس کی دعوت دیتی ہے، اسی وجہ سے ایک حدیث میں بیان ہوا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ایک صحابی سے سوال کیا "اگر تمہارے مکان کے پاس پاک و صاف پانی کی نہر جاری ہو اور تم روزانہ پانچ مرتبہ اس میں غوطہ لگاؤ تو کیا تمہارے بدن میں گندگی اور کثافت باقی رہے گی؟

اس نے جواب دیا نہیں [یا رسول اللہ]، آپ نے فرمایا نماز بالکل اسی جاری پانی کی طرح ہے کہ جب انسان نماز پڑھتا ہے تو گناہوں کی گندگی دور ہو جاتی ہے اور دو نمازوں کے درمیان انجام دئے گئے گناہ پاک ہو جاتے ہیں۔(۲)

گویا نماز انسان کے بدن میں گناہوں کے ذریعہ وارد ہونے والے زخموں کے لئے مرہم کا کام کرتی ہے اور انسان کے دل پر لگے ہوئے زنگ کو چھڑا دیتی ہے۔

۳۔نماز، آئندہ گناہوں کے لئے سد باب بن جاتی ہے، کیونکہ نماز انسان میں ایمان کی روح کو مضبوط کرتی ہے اور تقویٰ کے پودے کی پرورش کرتی ہے، اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ "ایمان" اور "تقویٰ" گناہوں کے مقابل دو مضبوط دیواریں ہیں، اور یہ وہی چیز ہے جس کو مذکورہ آیت میں "نہی از فحشاء و منکر" کے نام سے بیان کیا گیا ہے، اور یہ وہی چیز ہے جس کو متعدد حدیثوں

---

(۱) بحار الانوار، جلد ۸۲، صفحہ ۲۰۰

(۲) وسائل الشیعہ، جلد ۳، صفحہ ۷ (باب ۲، از ابواب اعداد الفرائض حدیث ۳)

میں پڑھتے ہیں کہ جب گنہگار لوگوں کے حالات ائمہ علیہم السلام کے سامنے بیان کئے گئے تو فرمایا غم نہ کرو نماز ان کی اصلاح کر دے گی، اور کر دی۔

۴۔ نماز، انسان کو خواب غفلت سے بیدار کر دیتی ہے، راہ حق پر چلنے والوں کی سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ وہ اپنی غرض خلقت کو بھول جاتے ہیں اور مادی دنیا اور زود گزر لذتوں میں غرق ہو جاتے ہیں، لیکن نماز چونکہ تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر اور شب و روز میں پانچ بار پڑھی جاتی ہے، مسلسل انسان کو متوجہ اور متنبہ کرتی رہتی ہے اور اس کو غرض خلقت یاد دلاتی رہتی ہے، اور اس دنیا میں اسے اس کی حیثیت سے آگاہ کرتی رہتی ہے، یہ انسان کے پاس ایک عظیم نعمت الٰہی ہے کہ شب و روز پانچ مرتبہ اس کو بھرپور طریقہ پر ہوشیار کرتی ہے۔

۵۔ نماز خود پسندی اور تکبر کو ختم کرتی رہتی ہے کیونکہ انسان ۲۴ گھنٹوں میں ۱۷ رکعت نماز پڑھتا ہے اور ہر رکعت میں دوبار اپنی پیشانی کو خدا کی بارگاہ میں رکھتا ہے، اور خدا کی عظمت کے مقابل اپنے کو ایک ذرہ شمار کرتا ہے بلکہ خدا کی عظمت کے مقابل اپنے کو صفر شمار کرتا ہے۔

نماز غرور و خود خواہی کے پردوں کو چاک کر دیتی ہے، تکبر اور برتری کو ختم کر دیتی ہے۔

اسی وجہ سے حضرت علی علیہ السلام نے اپنی اس مشہور و معروف حدیث میں بیان فرمایا ہے کہ جس میں عبادت کے فلسفہ کو بیان کیا ہے اور ایمان کے بعد سب سے پہلی عبادت کو "نماز" قرار دیتے ہوئے اس مطلب کو واضح فرمایا ہے "فَرَضَ اللهُ الإیمانَ تَطهیراً مِنَ الشِّرکِ وَالصَّلوٰةَ تَنزِیهاً عَنِ الکِبرِ "(۱) خداوند عالم نے انسان کے لئے ایمان کو شرک سے پاک کرنے کے لئے واجب قرار دیا ہے اور نماز کو غرور و تکبر سے پاک کرنے کے لئے [واجب قرار دیا ہے]۔"

---

(۱) نہج البلاغہ، کلمات قصار، نمبر ۲۵۲

۶۔ نماز انسان کے لئے معنوی کمال اور فضائل اخلاق کی پرورش کا ذریعہ ہے، کیونکہ یہی نماز انسان کو مادہ کی محدودیت اور عالم طبیعت کی چہار دیواری سے باہر نکال کر عالم ملکوت کی طرف دعوت دیتی ہے، جس سے انسان فرشتوں کا ہم صدا اور ہمراز ہو جاتا ہے، اور انسان اپنے کو بغیر کسی واسطے کے خدا کے حضور میں پاتا ہے اور اس سے گفتگو کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

ہر روز اس عمل کی تکرار خداوند عالم کے صفات جیسے رحمانیت اور رحیمیت اور اس کی عظمت کے پیش نظر خصوصاً سورہ حمد کے بعد دوسرے سوروں سے مدد لیتے ہوئے جو نیکیوں اور خوبیوں کی طرف دعوت دیتے ہیں، یہ سب چیزیں انسان میں اخلاقی فضائل کی پرورش کے لئے بہترین اور موثر ہیں۔

لہذا حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے نماز کے فلسفہ کو اس طرح بیان کیا: "الصَّلاۃُ قُربانُ کُلِّ تقي"، (نماز ہر پرہیزگار کے لئے خدا سے تقرب کا وسیلہ ہے) (۱)

۷۔ نماز انسان کے دوسرے اعمال کو [بھی] روح اور اہمیت عطا کرتی ہے اس لئے کہ نماز سے اخلاص پیدا ہوتا ہے، کیونکہ نماز خلوص نیت، نیک گفتار اور مخلصانہ اعمال کا مجموعہ ہے، ہر روز یہ عمل انسان کے اندر دوسرے اعمال کا بیج ڈالتا ہے اور روح اخلاص کو مضبوط کرتا ہے۔

لہذا ایک مشہور و معروف حدیث میں بیان ہوا ہے کہ حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام نے اس وقت اپنی وصیت میں فرمایا جب آپ ابن ملجم کی تلوار سے زخمی ہو چکے تھے اور آپ کا آخری وقت تھا، فرماتے ہیں:

"اللهَ اللهَ فِي الصَّلوٰةِ فَإنَّها عَمُودُ دِينِكُمْ" (۲)

---

(۱) نہج البلاغہ، کلمات قصار نمبر ۱۳۶

(۲) نہج البلاغہ، خطوط [مکتوب] (وصیت) ۴۷

''خدارا! خدارا! میں تم کو نماز کی سفارش کرتا ہوں کیونکہ یہی تمہارے دین کا ستون ہے''۔

ہم لوگ اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ جب کسی خیمہ کا ستون ٹوٹ جائے یا گر جائے تو طرف کی رسیوں اور کیلوں کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا ہے خواہ کتنی ہی مضبوط کیوں نہ ہوں، اسی طرح جب نماز کے ذریعہ خدا سے بندوں کا رابطہ ختم ہو جائے تو دوسرے اعمال کا اثر بھی ختم ہو جاتا ہے۔

حضرت امام صادق علیہ السلام سے منقول ایک حدیث میں بیان ہوا ہے ''أَوَّلُ مَا يُحَاسَبُ بِهِ الْعَبْدُ الصَّلوةُ فَإِنْ قُبِلَتْ قُبِلَ سَائِرُ عَمَلِهِ، وَإِنْ رُدَّتْ رُدَّ عَلَيْهِ سَائِرُ عَمَلُهُ'' (روز قیامت بندوں میں جس چیز کا سب سے پہلے حساب ہوگا وہ نماز ہے، اگر نماز قبول ہو گئی تو دوسرے اعمال بھی قبول ہو جائیں گے اور اگر نماز رد ہو گئی تو دوسرے اعمال بھی رد ہو جائیں گے!)

شاید اس کی دلیل یہ ہو کہ نماز خالق و مخلوق کے درمیان ایک راز ہے اگر صحیح طور پر بجالائی جائے تو انسان کے اندر نیت، خلاص اور قرب الٰہی پیدا ہوتا ہے جو دوسرے اعمال قبول ہونے کا ذریعہ ہے، ورنہ دوسرے اعمال کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور وہ اپنا عتبار کھو دیتے ہیں۔

۸۔ نماز میں پائے جانے والے مطالب اور مضمون سے قطع نظر اگر اس کے شرائط پر توجہ کریں تو وہ بھی اصلاح اور پاکیزگی کی دعوت دیتے ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ نمازی کی جگہ، نمازی کے کپڑے، جس فرش پر نماز پڑھتا ہے، جس پانی سے وضو یا غسل کیا ہے، جس جگہ وضو یا غسل کیا ہے، یہ تمام چیزیں غصبی نہیں ہونی چاہئے، اور ان کے حوالے سے کسی دوسرے پر ظلم اور تجاوز نہ کیا گیا ہو، جو شخص ظلم وستم، سود خوری، غصب، ناپ تول میں کمی، رشوت خوری اور حرام روزی وغیرہ جیسی چیزوں سے آلودہ ہو تو یہ شخص نماز کے مقدمات کس طرح فراہم کر سکتا ہے؟ لہٰذا ہر روز پانچ مرتبہ اس نماز کی تکرار دوسروں کے حقوق کی رعایت کی دعوت دیتی ہے۔

۹۔ نماز صحیح ہونے کے شرائط کے علاوہ، شرائط قبول یا بالفاظ دیگر شرائط کمال بھی پائے جاتے ہیں جن کی رعایت خود بہت سے گناہوں کو ترک کرنے کا سبب بنتی ہے۔

فقہ و حدیث کی کتابوں میں بہت سی چیزوں کو "موانع نماز" کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے جن میں سے ایک مسئلہ شراب پینا ہے، روایت میں بیان ہوا ہے کہ "لَا تُقْبَلُ صَلٰوةُ شَارِبُ الْخَمْرِ أَرْبَعِيْنَ يَوْماً إِلَّا أَنْ يَتُوْبَ"(۱) "شراب پینے والے کی نماز، چالیس دن تک قبول نہیں ہوتی مگر یہ کہ توبہ کرلے"۔

متعدد روایت میں بیان ہوا ہے کہ جن لوگوں کی نماز قبول نہیں ہوتی ان میں سے ایک ظالم افراد کا رہبر ہے"۔(۲)

بعض دوسری روایات میں تصریح کی گئی ہے کہ جو شخص زکوٰۃ نہیں کرتا اس کی نماز قبول نہیں ہے، اسی طرح دوسری روایات میں بیان ہوا ہے کہ حرام لقمہ کھانے والے یا خود پسندی کرنے والے کی نماز قبول نہیں ہوتی۔

لہٰذا ان تمام احادیث کے پیش نظر یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ ان تمام شرائط کا فراہم کرنا انسان کی اصلاح کے لئے بہت مفید ہے۔

۱۰۔ نماز کے ذریعہ انسان میں نظم و نسق کی روح طاقتور ہوتی ہے کیونکہ نماز معین وقت پر پڑھی جاتی ہے، یعنی اگر انسان نماز کو وقت سے پہلے یا وقت کے بعد پڑھے تو اس کی نماز باطل ہو جاتی ہے، اسی طرح نماز کے دیگر آداب و احکام جیسے نیت، قیام، قعود، رکوع اور سجود وغیرہ کی رعایت سے انسان کے لئے دوسرے کاموں میں بھی نظم کا لحاظ کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

نماز کے یہ تمام فائدے اس وقت ہیں جب نماز جماعت سے نہ پڑھی جائے اور اگر نماز کے ساتھ جماعت کی فضیلت کا اضافہ بھی کردیا جائے (کیونکہ نماز کی روح، جماعت ہے) تو پھر

---

(۱) بحار الانوار، جلد ۸۴، صفحہ ۳۱۷ و ۳۲۰

(۲) بحار الانوار، جلد ۸۴، صفحہ ۳۱۸

بے شمار برکتیں نازل ہوتی ہیں، جس کی تفصیل یہاں بیان نہیں کی جاسکتی، کم و بیش اکثر مومنین نماز جماعت کی فضیلت سے آگاہ ہیں۔

ہم فلسفۂ نماز اور اسرار نماز کے سلسلہ میں یہ گفتگو کو حضرت امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام کی ایک بہترین حدیث پر ختم کرتے ہیں:

امام علیہ السلام نے اس خط کے جواب میں اس طرح فرمایا جس میں فلسفۂ نماز کے بارے میں سوال کیا گیا تھا

نماز کو اس لئے واجب قرار دیا گیا ہے کہ اس میں خداوند عالم کی ربوبیت کا اقرار پایا جاتا ہے، اس میں شرک و بت پرستی کا مقابلہ ہوتا ہے، خدا کی بارگاہ میں مکمل خضوع و خشوع پایا جاتا ہے، انسان اپنے گناہوں کا اقرار کرتا ہے اور خداوند عالم سے اپنے گناہوں کی بخشش طلب کرتا ہے، انسان ہر روز عظمت پروردگار کے سامنے اپنی پیشانی کو خم کرتا ہے۔

اور نماز کا مقصد یہ ہے کہ انسان ہمیشہ ہوشیار اور متوجہ رہے انسان کے دل پر بھول چوک کی گرد و غبار نہ بیٹھے، مست اور مغرور نہ ہو، خاشع اور خاضع رہے، انسان دین و دنیا کی نعمتوں کو حاصل کرنے کے لئے کوشش کرے۔

جب انسان ہر روز نماز کے ذریعہ ذکر خدا کرتا ہے تو یہ سبب بنتا ہے کہ وہ اپنے مولا و آقا، مدبر اور خالق کو نہ بھولے اور اس پر سرکشی اور غلبہ کرنے کا تصور تک نہ کرے۔

خداوند عالم پر توجہ رکھنا اور خود کو اس کے سامنے حاضر سمجھنا انسان کو گناہوں سے دور رکھتا ہے اور مختلف برائیوں سے روکتا ہے۔(۱)(۲)

---

(۱) وسائل الشیعہ، جلد ۳، صفحہ ۴

(۲) تفسیر نمونہ، جلد ۱۶، صفحہ ۲۹۱

روزہ

۳۷۔ روزہ کا فلسفہ کیا ہے؟

روزہ کے مختلف پہلو ہیں اور انسان کے اندر مادی و معنوی لحاظ سے بہت زیادہ تاثیر رکھتا ہے، جن میں سے سب سے اہم "اخلاقی پہلو" اور "تربیتی فلسفہ" ہے۔

روزہ کا سب سے اہم فائدہ یہ ہے کہ روزہ کے ذریعہ انسان کی روح "لطیف"، اور اس کی "قوت ارادی" مضبوط ہوتی ہے اور خواہشات میں "اعتدال" پیدا ہوتا ہے۔

روزہ دار کو چاہئے کہ روزہ کے عالم میں بھوک اور پیاس کو برداشت کرتے ہوئے جنسی لذت سے بھی چشم پوشی کرے، اور عملی طور پر یہ ثابت کردکھائے کہ وہ جانوروں کی طرح کسی چراگاہ اور گھاس پھوس کا اسیر نہیں ہے، سرکش نفس کی لگام اس کے ہاتھ میں ہے اور ہوا وہوس اور شہوت و خواہشات اس کے کنٹرول میں ہے۔

دراصل روزہ کا سب سے بڑا فلسفہ یہی روحانی اور معنوی اثر ہے، جس انسان کے پاس کھانے پینے کی مختلف چیزیں موجود ہوں جب اور اس کو بھوک یا پیاس لگتی ہے تو وہ فوراً کھا پی لیتا ہے، بالکل ان درختوں کے مانند جو کسی نہر کے قریب ہوتے ہیں اور ہر وقت پانی سے سیراب ہوتے رہتے ہیں وہ نازپرور ہوتے ہیں یہ حوادث کا مقابلہ بہت کم کرتے ہیں ان میں باقی رہنے کی صلاحیت کم ہوتی

ہے اگر انھیں چند دن تک پانی نہ ملے تو پژمردہ ہو کر خشک ہو جاتے ہیں۔

لیکن جنگل، بیابان اور پہاڑوں میں، گنے والے درخت ہمیشہ سخت طوفان، تمازت آفتاب اور کڑاکے کی سردیوں کا مقابلہ کرنے کے عادی ہوتے ہیں اور طرح طرح کی محرومیوں سے دست و گریباں رہتے ہیں، لہٰذا یسے درخت بادوام اور مستحکم ہوتے ہیں"

روزہ بھی انسان کی روح و جان کے ساتھ یہی سلوک کرتا ہے، یہ وقتی پابندیوں کے ذریعہ انسان میں قوت دفاع اور قوت ارادی پیدا کرتا ہے اور اسے سخت حوادث کے مقابلہ میں طاقت عطا کرتا ہے، چونکہ روزہ سرکش خواہشات اور انسانی جذبات پر کنٹرول کرتا ہے لہٰذا اس کے ذریعہ انسان کے دل پر نور و ضیا کی بارش ہوتی ہے، خلاصہ یہ کہ روزہ، انسان کو عالم حیوانیت سے بلند کرکے فرشتوں کی صف میں لے جا کر کھڑا کر دیتا ہے، ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ (۱)، (شاید تم پرہیزگار بن جاؤ) اس آیہ شریفہ میں روزہ کے واجب ہونے کا فلسفہ بیان ہوا ہے۔

اس مشہور و معروف حدیث میں بھی اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے "اَلصَّوْمُ جُنَّةٌ مِنَ النَّارِ" (۲) (روزہ جہنم کی آگ سے بچنے کے لئے ایک ڈھال ہے)۔

ایک اور حدیث حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ ہم کون سا کام کریں جس کی وجہ سے شیطان ہم سے دور رہے؟ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا روزہ، شیطان کا منہ کالا کر دیتا ہے، راہ خدا میں خرچ کرنے سے اس کی کمر ٹوٹ جاتی ہے خدا کے لئے محبت و دوستی نیز عمل صالح کی پابندی سے اس کی دم کٹ جاتی ہے اور توبہ و استغفار سے اس کے دل کی بھی رگ کٹ جاتی ہے۔ (۳)

---

(۱) سورہ بقرہ، آیت ۱۸۳۔ (۲) بحار الانوار جلد ۹۶ صفحہ ۲۵۶

(۳) بحار الانوار، جلد ۹۶، صفحہ ۲۵۵

نہج البلاغہ میں عبادت کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے حضرت امیر المومنین علیہ السلام روزہ کے بارے میں فرماتے ہیں "وَالصِّيَامُ اِبْتِلَاءً لِإِخْلَاصِ الْخَلْقِ" (۱) "خداوند عالم نے روزہ کو شریعت میں اس لئے شامل کیا تا کہ لوگوں میں اخلاقی روح کی پرورش ہو سکے"۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک اور حدیث میں منقول ہے کہ آپ نے فرمایا "اِنَّ لِلْجَنَّةِ بَاباً يُدْعَى الرَّيَّانُ لَا يَدْخُلُ فِيهَا إِلَّا الصَّائِمُونَ" (بہشت کے ایک دروازے کا نام "ریان" (یعنی سیراب کرنے والا) ہے جس سے صرف روزہ دار ہی داخل جنت ہوں گے۔)

شیخ صدوق علیہ الرحمہ نے معانی الاخبار میں اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے تحریر فرمایا کہ بہشت میں داخل ہونے کے لئے اس دروازہ کا انتخاب اس بنا پر ہے کہ روزہ دار کو چونکہ زیادہ تکلیف پیاس کی وجہ سے ہوتی ہے لہذا جب روزہ دار اس دروازے سے داخل ہوگا تو وہ ایسا سیراب ہوگا کہ اسے پھر کبھی تشنگی کا احساس نہ ہوگا۔ (۲)

روزہ کے معاشرتی اثرات

روزہ کا اجتماعی اور معاشرتی اثر کسی پر پوشیدہ نہیں ہے، روزہ انسانی معاشرہ کے لئے ایک درس مساوات ہے کیونکہ اس مذہبی فریضہ کی انجام دہی سے صاحب ثروت لوگ بھوکوں اور معاشرہ کے محروم افراد کی کیفیت کا احساس کر سکیں گے اور دوسری طرف شب و روز کی غذا میں کمی کر کے ان کی مدد کے لئے جلدی کریں گے۔

البتہ ممکن ہے کہ بھوکے اور محروم لوگوں کی توصیف کر کے خداوند عالم صاحب قدرت لوگوں کو ان کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہو اور اگر یہ معاملہ حسی اور عینی پہلو اختیار کر لے تو اس کا ایک دوسرا اثر

---

(۱) نہج البلاغہ، کلمات قصار، کلمہ نمبر ۲۵۲

(۲) بحار الانوار، جلد ۹۶، صفحہ ۲۵۲

ہوتا ہے، روزہ اس اہم اجتماعی موضوع کو حسی رنگ دیتا ہے، اس مشہور حدیث میں حضرت امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ ہشام بن حکم نے روزہ کی علت اور سبب کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا:

"روزہ اس لئے واجب ہوا ہے کہ فقیر اور غنی کے درمیان مساوات قائم ہو جائے اور یہ اس وجہ سے کہ غنی بھی بھوک کا مزہ چکھ لے اور فقیر کا حق ادا کردے، کیونکہ مالدر عموماً جو کچھ چاہتے ہیں ان کے لئے فراہم ہو جاتا ہے خدا چاہتا ہے کہ اس کے بندوں کے درمیان مساوات قائم ہو اور مالدروں کو بھی بھوک اور درد و غم کا احساس ہو جائے تا کہ وہ کمزور اور بھوکے افراد پر رحم کریں۔ (۱)

روزہ کے طبی اثرات

طب کی جدید اور قدیم تحقیقات کی روشنی میں امساک (کھانے پینے سے پرہیز) بہت سی بیماریوں کے علاج کے لئے معجزنما اثر رکھتا ہے جو قابل انکار نہیں ہے، شاید ہی کوئی حکیم ہو جس نے اپنی مبسوط تالیفات اور تصنیفات میں اس حقیقت کی طرف اشارہ نہ کیا ہو کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ بہت سی بیماریاں زیادہ کھانے سے پیدا ہوتی ہیں، اور چونکہ اضافی مواد بدن میں جذب نہیں ہوتا جس سے خطرناک اور اضافی چربی پیدا ہوتی ہے یا یہ چربی اور خون میں اضافی شوگر کا باعث بنتی ہے، عضلات کا یہ اضافی مواد در حقیقت بدن میں ایک متعفن [بدبودار] بیماری کے جراثیم کی پرورش کے لئے گندگی کا ڈھیر بن جاتا ہے ایسے میں ان بیماریوں کا مقابلہ کرنے کے لئے بہترین راہ حل یہ ہے کہ گندگی کے ان ڈھیروں کو امساک اور روزہ کے ذریعہ ختم کیا جائے، روزہ ان اضافی غلاظتوں اور بدن میں جذب نہ ہونے والے مواد کو جلا دیتا ہے، در اصل روزہ بدن کو صاف و شفاف مکان بنا دیتا ہے۔

---

(۱) وسائل الشیعہ، جلد ۷، باب اول، کتاب صوم، صفحہ ۳

ان کے علاوہ روزہ سے معدہ کو اچھا خاص آرام ملتا ہے جس سے ہاضمہ کا نظام صحیح ہو جاتا ہے، چونکہ یہ بدن انسان کی نازک ترین مشینری ہے جو سال بھر کام کرتی رہتی ہے لہذا اس کے لئے تا آرام نہایت ضروری ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ اسلامی حکم کی رو سے روزہ دار کو اجازت نہیں ہے وہ سحری اور افطاری کی غذا میں افراط اور زیادتی سے کام لے، یہ اس لئے ہے تاکہ اس سے حفظان صحت اور علاج سے مکمل نتیجہ حاصل کیا جاسکے ورنہ ممکن ہے کہ مطلوبہ نتیجہ نہ حاصل ہو سکے۔

چنانچہ "الکسی سوفرین" ایک روسی دانشور لکھتا ہے

روزہ ان بیماریوں کے علاج کے لئے خاص طور پر مفید ہے خون کی کمی، انتڑیوں کی کمزوری، التہاب زائدہ (Appendicitis) اندرونی اور بیرونی قدیم پھوڑے، تپ دق (T B) اسکلیروز، نقرس، استسقاء، (جلندر کی بیماری جس میں بہت زیادہ پیاس لگتی ہے اور پیٹ دن بدن بڑھتا جاتا ہے) جوڑوں کا درد، نوراستھنی، عرق النساء، (چڈوں سے ٹخنوں تک پہنچنے والا درد)، خزاز (جلد کا گرنا) امراض چشم، شوگر، امراض جلد، امراض جگر اور دیگر بیماریں۔

امساک اور روزہ کے ذریعہ علاج صرف مندرجہ بالا بیماریوں سے مخصوص نہیں ہے بلکہ وہ بیماریاں جو جسم انسان کے اصول سے متعلق ہیں اور جسم کے خلیوں سے چمٹی ہوئی ہیں مثلاً سرطان، سفلیس، سل اور طاعون کے لئے بھی شفا بخش ہے(۱)

ایک مشہور و معروف حدیث میں پیغمبر اکرم ﷺ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا "صُومُوا تَصِحُّوا"(۲)، (روزہ رکھوتا کہ صحت مند رہو)۔

---

(۱) روزہ روش نوین برای درمان بیماریہا، صفحہ ۶۵ طبع اول۔

(۲) بحار الانوار، جلد ۹۶ صفحہ ۲۵۵

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک اور حدیث میں منقول ہے جس میں آپ نے فرمایا: "المعدة بيت كُلّ داءٍ والحمية رأسُ كُلّ دواءٍ" (۱) معدہ ہر بیماری کا گھر ہے، اور امساک [روزہ] ہر مرض کی دوا ہے۔ (۲)

( ) بحار الانوار، جلد ۱۴، طبع قدیم

(۲) تفسیر نمونہ، جلد ۱، صفحہ ۶۲۸

خمس

۴۷۔ خمس کا نصف حصہ سادات سے مخصوص ہونا، کیا طبقاتی نظام نہیں ہے؟

بعض لوگوں کے ذہن میں یہ تصور آتا ہے کہ یہ اسلامی ٹیکس جو بہت سے مال کا پانچواں حصہ ہے جس کا آدھا حصہ سادات اور اولاد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مخصوص ہے، کیا یہ ایک طرح سے نسل پرستی نہیں ہے؟ جس میں قرابا پروری دکھائی دیتی ہے یہ موضوع اسلامی اجتماعی عدالت اور اسلام کے عالمی ہونے سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

جواب میں ہم عرض کرتے ہیں جو لوگ اس طرح کا خیال رکھتے ہیں انھوں نے اس اسلامی حکم کی مکمل طور پر تحقیق نہیں کی ہے، کیونکہ اس اعتراض کا جواب خمس کے شرائط میں موجود ہے۔

وضاحت:

اولاً خمس کا نصف حصہ جو سادات اور بنی ہاشم کو دیا جاتا ہے لیکن صرف غریب اور نیازمند افراد کو دیا جاتا ہے اور وہ بھی سال بھر کا خرچ، اس سے زیادہ نہیں دیا جا سکتا، لہٰذا خمس کا یہ نصف حصہ صرف انھیں لوگوں کو دیا جا سکتا ہے جو غریب، بیمار، یتیم بچے ہوں، یا کسی بھی باعث اپنی زندگی کے خرچ سے لاچار ہوں۔

لہٰذا جو لوگ کام کرنے کی قدرت رکھتے ہوں (اس وقت یا آئندہ) اور اپنے خرچ بھر درآمد

رکھتے ہوں ان کو خمس نہیں دیا جا سکتا۔

ثانیاً محتاج اور غریب سادات کو زکوٰۃ لینے کا حق نہیں ہے، وہ زکوٰۃ کے بدلے صرف نصف خمس میں سے لے سکتے ہیں ()

ثالثاً اگر سہم سادات جو خمس کا نصف حصہ ہے اگر سادات کی ضرورت سے زیادہ ہو جائے تو اس کو بیت المال میں جمع کیا جائے گا اور دوسرے موارد میں خرچ کیا جائے گا، اور اگر سہم سادات، سادات کے لئے کافی نہ ہو تو انھیں بیت المال یا زکوٰۃ سے دیا جائے گا۔

مذکورہ تین نکات پر توجہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مادی لحاظ سے سادات اور غیر سادات میں کوئی فرق نہیں رکھا گیا ہے۔

غیر سادات کے غریب افراد اپنے خرچ کے لئے زکوٰۃ لے سکتے ہیں لیکن خمس سے محروم ہیں، اسی طرح غریب سادات صرف خمس لے سکتے ہیں لیکن وہ زکوٰۃ سے محروم ہیں۔

دراصل یہاں پر دو صندوق ہیں "خمس کا صندوق"، "زکوٰۃ کا صندوق"، سادات یا غیر سادات ان دونوں میں سے صرف ایک سے لے سکتے ہیں اور وہ بھی برابر برابر یعنی اپنے سال بھر کا خرچ۔ (غور کیجئے)

جن لوگوں نے ان شرائط پر غور نہیں کیا وہ اس طرح کا تصور کرتے ہیں کہ سادات کے لئے بیت المال سے زیادہ حصہ قرار دیا گیا ہے یا ان کے لئے خمس ایک امتیاز قرار دیا گیا ہے۔

صرف یہاں پر ایک سوال یہ پیش آتا ہے کہ اگر ان دونوں میں نتیجہ کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے تو پھر اس فرق کا فائدہ کیا ہے؟

() سادات کو زکوٰۃ نہیں دی جا سکتی، یہ ایک مسلم مسئلہ ہے اور اس سلسلہ میں حدیث و فقہ کی کتابوں میں تفصیل سے بیان ہوا ہے کیا اس بات پر یقین کیا جا سکتا ہے کہ اسلام نے غیر سادات کے غریبوں کا خیال رکھا ہو لیکن غریب سادات کا خیال نہیں کیا ہے؟!

اس سوال کا جواب بھی اس بات پر غور و فکر کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ خمس اور زکوٰۃ میں ایک اہم فرق پایا جاتا ہے اور وہ یہ کہ زکوٰۃ ایک ایسا ٹیکس ہے جو دراصل اسلامی معاشرہ کے عام اموال سے متعلق ہے لہٰذا اس کو معمولاً اسی سلسلہ میں خرچ بھی کیا جاتا ہے، لیکن خمس ایک ایسا ٹیکس ہے جو اسلامی حکومت سے متعلق ہے یعنی اسلامی حکومت کے عہدہ داروں اور حکومتی ملازمین اس سے فیضیاب ہوتے ہیں۔

اس بنا پر سادات کا عام اموال (زکوٰۃ) سے محروم ہونا، درحقیقت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رشتہ داروں کو اس حصہ [مال] سے دور رکھنا ہے تاکہ مخالفوں کو بہانہ نہ مل جائے کہ پیغمبرؐ نے اپنے رشتہ داروں کو عام اموال پر قابض بنا دیا۔

دوسری طرف غریب سادات کی ضرورت بھی کہیں سے پوری ہونی چاہئے تھی، تو اسلامی قوانین نے اس سلسلہ میں یہ پیش کش کی کہ سادات، اسلامی حکومت کے بجٹ سے استفادہ کریں نہ عام بجٹ سے، دراصل خمس نہ صرف سادات کے لئے ایک امتیاز ہے بلکہ مصلحت کے تحت بدگمانی سے بچانے کے لئے قرار دیا گیا ہے۔(۱)(۳)

---

(۱) اگر ہم بعض روایت میں یہ دیکھتے ہیں کہ "کرامۃ لھم عن اوساخ الناس" (تو اس کا مقصد یہ ہے کہ سادات زکوٰۃ سے دور رہیں کیونکہ زکوٰۃ لوگوں کے مال کا کثیف حصہ (میل کچیل) شمار کیا جاتا ہے) اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک طرف تو سادات کو اس محرومیت اور ممنوعیت پر قانع کیا جا سکے اور دوسری طرف لوگوں کو یہ باور کرا دیا جائے کہ جہاں تک ممکن ہو بیت المال سے ہمیشہ فیض نہ لیں اور زکوٰۃ کو سالوگوں کے لئے چھوڑ دیں جو بہت زیادہ غریب محتاج ہیں

(۲) تفسیر نمونہ، جلد ۷، صفحہ ۱۸۱

زکوٰۃ

۷۵۔ فلسفہ زکوٰۃ کیا ہے؟

اسلام صرف ایک اخلاقی یا فلسفی اور عقائدی مکتب کے عنوان سے نہیں آیا ہے بلکہ ایک "مکمل آئین" کے عنوان سے پیش ہوا ہے، جس میں تمام مادی اور معنوی ضرورتوں کو مد نظر رکھا گیا ہے، اسلام نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے زمانہ سے ہی حکومت تشکیل دے کر غریب اور محتاج لوگوں کی حمایت اور طبقاتی نظام کا مقابلہ کیا ہے، جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بیت المال اور زکوٰۃ جو بیت المال کی درآمد کا راستہ ہے، اسلام کی اہم منصوبہ بندی میں سے ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہر معاشرہ میں غریب، محتاج، بیمار، بے سرپرست یتیم اور اپاہج لوگ پائے جاتے ہیں، جن کی حمایت اور مدد ہونی چاہئے۔

اور اسی طرح دشمن کے مقابل اپنی حفاظت کے لئے نگہبان اور مجاہدین کی ضرورت ہوتی ہے جس کا خرچ حکومت کو ادا کرنا ہوتا ہے۔

اسی طرح حکومتی ملازمین، قاضی، دینی ادارے اور تبلیغی وسائل کے لئے بھی کچھ مصارف کی ضرورت ہوتی ہے، جس کے لئے منظم طور پر منصوبہ بندی کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ اسلامی نظام بہتر طور پر قائم ہو سکے۔

اسی وجہ سے اسلام نے زکوٰۃ پر ایک خاص توجہ دی ہے جو دراصل ایک طرح سے "انکم ٹیکس" اور "ذخیرہ شدہ سرمایہ پر ٹیکس" ہے، اور زکوٰۃ کی اہمیت کے پیش نظر اس کو اہم ترین عبادت میں شمار کیا گیا ہے، بہت سے مقامات پر نماز کے ساتھ ذکر ہوا ہے، یہاں تک کہ قبولیت نماز کی شرط شمار کی گئی ہے!

بلکہ اسلامی روایات میں بیان ہوا ہے کہ اگر اسلامی حکومت نے کسی شخص یا اشخاص سے زکوٰۃ کا مطالبہ کیا اور انھوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا اور حکومت سے مقابلہ کیا تو ان کو مرتد شمار کیا جائے گا، اور اگر ان پر وعظ و نصیحت کا کوئی اثر نہ ہو تو اس صورت میں طاقت کا سہارا لینا جائز ہے، جیسے کہ واقعہ "اصحاب ردّہ" (جس گروہ نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد زکوٰۃ دینے سے انکار کیا اور خلیفۂ وقت نے ان سے مقابلہ کرنے کی ٹھان لی یہاں تک حضرت علی علیہ السلام نے اس مقابلہ پر رضامندی دے دی اور خود ایک پرچم دار کے عنوان سے میدان جنگ میں حاضر ہوئے) تاریخ میں مشہور ہے۔

حضرت امام صادق علیہ السلام سے منقول ایک روایت میں بیان ہوا ہے: "مَنْ مَنَعَ قِيرَاطاً مِنَ الزَّكَاةِ فَلَيسَ هُوَ بِمُؤمِنٍ، وَلَا مُسْلِمٍ، وَلَا كَرَامَةَ" (۱) "جو شخص زکوٰۃ کی ایک قیراط (۲) ادا نہ کرے تو وہ نہ مومن ہے، اور نہ مسلمان، اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے"۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ زکوٰۃ کے سلسلہ میں بیان شدہ روایات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اسلام نے زکوٰۃ کی "حدود" اور "مقدار" اس قدر دقیق معین کی ہے کہ اگر تمام مسلمان اپنے مال کی زکوٰۃ صحیح اور مکمل طریقہ سے ادا کریں تو اسلامی ممالک میں کوئی غریب اور فقیر نہیں پایا جائے گا۔

---

(۱) وسائل الشیعہ، جلد ۶، صفحہ ۲۰، باب ۴، حدیث ۹

(۲) درہم کے بارہویں حصے کے برابر ایک وزن

حضرت امام صادق علیہ السلام سے منقول ایک اور روایت میں بیان ہوا ہے ''اگر تمام مسلمان اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کریں تو کوئی مسلمان غریب نہیں رہ سکتا، لوگ غریب محتاج، بھوکے اور ننگے نہیں ہوتے مگر مالداروں کے گناہوں کی بدولت''۔(۱)

اسی طرح روایات سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ زکوٰۃ کی ادائگی سے ملکیت کا تحفظ ہوتا ہے کہ اگر مسلمان اس اسلامی اہم اصل کو بالائے طاق رکھ دیں تو لوگوں کے درمیان (غریب اور امیر میں) اس قدر فاصلہ ہو جائے کہ مالدار لوگوں کا مال خطرہ میں پڑ جائے گا۔

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے منقول ہے کہ ''حَصِّنُوا اَموالَکُمْ بِالزَّکاۃِ''(۲) ''زکوٰۃ کے ذریعہ اپنے مال کی حفاظت کرو''۔

یہی مضمون خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور امیر المومنین علی علیہ السلام سے دوسری احادیث میں نقل ہوا ہے۔(۳)

---

(۱) وسائل الشیعہ، جلد ۶، صفحہ ۴، (باب ۱، حدیث ۶، از ابواب زکوٰۃ)

(۲) وسائل الشیعہ، جلد ۶، صفحہ ۶، (باب ۱، حدیث ، از ابواب زکوٰۃ)

(۳) تفسیر نمونہ، جلد ۸، صفحہ

۷۷۔ فلسفہ اور اسرار حج کیا ہیں؟

حج کے یہ عظیم الشان مناسک دراصل چار پہلو رکھتے ہیں، ان میں سے ہر ایک دوسرے سے اہم اور مفید تر ہے

۱۔ حج کا اخلاقی پہلو: حج کا سب سے اہم ترین فلسفہ یہی اخلاقی انقلاب ہے جو حج کرنے والے میں رونما ہوتا ہے، جس وقت انسان "احرام" باندھتا ہے تو ظاہری امتیازات، رنگ برنگ کے لباس اور زر و زیور جیسی تمام مادیات سے باہر نکال دیتا ہے، لذتوں کا حرام ہونا اور اصلاح نفس میں مشغول ہونا (جو کہ مُحرم کا ایک فریضہ ہے) انسان کو مادیت سے دور کر دیتا ہے اور نور و پاکیزگی اور روحانیت کے عالم میں پہنچا دیتا ہے اور عام حالات میں خیالی امتیازات اور ظاہری افتخارات کے بوجھ کو اچانک ختم کر دیتا ہے جس سے انسان کو راحت اور سکون حاصل ہوتا ہے۔

اس کے بعد حج کے دوسرے اعمال یکے بعد دیگرے انجام پاتے ہیں، جن سے انسان خدا سے لحظہ بہ لحظہ نزدیک ہوتا جاتا ہے اور خدا سے رابطہ مستحکم تر ہوتا جاتا ہے، یہ اعمال انسان کو گزشتہ گناہوں کی تاریکی سے نکال کر نور و پاکیزگی کی وادی میں پہنچا دیتے ہیں۔

حج کے تمام اعمال میں قدم قدم پر بت شکن ابراہیم، اسماعیل ذبیح اللہ اور ان کی مادر گرامی

جناب ہاجرہ کی یاد تازہ ہوتی ہے جس سے ان کا ایثار اور قربانی انسان کی آنکھوں کے سامنے مجسم ہوجاتی ہے، اور اس بات پر بھی توجہ کرے ہے سرزمین مکہ عام طور پر اور مسجد الحرام و خانہ کعبہ خاص طور پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ائمہ علیہم السلام اور صدر اسلام کے مسلمانوں کے جہاد کی یاد تازہ کردیتے ہیں، چنانچہ یہ اخلاقی انقلاب عمیق تر ہوجاتا ہے گویا انسان مسجد الحرام اور سرزمین مکہ کے ہر طرف اپنے خیالات میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت علی علیہ السلام اور دیگر ائمہ علیہم السلام کے نورانی چہروں کی زیارت کرتا ہے اور ان کی دل نشین آواز کو سنتا ہے۔

جی ہاں! یہ تمام چیزیں مل کر انسان کے دل میں ایک روحی اور اخلاقی انقلاب پیدا کردیتی ہیں گویا انسانی زندگی کی ناگفتہ بہ حالت کے صفحہ کو بند کردیا جاتا ہے اور اس کی بہترین زندگی کا نیا صفحہ کھل جاتا ہے۔

یہ بات بلاوجہ اسلامی روایات میں بیان نہیں ہوا ہے کہ "یَخْرُجُ مِنْ ذُنُوبِهِ کَهَیْئَتِهِ یَوْمَ وَلَدَتْهُ اُمُّهُ!" (۱) "حج کرنے والا اپنے گناہوں سے اس طرح پاک ہوجاتا ہے جیسے ابھی شکم مادر سے پیدا ہوا ہو"۔

جی ہاں! حج مسلمانوں کے لئے ایک نئی پیدائش ہے جس سے انسان کی زندگی کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔

البتہ یہ تمام آثار و برکات ان لوگوں کے لئے نہیں ہیں جن کا حج صرف ظاہری پہلو رکھتا ہے جو حج کی حقیقت سے دور ہیں، اور نہ ہی ان لوگوں کے لئے جو حج کو ایک سیر و تفریح سمجھتے ہیں یا ریاکاری اور سامان کی خرید و فروخت کے لئے جاتے ہیں، اور جنھیں حج کی حقیقت کا علم نہیں ہے، ایسے لوگوں کا حج میں وہی حصہ ہے جو انھوں نے حاصل کرلیا ہے!

---

(۱) بحار الانوار، جلد ۹۹، صفحہ ۲۶

۲۔حج کا سیاسی پہلو: ایک عظیم الشان فقیہ کے قول کے مطابق حج درعین حال کہ خاص ترین و رعمیق ترین عبادت ہے، اس کے ساتھ اسلامی اغراض و مقاصد تک پہنچنے کے لئے بہترین وسیلہ ہے۔

روح عبادت، خدا پر توجہ کرنا، روح سیاست یعنی خلق خدا پر توجہ کرنا ہے اور یہ دونوں چیزیں حج کے موقع پر ایک دوسرے کے ساتھ متحد ہیں!

حج مسلمانوں کی صفوں میں اتحاد کا بہترین سبب ہے۔

حج نسل پرستی اور علاقائی طبقات کے فرق کو ختم کرنے کے لئے بہترین ذریعہ ہے۔

حج اسلامی ممالک میں فوجی ظلم وستم کے خاتمہ کا وسیلہ ہے۔

حج اسلامی ممالک کی سیاسی خبروں کو دوسرے مقامات تک پہنچنے کا وسیلہ ہے، خلاصہ یہ کہ حج مسلمانوں پر ظلم وستم اور استعمار کی زنجیروں کو کاٹنے اور مسلمانوں کو آزادی دلانے کا بہترین ذریعہ ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ حج کے موسم میں بنی امیہ اور بنی عباس جیسی ظالم و جابر حکومتیں اس موقع پر حجاج کی ملاقاتوں پر نظر رکھتی تھیں تاکہ آزادی کی تحریک کو وہیں کچل دیا جائے، کیونکہ حج کا موقع مسلمانوں کی آزادی کے لئے بہترین دریچہ تھا تاکہ مسلمان جمع ہوکر مختلف سیاسی مسائل کو حل کریں۔

حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام جس وقت فرائض اور عبادات کا فلسفہ بیان کرتے ہیں تو حج کے بارے میں فرماتے ہیں "الْحَجُّ تَقْوِيَةٌ لِلدِّينِ"(۱) (خداوند عالم نے حج کو آئین اسلام کی تقویت کے لئے واجب قرار دیا ہے)

---

(۱) نہج البلاغہ کلمات قصار، نمبر ۲۵۲

بلاوجہ نہیں ہے کہ ایک غیر مسلم سیاست داں اپنی پُرمعنی گفتگو میں کہتا ہے: "وائے ہو مسلمانوں کے حال پر اگر حج کے معنی کو نہ سمجھیں اور وائے ہو اسلام کے دشمنوں پر کہ اگر حج کے معنی کو سمجھ لیں۔"

یہاں تک اسلامی روایات میں حج کو ضعیف اور کمزور لوگوں کا جہاد قرار دیا گیا ہے اور ایک ایسا جہاد جس میں کمزور ضعیف مرد اور ضعیف عورتیں بھی حاضر ہو کر اسلامی شان و شوکت میں اضافہ کر سکتی ہیں، اور خانہ کعبہ میں نماز گزاروں میں شامل ہو کر تکبیر اور وحدت کے نعروں سے اسلامی دشمنوں کو خوف زدہ کر سکتے ہیں۔

۳۔ثقافتی پہلو: مسلمانوں کا ایام حج میں دنیا بھر کے مسلمانوں سے ثقافتی رابطہ اور فکر و نظر کے اتفاق کے لئے بہترین اور موثر ترین عامل ہو سکتا ہے۔

خصوصاً اس چیز کے پیش نظر کہ حج کا عظیم الشان اجتماع دنیا بھر کے مسلمانوں کی حقیقی نمائندگی ہے (کیونکہ حج کے لئے جانے والوں کے درمیان کوئی مصنوعی عامل موثر نہیں ہے، اور تمام قبائل تمام زبانوں کے افراد حج کے لئے جمع ہوتے ہیں)

جیسا کہ اسلامی روایت میں بیان ہوا ہے کہ حج کے فوائد میں سے ایک فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ پیغمبر اکرم ﷺ کی احادیث و اخبار، عالم اسلام میں نشر ہوں۔

"ہشام بن حکم" حضرت امام صادق علیہ السلام کے اصحاب میں سے ہیں کہتے ہیں: میں نے امام علیہ السلام سے فلسفہ حج و طواف کعبہ کے بارے میں سوال کیا تو امام علیہ السلام نے فرمایا "خداوند عالم نے ان تمام بندوں کو پیدا کیا ہے، اور دین و دنیا کی مصلحت کے پیش نظر ان کے لئے احکام مقرر کئے، ان میں مشرق و مغرب سے (حج کے لئے) آنے والے لوگوں کے لئے حج واجب قرار دیا تاکہ مسلمان ایک دوسرے کو اچھی طرح پہچان لیں اور اس کے حالات سے باخبر ہوں، ہر

گروہ ایک شہر سے دوسرے شہر میں تجارتی سامان منتقل کرے اور پیغمبر اکرم ﷺ کی احادیث و آثار کی معرفت حاصل ہو اور حجاج ان کو ذہن نشین کرلیں ان کو کبھی فراموش نہ کریں، [اور دوسروں تک پہونچا ئیں](۱)

اسی وجہ سے ظالم و جابر خلفاء اور سلاطین مسلمانوں کو ان چیزوں کے نشر کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے، وہ خود اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی مشکلوں کو دور کرتے تھے اور ائمہ معصومین علیہم السلام اور بزرگ علمائے دین سے ملاقات کرکے قوانین اسلامی اور سنت پیغمبر پر پردہ ڈالتے تھے۔

اس کے علاوہ حج، عالمی پیمانہ پر ایک عظیم الشان کانفرنس کا نام ہے جس میں دنیا بھر کے تمام مسلمان مکہ معظمہ میں جمع ہوتے ہیں اور اپنے افکار اور ابتکارات کو دوسرے کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

اصولی طور پر ہماری سب سے بڑی بدبختی یہ ہے کہ اسلامی ممالک کی سرحدوں نے مسلمانوں کی ثقافت میں جدائی ڈال دی ہے، ہر ملک کا مسلمان صرف اپنے بارے میں سوچتا ہے، جس سے اسلامی معاشرہ کی وحدت نیست و نابود ہوگئی ہے، لیکن حج کے ایام میں اس اتحاد اور اسلامی ثقافت کا مظاہرہ کیا جاسکتا ہے۔

چنانچہ حضرت امام صادق علیہ السلام نے کیا خوب فرمایا ہے (اسی ہشام بن حکم کی روایت کے ذیل میں) جن قوموں نے صرف اپنے ملک، شہروں اور اپنے یہاں در پیش مسائل کی گفتگو کی تو وہ ساری قومیں نابود ہوجائیں گی اور ان کے ملک تباہ و برباد اور ان کے منافع ختم ہوجائیں گے اور ان کی حقیقی خبریں پشت پردہ رہ جائیں گی۔(۲)

---

(۱)وسائل الشیعہ، جلد۸، صفحہ۹ (۲)وسائل الشیعہ، جلد۸، صفحہ۹

۳۔ حج کا اقتصادی پہلو: بعض لوگوں کے نظریہ کے برخلاف، حج کا موسم اسلامی ممالک کی اقتصادی بنیادکو مستحکم بنانے کے لئے نہ صرف "حقیقت حج" سے کوئی منافات نہیں رکھتا بلکہ اسلامی روایات کے مطابق، حج کا ایک فلسفہ ہے۔

اس میں کیا حرج ہے کہ اس عظیم الشان اجتماع میں اسلامی مشترک بازار کی بنیاد ڈالیں اور تجارتی اسباب ووسائل کے سلسلہ میں ایسے قدم اٹھائیں جس سے دشمن کی جیب میں پیسہ نہ جائے اور نہ ہی مسلمانوں کا اقتصاد دشمن کے ہاتھوں میں رہے، یہ دنیا پرستی نہیں ہے بلکہ عین عبادت اور جہاد ہے۔

ہشام بن حکم کی اسی روایت میں حضرت امام صادق علیہ السلام نے حج کے فلسفہ کو بیان کرتے ہوئے صاف صاف اس موضوع کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مسلمانوں کی تجارت کوفروغ دینا اور اقتصادی تعلقات میں سہولت قائم کرنا، حج کے اغراض ومقاصد میں سے ہے۔

حضرت امام صادق علیہ السلام سے آیہ شریفہ ﴿لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِنْ رَبِّكُمْ﴾ (۱) کے ذیل میں بیان ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا اس آیت سے مراد کسب روزی ہے، "فاذا احل الرجل من احرامه و قضی فليشتر وليبع فی الموسم" () "جس وقت انسان احرام سے فارغ ہو جاتا ہے اور مناسک حج کو انجام دے لیتا ہے تو اسی موسم حج میں خرید وفروخت کرے (اور یہ چیز نہ صرف حرام نہیں ہے بلکہ اس میں ثواب بھی ہے) (۲)

اور حضرت امام رضا علیہ السلام سے منقول فلسفہ حج کے بارے میں ایک تفصیلی حدیث کے ذیل میں یہی معنی بیان ہوئے ہیں جس کے آخر میں ارشاد ہوا ہے "لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ" (۳)

---

(۱) سورۂ بقرہ، آیت ۹۸ [ترجمہ آیت "تمہارے لئے کوئی حرج نہیں ہے کہ اپنے پروردگار کے فضل وکرم کو تلاش کرو"]
(۲) تفسیر عیاشی بعنوان نور الثقلین، جلد ۱، صفحہ ۱۹۸ کی نقل کے مطابق۔
(۳) بحار الانوار، جلد ۹۹، صفحہ ۳۲

آیہ شریفہ "لیشھدوا منافع لھم" معنوی منافع کو بھی شامل ہوتی ہے اور مادی منافع کو بھی، لیکن ایک لحاظ سے دونوں معنوی منافع ہیں۔

مختصر یہ کہ اگر اس عظیم الشان عبادت سے صحیح اور کامل طور پر استفادہ کیا جائے، اور خانہ خدا کے زائرین ان دنوں میں جبکہ وہ اس مقدس سرزمین پر بڑے جوش و جذبہ کے ساتھ حاضر ہیں اور ان کے دل آمادہ ہیں تو اسلامی معاشرہ کی مختلف مشکلات دور کرنے کے لئے سیاسی، ثقافتی اور اقتصادی کانفرنس کے ذریعہ فائدہ اٹھائیں، یہ عبادت ہر پہلو سے مشکل کشا ہوسکتی ہے، اور شاید اسی وجہ سے حضرت امام صادق علیہ السلام نے فرمایا "لا یزال الدین قائما ما قامت الکعبة"(۱) "جب تک خانہ کعبہ باقی ہے اس وقت تک اسلام بھی باقی رہے گا"۔

اور اسی طرح حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا خانہ خدا کو نہ بھولو کہ اگر تم نے اسے بھلا دیا تو ہلاک ہوجاؤ گے، "اللہ اللہ فی بیت ربکم لا تخلوہ ما بقیتم فانہ ان ترک لم تناظروا"(۲) (خدا کے لئے تمہیں خانہ خدا کے بارے میں تلقین کرتا ہوں اس کو خالی نہ چھوڑنا، اور اگر تم نے چھوڑ دیا تو مہلت الہی تم سے اٹھالی جائے گی۔)

اور اس موضوع کی اہمیت کے پیش نظر اسلامی روایت میں ایک فصل اس عنوان سے بیان کی گئی کہ اگر ایک سال ایسا آجائے کہ مسلمان حج کے لئے نہ جائیں تو اسلامی حکومت پر واجب ہے کہ مسلمانوں کو مکہ معظمہ جانے پر مجبور کرے۔(۳)(۴)

---

(۱) وسائل الشیعہ، جلد ۸، صفحہ ۳

(۲) نہج البلاغہ، وصیت نامہ سے اقتباس ص ۴۷

(۳) وسائل الشیعہ، جلد ۸، صفحہ ۱۵ "باب وجوب اجبار الوالی الناس علی الحج"

(۴) تفسیر نمونہ، جلد ۱۴، صفحہ ۷۶

”حج“ ایک اہم انسان ساز عبادت ہے

حج کا سفر در اصل بہت عظیم ہجرت ہے، ایک الٰہی سفر ہے اور اصلاح نیز جہاد اکبر کا وسیع میدان ہے۔

اعمال حج، حقیقت میں ایک ایسی عبادت ہے جس میں جناب ابراہیمؑ اور ان کے بیٹے جناب اسماعیل اور ان کی زوجہ حضرت ہاجرہ کی قربانیوں اور مجاہدت کی یاد تازہ ہوتی ہے، اور اگر ہم ہر رحج کے بارے میں اس نکتہ سے غافل ہو جائیں تو بہت سے اعمال ایک معمہ بن کر رہ جائیں گے اور جیسا کہ اس معمہ کو حل کرنے کی کنجی انھیں عمیق مطالب پر توجہ دینا ہے۔

جس وقت ہم سرزمین منیٰ کی قربانگاہ میں جاتے ہیں تو تعجب کرتے ہیں، یہ کس قدر قربانی کس لئے؟ کیا حیوانات کی قربانی عبادت ہو سکتی ہے؟!

لیکن جس وقت قربانی کے ساتھ ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یاد کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے نور نظر، پارۂ جگر اور اپنے ہر دل عزیز بیٹے کو راہ خدا میں قربان کر دیا، جو ایک سنت ابراہیمی بن گیا اور منیٰ میں اس کی یاد میں قربانی ہونے لگی تو اس کام کا فلسفہ سمجھ میں آ جاتا ہے۔

قربانی کرنا خدا کی راہ میں تمام چیزوں سے گزرنے کا راز ہے، قربانی کرنا یعنی اس بات کا ظاہر کرنا ہے کہ اس کا دل غیر خدا سے خالی ہے، حج کے اعمال سے اسی وقت ضروری مقدار میں تربیتی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے جب ذبح اسماعیل اور قربانی کے وقت اس باپ کے احساسات کو مد نظر رکھا جائے، اور وہی احساسات ان کے اندر جلوہ گر ہو جائیں۔ (۱)

جس وقت ہم ”جمرات“ کی طرف جاتے ہیں (یعنی وہ تین مخصوص پتھر جن پر حجاج کو کنکری مارنا ہوتی ہیں، اور ہر بار سات کنکر مارنا ہوتی ہیں) تو ہمارے سامنے یہ سوال پیش آتا ہے کہ اس مجسمہ

(۱) افسوس کہ ہمارے زمانہ میں منیٰ میں قربانی کا طریقہ کار رضایت بخش نہیں ہے لہٰذا علمائے اسلام کو اس سلسلہ میں توجہ دینا چاہئے

پر سنگ باری کا کیا مقصد ہے؟ اور اس سے کیا مشکل حل ہو سکتی ہے؟ لیکن جس وقت ہم یاد کرتے ہیں کہ یہ سب بت شکن قہرمان جناب ابراہیم علیہ السلام کی یاد ہے، آپ کی راہ میں تین بار شیطان آیا تا کہ آپ کو اس عظیم "جہاد اکبر" سے روک دے یا شک وشبہ میں مبتلا کر دے لیکن ہر بار توحید کے علمبردار نے شیطان کو پتھر مار کر دور بھگا دیا، لہٰذا، گر اس واقعہ کو یاد کریں تو پھر "رمی جمرات" کا مقصد سمجھ میں آجاتا ہے۔

رمی جمرات کا مقصد یہ ہے کہ ہم سب جہاد کبیر کے موقع پر شیطانی وسوسوں سے روبرو ہوتے ہیں اور جب تک ان کو سنگسار نہ کریں گے اور اپنے سے دور نہ بھگائیں گے تو اس پر غالب نہیں ہو سکتے۔

اگر تمہیں اس بات کی امید ہے کہ خداوند عالم نے جس طرح جناب ابراہیم علیہ السلام پر درود وسلام بھیجا اور ان کی یاد کو ہمیشہ کے لئے باقی رکھا ہے، گر تم بھی یہ چاہتے ہو کہ وہ تم پر نظر رحمت کرے تو پھر راہ ابراہیم پر قدم بڑھاؤ۔

یا جس وقت "صفا" اور "مروہ" پر جاتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ حاجی گروہ در گروہ یک چھوٹی پہاڑی سے دوسری چھوٹی پہاڑی پر جاتے ہیں، ور پھر وہاں سے اسی پہاڑی پر واپس آجاتے ہیں، اور پھر اسی طرح اس عمل کی تکرار کرتے ہیں، کبھی آہستہ چلتے ہیں تو کبھی دوڑتے ہیں، واقعاً تعجب ہوتا ہے کہ یہ کیا ہے؟! اور اس کا مقصد کیا ہے؟!

لیکن جب ایک نظر اس باایمان خاتون حضرت ہاجرہ کے واقعہ پر ڈالتے ہیں جو اپنے شیر خوار فرزند اسماعیل کی جان کے لئے اس بے آب وگیاہ بیابان میں اس پہاڑی سے اس پہاڑی پر جاتی ہیں، اس واقعہ کو یاد کرتے ہیں کہ خداوند عالم نے حضرت ہاجرہ کی سعی وکوشش کو کس طرح منزل مقصود تک پہنچایا اور ان کے نومولود بچہ کے پیروں کے نیچے چشمۂ زمزم جاری کیا، تو اچانک زمانہ پیچھے ہٹتا دکھائی دیتا ہے اور پردے ہٹ جاتے ہیں اور ہم اپنے کو جناب ہاجرہ کے پاس دیکھتے ہیں اور ہم بھی

ان کے ساتھ سعی و کوشش میں مشغول ہوجاتے ہیں کہ راہ خدا میں سعی و کوشش کے بغیر منزل نہیں مل سکتی'

[قارئین کرام!] ہماری مذکورہ گفتگو کے ذریعہ آسانی کے ساتھ یہ نتیجہ حاصل کیا جاسکتا ہے کہ "حج" کو ان اسرار و رموز کے ذریعہ تعلیم دیا جائے، اور جناب ابراہیم، ان کی زوجہ اور ان کے فرزند اسماعیل کی یاد کو قدم قدم پر مجسم بنایا جائے تاکہ اس کے فلسفہ کو سمجھ سکیں، اور حجاج کے دل و جان میں حج کی خلاقی تاثیر جلوہ گر ہو، کیونکہ ان آثار کے بغیر حج کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔(۱)

---

(۱) تفسیر نمونہ، جلد ۱۴، صفحہ ۱۳۵.

جهاد

۷۷۔ جہاد کا مقصد کیا ہے؟ اور ابتدائی جہاد کس لئے؟

اسلامی جہاد کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ ابتدائی جہاد (آزادی کے لئے)

خداوند عالم نے انسان کی سعادت وخوشبختی، آزادی اور کمال تک پہنچنے کے لئے احکام بیان کئے ہیں، اور اپنے مرسلین کو ذمہ داری دی ہے تاکہ یہ احکام لوگوں تک پہنچائیں، اب اگر کوئی شخص یا کوئی گروہ اسلامی احکام کو اپنے منافع میں مزاحم سمجھے اور ان کے پہنچنے میں مانع اور رکاوٹ بنے تو انبیاء علیہم السلام کو اس بات کا حق ہے کہ پہلے انہیں گفتگو کے ذریعہ سمجھائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو طاقت کے ذریعہ ان کو راستے سے ہٹا دیں اور آزاد طریقے سے تبلیغ کے فرائض انجام دیں۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہیں کہ ہر معاشرہ کے لوگوں کا حق ہے کہ وہ راہ حق کے منادی افراد کی ندا کو سنیں اور اس دعوت کے قبول کرنے میں آزاد رہیں، لہٰذا اگر کوئی ان کو اس جائز حق سے محروم کرنا چاہے اور ان کو راہ خدا کے منادی افراد کی آواز سننے سے روکے، تو ان کو یہ حق ہے کہ اس آزادی کو حاصل کرنے کے لئے کسی بھی طاقت کا سہارا لیں، یہیں سے اسلام اور دیگر آسمانی ادیان میں "ابتدائی جہاد" کی ضرورت واضح وروشن ہو جاتی ہے۔

اور اسی طرح اگر کچھ لوگ مومنین پر دباؤ ڈالیں کہ وہ اپنے گزشتہ مذہب کی طرف لوٹ جائیں تو اس موقع پر بھی اسی طاقت کا سہارا لیا جا سکتا ہے۔

۲۔ دفاعی جہاد:

اگر کسی شخص یا گروہ پر دشمن کی طرف سے حملہ کیا جاتا ہے تو اس موقع پر تمام آسمانی اور انسانی قوانین اس بات کا حق دیتے ہیں کہ انسان اپنے دفاع کے لئے اٹھ کھڑا ہو اور اپنے دفاع کے لئے اپنی پوری طاقت لگا دے، اور اپنی حفاظت کے لئے کوئی بھی حربہ اپنانے میں چوں وچرا نہ کرے، اس قسم کے جہاد کو ''دفاعی جہاد'' کہا جاتا ہے، اسلام کی مختلف جنگیں اسی طرح کی تھیں جیسے جنگ احزاب، جنگ احد، جنگ موتہ، جنگ تبوک، جنگ حنین وغیرہ، یہ تمام جنگیں دفاعی پہلو رکھتی تھیں۔

۳۔ کفر اور شرک کی نابودی کے لئے جہاد

اسلام، اگرچہ دنیا بھر کے لوگوں کو اس دین (جو سب سے عظیم اور آخری دین ہے) کے انتخاب کے لئے دعوت دیتا ہے لیکن ان کے عقیدہ کی آزادی کا احترام کرتا ہے اسی وجہ سے جو اقوام آسمانی کتاب رکھتی ہیں ان کو اسلام قبول کرنے کے لئے غور وفکر کے لئے کافی فرصت دیتا ہے، اور اگر انھوں نے اسلام قبول نہ کیا تو ان کے ساتھ ایک ''ہم پیمان اقلیت'' کے عنوان سے معاملہ کرتا ہے اور خاص شرائط کے تحت (جو نہ مشکل ہیں اور نہ پیچیدہ) ان کے ساتھ آرام وسکون کی زندگی بسر کرنے کا سبق دیتا ہے۔

لیکن کفر وشرک نہ دین ہے، نہ کوئی مذہب اور نہ ہی قابل احترام ہے، بلکہ ایک قسم کی خرافات، انحراف اور حماقت ہے، درحقیقت ایک فکری اور اخلاقی بیماری ہے جس کو کسی نہ کسی طرح ختم ہونا چاہئے۔

دوسروں کی ''آزادی'' اور ''احترام'' کی بات ان مقامات پر کی جاتی ہے جہاں فکر وعقیدہ

میں کوئی ایک صحیح اصل پائی جاتی ہو لیکن انحرافات، گمراہی اور فکری بیماری قابل احترام نہیں ہے اسی وجہ سے اسلام کا حکم ہے کہ کفر و شرک کا دنیا بھر سے نام و نشان تک مٹا دیا جائے، چاہے جنگ کرنی پڑے، اگر بت پرستی کے برے آثار گفتگو کے ذریعہ ختم نہ ہوں تو جنگ کے ذریعہ ان کا خاتمہ کر دیا جائے۔(۱)

ہماری مذکورہ باتوں سے گرجا گھروں کے زہریلے پروپیگنڈے کا جواب بھی واضح ہو جاتا ہے کیونکہ اس سلسلہ میں ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾(۲) سے واضح آیت قرآن مجید میں موجود نہیں ہے۔

البتہ وہ لوگ اسلامی جہاد اور اسلامی جنگوں میں تحریف کرنے کے لئے مختلف بہانہ بازی کرتے ہیں جبکہ اسلامی جنگوں کی تحقیق سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان میں سے بہت سی جنگیں دفاعی پہلو رکھتی تھیں اور بعض وہ جنگیں جو" ابتدائی جہاد" کی صورت میں تھیں وہ بھی دوسرے ملکوں پر غلبہ کرنے اور مسلمانوں کو طاقت کے بل پر اسلام قبول کرانے کے لئے نہیں تھی بلکہ اس ملک میں حکم فرما ظالمانہ نظام کے خاتمہ کے لئے تھیں تاکہ اس ملک کے باشندے مذہب قبول کرنے میں آزاد رہیں۔

اس گفتگو پر تاریخ اسلام گواہ ہے، جس میں یہ بات بارہا بیان کی گئی ہے کہ جب مسلمان کسی ملک کو فتح کرتے تھے تو دوسرے مذہب کے پیروؤں کو مسلمانوں کی طرح آزادی دیتے تھے اور اگر ان سے ایک معمولی جزیہ حاصل کرتے تھے جو امنیت اور حافظ امنیت لشکر کے خرچ کے لئے ہوتا تھا کیونکہ ان کی جان و مال اور ناموس اسلام کی حفاظت میں تھی یہاں تک کہ وہ اپنے دینی پروگرام کرنے میں بھی آزاد تھے۔

---

(۱) تفسیر نمونہ، جلد دوم، صفحہ ۵

(۲)سورۂ بقرہ، آیت ۲۵۶ ترجمہ:"دین [قبول کرنے] میں کوئی جبر نہیں ہے"

تاریخ اسلام کا مطالعہ کرنے والے افراد اس حقیقت کو جانتے ہیں یہاں تک کہ اسلام کے بارے میں تحقیق کرنے والے اور کتاب لکھنے والے عیسائی محققین نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے مثلاً کتاب "تمدن اسلام و عرب" میں تحریر ہے: "دوسرے مذہب کے ساتھ مسلمانوں کا طریقہ کار اتنا مدبرانہ تھا کہ مذہبی رؤساء کو مذہبی پروگرام کرنے کی اجازت تھی"۔

یہاں تک کہ بعض اسلامی تاریخ میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ جو عیسائی اسلامی تحقیق کے لئے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اپنی مذہبی دعاؤں کا پروگرام آزاد طریقے سے مسجد النبی (مدینہ) میں انجام دیا کرتے تھے۔(۱)

---

(۱) تفسیر نمونہ، جلد دوم، صفحہ ۲۰۵

اسلام میں خواتین کے حقوق

۷۸۔ اسلام خواتین کے لئے کن حقوق کا قائل ہے؟

ظہور اسلام اور اس کی مخصوص تعلیمات کے ساتھ عورت کی زندگی ایک نئے مرحلہ میں داخل ہوئی جو پہلے مراحل سے بہت مختلف تھی، یہ وہ دور تھا جس میں عورت مستقل اور تمام انفرادی، اجتماعی اور انسانی حقوق سے فیضیاب ہوئی، عورت کے سلسلہ میں اسلام کی بنیادی تعلیمات وہی ہیں جن کا ذکر قرآنی آیت میں ہوا ہے، جیسا کہ ارشاد خداوندی ہوتا ہے: ﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾(۱) ''عورتوں کے لئے ویسے ہی حقوق بھی ہیں جیسی ذمہ داریاں ہیں''۔

اسلام عورت کو مرد کی طرح کامل انسانی روح، ارادہ اور اختیار کا حامل سمجھتا ہے اور اسے سیر تکامل وارتقا کے عالم میں دیکھتا ہے جو مقصد خلقت ہے، اسی لئے اسلام دونوں کو ایک ہی صف میں قرار دیتا ہے اور دونوں کو ''یا ایہا الناس'' اور ''یا ایہا الذین آمنوا'' کے ذریعہ مخاطب کرتا ہے، اسلام نے دونوں کے لئے تربیتی، اخلاقی اور علمی پروگرام لازمی قرار دئے ہیں، ارشاد الٰہی ہوتا ہے:

﴿وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ﴾(۲)

---

(۱) سورۂ بقرہ، آیت ۲۲۸۔ (۲) سورۂ غافر (مومن)، آیت ۴۰

''اور جو نیک عمل کرے گا چاہے وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ صاحب ایمان بھی ہو اسے جنت میں داخل کیا جائے گا''۔

ایسی سعادتیں دونوں صنف حاصل کرسکتی ہیں، جیسے کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾(۱)

''جو شخص بھی نیک عمل کرے گا وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ صاحب ایمان ہو ہم اسے پاکیزہ حیات عطا کریں گے اور انھیں ان اعمال سے بہتر جزا دیں گے جو وہ زندگی میں انجام دے رہے تھے''۔

مذکورہ آیت اس بات کو واضح کردیتی ہیں کہ مرد ہو یا عورت اسلامی قوانین و اعمال پر عمل کرتے ہوئے معنوی و مادی کمال کی منزلوں پر فائز ہوسکتے ہیں ورایک طیب وطاہر زندگی میں قدم رکھ سکتے ہیں جو آرام وسکون کی منزل ہے۔

اسلام عورت کو مرد کی طرح مکمل طور پر آزاد سمجھتا ہے، جیسے کہ ارشاد ہی ہوتا ہے:

﴿كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ﴾ (۲) ''ہر نفس اپنے اعمال کا رہین ہے''۔

یا ایک دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَاءَ فَعَلَيْهَا﴾(۳) ''جو بھی نیک عمل کرے گا وہ اپنے لئے کرے گا اور جو برا کرے گا اس کا ذمہ دار بھی وہ خود ہی ہوگا''۔

---

(۱) سورۂ نحل، آیت ۹۷

(۲) سورۂ مدثر، آیت ۳۸

(۳) سورۂ فصلت، آیت ۴۶

اسی طرح یہ آیت بھی مرد اور عورت دونوں کے لئے ہیں، اسی سے سزا کے بارے میں قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ﴾(۱)

"زنا کار عورت اور زنا کار مرد دونوں کو سو سو کوڑے لگائے جائیں"۔

اس کے علاوہ دیگر آیات میں بھی ایک جیسے گناہ پر دونوں کے لئے ایک جیسی سزا کا حکم سنایا گیا ہے۔

رادہ واختیار سے استقلال پیدا ہوتا ہے، اور اسلام یہی استقلال اقتصادی حقوق میں بھی نافذ کرتا ہے، اسلام بغیر کسی رکاوٹ کے عورت کو اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ وہ ہر قسم کے مالی معاملات انجام دے اور عورت کو اس سرمایہ کا مالک شمار کرتا ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿لِّلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ﴾(۲)

"مردوں کے لئے وہ حصہ ہے جو انھوں نے کمایا ہے اور عورتوں کے لئے وہ حصہ ہے جو انھوں نے کمایا ہے"۔

لغت میں "اکتساب" کے معنی کسب اور حاصل کرنے کے ہیں، (۳) اسی طرح ایک دوسرا قانون کلی ہے:

"النَّاسُ مُسَلَّطُونَ عَلَى أَمْوَالِهِمْ" یعنی تمام لوگ اپنے مال پر مسلط ہیں۔

---

(۱) سورہ نور، آیت نمبر ۲

(۲) سورہ نساء، آیت ۳۲

(۳) دیکھئے مفردات راغب اصفہانی، البتہ یہ نکتہ اس وقت ہے جب "کسب" اور "اکتساب" ایک ساتھ استعمال ہو

اس قانون کے پیش نظر یہ معلوم ہوتا ہے کہ، سلام عورت کے اقتصادی استقلال کا احترام کرتا ہے اور عورت مرد میں کسی فرق کا قائل نہیں ہے۔

خلاصہ یہ کہ اسلام کی نظر میں عورت، معاشرہ کا ایک بنیادی رکن ہے اسے یک بے ارادہ، محکوم، سرپرست کا محتاج سمجھنا خیال خام ہے۔

مساوات کے معنی میں غلط فہمی نہ ہو:

اسلام نے مساوات کی طرف خاص توجہ دی ہے اور ہمیں بھی متوجہ ہونا چاہئے لیکن خیال رہے کہ بعض لوگ بے سوچے سمجھے جذبات میں آکر افراط وتفریط کا شکار ہو جاتے ہیں اور مرد وعورت کے روحانی وجسمانی فرق اور ان کی ذمہ داریوں کے اختلاف تک سے انکار کر بیٹھتے ہیں۔

ہم جس چیز کا چاہیں انکار کریں تاہم اس حقیقت کا انکار نہیں کرسکتے کہ دو صنفوں میں جسمانی اور روحانی طور پر بہت فرق ہے، مختلف کتابوں میں اس کی تفصیلات موجود ہیں، یہاں اس کی تکرار کی ضرورت نہیں، خلاصہ یہ کہ عورت وجود انسانی کی پیدائش کا ظرف ہے، نونہالوں کا رشد اسی کے دامن میں ہوتا ہے، جیسے وہ جسمانی طور پر آنے والی نسلوں کی پیدائش، تربیت اور پرورش کے لئے پیدا کی گئی ہے اسی طرح روحانی طور پر بھی اسے عواطف، احساسات اور جذبات کا زیادہ حصہ دیا گیا ہے۔

ان وسیع اختلافات کے باوجود کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ مرد وعورت کو تمام حالات میں ہم قدم ہونا چاہئے اور تمام کاموں میں سو فیصد مساوی ہونا چاہئے؟!

کیا عدالت اور مساوات کے حامیوں کو معاشرے کے تقاضوں کے حوالے سے بات کرنا چاہئے؟ کیا یہ عدالت نہیں ہے کہ ہر شخص اپنی ذمہ داری پوری کرے اور اپنے وجود کی نعمتوں اور خوبیوں سے فیض یاب ہو؟ اس لئے کیا عورت کا ایسے کاموں میں دخل اندازی کرنا جو اس کی روح

اور جسم سے مناسبت نہیں رکھتے، خلاف عدالت نہیں ہے؟

یہی وہ مقام ہے جہاں ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام جو عدالت کا طرفدار ہے کئی ایک اجتماعی کاموں میں سختی یا زیادہ وقت نظر والے کاموں مثلاً گھر کے معاملات کی سرپرستی وغیرہ میں مرد کو مقدم رکھتا ہے، اور معاونت و کمک کا مقام عورت کے سپرد کر دیتا ہے۔

ایک گھر اور ایک معاشرے کو منتظم ہونے کی ضرورت ہوتی ہے، اور نظم و ضبط کا آخری مرحلہ ایک ہی شخص کے ذریعہ انجام پانا چاہئے ورنہ کشمکش اور بے نظمی پیدا ہوگی۔

اگر تمام تعصبات سے بے نیاز ہو کر غور کیا جائے تو یہ واضح ہو جائے گا کہ مرد کی ساخت کے پیش نظر ضروری ہے کہ گھر کی سرپرستی اس کے ذمہ کی جائے اور عورت اس کی معاون ہو، اگر چہ کچھ لوگ ان حقائق سے چشم پوشی اختیار کرنے پر مصر ہیں۔

آج کی دنیا میں بھی بلکہ ان اقوام میں بھی جو عورتوں کو مکمل آزادی و مساوات دینے کا دعوی کرتے ہیں، خارجی حالات زندگی اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ عملی طور پر وہی بات ہے جو ہم بیان کر چکے ہیں اگر چہ باتیں اس کے برخلاف بناتے ہیں۔(۱)

عورت اور مرد کے معنوی اقدار

قرآن مجید نے مرد و عورت کو بارگاہ خداوندی اور معنوی مقامات کے لحاظ سے برابر شمار کیا ہے، اور جنس و جسمانی اختلاف، نیز اجتماعی ذمہ داریوں کے اختلاف کو ترقی و کمال کی منزل حاصل کرنے کے لئے دلیل شمار نہیں کیا ہے بلکہ اس لحاظ سے دونوں کو بالکل برابر قرار دیا ہے، اسی وجہ سے دونوں کا ایک ساتھ ذکر کیا ہے، قرآن مجید کی بہت سی آیات اس وقت نازل ہوئی ہیں جس زمانہ میں متعدد قوم و ملل عورت کو انسان سمجھنے میں شک کرتی تھیں اور اس کو نفرت و ذلت کی نگاہ سے دیکھا

(۱)تفسیر نمونہ، جلد دوم، صفحہ ۲۱۳

جاتا تھا نیز عورت کو گناہ، انحراف اور موت کا سرچشمہ سمجھا جاتا تھا!!

بہت سی گزشتہ اقوام تو یہاں تک قائل تھی کہ خداوندعالم کی بارگاہ میں عورت کی عبادت قبول نہیں ہے، بہت سے یونانی عورت کے وجود کو پست و ذلیل اور شیطانی عمل جانتے تھے، رومیوں اور بعض یونانیوں کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ عورت میں انسان کی روح نہیں ہوتی بلکہ انسانی روح صرف اور صرف مرد میں ہوتی ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ انھیں آخری صدیوں میں اسپین کے عیسائی علما اس مسئلہ میں بحث وگفتگو کرتے تھے کہ کیا عورت، مرد کی طرح انسانی روح رکھتی ہے یا نہیں یا مرنے کے بعد اس کی روح جاویداں ہو جاتی ہے یا نہیں؟ اور بحث وگفتگو کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے چونکہ عورت کی روح "انسان و حیوان کے درمیان برزخ ہے، [یعنی ایک حصہ انسانی روح ہے تو ایک حصہ حیوانی روح] لہٰذا اس کی روح جاویدانی نہیں ہے سوائے جناب مریم کے۔ (۱)

یہاں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ تہمتیں جیسا کہ اسلام کو صحیح طور پر نہ سمجھنے والے افراد اعتراض کردیتے ہیں کہ اسلام تو صرف مردوں کا دین ہے، عورتوں کا نہیں، واقعاً یہ بات کس قدر بیہودہ ہے، اصولی طور پر اگر عورت مرد کے جسمی اور عاطفی اور اجتماعی ذمہ داری کے فرق کے پیش نظر اسلامی قوانین پر غور وفکر کیا جائے تو عورت کی اہمیت اور عظمت پر ذرا بھی حرف نہیں آئے گا، اور اس لحاظ سے عورت مرد میں ذرا بھی فرق نہیں پایا جاتا، سعادت وخوشبختی کے دروازے دونوں کے لئے کھلے ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿بَعْضُكُمْ مِنْ بَعْضٍ...﴾ (سب ایک جنس اور ایک معاشرہ سے تعلق رکھتے ہیں) (۲)

---

(۱) "دو شرح مارک" بحوالہ تفسیر پیشگاہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اور "حقوق زن در اسلام" اور اس مسئلہ میں دوسری کتابیں دیکھئے

(۲) تفسیر نمونہ، جلد ۳، صفحہ ۴۴۳

۷۹۔ پردہ کا فلسفہ کیا ہے؟

بے شک عصر حاضر میں جس کو بعض لوگوں نے عریانی ور جنسی آزادی کا زمانہ قر ردیا ہے، ور مغرب نواز لوگوں نے اس کو عورتوں کی آزادی کا ایک حصہ قرار دیا ہے، ہذا ایسے وگ پردہ کی باتوں کو ن کرمنہ بناتے ہیں ور پردہ کو گزشتہ زمانہ کا ایک افسانہ شمار کرتے ہیں۔

لیکن س آزادی اور بے رہ روی سے جس قدر فسادت اور برائیاں بڑھتی جا رہی ہیں اتنا ہی پردہ کی باتوں پر توجہ کی جا رہی ہے۔

البتہ سلامی ور مذہبی معاشرہ میں خصوصاً ایرانی انقلاب کے بعد بہت سے مسائل حل ہو چکے ہیں اور بہت سے سوالات کا اطمینان بخش جواب دیا جا چکا ہے، لیکن چونکہ یہ مسئلہ بہت اہم ہے لہٰذا اس مسئلہ پر مزید بحث و گفتگو کی ضرورت ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ (بہت ہی معذرت کے ساتھ) کیا عورتوں سے (ہمبستری کے علاوہ) سننے، دیکھنے اور مس کرنے کی دوسری لذتیں تمام مردوں کے لئے ہیں یا صرف ان کے شوہروں سے مخصوص ہیں؟!

بحث اس میں ہے کہ عورتیں اپنے جسم کے مختلف اعضا کی نمائش کے ایک بے انتہا مقابلہ میں جوانوں کی شہوتوں کو بھڑکائیں اور آلودہ مردوں کی ہوس کا شکار بنیں یا یہ مسائل شوہروں سے متعلق ہیں؟!

سلام اس دوسری قسم کا طرف دار ہے، ور حجاب کو اسی سے قرار دیا ہے، حالانکہ مغربی ممالک اور مغرب نواز لوگ پہلے نظریہ کے قائل ہیں۔

سلام کہتا ہے کہ جنسی لذت اور دیکھنے، سننے اور چھونے کی لذت شوہر سے مخصوص ہے اس کے علاوہ دوسرے کے لئے گناہ، آلودگی اور معاشرہ کے لئے ناپاکی کا سبب ہے۔

فلسفہ حجاب کوئی مخفی اور پوشیدہ چیز نہیں ہے، کیونکہ

۔ بے پردہ عورتیں معمولاً بناؤ سنگار اور دیگر زرق و برق کے ذریعہ جوانوں کے جذبات کو بھارتی ہیں جس سے ان کے حساسات بھڑک اٹھتے ہیں اور بعض اوقات نفسیاتی امراض پیدا ہو جاتے ہیں، نساں کے احساسات کتنے ہیجان آور وزن کو برداشت کر سکتے ہیں؟ کیا نفسیاتی ڈاکٹر یہ نہیں کہتے کہ ہمیشہ نسان میں ہیجان سے بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔

خصوصاً جب یہ بھی معلوم ہو کہ جنسی غریزہ انسان کی سب سے بنیادی فطرت ہوتی ہے جس کی بنا پر تاریخ میں ایسے متعدد خطرناک حوادث ورو قعات ملتے ہیں جس کی بنیاد یہی چیز تھی، یہاں تک بعض لوگوں کا کہنا ہے ''کوئی بھی اہم واقعہ نہیں ہوگا مگر یہ کہ اس میں عورت کا ہاتھ ضرور ہوگا''!

ہمیشہ بازاروں اور گلی کوچوں میں عریاں پھر کر احساس کو بھڑکانا' کیا آگ سے کھیلنا نہیں ہے؟ اور کیا یہ کام عقلمندی ہے؟!

اسلام تو یہ چاہتا ہے کہ مسلمان مرد اور عورت چین وسکون کے ساتھ زندگی بسر کریں اور ان کی آنکھیں اور کان غلط کاموں سے محفوظ رہیں وراس لحاظ سے مطمئن طور پر زندگی بسر کریں، پردہ کا ایک فلسفہ یہ بھی ہے۔

۲۔ مستند اور قطعی رپورٹ اس چیز کی گواہی دیتی ہیں کہ دنیا بھر میں جب سے بے پردگی بڑھی ہے اسی وقت سے طلاقوں میں بھی روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے، کیونکہ ''ھر چہ دیدہ بیند دل کند یاد'' انسان جس کا عاشق ہو جاتا ہے اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے لہٰذا انسان ہر روز

یک دلبر کو تلاش کرتا ہے تو دوسرے کو لوداع کہتا ہو نظر آتا ہے۔

جس معاشرہ میں پردہ پایا جاتا ہے (ور سلامی دیگر شرائط کی رعایت کی جاتی ہے) اس میں یہ رشتہ صرف میاں بیوی میں ہوتا ہے ان کے احساسات، عشق اور محبت ایک دوسرے کے لئے مخصوص ہوتے ہیں۔

لیکن "اس آزادی کے بازار" میں جبکہ عورتیں عملی طور پر ایک سامان کی حیثیت رکھتی ہیں (کم از کم جنسی ملاپ کے علاوہ) تو پھر ان کے لئے میاں بیوی کا عہد و پیمان کوئی مفہوم نہیں رکھتا، اور بہت سی شادیاں مکڑی کے جالے کی طرح بہت جلدی جدائی کی صورت اختیار کر لیتی ہیں، اور بچے بے سرپرست ہو جاتے ہیں۔

۳۔ فحاشی کا اس قدر عام ہو جانا اور ناجائز اولادیں پیدا ہونا بے پردگی کے نتیجہ کا یک معمولی سا درد ہے، جس کے بارے میں بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، یہ مسئلہ خصوصاً مغربی ممالک میں اس قدر واضح ہے جس کے بارے میں بیان کرنا سورج کو چراغ دکھانا ہے، ہمیں لوگ اس طرح کی چیزوں کے بارے میں ذرائع ابلاغ سے سنتے رہتے ہیں۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ فحاشی اور ناجائز بچوں کی پیدائش کی اصل وجہ یہی بے حجابی ہے، ہم یہ نہیں کہتے کہ مغربی ماحول اور غلط سیاسی مسائل اس میں موثر نہیں ہے، بلکہ ہمارا کہنا تو یہ ہے کہ عریانی اور بے پردگی اس کے موثر عوامل اور اسباب میں سے ایک ہے۔

فحاشی اور ناجائز اولاد کی پیداوار کی وجہ سے معاشرہ میں ظلم و ستم اور خون خرابہ میں اضافہ ہو ہے، جس کے پیش نظر اس خطرناک مسئلہ کے پہلو واضح ہو جاتے ہیں۔

جس وقت ہم سنتے ہیں کہ ایک رپورٹ کے مطابق انگلینڈ میں ہر سال پانچ لاکھ بچے ناجائز طریقے سے پیدا ہوتے ہیں، اور جب ہم سنتے ہیں کہ انگلینڈ کے بہت سے دانشوروں نے حکومتی عہدہ داروں کو یہ چیلنج دیا ہے کہ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو ملک کی امنیت کو خطرہ ہے، (انھوں نے اخلاقی اور

مذہبی مسائل کی بنیاد پر یہ چیلنج نہیں کیا ہے) بلکہ صرف اس وجہ سے کہ حرام زادے بچے معاشرہ کے امن و امان کے لئے خطرہ بنے ہوئے ہیں، کیونکہ جب ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ عدالت کے مقدموں میں اس طرح کے افراد کا نام پایا جاتا ہے، تو واقعاً اس مسئلہ کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ جو لوگ دین و مذہب کو بھی نہیں مانتے، اس برائی کے پھیلنے سے وہ بھی پریشان ہیں، لہٰذا معاشرہ میں جنسی فساد کو مزید پھیلانے والی چیز معاشرہ کی امنیت کے لئے خطرہ شمار ہوتی ہے اور اس کے خطرناک نتائج ہر طرح سے معاشرہ کے لئے نقصان دہ ہیں۔

تربیتی دانشوروں کی تحقیق بھی اسی بات کی عکاسی کرتی ہے کہ جن کالجوں میں لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ پڑھتے ہیں یا جن اداروں میں مرد اور عورت ایک ساتھ کام کرتے ہیں اور ان کو ہر طرح کی آزادی ہے تو ایسے کالجوں میں پڑھائی کم ہوتی ہے اور اداروں میں کام کم ہوتا ہے، اور ذمہ داری کا احساس بھی کم پایا جاتا ہے۔

۴۔ بے پردگی اور عریانی عورت کی عظمت کے زوال کا بھی باعث ہے، اگر معاشرہ عورت کو عریاں بدن دیکھنا چاہے گا تو فطری بات ہے کہ ہر روز اس کی آرائش کا تقاضا بڑھتا جائے گا اور اس کی نمائش میں اضافہ ہوتا جائے گا، جب عورت جنسی کشش کی بنا پر سامان کی تشہیر کا ذریعہ بن جائے گی، انتظار گاہوں میں دل لگی کا سامان ہوگی اور سیاحوں کو متوجہ کرنے کا ذریعہ بن جائے گی تو معاشرہ میں اس کی حیثیت کھلونے یا بے قیمت مال و اسباب کی طرح گر جائے گی، اور اس کے شایان شان انسانی اقدار فراموش ہو جائیں گے، اور اس کا افتخار صرف اس کی جوانی، خوبصورتی اور نمائش تک محدود ہو کر رہ جائے گا۔

اس طرح سے وہ چند ناپاک فریب کار انسان نما درندوں کی سرکش ہوا و ہوس پوری کرنے کے آلہ کار میں بدل جائے گی!۔

ایسے معاشرہ میں ایک عورت اپنی اخلاقی خصوصیت، علم و آگہی اور بصیرت کے جلووں کو

کیسے پورا کر سکتی ہے اور کوئی بلند مقام کیسے حاصل کر سکتی ہے؟!

واقعاً یہ بات کتنی تکلیف دہ ہے کہ مغربی اور مغرب زدہ ممالک میں عورت کا مقام کس قدر گر چکا ہے خود ہمارے ملک ایران میں انقلاب سے پہلے یہ حالت تھی کہ نام، شہرت، دولت اور حیثیت ان چند ناپاک اور بے لگام عورتوں کے لئے تھی جو "فنکار" اور آرٹسٹ کے نام سے مشہور تھیں، جہاں وہ قدم رکھتی تھیں اُس گندے ماحول کے ذمہ داران کے لئے آنکھیں بچھاتے تھے اور انھیں خوش آمدید کہتے تھے۔

الحمد للہ شکر ہے کہ ایران میں وہ سب گندگی ختم کر دی گئی اور عورت اپنے اس دور سے نکل آئی ہے جس میں اسے رسوا کر دیا گیا تھا، اور وہ ثقافتی کھلونے اور بے قیمت ساز و سامان بن کر رہ گئی تھی، اب اس نے اپنا مقام دوبارہ حاصل کر لیا ہے اور اپنے کو پردہ سے ڈھانپ لیا ہے لیکن ایسا نہیں ہے کہ وہ گوشہ نشین ہو گئی ہو، بلکہ معاشرہ کے تمام مفید اور اصلاحی کاموں میں یہاں تک کہ میدان جنگ میں بھی اسلامی پردے کے ساتھ بڑی بڑی خدمات انجام دے رہی ہیں۔

حجاب کے مخالفین کے اعتراضات

[قارئین کرام!] ہم یہاں پر حجاب کے مخالفین کے اعتراضات کو بیان کرتے ہیں اور مختصر طور پر ان کے جوابات بھی پیش کرتے ہیں

۱۔ حجاب کے مخالفین کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ معاشرہ میں تقریباً نصف عورتیں ہوتی ہیں لیکن حجاب کی وجہ سے یہ عظیم جمعیت گوشہ نشین اور طبعی طور پر پسماندہ ہو جائے گی، خصوصاً جب انسان کو کاروبار کی ضرورت ہوتی ہے اور انسانی کارکردگی کی ضرورت ہوتی ہے، تو اگر عورتیں پردہ میں رہیں گی تو اقتصادی کاموں میں ان سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا، نیز ثقافتی اور اجتماعی اداروں میں ان کی جگہ خالی رہے گی! اس طرح وہ معاشرہ میں صرف خرچ کریں گی اور معاشرہ کے لئے بوجھ بن کر رہ

جائیں گی۔

لیکن جن لوگوں نے یہ اعتراض کیا ہے وہ چند چیزوں سے غافل ہیں یا انھوں نے اپنے کو غافل بنالیا ہے، کیونکہ:

اولاً: یہ کون کہتا ہے کہ اسلامی پردہ کی وجہ سے عورتیں گوشہ نشین اور معاشرہ سے دور ہوجائیں گی؟! اگر گزشتہ زمانہ میں اس طرح کی دلیل دینے میں زحمت تھی تو آج اسلامی انقلاب [ایران] نے ثابت کردکھایا ہے کہ عورتیں اسلامی پردہ میں رہ کر بھی معاشرہ کے لئے بہت سے کام انجام دے سکتی ہیں، کیونکہ ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ خواتین 'اسلامی پردہ کی رعایت کرتے ہوئے معاشرہ میں ہر جگہ حاضر ہیں، اداروں میں، کارخانوں میں، سیاسی مظاہروں میں، ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں، ہسپتالوں میں، کلینکوں میں، خصوصاً جنگ کے دوران جنگی زخمیوں کی مرہم پٹی اور ان کی نگہداشت کے لئے، مدرسوں اور یونیورسٹیوں میں، دشمن کے مقابلہ میں میدان جنگ میں، خلاصہ ہر مقام پر عورتوں نے اپنا کردار ادا کیا ہے۔

مختصر یہ کہ موجودہ حالات خود اس اعتراض کا دندان شکن جواب ہیں، گرچہ ہم گزشتہ زمانہ میں ان جوابات کے لئے ''امکان'' کی باتیں کرتے تھے [یعنی عورتیں پردہ میں رہ کر کیا اجتماعی امور کو انجام دے سکتی ہیں) لیکن آج کل یہ دیکھ رہے ہیں، اور فلاسفہ کا کہنا ہے کہ کسی چیز کے امکان کی دلیل خود اس چیز کا واقع ہونا ہے، یہ بات خود آشکار ہے اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ثانیاً: اگر ان چیزوں سے قطع نظر کریں تو کیا عورتوں کے لئے گھر میں رہ کر بچوں کی تربیت کرنا اور ان کو آئندہ کے لئے بہترین انسان بنانا تاکہ معاشرہ کے لئے بہترین اور مفید واقع ہوں، کیا یہ ایک بہترین اور مفید کام نہیں ہے؟

جو لوگ عورتوں کی اس ذمہ داری کو مثبت اور مفید کام نہیں سمجھتے، تو پھر وہ لوگ تعلیم و تربیت، صحیح و سالم اور پر رونق معاشرہ کی اہمیت سے بے خبر ہیں، ان لوگوں کا گمان ہے کہ مرد و عورت مغربی

ممالک کی طرح اداروں اور کارخانوں میں کام کرنے کے لئے نکل پڑیں اور بچے بچوں کو شیر خوار گاہوں میں چھوڑ دیں، یا کمرہ میں بند کر کے تالہ لگا دیا جائے اور ان کو اسی زمانہ سے قید کی تختی کا مزا چکھا دیں۔

وہ لوگ اس چیز سے غافل ہیں کہ اس طرح بچوں کی شخصیت اور اہمیت درہم و برہم ہو جاتی ہے بچوں میں انسانی محبت پیدا نہیں ہوتی، جس سے معاشرہ کو خطرہ در پیش ہوگا۔

۲۔ پردہ کے مخالفین کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ پردہ کے نئے برقع یا چادر کے ساتھ اجتماعی کاموں کو انجام نہیں دیا جا سکتا خصوصاً آج جبکہ موٹر گاڑیوں کا دور ہے، ایک پردہ دار عورت اپنے کو سنبھالے یا اپنی چادر کو، یا اپنے بچہ کو یا اپنے کام میں مشغول رہے؟

لیکن یہ اعتراض کرنے والے اس بات سے غافل ہیں کہ حجاب ہمیشہ برقع یا چادر کے معنی میں نہیں ہے بلکہ حجاب کے معنی عورت کا لباس ہے اگر چادر سے پردہ ہو سکتا ہو تو بہتر ہے ورنہ اگر ممکن نہیں ہے تو صرف اسی لباس پر اکتفا کرے [یعنی صرف اسکارف کے ذریعہ اپنے سر کے بال اور گردن وغیرہ کو چھپائے رکھیں]

ہمارے دیہی علاقوں کی عورتوں نے زراعتی کاموں میں اپنا پردہ باقی رکھتے ہوئے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ ایک بستی کی پردے دار عورت اسلامی پردہ کی رعایت کرتے ہوئے بہت سے اہم کام بلکہ مردوں سے بہتر کام کر سکتی ہیں، اور ان کا حجاب ان کے کام میں رکاوٹ نہیں بنتا۔

۳۔ ان کا ایک اعتراض یہ ہے کہ پردہ کی وجہ سے مرد اور عورت میں ایک طرح سے فاصلہ ہو جاتا ہے جس سے مردوں میں دیکھنے کی طمع بھڑکتی ہے، اور ان کے جذبات مزید شعلہ ور ہوتے ہیں کیونکہ "الانسانُ حریصٌ علی ما منع" (جس چیز سے انسان کو روکا جاتا ہے اس کی طرف مزید دوڑتا ہے)

اس اعتراض کا جواب یا صحیح الفاظ میں یہ کہا جائے کہ اس مغالطہ کا جواب یہ ہے کہ آج کے

معاشرہ کا شاہ کے زمانہ سے موازنہ کیا جائے آج ہر ادارہ میں پردہ حکم فرما ہے، اور شاہ کے زمانہ میں عورتوں کو پردہ کرنے سے روکا جاتا تھا۔

اس زمانہ میں ہر گلی کوچہ میں فحاشی کے اڈے تھے، گھروں میں بہت ہی عجیب وغریب ماحول پیدا ہوجاتا تھا، طلاق کی کثرت تھی ناجائز اولاد کی تعداد زیادہ تھی، وغیرہ وغیرہ۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ اب یہ تمام چیزیں بالکل ختم ہوگئی ہیں لیکن بے شک اس میں بہت کمی واقع ہوئی ہے، ہمارے معاشرہ میں بہت سدھار آیا ہے اور اگر فضل خدا شامل حال رہا اور یہی حالات باقی رہے اور دوسری مشکلات برطرف ہوگئیں تو ہمارا معاشرہ اس برائی سے بالکل پاک ہوجائے گا اور عورت کی اہمیت اجاگر ہوتی جائے گی۔(۱)

(۱) تفسیر نمونہ، جلد ۳، صفحہ ۳۳۴

۸۰۔ میراث میں مرد کا حصہ عورت کے دو برابر کیوں ہے؟

گرچہ میراث میں مرد کا حصہ عورت کے دو برابر ہے، لیکن اگر غور و فکر کریں تو معلوم ہوگا کہ عورتوں کا حصہ مردوں کے دو برابر ہے' اور یہ اس وجہ سے ہے کہ اسلام نے عورتوں کے حقوق کی حمایت کی ہے۔

وضاحت: اسلام نے مرد کے کاندھوں پر ایسی ذمہ داری رکھی ہے جس سے اس کی درآمد کا آدھا حصہ عورتوں پر خرچ ہوتا ہے، جبکہ عورتوں کے ذمہ کوئی خرچ نہیں ہے، چنانچہ ایک شوہر پر واجب ہے کہ اپنی زوجہ کو' مکان، لباس، کھانا اور دوسری چیزوں کا خرچ ادا کرے، اور اپنے بچوں کا خرچ بھی اسی کی گردن پر ہے، جبکہ عورتوں پر کسی طرح کا کوئی خرچ نہیں ہے یہاں تک کہ اپنا ذاتی خرچ بھی اس کے ذمہ نہیں ہے، لہٰذا ایک عورت میراث سے اپنا پورا حصہ بچا کر بینک میں رکھ سکتی ہے، جبکہ مرد اپنے حصہ کو بیوی بچوں پر خرچ کرتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مرد کی آمدنی کا آدھا حصہ اہل و عیال پر خرچ ہوگا، اور آدھا اس کے لئے باقی رہے گا، جبکہ عورت کا حصہ اسی طرح محفوظ رہے گا۔

یہ مسئلہ واضح ہونے کے لئے اس مثال پر توجہ کریں: فرض کریں کہ پوری دنیا کا مال و دولت ۳۰/ارب روپیہ ہے، جو میراث کے عنوان سے مردوں اور عورتوں میں تقسیم ہوتا ہے، تو اس میں ۲۰ ارب مردوں کا اور ۱۰/ارب عورتوں کا حصہ ہوگا، لیکن عورتیں عام طور پر شادی کرتی ہیں اور ان کی زندگی کا خرچ مردوں کے ذمہ ہوتا ہے، تو اس صورت میں عورتیں اپنے ۱۰/ارب کو بینک میں جمع کر

سکتی ہیں، اور عملی طور پر مردوں کے حصہ میں شریک ہوتی ہیں، کیونکہ خود اس پر اور بچوں پر بھی مرد ہی کا حصہ خرچ ہوگا۔ اس بنا پر حقیقت میں مردوں کا آدھا حصہ یعنی ۱۰ ارب عورتوں پر خرچ ہوگا، اور وہ دس ارب جو ان کے پاس محفوظ ہے سب ملاکر ۲۰ ارب (یعنی دو تہائی) عورتوں کے اختیار میں ہوگا جبکہ عملی طور پر مردوں کے خرچ کے لئے صرف دس ارب ہی باقی رہے گا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ عورتوں کا حقیقی خرچ اور فائدہ کے لحاظ سے مردوں کے دو برابر ہے، اور یہ فرق اس وجہ سے ہے کہ ان کے یہاں کاروبار کرنے کی قدرت کم پائی جاتی ہے، اور یہ ایک طرح سے منطقی اور عادلانہ حمایت ہے جس پر اسلام نے عورتوں کے لئے توجہ دی ہے، حقیقت میں ان کا حصہ زیادہ رکھا ہے، اگرچہ ظاہری طور پر ان کا حصہ مردوں سے آدھا رکھا ہے۔

سابق روایت کے پیش نظر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ سوال پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ سے لوگوں کے ذہن میں موجود تھا جس کی بنا پر دینی رہبروں سے یہ سوال ہوتا رہا ہے، اور ائمہ معصومین علیہم السلام کی طرف سے اس کا جواب دیا گیا ہے جن میں سے اکثر کا مضمون ایک ہی ہے، اور وہ جواب یہ ہے: ''خداوندعالم نے زندگی کا خرچ اور مہر مرد کے ذمہ رکھا ہے، اسی وجہ سے ان کا حصہ زیادہ قرار دیا ہے''۔

کتاب ''معانی الاخبار'' میں حضرت امام رضا علیہ السلام سے منقول ہے کہ اس سوال کے جواب میں آپ نے فرمایا: ''میراث میں عورتوں کا حصہ مردوں کے حصہ سے آدھا اس وجہ سے رکھا گیا ہے کہ عورت جب شادی کرتی ہے تو وہ مہر لیتی ہے اور مرد دیتا ہے، اس کے علاوہ بیوی کا خرچ شوہر پر ہے، جبکہ عورت خود اپنی اور شوہر کی زندگی کے خرچ کے سلسلہ میں کوئی ذمہ داری نہیں رکھتی''۔(۱)

---

(۱)تفسیر نمونہ، جلد ۳، صفحہ ۲۹۰

۸۱۔ فلسفہ متعہ کیا ہے؟

یہ ایک عام اور کلی قانون ہے کہ اگر انسان کی طبیعی خواہشات صحیح طریقہ سے پوری نہ ہوں تو پھر اس کو پورا کرنے کے لئے غلط راستہ اپنانا پڑتا ہے، کیونکہ اس حقیقت کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ طبیعی خواہشات کا گلا نہیں گھونٹا جا سکتا، اور اگر بالفرض ایسا کر بھی لیا جائے تو یہ کام عقلی نہیں ہے، کیونکہ یہ کام ایک طرح سے قانونِ خلقت سے جنگ ہے۔

اس بنا پر صحیح راستہ یہ ہے کہ اس کو معقول طریقہ سے پورا کیا جائے اور اس سے زندگی بہتر بنانے کے لئے فائدہ اٹھایا جائے۔

اس بات کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جنسی خواہش انسان کی بہت بڑی خواہش ہوتی ہے، یہاں تک کہ بعض ماہرین کا کہنا ہے کہ جنسی خواہش ہی انسان کی اصل خواہش ہوتی ہے اور باقی دوسری خواہشات کی بازگشت اسی طرف ہوتی ہیں۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بہت سے مواقع ایسے ہیں جن میں انسان خاص عمر میں شادی نہیں کر سکتا، یا شادی شدہ انسان طولانی سفر میں یہ جنسی خواہش پوری نہیں کر سکتا۔

یہ موضوع خصوصاً ہمارے زمانہ میں تعلیم کی مدت طولانی ہونے کے سبب اور بعض دیگر مسائل اور مشکلات کی بنا پر شادی دیر سے ہوتی ہے، اور بہت ہی کم نوجوان ایسے ہیں جو جوانی کے شروع اور اس خواہش کے شباب کے وقت شادی کر سکتے ہیں، لہٰذا یہ مسئلہ بہت مشکل بن گیا ہے۔

اس موقع پر کیا کیا جائے؟ کیا ایسے مواقع پر لوگوں کی اس خواہش کا (راہبوں کی طرح) گلا گھونٹ دیا جائے؟ یا یہ کہ ان کو جنسی آزادی دے دی جائے اور عصر حاضر کی شرمناک حالت کو ان کے لئے جائز سمجھ لیا جائے؟

یا ایک تیسرا راستہ اپنایا جائے جس میں نہ شادی جیسی مشکلات ہوں اور نہ ہی جنسی آزادی؟

الختصر: ''دائمی ازدواج'' (شادی) نہ گزشتہ زمانہ میں تمام لوگوں کی اس خواہش کا جواب بن سکتی تھی اور نہ آج، اور ہم ایک ایسے مقام پر کھڑے ہیں جہاں سے دو راستے نکلتے ہیں، یا ''فحاشی'' کو جائز مانیں، (جیسا کہ مغربی ممالک میں آج کل رسمی طور پر صحیح مانا جا رہا ہے) یا ''وقتی ازدواج'' [یعنی متعہ] کو قبول کریں، معلوم نہیں ہے جو لوگ متعہ کے مخالف ہیں انھوں نے اس سوال کے لئے کیا جواب سوچ رکھا ہے؟!

متعہ کا مسئلہ نہ تو شادی جیسی مشکلات رکھتا ہے کہ انسان کو اقتصادی یا تعلیمی مسائل اجازت نہیں دیتے کہ فوراً شادی کرے اور نہ ہی اس میں فحاشی کے دردناک حادثات پیش آتے ہیں۔

متعہ پر ہونے والے اعتراضات

ہم یہاں متعہ کے سلسلہ میں کئے گئے کچھ اعتراضات کا مختصر جواب پیش کرتے ہیں

ا۔ کبھی تو یہ کہا جاتا ہے کہ ''متعہ'' اور ''فحاشی'' میں کیا فرق ہے؟ دونوں ایک خاص مبلغ کے عوض ''جسم فروشی'' ہی تو ہیں، دراصل یہ تو فحاشی اور جنس بازی کے لئے ایک نقاب ہے، صرف ان دونوں میں چند صیغوں کا فرق ہے''۔

جواب: ان لوگوں کے اعتراض سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ متعہ کے سلسلہ میں معلومات نہیں رکھتے، کیونکہ متعہ صرف دو جملہ کہنے سے تمام نہیں ہوتا بلکہ بعض قوانین، شادی کی طرح ہوتے ہیں، یعنی ایسی عورت متعہ کی مدت میں صرف اسی مرد سے مخصوص ہے، اور مدت تمام ہونے

کے بعد عدہ رکھنا ضروری ہے یعنی کم سے کم ۴۵ دن تک کسی دوسرے سے شادی یا متعہ نہیں کرسکتی تاکہ اگر پہلے شوہر سے حاملہ ہوگئی ہے تو واضح ہو جائے، یہاں تک کہ اگر مانع حمل چیزیں استعمال کی ہوں تو اس مدت کی رعایت کرنا واجب ہے، اور اگر اس مرد سے حاملہ ہوگئی ہے تو یہ بچہ اس مرد کا ہوگا اور اولاد کے تمام مسائل اس پر نافذ ہوں گے، جبکہ فحاشی میں اس طرح کی کوئی قید وشرط نہیں ہے، پس معلوم یہ ہوا کہ دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔

اگرچہ (میاں بیوی کے درمیان) میراث، خرچ اور دوسرے احکام میں شادی اور متعہ میں فرق پایا جاتا ہے، () لیکن اس فرق کی وجہ سے متعہ کو فحاشی کی صف میں قرار نہیں دیا جا سکتا، بہرحال یہ بھی شادی کی ایک قسم ہے اور شادی کے متعدد قوانین اس پر نافذ ہوتے ہیں۔

۲۔ متعہ پر دوسرا اعتراض یہ ہوتا ہے کہ اس قانون کے پیچھے بہت سے عیاش لوگ غلط فائدہ اٹھاسکتے ہیں، اور متعہ کی آڑ میں ہر طرح کی فحاشی کرسکتے ہیں، جبکہ اس کی اجازت نہ ہونے کی صورت میں بعض شریف نسل متعہ سے دور رہتے ہیں، اور شریف خواتین اس سے پرہیز کرتی ہیں۔

جواب دنیا میں کس قانون سے غلط فائدہ نہیں اٹھایا جارہا ہے؟ کیا ہر فطری قانون کو اس لئے ختم کردیا جائے کہ اس سے غلط فائدہ اٹھایا جارہا ہے! انہیں غلط فائدہ اٹھانے والوں کو روکنا چاہئے۔

مثال کے طور پر اگر بہت سے لوگ حج کے موقع سے غلط فائدہ اٹھاتا چاہتے ہیں [جیسا کہ دیکھا گیا ہے] اور اس مبارک سفر میں منشیات کی تجارت کے لئے جاتے ہیں، تو کیا اس صورت میں لوگوں کو حج سے روکا جائے یا غلط فائدہ اٹھانے والوں کو روکا جائے؟!

() اسلام کا یہ مسئلہ ہے کہ متعہ سے پیدا ہونے والے بچوں کے احکام شادی سے پیدا ہونے والے بچوں کی طرح ہیں، ان میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔

اور اگر ہم دیکھتے ہیں کہ آج شریف انسان اس اسلامی قانون سے پرہیز کرتے ہیں، تو یہ قانون کا نقص نہیں ہے بلکہ قانون پر عمل کرنے والوں یا غلط فائدہ اٹھانے والوں کا نقص ہے، اگر آج ہمارے معاشرہ میں صحیح طریقہ پر متعہ کا رواج ہو جائے اور اسلامی حکومت خاص قوانین کے تحت اس مسئلہ میں صحیح منصوبہ بندی کرے، تو اس صورت میں غلط فائدہ اٹھانے والوں کی روک تھام ہو سکتی ہے (اور ضرورت کے وقت) شریف لوگ بھی اس سے کراہت نہیں کریں گے۔

۳۔ اعتراض کرنے والے کہتے ہیں متعہ کی وجہ سے معاشرہ میں (ناجائز بچوں کی طرح) بے سرپرست بچوں کی تعداد میں اضافہ ہو جائے گا۔

جواب: ہماری مذکورہ گفتگو مکمل طور پر اس اعتراض کا جواب ہے، کیونکہ ناجائز بچے قانونی لحاظ سے نہ باپ سے ملحق ہیں اور نہ ماں سے، جبکہ متعہ کے ذریعہ پیدا ہونے والے بچوں میں میراث اور اجتماعی حقوق کے لحاظ سے شادی سے پیدا ہونے والے بچوں سے کوئی فرق نہیں ہے، گویا اس حقیقت پر توجہ نہ کرنے کی وجہ سے مذکورہ اعتراض کیا گیا ہے۔

”راسل“ اور ”وقتی شادی“

آخر کلام میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس بات کی یاد دہانی کرائی جائے کہ مشہور و معروف انگریزی دانشور ”برٹرانڈ راسل“ کتاب **”زناشوئی واخلاق“** میں ”آزمائشی شادی“ کے عنوان سے اسی بات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

وہ ایک جج بنام ”بن لی بینڈسی“ کی تجویز ”دوستانہ شادی“ یا ”آزمائشی شادی“ کا ذکر کرنے کے بعد کہتا ہے۔

جج صاحب موصوف کی تجویز کے مطابق جوانوں کو یہ اختیار ملنا چاہئے کہ ایک نئی قسم کی شادی کرسکیں جو عام شادی (دائمی نکاح) سے تین امور میں مختلف ہو

الف: طرفین کا مقصد صاحب اولاد ہونا نہ ہو، اس سلسلہ میں ضروری ہے کہ انھیں حمل روکنے کے طریقہ سکھائے جائیں۔

ب۔ ان کی جدائی آسانی کے ساتھ ہو سکے۔

ج۔ طلاق کے بعد عورت کسی قسم کا نان ونفقہ کا حق نہ رکھتی ہو۔

راسل جج لینڈسی کا مقصد بیان کرنے کے بعد کہتا ہے "میرا خیال ہے کہ اس قسم کی شادی کو قانونی حیثیت دے دی جائے تو بہت سے نوجوان خصوصاً کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طالب علم وقتی نکاح پر تیار ہو جائیں گے اور وقتی مشترک زندگی میں قدم رکھیں گے، ایسی زندگی سے جو ان کی آزادی کا سبب بنے، تو اس طرح معاشرہ کی بہت سی خرابیوں، لڑائی جھگڑوں خصوصاً جنسی بے راہ روی سے نجات مل جائے گی۔(۱)

بہر حال جیسا کہ آپ حضرات نے ملاحظہ فرمایا کہ وقتی شادی کے بارے میں مذکورہ تجویز کس لحاظ سے اسلامی حکم کی طرح ہے، لیکن جو شرائط اور خصوصیات اسلام نے وقتی شادی کے لئے تجویز کی ہیں وہ کئی لحاظ سے زیادہ واضح اور مکمل ہیں، اسلامی وقتی شادی میں اولاد نہ ہونے کو ممنوع نہیں کیا گیا ہے اور فریقین کا ایک دوسرے سے جدا ہونا بھی آسان ہے، جدائی کے بعد نان ونفقہ بھی نہیں ہے۔(۲)

متعہ کی تاریخی حیثیت

علمائے اسلام کا اتفاق ہے بلکہ دین کے ضروری احکام میں سے ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں "متعہ" تھا، (اور سورہ نساء کی آیہ شریفہ ﴿فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ

---

(۱) کتاب زناشوئی و طلاق صفحہ ۸۹ و ۹۰

(۲) تفسیر نمونہ، جلد ۳، صفحہ ۳۳۲

﴿أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً﴾ (۱) متعہ کے جواز پر دلیل ہے، کیونکہ مخالف اس بات پر عقیدہ رکھتے ہیں کہ متعہ کا جواز سنت پیغمبر سے ثابت ہے) یہاں تک صدر اسلام میں مسلمان اس پر عمل کیا کرتے تھے، چنانچہ حضرت عمر کا یہ مشہور و معروف قول مختلف کتابوں میں ملتا ہے "مُتْعَتَانِ كَانَتَ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللهِ وَأَنَا أُحَرِّمُهُمَا وَ مُعَاقِبٌ عَلَيْهِمَا: مُتعةُ النّساءِ و مُتعةُ الحجّ" (۲) "دو متعہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں رائج تھے اور میں ان کو حرام قرار دیتا ہوں، اور انجام دینے والوں کو سزا دوں گا، متعۃ النساء اور حج تمتع (جو حج کی ایک خاص قسم ہے)، چنانچہ حضرت عمر کا یہ قول اس بات کی واضح دلیل ہے کہ متعہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں ہوتا تھا، لیکن اس حکم کے مخالف کہتے ہیں کہ یہ حکم بعد میں نسخ ہوگیا ہے اور حرام قرار دیا گیا ہے۔

لیکن قابل توجہ بات یہ ہے کہ جن روایات کو "حکم متعہ کے نسخ" کے لئے دلیل قرار دیا جاتا ہے ان میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے، چنانچہ بعض روایات کہتی ہیں کہ خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس حکم کو نسخ کیا ہے، لہٰذا اس حکم کی ناسخ خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت اور حدیث ہے، بعض کہتی ہیں کہ اس حکم کی ناسخ سورہ طلاق کی درج ذیل آیت ہے:

﴿إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَأَحْصُوا الْعِدَّةَ وَاتَّقُوا اللهَ رَبَّكُمْ﴾ (۳)

"جب تم لوگ عورتوں کو طلاق دو تو انھیں عدت کے حساب سے طلاق دو اور پھر عدت کا حساب رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو"۔

---

(۱) سورۂ نساء، آیت ۲۴ "جو بھی ان عورتوں سے تمتع کرے اس کی اجرت بطور فریضہ دے دے۔

(۲) کنز العرفان، جلد دوم، صفحہ ۱۵۸ و تفسیر قرطبی، تفسیر طبری میں مذکورہ حدیث کے مد نظر نقل ہوئی ہے نیز سنن بیہقی، جلد ۷ کتاب نکاح میں بھی وہ حدیث موجود ہے

(۳) سورہ طلاق، پہلی آیت

حالانکہ اس آیہ شریفہ کا محل بحث سے کوئی تعلق نہیں ہے، کیونکہ اس آیت میں طلاق کی گفتگو ہے، جبکہ متعہ میں طلاق نہیں ہوتی متعہ میں مدت ختم ہونے سے جدائی ہو جاتی ہے۔

یہ بات مسلم ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ کے زمانہ میں متعہ قطعی طور پر پایا جاتا تھا، اور اس کے نسخ ہونے پر کوئی محکم دلیل ہمارے پاس نہیں ہے، لہٰذا علم اصول کے قانون کے مطابق اس حکم کے باقی رہنے پر حکم کیا جائے گا، [جسے علم اصول کی اصطلاح میں استصحاب کہا جاتا ہے]۔

حضرت عمر سے منقول جملہ بھی اس حقیقت پر واضح دلیل ہے کہ متعہ کا حکم پیغمبر اکرم ﷺ کے زمانہ میں نسخ نہیں ہوا تھا۔

اور یہ بات بھی واضح ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ کے علاوہ کوئی بھی شخص احکام کو نسخ کرنے کا حق نہیں رکھتا، اور صرف آنحضرت ﷺ کی ذات مبارک ہی حکم خدا کے ذریعہ بعض احکام کو نسخ کر سکتی ہے، پیغمبر اکرم ﷺ کی وفات کے بعد باب نسخ بالکل بند ہو چکا ہے، اور اگر کوئی اپنے اجتہاد کے ذریعہ بعض احکام کو منسوخ کرے تو پھر اس دائمی شریعت میں کوئی چیز باقی نہیں رہے گی، اور اصولی طور پر پیغمبر اکرم ﷺ کی گفتگو کے مقابل اجتہاد کرے تو یہ ''اجتہاد مقابل نص'' ہوگا جس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

مزے کی بات تو یہ ہے کہ صحیح ترمذی جو اہل سنت کی مشہور صحیح ترین کتابوں میں سے ہے، اور ''دار قطنی'' (۱) میں تحریر ہے: ''ایک شامی شخص نے عبد اللہ بن عمر سے ''حج تمتع'' کے بارے میں سوال کیا تو عبد اللہ بن عمر نے کہا: یہ کام جائز اور بہتر ہے، اس شامی نے کہا: تمہارے باپ نے اس کو ممنوع قرار دیا ہے، تو عبد اللہ بن عمر بہت ناراض ہوئے اور کہا: اگر میرا باپ کسی کام سے نہی کرے، جبکہ پیغمبر اکرم ﷺ نے اس کی اجازت دی ہو تو کیا تم لوگ سنت پیغمبر کو چھوڑ کر میرے

(۱) تفسیر قرطبی، جلد ۲، صفحہ ۷۶۲، سورۂ بقرہ، آیت ۱۹۵ کے ذیل میں۔

باپ کی پیروی کروگے؟ یہاں سے چلے جاؤ۔(۱)

متعہ کے سلسلہ میں اسی طرح کی روایت "عبد اللہ بن عمر" سے صحیح ترمذی میں بھی نقل ہوئی ہے،(۲)

اور "محاضرات" راغب سے نقل ہوا ہے کہ ایک مسلمان نے متعہ کیا تو لوگوں نے سوال کیا کہ اس کام کے جواز کا حکم کس سے حاصل کیا ہے؟ تو اس نے کہا "عمر" سے! لوگوں نے تعجب کے ساتھ سوال کیا، یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے جبکہ خود عمر نے اس کام سے روکا ہے یہاں تک کہ انجام دینے والے کے لئے سزا کا وعدہ کیا ہے؟ تو اس نے کہا ٹھیک ہے، میں بھی تو اسی وجہ سے کہتا ہوں، کیونکہ عمر نے کہا: پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو حلال کیا تھا لیکن میں اس کو حرام کرتا ہوں، میں نے اس کا جواز پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لیا، لیکن اس کی حرمت کسی سے قبول نہیں کروں گا!(۳)

یہاں پر اس بات کی یاددہانی ضروری ہے کہ اس حکم کے منسوخ ہونے کا دعویٰ کرنے والے بھی متضاد بیانات رکھتے ہیں اور تناقض اور تضاد گوئی کے شکار نظر آتے ہیں:

اہل سنت کی معتبر کتابوں میں متعدد روایات اس بات کی وضاحت کرتی ہیں کہ یہ حکم پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں ہرگز منسوخ نہیں ہوا تھا، بلکہ عمر نے اس کو ممنوع قرار دیا ہے، لہٰذا اس حکم کو

---

(۱) "متعہ حج" سے مراد جس کو عمر نے حرام قرار دیدیا تھا یہ ہے کہ حج تمتع سے قطع نظر کی جائے، حج تمتع یہ ہے کہ انسان حج کے لئے جاتا ہے تو پہلے محرم ہوتا ہے اور "عمرہ" انجام دینے کے بعد احرام سے آزاد ہو جاتا ہے (اور اس کے لئے حالت احرام کی حرام چیزیں یہاں تک کہ ہمبستری بھی جائز ہو جاتی ہے) اور اس کے بعد دوبارہ حج کے لئے نویں ذی الحجہ کو احرام باندھتا ہے، دور جاہلیت میں اس کام کو صحیح نہیں سمجھا جاتا تھا اور تعجب کیا جاتا تھا کہ جو شخص ایام حج میں مکہ معظمہ میں وارد ہو اور حج انجام دینے سے پہلے عمرہ بجالائے، اور اپنا احرام کھول دے لیکن اسلام نے واضح طور پر اس بات کی اجازت دیدی، اور سورۂ بقرہ، آیت ۸۲ میں اس موضوع کی وضاحت فرمادی۔

(۲) شرح لمعہ، جلد۲، کتاب النکاح۔

(۳) کنز العرفان، جلد دوم صفحہ ۱۵۹، (حاشیہ)

منسوخ ماننے والی ان تمام روایات کا جواب دیں، ان روایات کی تعداد ۲۴ ہے، جن کو علامہ امینی علیہ الرحمہ نے اپنی نامور کتاب ''الغدیر'' کی چھٹی جلد میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، ہم یہاں پر ان میں سے دو نمونے پیش کرتے ہیں:

۱۔ صحیح مسلم میں جابر بن عبداللہ انصاری سے نقل ہوا ہے کہ انھوں نے کہا: ہم پیغمبر اکرمؐ کے زمانہ میں بہت آسانی سے متعہ کر لیتے تھے، اور اسی طرح یہ سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ عمر نے ''عمرو بن حریث'' کے مسئلہ میں اس کام سے بالکل روک دیا۔( )

۲۔ دوسری حدیث کتاب ''موطا بن مالک'' اور ''سنن کبری بیہقی'' میں ''عروہ بن زبیر'' سے نقل ہوئی ہے کہ ''خولہ بنت حکیم'' نامی عورت حضرت عمر کے زمانہ خلافت میں دربار میں حاضر ہوئی اور اس نے خبر دی کہ مسلمانوں میں ایک شخص ''ربیعہ بن امیہ'' نامی نے متعہ کیا ہے، تو یہ سن کر حضرت عمر نے کہا: اگر پہلے سے اس کام کی نہی کی ہوتی تو اس کو سنگسار کر دیتا، (لیکن آج سے اس کام پر پابندی لگاتا ہوں!)(۲)

کتاب بدایۃ المجتہد، تالیف ابن رشد اندلسی میں بھی تحریر ہے کہ جابر بن عبداللہ انصاری کہتے ہیں: ''پیغمبر اکرم ﷺ کے زمانہ میں اور ''ابوبکر'' کی خلافت اور ''عمر'' کی آدھی خلافت تک متعہ پر عمل ہوتا تھا اس کے بعد عمر نے منع کر دیا''۔(۳)

دوسری مشکل یہ ہے کہ اس حکم کے منسوخ ہونے کی حکایت کرنے والی روایات میں ضد ونقیض باتیں ہیں، بعض کہتی ہیں یہ حکم جنگ خیبر میں منسوخ ہوا ہے، بعض کہتی ہیں کہ ''روز فتح مکہ''

( ) الغدیر، جلد ۶، صفحہ ۲۰۶

(۲) الغدیر، جلد ۶، صفحہ ۲۱۰

(۳) بدایۃ المجتہد، کتاب نکاح

منسوخ ہوا اور بعض کہتے ہیں جنگ تبوک میں، نیز بعض کہتے ہیں کہ جنگ اوطاس میں منسوخ ہوا لہٰذا ان تمام چیزوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام روایت جعلی ہیں جن میں اس قدر تناقض اور ٹکراؤ پایا جاتا ہے۔

[قارئین کرام!] ہماری گفتگو سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ صاحب تفسیر المنار (دور حاضر کے سنی عالم) کی گفتگو تعصب اور ہٹ دھرمی پر مبنی ہے، جیسا کہ موصوف کہتے ہیں: ''ہم نے پہلے تفسیر المنار کی تیسری اور چوتھی جلد میں اس بات کی وضاحت کی تھی کہ عمر نے متعہ سے منع کیا ہے لیکن بعد میں ایسی روایات ملی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ متعہ کا حکم خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں منسوخ ہوگیا تھا نہ کہ زمانہ عمر میں منسوخ ہوا، لہٰذا اپنی گزشتہ بات کی اصلاح کرتے ہیں اور اس سے استغفار کرتے ہیں''۔(۱) یہ تعصب نہیں تو اور کیا ہے؟! کیونکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں متعہ کا حکم منسوخ ہونے کی حکایت کرنے والی ضد و نقیض روایت کے مقابل ایسی روایات موجود ہیں جو اس بات کی حکایت کرتی ہیں کہ یہ حکم حضرت عمر کے زمانہ میں بھی تھا، لہٰذا نہ تو معافی کی گنجائش ہے اور نہ توبہ واستغفار کی، اور جیسا کہ ہم نے پہلے بھی عرض کیا کہ اس معاصر کا پہلا نظریہ حقیقت ہے اور دوسرے نظریہ میں حقیقت کو چھپانے کی ناکام کوشش کی ہے!

یہ بات بھی ظاہر ہے کہ نہ تو ''عمر'' اور نہ کوئی دوسرا شخص یہاں تک ائمہ معصومین علیہم السلام جو کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حقیقی جانشین ہیں، کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں موجود احکام کو منسوخ کرے، اور اصولی طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد اور وحی کا سلسلہ بند ہونے کے بعد نسخ معنی نہیں رکھتا، اور جیسا کہ بعض لوگوں نے ''کلام عمر'' کو اجتہاد پر حمل کیا ہے کہ یہ حضرت عمر کا اجتہاد ہے، یہ بھی تعجب کا مقام ہے کیونکہ ''نص'' کے مقابلہ میں ''اجتہاد'' ممکن ہی نہیں۔(۲)

---

(۱) تفسیر المنار، جلد ۵، صفحہ ۱۶۔ (۲) تفسیر نمونہ، جلد ۳، صفحہ ۳۴۔

۸۲۔ عدّہ کا فلسفہ کیا ہے؟

جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ﴿وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ﴾(۱) ''مطلقہ عورتیں تین حیض تک انتظار کریں گی، [اور عدہ رکھیں گی]''۔

یہاں پر سوال یہ ہوتا ہے کہ اس اسلامی قانون کا فلسفہ کیا ہے؟

چونکہ طلاق کے ذریعہ معمولاً گھر اجڑنے لگتا ہے اور معاشرہ کا ناقابل تلافی نقصان ہوتا ہے، اسی وجہ سے اسلام نے ایسا قانون پیش کیا ہے تاکہ آخری منزل تک طلاق سے روک تھام ہو سکے، ایک طرف تو ''اس کو جائز کاموں میں سب سے زیادہ قابل نفرت'' قرار دیا گیا ہے اور دوسری طرف شادی بیاہ کے مسائل میں اختلاف کی صورت میں طرفین میں صلح و مصالحت کے اسباب فراہم کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ حتی الامکان اس کام سے روک تھام ہو سکے۔

انہی قوانین میں سے طلاق میں تاخیر اور خود طلاق کو متزلزل کرنا ہے یعنی طلاق کے بعد عدہ کو واجب کیا ہے جس کی مدت تین ''طہر'' یعنی عورت کا تین مرتبہ خون حیض سے پاک ہونا۔

''عدّہ'' یا صلح و مصالحت اور واپس پلٹنے کا وسیلہ

کبھی کبھی بعض وجوہات کی بنا پر انسان میں ایک حالت پیدا ہو جاتی ہے کہ ایک چھوٹے سے اختلاف یا معمولی تنازع سے انتقام کی آگ بھڑک جاتی ہے اور عقل و وجدان پر غالب آجاتی ہے۔

---

(۱) سورۂ بقرہ، آیت ۲۲۸

معمولاً گھریلو اختلاف اسی وجہ سے پیش آتے ہیں، لیکن اس کشمکش کے کچھ ہی بعد میاں بیوی ہوش میں آتے ہیں اور پشیمان ہو جاتے ہیں، خصوصاً جب یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے بچے پریشان ہیں تو مختلف پریشانیاں لاحق ہوتی ہیں۔ اس موقع پر مذکورہ آیت کہتی ہے عورتیں ایک مدت عدہ رکھیں تاکہ اس مدت میں غصہ کی جلد ختم ہو جانے والی لہریں گزر جائیں، اور ان کی زندگی میں دشمنی کے سیاہ بادل چھٹ جائیں۔

خصوصاً اسلام نے اس عدہ کی مدت میں عورت کو حکم دیا ہے کہ گھر سے باہر نہ نکلے، جس کے پیش نظر اس عورت کو غور وفکر کا موقع ملتا ہے جو میاں بیوی میں تعلقات بہتر ہونے کے لئے ایک موثر قدم ہے۔ لہٰذا سورہ طلاق کی پہلی آیت میں پڑھتے ہیں ﴿**لَا تُخْرِجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ ... لَا تَدْرِي لَعَلَّ اللهُ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ أَمْرًا**﴾ **"ان کو گھروں سے نہ نکالو... تم کیا جانو شاید خداوند عالم کوئی ایسا راستہ نکال دے کہ جس سے آپس میں صلح ومصالحت ہو جائے"**۔ اکثر اوقات طلاق سے پہلے کے خوشگوار لمحات، محبت اور پیار کے گزرے ہوئے لمحات کو یاد کرلینا کافی ہو جاتا ہے اور پھیکی پڑ جانے والی محبت میں نمک پڑ جاتا ہے۔

عدہ؛ نسل کی حفاظت کا وسیلہ

عدہ کا دوسرا فلسفہ یہ ہے کہ عدہ کے ذریعہ یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ طلاق شدہ عورت حاملہ ہے یا نہیں؟ یہ صحیح ہے کہ ایک دفعہ حیض دیکھنا حاملہ نہ ہونے کی دلیل نہیں ہے، لیکن بسا اوقات دیکھا گیا ہے کہ عورت حاملہ ہونے کی صورت میں بھی شروع کے چند ماہ تک حیض دیکھتی ہے، لہٰذا اس موضوع کی مکمل رعایت کا حکم دیا گیا ہے کہ عورت تین دفعہ تک حیض دیکھے اور پاک ہو جائے، تاکہ یہ یقین ہو جائے کہ اپنے گزشتہ شوہر سے حاملہ نہیں ہے، پھر اس کے بعد دوبارہ نکاح کر سکتی ہے۔ ( )

( ) تفسیر نمونہ، جلد ۲، ص ۱۴۰

اسلام کے بعض محرمات کا فلسفہ

۸۳۔غنا؛ کیا ہے اور اس کی حرمت کا فلسفہ کیا ہے؟

غنا[گانا] کی حرمت میں کوئی خاص مشکل نہیں ہے، صرف موضوع غنا کو معین کرنا مشکل ہے۔

کیا ہر خوش آواز اور مترنم لہجہ غنا ہے؟

مسلّم طور پر ایسا نہیں ہے، کیونکہ اسلامی روایات میں بیان ہوا ہے اور مسلمین کی سیرت اس بات کی حکایت کرتی ہے کہ قرآن اور اذان وغیرہ کو بہترین آواز اور خوش لہجہ میں پڑھا جائے۔

کیا ہر وہ آواز جس میں "ترجیع" [گلگری یعنی آواز کا اتار چڑھاؤ] پایا جاتا ہو، وہ غنا ہے؟

یہ بھی ثابت نہیں ہے۔

اس مسئلہ میں شیعہ اور اہل سنت کے فقہا کے بیان سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ غنا، طرب انگیز آواز اور لہو باطل ہے۔

واضح الفاظ میں یوں کہا جائے: غنا اس آہنگ اور طرز کو کہا جاتا ہے جو فسق و فجور اور گناہگاروں، عیاشوں اور بدکاروں کی محفلوں سے مطابقت رکھتا ہو۔

یا اس کے لئے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ غنا اس آواز اور طرز کو کہا جاتا ہے جس سے انسان کی شہوانی طاقت ہیجان میں آجائے، اور انسان اس حال میں احساس کرے کہ اگر اس طرز اور آواز کے ساتھ شراب اور جنسی لذت بھی ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا!۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ کبھی یہ "آہنگ" اور "طرز" خود بھی غنا اور لہو و باطل ہوتا ہے اور اس کے الفاظ اور مفہوم بھی، اس لحاظ سے عاشقانہ فتنہ انگیز اشعار کو مطرب طرز میں پڑھا جاتا ہے، لیکن کبھی صرف آہنگ اور طرز غنا ہوتا ہے لیکن اشعار یا قرآنی آیات یا دعا اور مناجات کو ایسی طرز سے پڑھیں جو عیاشوں اور بدکاروں کی محفلوں سے مناسب ہے، لہذا یہ دونوں صورتیں حرام ہیں۔ (غور کیجئے)

اس نکتہ کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ غنا کے سلسلہ میں دو معنی بیان کئے گئے ہیں "عام معنی"، "خاص معنی"، معنی خاص وہی ہیں جو ہم نے اوپر بیان کئے ہیں یعنی شہوانی طاقت کو ہیجان میں لانے والی اور فسق و فجور کی محفل کے موافق طرز اور آواز۔

لیکن عام معنی ہر بہترین آواز کو غنا کہتے ہیں، لہٰذا جن حضرات نے غنا کے عام معنی کئے ہیں انھوں نے غنا کی دو قسمیں کی ہیں، "حلال غنا"، "حرام غنا"۔

حرام غنا سے مراد وہی ہے جو ہم نے بیان کیا ہے اور حلال غنا سے ہر وہ دلکش اور بہترین آواز ہے جو مفسدہ انگیز نہ ہو اور اہل فسق و فجور سے مناسبت نہ رکھتی ہو۔

اس بنا پر غنا کی حرمت تقریباً اختلافی نہیں ہے، بلکہ اس کے معنی میں اختلاف ہے۔

اگرچہ "غنا" کے کچھ مشکوک موارد بھی ہیں (دوسرے تمام مفاہیم کی طرح) جس میں انسان کو معلوم نہیں ہوتا کہ فلاں طرز یا فلاں آواز فسق و فجور کی محفلوں سے مناسبت رکھتی ہے یا نہیں؟ اس صورت میں یہ آواز "اصل برائت" [ ] کے تحت جواز کا حکم رکھتی ہے (البتہ غنا کی مذکورہ تعریف کے پیش نظر اس کے مفہوم سے کافی معلومات کے بعد)

[ ] یہ قاعدہ علم اصول میں ثابت ہے کہ اگر کسی کام کی حرمت پر کوئی دلیل نہ ہو تو اصل برائت جاری کی جائے گی یعنی وہ کام جائز ہے۔ [مترجم]

یہیں سے یہ بات بھی روشن ہو جاتی ہے کہ وہ رزمیہ ترانہ جو میدان جنگ اور ورزش کے وقت مخصوص آہنگ و آواز کے ساتھ پڑھا جاتا ہے اس کے حرام ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے۔

البتہ غنا کے سلسلہ میں دوسری بحثیں بھی پائی جاتی ہیں جیسے غنا سے کیا کیا مستثنیٰ ہیں؟ اس سلسلہ میں کہ کس نے کس کو قبول کیا ہے اور کس نے کس کا انکار کیا ہے، فقہی کتابوں کی طرف رجوع کیا جائے۔

یہاں پر جس آخری بات کا ذکر ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ہم نے جو کچھ اوپر بیان کیا ہے وہ پڑھنے سے متعلق ہے، لیکن موسیقی کے آلات اور ساز وسامان کی حرمت کے بارے میں دوسری بحث ہے جس کا ہماری بحث سے تعلق نہیں ہے۔

حرمت غنا کا فلسفہ

مذکورہ شرائط کے ساتھ "غنا" کے معنی ومفہوم میں غور وفکر کرنے سے غنا کی حرمت کا فلسفہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔

ہم یہاں پر ایک مختصر تحقیق کی بنا پر اس کے مفاسد اور نقصانات کو بیان کرتے ہیں

الف: برائیوں کی طرف رغبت

تجربات اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں (اور تجربات بہترین شاہد اور گواہ ہوتے ہیں) کہ غنا [یعنی ناچ گانے] سے متاثر ہونے والے افراد تقویٰ اور پرہیزگاری کی راہ کو ترک کر کے جنسی بے راہ روی کے اسیر ہو گئے ہیں۔

غنا کی محفلیں عام طور پر فساد کے مرکز ہوتی ہیں، یعنی کثرت گناہوں اور بدکاریوں کی جڑ یہی غنا اور ناچ گانا ہوتا ہے۔

بیرونی جرائد کی بعض رپورٹوں میں ہم پڑھتے ہیں کہ ایک پروگرام میں لڑکے اور لڑکیاں

شریک تھیں وہاں ناچ گانے کا ایک مخصوص ''شو'' ہوا جس کی بنا پر لڑکوں اور لڑکیوں میں اس قدر ہیجان پیدا ہوا کہ یک دوسرے پر حملہ آور ہو گئے اور ایسے واقعات پیش آئے جن کے ذکر کرنے سے قلم کو شرم آتی ہے۔

تفسیر ''روح المعانی'' میں ''بنی امیہ'' کے ایک عہدہ دار کے حوالہ سے نقل ہوا ہے جو کہتا تھا غنا ورناچ گانے سے پرہیز کرو، کیونکہ اس سے حیا کم ہوتی ہے، شہوت میں اضافہ ہوتا ہے، انسان کی شخصیت پامال ہوتی ہے، اور [یہ ناچ گانا] شراب کا جانشین ہوتا ہے، کیونکہ ایسا شخص وہ سب کام کرتا ہے جو ایک مست انسان [شراب کے نشہ میں] انجام دیتا ہے۔ (۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ بھی ناچ گانے کے فسادات اور نقصانات سے واقف تھے اور اگر ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی روایات میں بارہا بیان ہوا ہے کہ ناچ گانے کے ذریعہ انسان کے دل میں روح نفاق پرورش پاتی ہے، تو یہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے، روح نفاق وہی گناہوں اور برائیوں سے آلودہ ہونا اور تقویٰ وپرہیزگاری سے دوری کا نام ہے۔

نیز اگر روایات میں بیان ہوا ہے کہ جس گھر میں غنا اور ناچ گانا ہوتا ہے اس میں فرشتے داخل نہیں ہوتے تو یہ بھی انھیں فسادات سے آلودگی کی وجہ سے ہے کیونکہ فرشتے پاک وپاکیزہ ہیں اور پاکیزگی کے طلب ہیں نیز آلودہ فضا سے بیزار ہیں۔

ب: یاد خدا سے غفلت

بعض اسلامی روایات میں ''غنا'' کے معنی میں ''لہو'' کا استعمال ہونے والا لفظ اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ غنا اور ناچ گانے کے ذریعہ انسان اتنا مست ہوجاتا ہے کہ یاد خدا سے غافل ہوجاتا ہے۔

(۱) تفسیر روح المعانی، جلد ۲۱، صفحہ ۶۰

حضرت امام علی علیہ سلام سے منقول ایک حدیث میں بیان ہوا ہے "کل ما الھی عن ذکر اللہ فھو من المیسر" (۱)(یاد خدا سے غافل کرنے والی (اور شہوت میں غرق کرنے والی) ہر چیز جوے کا حکم رکھتی ہے۔

ج۔اعصاب کے لئے نقصان دہ آثار

غنا اور ناچ گانا نیز موسیقی، دراصل انسانی اعصاب کے نشہ کے عوامل میں سے ہے، یا دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ نشہ کبھی منھ کے ذریعہ انسان کے بدن میں پہنچتا ہے (جیسے شراب)

اور کبھی حس شامہ اور سونگھنے سے ہوتا ہے (جیسے ہیروئن)

اور کبھی انجکشن کے ذریعہ ہوتا ہے (جیسے مرفین)

در کبھی حس سامعہ یعنی کانوں کے ذریعہ نشہ ہوتا ہے (جیسے غنا اور موسیقی)

اسی وجہ سے کبھی کبھی غنا اور ناچ گانے کے ذریعہ انسان بہت زیادہ مست ہوجاتا ہے، اگرچہ کبھی اس حد تک نہیں پہنچتا لیکن پھر بھی نشہ کا تھوڑا بہت اثر ہوتا ہے۔

اور اسی وجہ سے غنا میں نشہ کے بہت سے مفاسد موجود ہیں چاہے اس کا نشہ کم ہو یا زیادہ۔

''اگر مشہور موسیقی داں افراد کی زندگی پر دقیق توجہ کی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ آہستہ آہستہ اپنی عمر میں نفسیاتی مشکلات میں گرفتار ہوجاتے ہیں یہاں تک کہ ان کے اعصاب جواب دے دیتے ہیں، اور بہت سے افراد نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں، بعض لوگ اپنی عقل و شعور کھو بیٹھتے ہیں اور پاگل خانوں کے مہمان بن جاتے ہیں، بعض لوگ مفلوج اور ناتواں ہوجاتے ہیں، یہاں تک بعض لوگوں کا موسیقی کا پروگرام کرتے ہوئے بلڈ پریشر ہائی ہوجاتا ہے اور وہ موقع پر ہی دم توڑ جاتے ہیں''۔(۱)

---

(۱) تاثیر موسیقی بر روان واعصاب، صفحہ ۲۶

مختصر یہ کہ غنا اور موسیقی کے آثار جنون کی حد تک، بلڈ پریشر کا بڑھنا اور دوسرے خطرناک آثار اس درجہ ہیں کہ اس کے بیان کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔

عصر حاضر میں ناگہانی اموات کے سلسلہ میں ہونے والے اعداد وشمار سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ گزشتہ کی بنسبت اس زمانہ میں ناگہانی اموات میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا ہے، جس کی مختلف وجوہات ہیں ان میں سے ایک وجہ یہی عالمی پیمانہ پر غنا اور موسیقی کی زیادتی ہے۔

د۔ غنا، استعمار کا ایک حربہ

عالمی پیمانہ پر استعمار، عام لوگوں خصوصاً نسل جوان کی بیداری سے خوف زدہ ہے، اسی وجہ سے استعمار کے پاس اپنے ناپاک ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے پنی منصوبہ بندی ہے کہ جس سے مختلف قوموں کو جہالت اور غفلت میں رکھنے کے لئے غلط سرگرمیوں کو رائج کرے۔

عصر حاضر میں منشیات صرف تجارتی پہلو نہیں رکھتی، بلکہ ایک اہم سیاسی حربہ ہے یعنی استعمار کی ایک اہم سیاست ہے، فحاشی کے اڈے، جوے خانے اور دوسری غلط سرگرمی، منجملہ غنا اور موسیقی کو وسیع پیمانہ پر رائج کرنا استعمار کا ایک اہم ترین حربہ ہے، تاکہ عام لوگوں کے افکار کو منحرف کردیں، اسی وجہ سے دنیا بھر کی ریڈیو سروسیوں میں زیادہ تر موسیقی ہوتی ہے، اسی طرح ٹیلی ویژن وغیرہ میں بھی موسیقی کی بھرمار ہے۔(۱)

---

(۱)تفسیر نمونہ، جلد ۱۷، صفحہ ۲۱

۸۴۔ زنا کی حرمت کا فلسفہ کیا ہے؟

۱۔ زنا کے ذریعہ خاندانی نظام درہم و برہم ہو جاتا ہے، ماں باپ اور اولاد کے درمیان رابطہ ختم ہو جاتا ہے جبکہ یہ وہ رابطہ ہے جو نہ صرف معاشرے کی شناخت کا سبب ہے بلکہ خود اولاد کی نشو و نما کا موجب بھی ہے، یہی رابطہ ساری عمر محبت کے ستونوں کو قائم رکھتا ہے اور انہیں دوام بخشتا ہے۔

المختصر جس معاشرے میں غیر شرعی اور بے باپ کی اولاد زیادہ ہو اس کے اجتماعی روابط سخت متزلزل ہو جاتے ہیں کیونکہ ان روابط کی بنیاد خاندانی روابط ہی ہوتے ہیں۔

اس مسئلہ کی اہمیت سمجھنے کے لئے ایک لمحہ اس بات پر غور کرنا کافی ہے کہ اگر سارے انسانی معاشرے میں زنا جائز اور مباح ہو جائے اور شادی بیاہ کا قانون ختم کر دیا جائے تو ان حالات میں غیر معین اور بے ٹھکانہ اولاد پیدا ہوگی، اس اولاد کو کسی کی مدد اور سرپرستی حاصل نہ ہوگی، نہ پیدائش کے وقت کوئی پوچھے گا اور نہ بڑا ہونے کے بعد۔

اس سے قطع نظر برائیوں، سختیوں اور مشکلات میں محبت کی تاثیر تسلیم شدہ ہے جبکہ ایسی اولاد اس محبت سے بالکل محروم ہو جائے گی، اور انسانی معاشرہ پوری طرح تمام پہلوؤں سے حیوانی زندگی کی شکل اختیار کرے گا۔

۲۔ یہ شرمناک اور قبیح عمل ہوس باز لوگوں کے درمیان طرح طرح کے جھگڑوں اور کشمکش کا باعث ہوگا، وہ واقعات جو بعض افراد نے بدنام محلوں اور غلط مراکز کی داخلی کیفیت کے بارے میں

لکھے ہیں ان سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جنسی بے راہ روی بدترین جرائم کو جنم دیتی ہے۔

۳۔ یہ بات علم اور تجربہ نے ثابت کر دی ہے کہ زنا طرح طرح کی بیماریاں پھیلانے کا سبب بنتا ہے، چنانچہ اسی بنا پر اس کے بُرے نتائج کی روک تھام کے لئے آج کے دور میں بہت سے اداروں کی بنا رکھی گئی ہے اور بہت سے اقدامات کئے گئے ہیں، مگر اس کے باوجود اعداد و شمار نشاندہی کرتے ہیں، بہت سے افراد اس راستہ میں اپنی صحت و سلامتی کھو بیٹھے ہیں۔

۴۔ اکثر اوقات یہ عمل اسقاط حمل، قتل اولاد اور نسل کے قطع ہونے کا سبب بنتا ہے کیونکہ ایسی عورتیں ایسی اولاد کی نگرانی کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوتیں، اصولاً ورروان کے لئے ایسا منحوس عمل جاری رکھنے میں بہت بڑی رکاوٹ ہوتی ہے، لہٰذا وہ ہمیشہ سے پیچھے سے ختم کر دینے کی کوشش کرتی ہیں۔

یہ فرضیہ بالکل خیال خام ہے کہ ایسی اولاد حکومت کے زیر اہتمام چلنے والے اداروں میں رکھی جا سکتی ہے کیونکہ اس فرض کی ناکامی عملی طور پر واضح ہو چکی ہے اور ثابت ہو چکا ہے کہ اس صورت میں بن باپ کی اولاد کی پرورش کس قدر مشکلات کا باعث ہے، اور نتیجتاً بہت ہی نامطلوب اور غیر پسندیدہ ہے، ایسی اولاد سنگدل، مجرم، بے حیثیت اور ہر چیز سے عاری ہوتی ہے۔

۵۔ اس بات کو یاد رکھنا چاہئے کہ شادی بیاہ کا مقصد صرف جنسی تقاضے پورے کرنا نہیں ہے بلکہ ایک مشترکہ زندگی کی تشکیل، روحانی محبت، فکری سکون، اولاد کی تربیت اور زندگی کے ہر موڑ پر ایک دوسرے کی ہر ممکن مدد کرنا شادی کے نتائج میں سے ہیں، اور ایسا بغیر اس کے نہیں ہو سکتا کہ عورت اور مرد ایک دوسرے سے مخصوص ہوں اور عورتیں دوسروں پر حرام ہوں۔

حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام ایک حدیث میں فرماتے ہیں ''میں نے پیغمبر اکرمؐ سے سنا کہ آپ نے فرمایا زنا کے چھ بُرے اثرات ہیں، ان میں سے تین دنیا سے متعلق ہیں اور تین آخرت سے:

دنیوی بُرے اثرات یہ ہیں کہ یہ عمل، انسان کی نورانیت کو چھین لیتا ہے، روزی منقطع

کر دیتا ہے اور موت کو نزدیک کر دیتا ہے۔

اور اُخروی آثار یہ ہیں کہ یہ عمل پروردگار کے غضب، حساب و کتاب میں سختی اور آتش جہنم میں داخل ہونے (یا اس میں دوام) کا سبب بنتا ہے۔(۱)(۲)

(۱) مجمع البیان، جلد ۶، صفحہ ۳۱۴

(۲) تفسیر نمونہ، جلد ۲، صفحہ ۳۰

۸۵۔ ہم جنس بازی کی حرمت کا فلسفہ کیا ہے؟

اگرچہ مغربی دنیا میں جہاں جنسی بے راہ روی بہت زیادہ رائج ہے ایسی برائیوں سے نفرت نہیں کی جاتی، یہاں تک کہ سننے میں آیا ہے کہ بعض ممالک مثلاً برطانیہ میں پارلیمنٹ نے اس کام کو نہایت بے شرمی سے قانونی جواز دے دیا ہے، لیکن ان برائیوں کے عام ہونے سے ان کی برائی اور قباحت میں ہرگز کوئی کمی نہیں آتی، اور اس کے اخلاقی، نفسیاتی اور اجتماعی مفاسد اپنی جگہ پر ثابت ہیں۔

بعض اوقات مادی مکتب کے بعض پیرو جو اس قسم کی آلودگیوں میں مبتلا ہیں اپنے عمل کی توجیہ کرنے کے لئے کہتے ہیں کہ اس میں طبی نکتہ نظر سے کوئی خرابی نہیں ہے لیکن وہ یہ بات بھول چکے ہیں کہ اصولی طور پر ہر قسم کا جنسی انحراف انسانی وجود کے تمام ڈھانچے پر اثر انداز ہوتا ہے اور اس کا اعتدال درہم وبرہم کر دیتا ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ انسان فطری اور طبیعی طور پر صنف مخالف کی طرف زیادہ میلان رکھتا ہے اور یہ میلان انسانی فطرت میں بہت مضبوط جڑیں رکھتا ہے اور انسانی نسل کی بقا کا ضامن ہے، ہر وہ کام جو طبیعی میلان سے ہٹ کر انجام پذیر ہوتا ہے وہ انسان میں ایک قسم کی بیماری اور نفسیاتی انحراف پیدا کرتا ہے۔

وہ مرد جو جنس موافق کی طرف میلان رکھتا ہے اور وہ مرد جو اپنے کو اس کام کے لئے پیش کرتا ہے ہرگز کامل مرد نہیں ہے، جنسی امور کی کتاب میں ہم جنس بازی کو ایک اہم ترین انحراف قرار دیا گیا ہے۔

اگر یہ سلسلہ جاری رہے تو انسان میں جنس مخالف کا میلان آہستہ آہستہ ختم ہو جاتا ہے اور اس کام کے مفعول میں آہستہ آہستہ زنانے احساسات پیدا ہونے لگتے ہیں اور دونوں میں بہت زیادہ جنسی ضعف پیدا ہوتا ہے جسے اصطلاح کے مطابق ''سرد مزاجی'' کہا جاتا ہے، اس طرح سے کہ ایک مدت کے بعد وہ (جنس مخالف سے) طبیعی اور فطری ملاپ کرنے پر قادر نہیں رہتے۔

اس چیز کے پیش نظر کہ مرد اور عورت کے جنسی احساسات جہاں ان کے بدن کے ارگانیزم (Organism) میں موثر ہیں وہاں ان کے روحانی اور مخصوص اخلاقی پہلوؤں پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں، یہ بات واضح ہے کہ طبیعی اور فطری احساسات سے محروم ہو کر انسان کے جسم اور روح پر کس قدر ضرب پڑتی ہے، یہاں تک کہ ممکن ہے کہ اس طرح کے انحراف میں مبتلا افراد اس قدر سرد مزاجی کا شکار ہو جائیں کہ پھر اولاد پیدا کرنے کی طاقت سے بھی محروم ہو جائیں۔

اس قسم کے افراد عموماً نفسیاتی طور پر صحیح و سالم نہیں ہوتے اور اپنی ذات میں اپنے آپ سے ایک طرح کی بیگانگی محسوس کرتے ہیں اور جس معاشرہ میں رہتے ہیں اس سے خود کو لاتعلق سا محسوس کرنے لگتے ہیں، ایسے افراد قوت ارادی جو ہر قسم کی کامیابی کی شرط ہے آہستہ آہستہ کھو بیٹھتے ہیں اور ان کی روح میں حیرانی و سرگردانی آشیانہ بنا لیتی ہے۔

ایسے افراد اگر جلد اپنی اصلاح کا ارادہ نہ کریں بلکہ لازمی طور پر جسمانی اور روحانی طبیب سے مدد نہ لیں اور یہ عمل ان کی عادت میں شامل ہو جائے تو اس بری عادت کا ترک کرنا مشکل ہو جائے گا، بہر حال اگر مصمم ارادہ کر لیا جائے تو کسی بھی حالت میں اس عادت کو ترک کرنے میں دیر نہیں لگتی، بہر صورت مستحکم ارادہ ہونا ضروری ہے۔

بہر حال نفسیاتی سرگردانی انھیں آہستہ آہستہ منشیات اور شراب کی طرف لے جاتی ہے اور ایسے لوگ مزید اخلاقی انحراف کا شکار ہو جاتے ہیں، یہ ایک اور بڑی بدبختی ہے۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ اسلامی روایت میں مختصر اور پُرمعنی عبارات کے ذریعہ ان مفاسد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ان میں، ایک روایت حضرت امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے، کسی نے امام علیہ السلام سے سوال کیا خدانے لواط کو کیوں حرام کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا ''اگر لڑکوں سے ملاپ حلال ہوتا تو مرد عورتوں سے بے نیاز ہو جاتے (اور ان کی طرف مائل نہ ہوتے) اور یہ چیز نسلِ انسانی کے منقطع ہونے کا باعث بنتی، اور جنس مخالف سے فطری ملاپ کے ختم ہونے کا باعث بنتی، اور یہ کام بہت سی اخلاقی اور اجتماعی خرابیوں کا سبب بنتا۔(۱)

یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ اسلام ایسے افراد کے لئے جن سزاؤں کا قائل ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ فاعل پر مفعول کی بہن، ماں اور بیٹی سے نکاح حرام ہے یعنی اگر یہ کام نکاح سے پہلے ہو تو یہ عورتیں اس کے لئے ہمیشہ کے لئے حرام ہو جاتی ہیں۔(۲)

---

(۱)وسائل الشیعہ ،جلد ۱۴ ،صفحہ ۲۵۲

(۲)تفسیر نمونہ، جلد ۹، صفحہ ۹۴

۸۶۔ شراب کی حرمت کا فلسفہ کیا ہے؟

انسان کی عمر پر شراب کا اثر

ایک مغربی دانشور کا کہنا ہے کہ ۲۰ رسے ۲۳ رسالہ جوانوں میں ۵ رفی صد شراب کے عادی مرجاتے ہیں جبکہ شراب نہ پینے والوں میں سے ۱۰ رافراد بھی نہیں مرتے۔

ایک دوسرے مشہور دانشور نے کہا: بیس سالہ جوان جن کے بارے میں ۵۰ رسال تک زندہ رہنے کی توقع کی جاتی ہے وہ شراب کی وجہ سے ۳۵ رسال سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتے۔

بیمہ کمپنیوں کے تجربات سے ثابت ہو چکا ہے کہ شرابیوں کی عمر دوسروں کی نسبت ۲۵ رسے ۳۰ رفیصد کم ہوتی ہے۔ ایک دوسرے اعداد وشمار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شرابیوں کی وسط عمر ۳۵ رسے ۵۰ رسال ہے، جبکہ اصول صحت کا یہ اوسط ۶۰ رسال سے زیادہ ہے۔

انسانی نسل میں شراب کی تاثیر

انعقاد نطفہ کے وقت اگر مرد نشہ میں تو ''الکلیسم حاد'' (Alcoalism) کی ۳۵ رفیصد بیماریاں بچہ میں منتقل ہوتی ہیں اور اگر مرد و عورت دونوں نشہ میں ہوں تو ''الکلیسم حاد'' (Alcoalism) کی سو فیصد بیماریاں بچہ میں ظاہر ہوتی ہیں، اس بنا پر اولاد کے بارے میں شراب کی تاثیر پر زیادہ توجہ دینا ضروری ہے، ہم یہاں کچھ مزید اعداد وشمار پیش کرتے ہیں

طبعی وقت سے پہلے پیدا ہونے والے بچوں میں ۴۵/ فیصد ماں باپ دونوں کی شراب نوشی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں، ۳۱/ فیصد ماں کی شراب نوشی کے باعث ہوتے ہیں اور ۱۷/ فیصد باپ کے شرابی ہونے کی وجہ سے، پیدائش کے وقت زندگی کی توانائی سے عاری سو بچوں میں ۹ شرابی باپ کی وجہ سے اور ۴۵/ فیصد شرابی ماں کی وجہ سے ایسے ہوتے ہیں، شرابی ماں کی وجہ سے ۷۵ فیصد اور شرابی باپ کی وجہ سے ۴۵ فیصد بچے پست قد پیدا ہوتے ہیں شرابی ماؤں کی وجہ سے ۷۵ فیصد اور شرابی باپ کی وجہ سے بھی ۷۵ فیصد بچے کافی عقلی اور روحانی طاقت سے محروم ہوتے ہیں۔

اخلاق پر شراب کا اثر

شرابی شخص گھر والوں سے ہمدردی اور اہل وعیال سے کم محبت کرتا ہے بارہا دیکھا گیا ہے کہ شرابی باپ نے اپنی اولاد کو قتل کر دیا۔

شراب کے اجتماعی نقصانات

ایک انسٹیٹیوٹ کے ڈاکٹر کے مہیا کردہ اعداد وشمار کے مطابق ۱۹۶۱ء میں ''نیویارک'' شہر کے شرابیوں کے اجتماعی جرائم کچھ اس طرح ہیں

عام قتل ۵۰ فی صد

مار پیٹ اور زخم وارد کرنے کے جرائم ۷۷/۸ فیصد

جنسی جرائم ۸۸/۸ فیصد۔

ان اعداد وشمار سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑے بڑے جرائم زیادہ تر نشہ کی حالت میں انجام پاتے ہیں۔

شراب کے اقتصادی نقصانات

نفسیاتی امراض کے ایک ڈاکٹر کا کہنا ہے ''افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ حکومتیں

شراب کے ٹیکس اور منافع کا حساب تو کرتی ہیں لیکن ان اخراجات کو نظر میں نہیں رکھتی جو شراب کے بُرے اثرات کی روک تھام پر ہوتے ہیں، نفسیاتی بیماریوں کی زیادتی، ایسے بُرے معاشرہ کے نقصانات، قیمتی اوقات کی بربادی، حالت نشہ میں ڈرائیورنگ حادثات، پاک نسلوں کی تباہی، سستی، بے راہ روی، ثقافت و تمدن کی پسماندگی، پولیس کی زحمتیں اور گرفتاری، شرابیوں کی اولاد کے لیے پرورش گاہیں اور ہسپتال، شراب سے متعلقہ جرائم کے لیے عدالتوں کی مصروفیات، شرابیوں کے لیے قید خانے مختصر یہ کہ اگر شراب نوشی سے ہونے والے دیگر نقصانات کو جمع کیا جائے تو حکومتوں کو معلوم ہوگا کہ وہ آمدنی جو شراب سے ہوتی ہے وہ مذکورہ نقصانات کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں ہے۔

ان کے علاوہ شراب نوشی کے افسوسناک نتائج کا موازنہ صرف ڈالروں سے نہیں کیا جا سکتا بلکہ احساسات کی موت، گھروں کی تباہی، آرزوؤں کی بربادی اور صاحبان فکر فرد کی ذہنی صلاحیتوں کا نقصان، یہ سب کچھ پیسے کے مقابل نہیں لائے جا سکتے۔

خلاصہ یہ کہ شراب کے نقصانات اتنے زیادہ ہیں کہ ایک دانشور کے بقول اگر حکومتیں یہ ضمانت دیں کہ وہ شراب خانوں کا آدھا دروازہ بند کر دیں تو یہ ضمانت دی جا سکتی ہے کہ ہم آدھے ہسپتالوں اور آدھے پاگل خانوں سے بے نیاز ہو جائیں گے۔

اگر شراب کی تجارت میں نوع بشر کے لیے کوئی فائدہ ہو یا فرض کریں کہ چند لمحوں کے لیے انسان اس کی وجہ سے اپنے غموں سے بے خبر ہو جاتا ہے تب بھی اس کا نقصان کہیں زیادہ، بہت وسیع ہے کہ اس کے فوائد اور نقصانات کا آپس میں موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ ( )

ہم یہاں پر ایک اور نکتہ کا ذکر کرنا مناسب سمجھتے ہیں، یہ نکتہ مختلف اعداد و شمار کا ایک مجموعہ ہے جن میں سے ہر ایک تفصیلی بحث کا محتاج کرتا ہے جس سے شراب کے نقصانات کا اندازہ ہوتا ہے۔

( ) تفسیر نمونہ، جلد دوم، صفحہ [illegible]

۱۔ برطانیہ میں شرابیوں کے دیوانہ پن کے سلسلہ میں ایک اعداد و شمار کے مطابق اس جنون کا دوسرے جنونوں سے موازنہ کیا گیا تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۲۲۴۹/ دیوانوں میں سے صرف ۵۳ دیوانے دوسری وجوہات کی بنا پر دیوانگی کا شکار ہوئے ہیں، اور باقی سب شراب کی وجہ سے دیوانہ ہوئے ہیں۔(۱)

۲۔ امریکہ کے ہسپتالوں کے ایک اعداد و شمار کے مطابق نفسیاتی بیماروں میں ۸۵ فی صد صرف شرابی تھے۔(۲)

۳۔ برطانوی دانشور "دنتم" لکھتا ہے: شراب، انسان کے اندر شمالی ممالک میں کم عقلی اور بے ذوقی اور جنوبی ممالک میں اس کے بعد دیوانہ پن پیدا کرتی ہے، اس کے بعد کہتا ہے کہ اسلامی قوانین نے ہر طرح کی شراب کو حرام قرار دیا ہے، اور یہ اسلام کا ایک امتیاز ہے۔"(۳)

۴۔ اگر ان لوگوں کے اعداد و شمار کو جمع کیا جائے جنھوں نے نشہ کی حالت میں خودکشی، ظلم و جنایت، گھروں کی بربادی اور عورتوں کی عصمت دری کی ہے تو واقعاً انسان کے ہوش اڑ جائیں گے۔(۴)

۵۔ فرانس میں ہر روز ۴۴۰/ لوگ شراب پر اپنی جان قربان کرتے ہیں۔(۵)

۶۔ امریکہ کے ہسپتالوں میں نفسیاتی بیماریوں کی وجہ سے ایک سال میں مرنے والوں کی تعداد "دوسری عالمی جنگ" کے دو برابر ہے، امریکہ میں ڈاکٹروں کے کہنے کے مطابق نفسیاتی بیماریوں میں "شراب" اور "سگریٹ" بنیادی وجہ ہے۔(۶)

۷۔ "ماہنامہ علوم اجتماعی" کی بیسویں سالگرہ کی مناسبت سے "ہوگر" نامی دانشور کے اعداد و

---

(۱) کتاب مسیو ریوم الکل، صفحہ ۶۵

(۲) کتاب مسیو ریوم الکل، صفحہ ۶۵

(۳) تفسیر طنطاوی، جلد دوم، صفحہ ۲۶۵

(۴) دائرۃ المعارف فرید وجدی، جلد ۳، صفحہ ۹۰۔

(۵) بلاہای اجتماعی قرن ما، صفحہ ۲۰۵

(۶) مجموعہ منشورات جوان

شمار کے مطابق ۶۰ رفی صد عمدی قتل، ۷۵ر فی صد مار پیٹ اور زخمی کرنا، ۳۰ر فیصد اخلاقی جرائم (بجملہ ماں بہن کے ساتھ زنا!) ۲۰ رفی صد چوری شرابی پینے والوں سے متعلق ہیں، دوسرا سی دانشور کی تحقیق کے مطابق ۴۰ر فیصد مجرم بچوں میں شرب کا سابقہ پایا جاتا ہے۔ ( )

۸۔ اقتصادی لحاظ سے صرف برطانیہ میں شراب پینے والے مدرزمین کی غیر حاضری کی وجہ سے ۵۰ ملین ڈالر [225 000 000 روپیہ] کا نقصان ہوا ہے، جس رقم سے بچوں کے لئے بڑے دس اسکول اور کالج بنائے جا سکتے ہیں۔ (۲)

۹۔ فرانس میں ایک عدد و شمار کے مطابق شرب کی وجہ سے ہونے والے نقصانات کی شرح اس طرح ہے شراب کی وجہ سے ۱۳۷ ارب فرانک فرانس کے بجٹ میں اضافہ کرنا پڑا:

۶۰ ارارب فرانک، کورٹ اور قید خانوں کا خرچ۔

۴۰ ارارب فرانک، عمومی فائدہ مند امور کے لئے تعاون۔

۱۰ ارارب فرانک، شرابیوں کے ہسپتالوں کا خرچ۔

۷۰ ارارب فرانک، اجتماعی امنیت کے لئے خرچ۔

اس لحاظ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ روحانی بیماروں، ہسپتالوں، قتل و غارت، لڑائی جھگڑوں، چوری اور ایکسیڈنٹ وغیرہ کی تعداد براہ راست شراب خانوں کی تعداد سے متعلق ہے۔ (۳)(۴)

---

(۱) کتاب سیود یوم الکل، صفحہ ۲۶

(۲) مجموعہ انتشارات نسل جواں، سال دوم صفحہ ۳۳

(۳) نشریہ مرکز مطالعہ پیشرفت کی ایران (دربارہ الکل و قمار)

(۴) تفسیر نمونہ جلد ۵، صفحہ ۷۷

۸۷۔ محارم سے شادی کی حرمت کا فلسفہ کیا ہے؟

جیسا کہ ہم قرآن مجید میں پڑھتے ہیں:

﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ وَعَمَّاتُكُمْ وَخَالَاتُكُمْ وَبَنَاتُ الْأَخِ وَبَنَاتُ الْأُخْتِ وَأُمَّهَاتُكُمُ اللَّاتِي أَرْضَعْنَكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ مِنَ الرَّضَاعَةِ وَأُمَّهَاتُ نِسَائِكُمْ وَرَبَائِبُكُمُ اللَّاتِي فِي حُجُورِكُمْ مِنْ نِسَائِكُمُ اللَّاتِي دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَإِنْ لَمْ تَكُونُوا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ وَحَلَائِلُ أَبْنَائِكُمُ الَّذِينَ مِنْ أَصْلَابِكُمْ وَأَنْ تَجْمَعُوا بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا﴾(۱)

''تمہارے اوپر تمہاری مائیں، بیٹیاں، بہنیں، پھوپھیاں، خالائیں، بھتیجیاں، بھانجیاں، وہ مائیں جنھوں نے تمہیں دودھ پلایا ہے تمہاری رضاعی (دودھ شریک) بہنیں، تمہاری بیویوں کی مائیں، تمہاری پروردہ عورتیں جو تمہاری آغوش میں ہیں اور ان عورتوں کی اولاد جن سے تم نے دخول کیا ہے، ہاں اگر دخول نہیں کیا ہے تو کوئی حرج نہیں ہے، اور تمہارے فرزندوں کی بیویاں جو فرزند تمہارے صلب سے ہیں اور دو بہنوں کا ایک ساتھ جمع کرنا سب حرام کردیا گیا ہے، علاوہ اس کے جو اس سے پہلے ہو چکا ہے کہ خدا بہت بخشنے والا اور مہربان ہے''۔

(۱) سورۂ نساء، آیت ۲۳

اس آیۂ شریف میں یہ بیان ہوا کہ محرم عورتیں کون کون ہے جن سے شادی کرنا حرام ہے، اور اس لحاظ سے تین طریقوں سے محرمیت پیدا ہوسکتی ہے

۱۔ ولادت کے ذریعہ، جس کو "نسبی رشتہ" کہا جاتا ہے۔

۲۔ شادی بیاہ کے ذریعہ، جس کو "سببی رشتہ" کہا جاتا ہے۔

۳۔ دودھ پلانے کے ذریعہ، جس کو "رضاعی رشتہ" کہتے ہیں۔

پہلے نسبی محارم کا ذکر کیا گیا ہے جن کی سات قسمیں ہیں، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے

﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ وَاَخَوَاتُكُمْ وَعَمَّاتُكُمْ وَخَالَاتُكُمْ وَبَنَاتُ الْاَخِ وَبَنَاتُ الْاُخْتِ﴾

"تمہارے اوپر تمہاری مائیں، بیٹیاں، بہنیں، پھوپھیاں، خالائیں، بھتیجیاں، بھانجیاں حرام ہیں"۔

یہاں پر یہ توجہ رہے کہ ماں سے مراد صرف وہ ماں نہیں ہے جس سے انسان پیدا ہوتا ہے، بلکہ دادی، پردادی، نانی اور پرنانی کو بھی شامل ہے، اسی طرح بیٹیوں سے مراد اپنی بیٹی مراد نہیں ہے بلکہ، پوتی اور نواسی ورن کی بیٹیاں بھی شامل ہیں، اسی طرح دوسری پانچ قسموں میں بھی ہے۔

یہ بات یونہی واضح ہے کہ سبھی اس طرح کی شادیوں سے نفرت کرتے ہیں اسی وجہ سے تمام قوم وملت (کم لوگوں کے علاوہ) محارم سے شادی کو حرام جانتے ہیں، یہاں تک کہ مجوسی جو اپنی کتابوں میں محارم سے شادی کو جائز مانتے تھے، لیکن آج کل وہ بھی انکار کرتے ہیں۔

اگرچہ بعض لوگوں کی کوشش یہ ہے کہ اس موضوع کو ایک پرانی رسم ورواج تصور کریں، لیکن ہم یہ بات جانتے ہیں کہ تمام نوع بشر میں قدیم زمانہ سے ایک عام قانون کا پایا جانا اس کے فطری ہونے کی عکاسی کرتا ہے، کیونکہ رسم ورواج ایک عام اور دائمی صورت میں نہیں ہوسکتا۔

اس کے علاوہ آج یہ حقیقت ثابت ہوچکی ہے کہ ہم خون کے ساتھ شادی کرنے میں بہت

سے نقصانات پائے جاتے ہیں یعنی پوشیدہ، اور موروثی بیماریاں ظاہر اور شدید ہو جاتی ہیں، (نہ یہ کہ خود ان سے بیماری پیدا ہوتی ہے) یہاں تک کہ بعض محارم کے علاوہ دیگر رشتہ داری میں شادی کو اچھا نہیں مانتے جیسے دو بھائیوں کی لڑکی لڑکا شادی کریں، دانشوروں کا ماننا ہے کہ اس طرح کی شادیوں میں ،رثی بیماریوں میں شدت پیدا ہوتی ہے(۱) لیکن یہ مسئلہ دور کی رشتہ داریوں میں کوئی مشکل پیدا نہیں کرتا (جیسا کہ معمولاً نہیں کرتا) البتہ قریبی رشتہ داری [یعنی ایک خون] میں بہت سی مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔

اس کے علاوہ محارم کے درمیان معمولاً جنسی جذبیت اور کشش نہیں پائی جاتی کیونکہ غالباً محارم ایک ساتھ بڑے ہوتے ہیں، اور ایک دوسرے کے لئے عام طریقہ سے ہوتے ہیں، مگر بعض نادر اور استثنائی موارد میں جن کو عام قوانین کا معیار نہیں بنایا جا سکتا، اور یہ بات بھی مسلم ہے کہ جنسی خواہشات شادی بیاہ کے برقرار رہنے کے لئے ضروری ہے، لہٰذا اگر محارم کے ساتھ شادی ہو بھی جائے تو ناپائیدار اور غیر مستحکم ہوگی۔

اس کے بعد رضاعی محارم کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے ﴿وَأُمَّهَاتُكُمُ اللاَّتِي أَرْضَعْنَكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ مِنَ الرَّضَاعَةِ﴾ ”وہ مائیں جنھوں نے تمھیں دودھ پلایا ہے، اور تمہاری رضاعی (دودھ شریک) بہنیں تم پر حرام ہیں“۔

اگرچہ آیت کے اس حصہ میں صرف رضاعی ماں اور بہن کی طرف اشارہ ہوا ہے لیکن متعدد روایات معتبر کتابوں میں موجود ہیں جن میں بیان ہوا ہے کہ رضاعی محرم صرف انھیں دو میں منحصر

---

(۱) اسلام نے چچا زاد بھائی بہن میں شادی کو حرام قرار نہیں دیا ہے کیونکہ ان کی شادی محارم سے شادی کی طرح نہیں ہے، اور اس طرح کی شادیوں میں خطرہ کم پایا جاتا ہے، اور ہم نے اس طرح کی بہت سی شادی دیکھی ہیں جن کے بچے صحیح و سالم ہیں اور استعداد و صلاحیت کے لحاظ سے بھی کوئی مشکل نہیں ہے

نہیں ہے بلکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مشہور و معروف حدیث کے پیش نظر دوسرے افراد میں شامل ہیں، جیسا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا "یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب" (یعنی تمام وہ فرد جو نسب کے ذریعہ حرام ہوتے ہیں (رضاعت) دودھ کے ذریعہ بھی حرام ہو جاتے ہیں)

البتہ محرمیت ایجاد ہونے کے لئے کتنی مقدار میں دودھ پلایا جائے اس کی کیفیت کیا ہونی چاہئے اس کی تفصیل کے لئے فقہی کتابوں [یا توضیح المسائل وغیرہ] کا مطالعہ فرمائیں۔

رضاعی محارم کی حرمت کا فلسفہ یہ ہے کہ دودھ کے ذریعہ انسان کے گوشت اور ہڈیاں مضبوط ہوتی ہیں لہٰذا اگر کوئی عورت کسی بچہ کو دودھ پلاتی ہے تو وہ اس کی اولاد جیسی ہو جاتی ہے، مثال کے طور پر اگر کوئی عورت کسی بچہ کو ایک مخصوص مقدار میں دودھ پلائے تو اس دودھ سے اس بچہ کے بدن میں رشد و نمو ہوتا ہے جس سے اس بچہ اور اس عورت کے بچوں میں شباہت پیدا ہوتی ہے، دراصل دونوں اس عورت کے بدن کا ایک حصہ شمار ہوں گے جس طرح دو نسبی بھائی۔

اس کے بعد قرآن مجید نے محارم کی تیسری قسم کی طرف اشارہ کیا ہے اور اس کو چند عنوان کے تحت بیان کیا ہے:

۱۔ **وَ اُمَّهَاتُ نِسَائِكُمْ** "تمہاری بیویوں کی مائیں" یعنی جب انسان کسی عورت سے نکاح کرتا ہے اور صیغہ عقد جاری کرتا ہے تو اس عورت کی ماں، اور اس کی ماں کی ماں اس پر ہمیشہ کے لئے حرام ہو جاتی ہیں۔

۲۔ **﴿وَرَبَائِبُكُمُ اللَّاتِي فِي حُجُورِكُمْ مِنْ نِسَائِكُمُ اللَّاتِي دَخَلْتُمْ بِهِنَّ﴾** "تمہاری پروردہ لڑکیاں جو تمہاری آغوش میں ہیں یعنی تمہاری ان بیویوں کی اولاد جن سے تم نے دخول کیا ہے، وہ تم پر حرام ہیں" گویا اگر کسی عورت سے صرف نکاح کیا ہے اور اس کے ساتھ ہمبستری نہیں کی اور اس عورت کی پہلے شوہر سے کوئی لڑکی ہو تو وہ حرام نہیں ہوگی مگر اس بیوی سے ہمبستری کی ہو تو اس صورت میں وہ لڑکی بھی حرام ہو جائے گی، یہاں اس قید کا ہونا اس بات کی تائید

کرتا ہے کہ ساس (خوش دامن) کے سلسلہ میں یہ شرط نہیں ہے [کیونکہ خوشدامن اس صورت میں حرام ہوتی ہے کہ جب بیوی کے ساتھ ہمبستری کی ہو] لہٰذا وہاں حکم مطلق ہے یعنی چاہے اپنی بیوی سے ہمبستری کی ہو یا نہ کی ہو ہر صورت میں ساس حرام ہے۔

اگر چہ "فِی حُجُورِکُمْ" کی ظاہری قید (یعنی تمہارے گھر میں ہو) سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اگر بیوی کے پہلے شوہر سے لڑکی ہو، اور وہ تمہارے گھر میں پرورش نہ پائے تو وہ اس صورت میں حرام نہیں ہے، لیکن دوسری روایت کے قرینہ اور اس حکم کے قطعی ہونے کی بنا پر یہ "قید احترازی" نہیں ہے، [یعنی یہ قید موضوع کو محرز اور معین کرنے کے لئے نہیں ہے] بلکہ اس سے حرمت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ اس جیسی لڑکیوں کی عمر کم ہوتی ہے جن کی مائیں دوبارہ شادی کرتی ہیں اور وہ معمولاً سوتیلے باپ کی گھر میں اس کی لڑکیوں کی طرح پرورش پاتی ہیں، آیہ شریفہ کہتی ہے کہ دراصل یہ تمہاری بیٹیوں کی طرح ہیں، کیا کوئی اپنی بیٹی سے شادی کرتا ہے؟! چنانچہ اسی وجہ سے انھیں "ربیبہ" کہا گیا ہے جس کے معنی پرورش پانے والی ہے۔

اس حصہ میں اس کی مزید تاکید ہوتی ہے کہ اگر اس زوجہ سے ہمبستری نہ کی ہو تو ان کی لڑکیاں تم پر حرام نہیں ہیں، ﴿فَإِنْ لَمْ تَکُونُوا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَاجُنَاحَ عَلَیْکُمْ﴾

۳۔ ﴿وَحَلَائِلُ (۱) أَبْنَائِکُمُ الَّذِینَ مِنْ أَصْلَابِکُمْ﴾ "اور تمہارے فرزندوں کی بیویاں جو فرزند تمہارے صلب سے ہیں"

دراصل "مِنْ أَصْلَابِکُمْ" (تمہارے صلب سے ہونے) کی قید دورِ جاہیت کی ایک غلط رسم کو ختم کرنے کے لئے ہے کیونکہ اس زمانہ میں رائج تھا کہ بعض افراد کو اپنا بیٹا بنا لیتے تھے، یعنی اگر

---

(۱) "حلائل" جمع "حلیلہ" مادہ "حل" سے ہے اور اس سے وہ عورت مراد ہے جو انسان پر حلال ہے، یا مادہ "حلول" سے ہے جس سے مراد وہ عورت ہے جو ایک انسان کے پاس ایک ساتھ زندگی گزارتی ہو اور اس سے جنسی تعلقات رکھتی ہو

کوئی کسی دوسرے کے بیٹے کو بنا بیٹا بنا ئے تو اس پر حقیقی بیٹے کے تمام احکام نافذ کیا کرتے تھے، اسی وجہ سے منھ بولے بیٹے کی بیوی سے نکاح نہیں کرتے تھے، لیکن اسلام نے منھ بولے بیٹے کو بیٹا قرار نہیں دیا اور اس غلط رسم اور رواج کو بے بنیاد قرار دیدیا۔

۳۔﴿وَأَنْ تَجْمَعُوا بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ﴾ ''اور تمہارے لئے دو بہنوں کا ایک ساتھ جمع کرنا حرام کردیا گیا ہے''، یعنی ایک وقت میں دو بہنوں کا رکھنا جائز نہیں ہے، لیکن اگر دو بہنوں سے مختلف زمانہ میں اور پہلی بہن کی جدائی کے بعد نکاح کیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

کیونکہ دور جاہلیت میں دو بہنوں کو ایک ساتھ رکھنے کا رواج تھا اور چونکہ بعض لوگ یہ کئے ہوئے تھے لہذا قرآن مجید میں اضافہ کیا گیا ﴿إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ﴾ ''علاوہ اس کے جو اس سے پہلے ہو چکا ہے''، یعنی یہ حکم (دوسرے احکام کی طرح) گزشتہ پر عطف نہیں کیا جائے گا اور جن لوگوں نے اس حکم کے نازل ہونے سے پہلے ایسا کیا ہے ان کو کوئی سزا نہیں دی جائے گی اگرچہ اب ان دونوں میں سے ایک بیوی کا انتخاب کرے اور دوسری کو آزاد کردے۔

اور شاید اس طرح کی شادی سے روکنے کا راز یہ ہو کہ دو بہنیں نسبی لحاظ سے ایک دوسرے سے بہت زیادہ محبت اور تعلق رکھتی ہیں، لیکن جس وقت ایک دوسرے کی رقیب ہو جائیں تو پھر اس گزشتہ رابطہ کو محفوظ نہیں رکھ سکتیں، اس طرح ان کی ''محبت میں تضاد'' پیدا ہو جائے گا جو ان کی زندگی کے لئے نقصان دہ ہے، کیونکہ ''محبت'' اور ''رقابت'' میں ہمیشہ کشمکش اور مقابلہ پایا جاتا ہے۔ (۱)

---

(۱) تفسیر نمونہ، جلد ۳، صفحہ ۳۳۶

مختلف موضوعات

۸۸۔ خلقت انسان کا مقصد کیا ہے؟

یہ سوال اکثر افراد کے ذہن میں آتا ہے اور بہت سے لوگ یہ سوال کرتے بھی ہیں کہ ہماری خلقت کا مقصد کیا ہے؟ ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ لوگ دنیا میں پیدا ہوتے ہیں اور کچھ لوگ اس دنیا سے چل بستے ہیں اور ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جاتے ہیں، تو پھر اس آمد و رفت کا مقصد کیا ہے؟۔

اور اگر ہم تمام انسان اس دنیا میں نہ آتے تو کیا خرابی پیش آتی؟ اور کیا مشکل ہوتی؟ ہمیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ ہم اس دنیا میں کیوں آئے ہیں؟ اور کیوں اس دنیا سے چل بسے؟! اور اگر ہم اس مقصد کو سمجھنا چاہیں تو کیا ہم میں سمجھنے کی طاقت ہے؟ اس طرح اس سوال کے بعد انسان کے ذہن میں بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

یہ سوال جب مادیوں کی طرف سے کیا جائے تو ظاہراً کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ "مادہ" عقل و شعور نہیں رکھتا اسی وجہ سے انھوں نے اپنے کو آسودہ خاطر کر لیا ہے اور اس بات کے قائل ہیں کہ ہماری خلقت کا کوئی مقصد نہیں ہے! واقعاً کس قدر تعجب کی بات ہے کہ انسان اپنی زندگی میں چھوٹے چھوٹے کاموں کے لئے ہدف اور مقصد معین کرے اور اپنی زندگی کے لئے منصوبہ بندی کرے مثال کے طور پر تعلیم، کاروبار، ورزش اور علاج وغیرہ کے لئے انسان کا ایک مقصد ہو، لیکن اس تمام کے مجموعہ کو بے ہدف اور بے معنی شمار کیا جائے!

لہٰذا جائے تعجب نہیں ہے کہ جب یہ لوگ اپنی بے معنی اور بے مقصد زندگی کے درپیش مشکلات پر غور کرتے ہیں تو اپنی زندگی سے سیر ہو جاتے ہیں اور خودکشی کر لیتے ہیں۔

لیکن جب ایک خدا پرست انسان یہی سوال خود اپنے سے کرتا ہے تو لا جواب نہیں ہوتا، کیونکہ ایک طرف تو وہ جانتا ہے کہ اس کائنات کا خالق حکیم ہے لہٰذا اس کی خلقت کا کوئی مقصد ضرور ہوگا، اگرچہ ہمیں معلوم نہیں ہے، اور دوسری طرف جب انسان اپنے اعضاء وجوارح کے بارے میں غور وفکر کرتا ہے تو ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی مقصد کے لئے خلق ہوا ہے، نہ صرف دل ودماغ اور اعصاب جیسے اعضاء با مقصد خلق کئے گئے ہیں بلکہ ناخن، پلکیں اور انگلیوں کی لکیریں، ہتھیلی اور پیروں کی گہرائی وغیرہ ان سب کا ایک فلسفہ ہے جن کے بارے میں آج کل سائنس نے بھی تائید کی ہے۔

کتنے سادہ فکر لوگ ہیں کہ ان سب چیزوں کے لئے تو ہدف اور مقصد کے قائل ہیں لیکن ان تمام کے مجموعہ کو بے ہدف تصور کرتے ہیں!

واقعاً کس قدر سادہ لوحی ہے کہ ہم ایک شہر کی عمارتوں کے لئے تو منصوبہ بندی اور ہدف کے قائل ہوں لیکن پوری دنیا کو بے مقصد تصور کریں!

کیا یہ ممکن ہے کہ ایک انجینئر کسی عمارت کے کمروں، دروازوں، کھڑکیوں، ہال اور چمن کے لئے حساب وکتاب کے ساتھ اور خاص مقصد کے لئے بنائے لیکن ان تمام کے مجموعہ کا کوئی ہدف اور مقصد نہ ہو؟!

یہی تمام چیزیں ایک خدا پرست اور مومن انسان کو اطمینان دلاتی ہیں کہ اس کی خلقت کا ایک عظیم مقصد ہے، جس کے سلسلہ میں کوشش کی جائے اور علم وعقل کے ذریعہ اس مقصد کو حاصل کیا جائے۔

عجیب بات تو یہ ہے کہ خلقت کو بے ہدف بتانے والے لوگ سائنس کے سلسلہ میں مختلف نئی چیزوں کے لئے ایک ہدف رکھتے ہیں اور جب تک اس مقصد تک نہیں پہنچ جاتے سکون سے نہیں بیٹھتے، یہاں تک کہ بدن کے کسی حصے میں ایک غدے کو بے کار اور بے مقصد ماننے کے لئے تیار

نہیں ہیں، اور اس کے فلسفہ کے لئے برسوں تحقیق اور آزمائش کرتے ہیں، لیکن جس وقت انسان کی خلقت کی بات آتی ہے تو واضح طور پر کہتے ہیں کہ انسان کی خلقت کا کوئی مقصد نہیں ہے![1]

واقعاً ان باتوں میں کس قدر تضاد و اختلاف پایا جاتا ہے؟!

بہر حال، ایک طرف حکمت خدا پر ایمان اور دوسری طرف انسان کے اعضاء و جوارح کے فلسفہ پر توجہ، انسان کو یقین کی منزل تک پہنچا دیتی ہیں کہ انسان کی خلقت کا ایک عظیم مقصد ہے۔

اب ہمیں اس ہدف کو تلاش کرنا چاہئے اور جہاں تک ممکن ہو اس ہدف کو معین کریں اور اس راستہ میں قدم بڑھائیں۔

ایک بنیادی نکتہ پر توجہ کرنے سے ہمیں راستہ میں روشنی ملتی ہے۔

ہم ہمیشہ اپنے کاموں میں ایک ہدف اور مقصد رکھتے ہیں، عام طور پر یہ ہدف ہماری کمیوں کو ختم اور ضرورتوں کو پورا کرتا ہے، یہاں تک کہ اگر کسی پریشان حال کی مدد کرتے ہیں یا اس کو مشکلات سے نجات دیتے ہیں یا اگر کسی کے لئے ایثار وقربانی کرتے ہیں تو یہ بھی ایک طرح سے معنوی خامیوں کو برطرف کرنے کے لئے ہے، جس سے ہماری روحانی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔

اور چونکہ خداوند عالم کی صفات اور اس کے افعال کو معمولاً ہم اپنے سے موازنہ کرتے ہیں، جس کی وجہ سے یہ تصور ذہن میں آسکتا ہے کہ خدا کے پاس کیا چیز کم تھی جو انسان کی خلقت سے پوری ہوجاتی؟! اور اگر قرآنی آیات میں پڑھتے ہیں کہ انسان کی خلقت کا ہدف عبادت خداوندی ہے، تو اسے ہماری عبادت کی کیا ضرورت تھی؟

حالانکہ یہ طرز فکر اسی وجہ سے ہے کہ صفات خالق کو صفات مخلوق اور صفات واجب الوجود کا ممکن الوجود سے موازنہ کرتے ہیں۔

ہمارا وجود چونکہ محدود ہے تو اپنی کمی اور خامی کو دور کرنے کے لئے کوشش کرتے ہیں اور ہمارے اعمال بھی اسی راہ کا ایک قدم ہوتے ہیں، لیکن ایک نامحدود وجود کے لئے یہ معنی ممکن نہیں ہے،

لہٰذا اس کے افعال کے مقصد کو اس کے وجود کے علاوہ تلاش کریں۔

وہ چشمۂ فیاض اور ایسا نعمت آفرین مبدء ہے جس نے تمام موجودات کو اپنے سایۂ رحمت میں جگہ دے رکھی ہے اور ان کی پرورش کرتا ہے، ان کی کمی اور خامی کو دور کرتا ہے اور کمال کی منزل پر پہنچانا چاہتا ہے، اور یہی عبادت اور بندگی کا حقیقی ہدف اور مقصد ہے، اور یہی عبادات اور دعا کا فلسفہ ہے جو ہماری تربیت اور تکامل وترقی کے لئے ایک درس گاہ ہے۔

لہٰذا ہم یہ نتیجہ حاصل کرتے ہیں کہ ہماری خلقت کا مقصد ہماری ترقی اور کمال ہے۔

بنیادی طور پر اصل خلقت ایک عظیم الشان تکاملی وارتقائی قدم ہے، یعنی کسی چیز کو عدم سے وجود کی منزل تک لانا، اور نیستی سے ہستی کے مرحلہ میں لانا اور صفر سے عدد کے مرحلہ تک پہنچانا ہے۔

اور اس عظیم مرحلہ کے بعد کمال وترقی کے دوسرے مراحل شروع ہوتے ہیں اور تمام دینی احکام وقوانین اسی راستہ میں قرار پاتے ہیں۔(۱)

(۱)تفسیر نمونہ، جلد ۲۲، صفحہ ۳۸۹

۸۹۔ کیا انسان کی سعادت اور شقاوت ذاتی ہے؟

قرآن مجید کے سورہ ہود میں ارشاد خداوندی ہوتا ہے:

﴿يَوْمَ يَاتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ إِلَّا بِإِذْنِهِ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَ سَعِيدٌ﴾(۱)

''اس کے بعد جب وہ دن آجائے گا تو کوئی شخص بھی اذن خدا کے بغیر کسی سے بات بھی نہ کر سکے گا اس دن کچھ بدبخت ہوں گے اور کچھ نیک بخت''

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ آیت نسانی سعادت ورشقاوت کے ذاتی ہونے پر دلیل نہیں ہے؟

یہاں پر چند نکات پر توجہ کرنا چاہئے

۱۔ بعض فراد نے مذکورہ آیت سے نسان کی سعادت وشقاوت کے ذاتی ہونے کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، حالانکہ مذکورہ آیت نہ صرف اس امر پر دلالت نہیں کرتی بلکہ واضح طور پر ثابت کرتی ہے کہ سعادت وشقاوت اکتسابی ہیں کیونکہ فرمایا گیا ''ف ما الذین شقوا'' یعنی وہ شقی ہوئے اسی طرح فرمایا گیا ہے ''اَمّا الَّذِینَ سُعِدُوا'' یعنی وہ لوگ جو سعادت مند

---

(۱) سورۂ ہود، آیت ۱۰۵

ہوئے، اگر شقاوت وسعادت ذاتی ہوتیں تو کہنا چاہیے تھا ''اما الاشقیاء و اما السعداء''، یا ایسی ہی کوئی اور عبارت ہوتی۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ فخر الدین رازی کی یہ بات بالکل بے بنیاد ہے جو اس نے ان لفظوں میں بیان کی ہے ''اس آیت میں خدا ابھی سے یہ حکم لگا رہا ہے کہ قیامت میں ایک گروہ سعادت مند ہوگا اور ایک شقاوت مند ہوگا اور جنہیں خدا ایسے حکم سے محکوم کرتا ہے اور جانتا ہے کہ آخر کار قیامت میں سعید یا شقی ہوں گے، محال ہے کہ وہ تبدیل ہو جائیں ورنہ خدا کا جھوٹی خبر دینا لازم آئے گا اور اس کا علم، جہالت میں تبدیل ہو جائے گا جبکہ یہ محال ہے۔

یہ مسئلہ جبر و اختیار میں ''علم خدا'' کے حوالے سے مشہور اعتراض ہے کہ جس کا جواب ہمیشہ دیا گیا ہے اور وہ یہ کہ اگر ہم اپنے خود ساختہ افکار کو آیت پر مسلط نہ کریں تو ان کے مفاہیم روشن اور واضح ہیں، یہ آیات کہتی ہیں کہ اس دن ایک گروہ اپنے کردار کے باعث شقی ہوگا اور خدا جانتا ہے کہ کون سے افراد اپنے کردار، خواہش و اختیار سے سعادت کی راہ اپنائیں گے اور کونسے اپنے ارادہ سے راہ شقاوت پر گامزن ہوں گے، اس بنا پر اگر اس کے کہنے کے برخلاف لوگ یہ راہ منتخب کرنے پر مجبور ہوں تو علم خدا جہل ہو جائے گا کیونکہ سب کے سب اپنے ارادہ و اختیار سے اپنی راہ انتخاب کریں گے۔

ہماری گفتگو کی دلیل یہ ہے کہ مذکورہ آیت گزشتہ قوموں کے واقعات کے بعد نازل ہوئی ہیں، ان واقعات کے مطابق ان لوگوں کی بڑی تعداد اپنے ظلم و ستم کی وجہ سے حق و عدالت کے راستے سے منحرف ہونے کے باعث، شدید اخلاقی مفاسد کے سبب اور خدائی رہبروں کے خلاف جنگ کی وجہ سے اس جہان میں دردناک عذابوں میں مبتلا ہوئی، یہ واقعات قرآن نے ہماری تربیت و رہنمائی کے لئے، راہ حق کو باطل سے جدا کر کے نمایاں کرنے کے لئے اور راہ سعادت کو راہ شقاوت سے جدا کر کے دکھانے کے لئے بیان کئے ہیں۔

اصولی طور پر جیسا کہ فخر رازی اور اس کے ہم فکر افراد خیال کرتے ہیں کہ اگر ہم پر ذاتی سعادت وشقاوت کا حکم نافذ ہو اور ہم بغیر ارادہ و اختیار کے برائیوں اور نیکیوں کی طرف کھینچے جائیں تو تعلیم وتربیت لغو اور بے فائدہ ہوگی، انبیاء کی بعثت، کتب آسمانی کا نزول، پند ونصیحت، تشویق وتوبیخ، سرزنش ومذمت مواخذہ وسوال غرض یہ سزا وجزا سب کچھ بے فائدہ یا ظالمانہ امور شمار ہوں گے۔

انسان کو نیک و بد کی انجام دہی میں مجبور سمجھنے والے، چاہے اس جبر کو جبر خدائی سمجھیں یا جبر طبیعی، چاہے جبر اقتصادی سمجھیں، یا جبر ماحول، صرف گفتگو اور کتابی دنیا تک اس مسلک کی طرفداری کرتے ہیں لیکن عملی طور پر وہ خود بھی ہرگز یہ عقیدہ نہیں رکھتے، یہی وجہ ہے کہ اگر ان کے حقوق پر تجاوز ہو تو وہ زیادتی کرنے والے کو سرزنش، مذمت اور سزا کا مستحق سمجھتے ہیں اور اس بات کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوتے کہ اسے مجبور قرار دے کر اس سے صرف نظر کرلیں، یا اس کی سزا کو ظالمانہ خیال کریں یا کہیں کہ وہ یہ کام کرنے پر قدرت نہیں رکھتا تھا چونکہ خدا نے ایسا ہی چاہا تھا یا ماحول و طبیعت کا جبر تھا، چنانچہ یہ خود اصل اختیار کے فطری ہونے پر ایک دوسری دلیل ہے۔

بہرحال ہمیں کوئی جبری مسلک والا ایسا نہیں ملتا جو اپنے روزمرہ کے کاموں میں اس عقیدہ کا پابند ہو بلکہ وہ تمام افراد سے ان کے آزاد، مسئول، جوابدہ اور مختار ہونے کے لحاظ سے ملتا اور پیش آتا ہے، دنیا کی تمام اقوام نے عدالتیں قائم کر رکھی ہیں، قوانین بنائے ہیں اور ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا دینے کے لیے اقدامات کیے جاتے ہیں، عملی طور پر یہ سب چیزیں ثابت کرتی ہیں کہ ارادہ کی آزادی اور انسان کے مختار ہونے کو قبول کیا گیا ہے، دنیا کے تمام تربیتی ادارے ضمنی طور پر اس بنیادی نظریہ کو قبول کرتے ہیں کہ انسان اپنے میل ورغبت اور ارادہ واختیار سے کام کرتا ہے، اور تعلیم وتربیت کے ذریعہ صرف اس کی رہنمائی کی جاسکتی ہے، اور اسے خطاؤں، غلطیوں اور کج فکریوں سے روکا جاسکتا ہے۔

۲۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ مذکورہ آیات میں "شقوا" فعل معروف اور "سعدوا" فعل

مجہول کی صورت میں آیا ہے، ہو سکتا ہے کہ تعبیر کا یہ اختلاف شاید اس لطیف نکتہ کی طرف اشارہ ہو کہ انسان راہ شقاوت کو اپنے قدموں سے طے کرتا ہے لیکن راہ سعادت پر چلنے کے لئے جب تک خدائی امداد اور تعاون نہ ہو اور اس راہ میں وہ اس کی نصرت نہ کرے اس وقت تک انسان کامیاب نہیں ہوتا، اس میں شک نہیں ہے کہ یہ امداد اور تعاون صرف ان لوگوں کے شامل حال ہوتا ہے جنھوں نے ابتدائی قدم اپنے ارادہ و اختیار سے اٹھائے ہوں اور اس طرح ایسی امداد کی اہلیت اور صلاحیت پیدا کرلی ہو۔ (غور کیجئے)(۱)

(۱) تفسیر نمونہ، جلد ۹، صفحہ ۲۳۶

۹۰۔ اسلام اور ایمان میں کیا فرق ہے؟

جیسا کہ ہم قرآن مجید کے سورہ حجرات میں پڑھتے ہیں ﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلٰكِنْ قُولُوا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ...﴾(۱) ”یہ بدو عرب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں تو آپ ان سے کہہ دیجئے کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ یہ کہو کہ اسلام لائے ہیں اور ابھی ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے...“

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام اور ایمان میں کیا فرق ہے؟

مذکورہ آیت کے مطابق ”اسلام“ اور ”ایمان“ کا فرق یہ ہے کہ اسلام ظاہری قانون کا نام ہے اور جس نے کلمہ شہادتین زبان پر جاری کر لیا وہ مسلمانوں کے دائرہ میں داخل ہو گیا، اور اسلامی احکامات اس پر نافذ ہوں گے۔

لیکن ایمان ایک واقعی اور باطنی امر ہے، جس کا مقام انسان کا دل ہے نہ کہ اس کی زبان اور اس کا ظاہری چہرہ۔

”اسلام“ کے لئے انسان کے ذہن میں بہت سے مقاصد ہو سکتے ہیں یہاں تک مادی اور ذاتی منافع کے لئے انسان مسلمان ہو سکتا ہے، لیکن ”ایمان“ میں معنوی مقصد ہوتا ہے جس کا سرچشمہ

---

(۱) سورۂ حجرات، آیت ۱۴

علم و بصیرت ہوتی ہے، اور جس کا حیات بخش ثمرہ یعنی تقویٰ اسی کی شاخوں پر ظاہر ہوتا ہے۔

یہ وہی چیز ہے جس کے لئے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے واضح طور پر ارشاد فرمایا ہے: "الإِسْلَامُ عَلانِيَةٌ، وَالإِيمَانُ فِي الْقَلْبِ" (۱) "اسلام ایک ظاہری چیز ہے اور ایمان کی جگہ انسان کا دل ہے"۔

اور ایک دوسری حدیث میں حضرت امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے: "الإِسْلَامُ يُحْقَنُ بِهِ الدَّمُ وَتُؤَدَّى بِهِ الأَمَانَةُ، وَتُسْتَحَلُّ بِهِ الفُرُوجُ، وَالثَّوَابُ عَلَى الإِيمَانِ" (۲) "اسلام کے ذریعہ انسان کے خون کی حفاظت، امانت کی ادائگی ہوتی ہے اور اسی کے ذریعہ شادی کا جواز پیدا ہوتا ہے، اور [لیکن] ایمان پر ثواب ملتا ہے"۔

اور یہی دلیل ہے کہ بعض روایت میں "اسلام" کا مفہوم صرف لفظی اقرار میں منحصر کیا گیا ہے جبکہ ایمان کو عمل کے ساتھ قرار دیا گیا ہے: "الإِيمَانُ إِقْرَارٌ وَعَمَلٌ، وَالإِسْلَامُ إِقْرَارٌ بِلا عَمَلٍ" (۳) "ایمان، اقرار و عمل کا نام ہے، جبکہ اسلام بغیر عمل کے صرف اقرار کا نام ہے"۔

یہی معنی دوسرے الفاظ میں "اسلام و ایمان" کی بحث میں بیان ہوئے ہیں: فضیل بن یسار کہتے ہیں: میں نے حضرت امام صادق علیہ السلام سے سنا کہ آپ نے فرمایا: "إِنَّ الإِيمَانَ يُشَارِكُ الإِسْلَامَ وَلا يُشَارِكُهُ الإِسْلَامُ، إِنَّ الإِيمَانَ مَا وَقَرَ فِي القُلُوبِ، وَالإِسْلَامُ مَا عَلَيْهِ المَنَاكِحُ وَالمَوَارِيثُ وَحَقْنُ الدِّمَاءِ" (۴) "ایمان، اسلام کے ساتھ شریک ہے، لیکن اسلام ایمان کے ساتھ شریک نہیں ہے، (دوسرے الفاظ میں ہر مومن مسلمان ہے لیکن ہر

---

(۱) مجمع البیان، جلد ۹، صفحہ ۱۳۸

(۲) کافی، جلد دوم، "باب ان الاسلام یحقن به الدم" حدیث ۱

(۳) کافی، جلد دوم، "باب ان الاسلام یحقن به الدم" حدیث ۲

(۴) کافی، جلد دوم، "باب ان الاسلام یحقن به الدم" حدیث ۳

مسلمان مومن نہیں ہے) ایمان انسان کے دل میں ہوتا ہے، لیکن اسلام کی بنا پر نکاح، میراث اور جان و مال کے حفاظتی قوانین جاری ہوتے ہیں۔

اس مفہوم کا فرق اس صورت میں ہے کہ یہ دونوں لفظ یک ساتھ استعمال ہوں، لیکن اگر جدا جدا استعمال ہوں تو ممکن ہے کہ اسلام کے وہی معنی ہیں جو ایمان کے لئے ہیں، یعنی دونوں الفاظ ایک ہی معنی کے لئے استعمال ہوں۔(۱)

(۱) تفسیر نمونہ، جلد ۲۲، صفحہ ۲۱۰

۹۱۔ جن اور فرشتہ کی حقیقت کیا ہے؟

"جن" کی حقیقت (جیسا کہ جن کے لغوی معنی سے معلوم ہوتا ہے کہ) ایک ایسی دکھائی نہ دینے والی مخلوق ہے جس کے لئے قرآن مجید میں بہت سے صفات بیان ہوئے ہیں، جن میں سے چند درج ذیل ہیں

۱۔ ایک ایسی مخلوق ہے جو آگ کے شعلوں سے پیدا کی گئی ہے، انسان کی خلقت کے برخلاف جو مٹی سے خلق ہوا ہے، جیسا کہ ارشاد الٰہی ہوتا ہے: ﴿وَخَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَارِجٍ مِنْ نَارٍ﴾(۱) "اور جنات کو آگ کے شعلوں سے پیدا کیا ہے"

۲۔ یہ مخلوق علم و ادراک، حق و باطل میں تمیز کرنے اور منطق و استدلال کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے (سورہ جن کی مختلف آیات میں اس مطلب کی طرف اشارہ ہوا ہے)

۳۔ جنوں پر تکالیف اور ذمہ داریاں ہیں، (سورہ جن اور رحمن کی آیات کا مطالعہ کریں)

۴۔ ان میں سے بعض گروہ مومن اور صالح ہیں اور بعض گروہ کافر ہیں ﴿وَأَنَّا مِنَّا الصَّالِحُونَ وَمِنَّا دُونَ ذَٰلِكَ﴾(۲) "اور ہم میں سے بعض نیک کردار ہیں اور بعض اس کے علاوہ ہیں"۔

---

(۱) سورۂ رحمن، آیت ۱۵ (۲) سورۂ جن، آیت ۱۱

۵۔ان کا بھی قیامت میں حشر ونشر اور حساب وکتاب ہوگا ﴿وَأَمَّا الْقَاسِطُونَ فَكَانُوا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا﴾(۱) ”اور نافرمان تو جہنم کے کندے ہوگئے ہیں“۔

۶۔جن آسمانوں میں نفوذ کی قدرت رکھتے ہیں اور دوسروں کی باتوں کو سن لیا کرتے تھے، لیکن بعد میں ان کی یہ قدرت سلب کرلی گئی، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے ﴿وَأَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ فَمَنْ يَسْتَمِعِ الْآنَ يَجِدْ لَهُ شِهَابًا رَصَدًا﴾(۲) ”اور ہم پہلے بعض مقامات پر بیٹھ کر باتیں سن لیا کرتے تھے لیکن اب کوئی سننا چاہے گا تو اپنے لئے شعلوں کو تیار پائے گا“۔

۷۔جن بعض انسانوں سے رابطہ برقرار کرلیتے ہیں اور بعض محدود اسرار سے مطلع ہونے کے بعد انسانوں کو اغوا کرلیتے ہیں ﴿وَأَنَّهُ كَانَ رِجَالٌ مِنَ الْإِنْسِ يَعُوذُونَ بِرِجَالٍ مِنَ الْجِنِّ فَزَادُوهُمْ رَهَقًا﴾ (۳) اور یہ کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ جنات کے بعض لوگوں کی پناہ ڈھونڈ رہے تھے تو انھوں نے گرفتاری میں اور اضافہ کردیا“۔

۸۔جنوں کے درمیان بہت سے بہت زیادہ طاقتور ہوتے ہیں، جیسا کہ بعض طاقتور لوگ انسانوں کے درمیان بھی ہوتے ہیں ﴿قَالَ عِفْرِيتٌ مِنَ الْجِنِّ أَنَا آتِيكَ بِهِ قَبْلَ أَنْ تَقُومَ مِنْ مَقَامِكَ﴾(۴) ”جنات میں سے ایک دیو نے کہا کہ میں اتنی جلدی لے آؤں گا کہ آپ اپنی جگہ سے بھی نہ اٹھیں گے“۔

۹۔جن انسانوں کے بعض ضروری کاموں کو انجام دینے کی طاقت رکھتے ہیں ﴿وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِإِذْنِ رَبِّهِ... يَعْمَلُونَ لَهُ مَا يَشَاءُ مِنْ مَحَارِيبَ وَتَمَاثِيلَ

---

(۱)سورۂ جن، آیت۵

(۲)سورۂ جن، آیت۹

(۳)سورۂ جن، آیت۶

(۴)سورۂ نمل، آیت۳۹

وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ﴾(۱) ”اور جنات میں ایسے افراد و بنا دیئے جو خدا کی اجازت سے ان کے سامنے کام کرتے تھے یہ جنات سلیمانؑ کے لئے جو وہ چاہتے تھے بنا دیتے تھے جیسے محرابیں، تصویریں اور حوضوں کے برابر پیالے اور بڑی بڑی زمین میں گڑی ہوئی دیگیں“۔

۱۰۔ زمین پر ان کی خلقت انسانوں کی خلقت سے پہلے ہو چکی تھی ﴿وَالْجَانَّ خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَارِ السَّمُومِ﴾(۲) ”اور جنات کو اس سے پہلے زہریلی آگ سے پیدا کیا“۔

[قارئین کرام!] ان کے علاوہ بھی جنوں کی دوسری خصوصیات بیان ہوئی ہیں۔

جبکہ عوام الناس میں یہ بات مشہور ہے کہ جنات انسانوں سے بہتر ہیں، لیکن قرآنی آیات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان، جنوں سے بہتر ہیں کیونکہ خداوند عالم نے جتنے بھی انبیاء اور مرسلین ہدایت کے لئے بھیجے ہیں وہ سب انسانوں میں سے تھے، اور انھیں میں سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ہیں، جن پر جنوں کا ایمان تھا اور آپ کی اتباع و پیروی کی، اسی طرح شیطان کا جناب آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کرنا جس کی وضاحت قرآن کریم میں بیان ہوئی ہے، یہ جنوں کے سرداروں میں سے تھا، (سورہ کہف، آیت نمبر ۵۰) یہ خود انسان کی فضیلت کی دلیل ہے۔

یہاں تک ان چیزوں کے بارے میں بیان ہوا ہے جو قرآن مجید میں اس دکھائی نہ دینے والی مخلوق کے بارے میں بیان ہوا ہے اور جو ہر طرح کے خرافاتی اور غیر علمی مسائل سے خالی ہے، لیکن ہم جانتے ہیں کہ جاہل عوام الناس نے جنوں کے سلسلہ میں بہت سے خرافات گڑھ لئے ہیں جو عقل و منطق سے دور ہیں، اور اسی وجہ سے اس موجود کا ایک خرافاتی اور غیر منطقی چہرہ پیش کیا گیا کہ جس وقت لفظ ”جن“ زبان پر جاری کیا جاتا ہے تو اس کے سلسلہ میں چند خرافاتی چیزیں بھی ذہن میں آتی ہیں، منجملہ عجیب و غریب اور وحشتناک شکل و صورت، دُمدار اور سُم دار موجود آزار و اذیت

(۱)سورۂ سبا، آیت ۱۲، ۱۳۔ (۲)سورۂ حجر آیت ۲۷

پہنچانے والے، حسد و کینہ رکھنے والے، اور برا سلوک کرنے والے وغیرہ وغیرہ۔

حالانکہ اگر جنوں کو ان تمام خرافات اور بے بنیاد چیزوں سے الگ رکھا جائے تو اصل مطلب قابل قبول ہے، کیونکہ اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ موجودات صرف وہی ہیں جس کو ہم دیکھ سکتے ہوں، اس سلسلہ میں علما اور دانشوروں کا کہنا ہے کہ جن موجودات کو ہم اپنے حواس کے ذریعہ درک کر سکتے ہیں وہ ان موجودات کے مقابلہ میں بہت کم ہیں جن کو ہم درک نہیں کر سکتے۔

ادھر چند سال پہلے تک کہ جب ذرہ بینی موجودات کشف نہیں ہوئی تھی، کسی کو یہ یقین نہیں ہوتا تھا کہ ایک قطرہ پانی یا ایک قطرہ خون میں ہزاروں زندہ موجودات پائے جاتے ہیں، جن کو انسان دیکھنے سے قاصر ہے۔ اور اسی طرح دانشوروں کا کہنا ہے کہ ہماری آنکھیں محدود رنگوں کو دیکھ سکتی ہیں اور ہمارے کان صرف محدود آواز کو سن سکتے ہیں، جبکہ ہم جن رنگ اور آواز کو دیکھتے یا سنتے ہیں اس سے کہیں زیادہ ہیں، اور ہمارے دائرۂ ادراک سے باہر ہیں۔

لہٰذا جب اس دنیا کی یہ حالت ہے تو کونسے تعجب کی بات ہے کہ اس جہان میں دوسری زندہ موجوات بھی ہوں جن کو ہم نہیں دیکھ سکتے، اور اپنے حواس کے ذریعہ درک نہیں کر سکتے، اور جب ایک سچی خبر دینے والے صادق پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خبر دی ہے تو پھر ہم اس کو کیوں نہ قبول کریں؟

بہر حال ایک طرف قرآن کریم جنات کے بارے میں مذکورہ خصوصیات کے ساتھ خبر دے رہا ہے اور دوسری طرف ان کے نہ ہونے پر کوئی عقلی دلیل ہمارے پاس نہیں ہے، تو ہمیں قبول کر لینا چاہئے، اور غلط تاویلات سے پرہیز کرنا چاہئے، اسی طرح اس مسئلہ میں عوامی خرافات سے بھی اجتناب کرنا چاہئے۔

اس نکتہ پر توجہ کرنا چاہئے کہ کبھی کبھی جنات کا اطلاق ایک وسیع مفہوم پر ہوتا ہے جن میں نظر نہ آنے والی کئی موجودات شامل ہیں، چاہے ہماری عقل ان کو درک کرے یا نہ کرے، یہاں تک کہ بعض وہ حیوانات جو آنکھوں سے دکھائی دیتے ہیں جو عام طور پر آشیانوں میں چھپے رہتے ہیں، اس

وسیع معنی میں داخل ہیں۔ اس بات پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ایک حدیث شاہد ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''خداوند عالم نے جنوں کی پانچ قسم پیدا کی ہیں، ایک قسم وہ جو ہوا کی طرح دکھائی نہیں دیتے، دوسری قسم سانپ کی طرح، ایک قسم بچھوؤں کی طرح، ایک قسم زمین کے حشرات اور ایک قسم انسان کی طرح ہے جن کے لئے حساب وکتاب رکھا گیا ہے''۔(۱)

اس روایت اور اس کے وسیع مفہوم کے پیش نظر جنوں کے حوالہ سے بعض روایات اور واقعات میں بیان ہونے والی مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔

مثال کے طور پر ہم حضرت علی علیہ السلام سے منقول روایات میں پڑھتے ہیں ''لاتَشْرِبِ الْمَاءَ مِنْ ثُلْمَةِ الإِنَاءِ وَلا مِنْ عُرْوَتِهِ فَإِنَّ الشَّيْطَانَ يَقْعُدُ عَلَى الْعُرْوَةِ وَالثُّلْمَةِ''(۲) ''ٹوٹے ہوئے ظرف یا دستہ کی طرف سے پانی نہ پیو کیونکہ شیطان ٹوٹے ہوئے کنارے اور دستہ کی طرف بیٹھتا ہے۔

چونکہ ''شیطان'' بھی جنات میں سے ہے، اور چونکہ ظرف کا ٹوٹا ہوا حصہ اور دستے کی طرف جرثیم ہوتے ہیں، لیکن بعید از نظر دکھائی دیتا ہے کہ ''جنات اور شیطان''، ''عام معنی'' کے لحاظ اس طرح کی موجودات کو بھی شامل ہو جائے، اگرچہ خاص معنی رکھتے ہیں یعنی [جنات] ایسی موجود کو کہا جاتا ہے جن کے یہاں فہم وشعور اور ذمہ داری وفرائض ہوتے ہیں۔

اس سلسلہ میں اور بہت سی روایات موجود ہیں۔(۳)(۴)

---

(۱)سفینۃ البحار، جلد اول، صفحہ ۱۸۶(مادہ جن)

(۲) کتاب ''کافی'' جلد ۶، صفحہ ۳۸۵، () کتاب الاطعمۃ والاشربۃ، باب الاوانی، حدیث ۵

(۳) اولیں درسگاہ تحریک پیامبر، جلد اول میں تقریباً ۲۳ روایتیں اس سلسلہ میں بیان ہوئی ہیں

(۴) تفسیر نمونہ، جلد ۲۵، صفحہ ۵۴۔

فرشتہ کی حقیقت:

جیسا کہ ہم قرآن مجید میں پڑھتے ہیں کہ بہت سے مقامات پر ملائکہ اور فرشتوں کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے۔

قرآن کریم کی بہت سی آیات میں ملائکہ کی صفات، خصوصیت، ان کے کام اور ذمہ داریاں بیان ہوئی ہیں یہاں تک کہ ملائکہ پر ایمان رکھنے کو خدا، انبیاء اور آسمانی کتابوں کی صف میں قرار دیا گیا ہے، جو اس مسئلہ کی اہمیت کی دلیل ہے۔ ﴿آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْهِ مِن رَّبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ كُلٌّ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ﴾(۱)

''رسول ان تمام باتوں پر ایمان رکھتا ہے جو اس پر نازل کی گئی ہیں اور سب مومنین بھی اللہ اور ملائکہ اور مرسلین پر ایمان رکھتے ہیں''۔

بے شک فرشتوں کا وجود ''غیبی'' چیزوں میں سے ہے جن کو ان صفات اور خصوصیت کے ساتھ پہچاننے کے لئے صرف قرآن و روایات ہی کو دلیل بنایا جا سکتا ہے، اور غیب پر ایمان لانے کے حکم کی وجہ سے ان کو قبول کیا جانا چاہئے۔

۱۔ فرشتے، صاحب عقل و شعور، اور خدا کے محترم بندے ہیں، جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے ﴿بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُونَ﴾(۲) ''بلکہ وہ سب اس کے محترم بندے ہیں''۔

ملائکہ، خداوندعالم کے حکم کی فوراً اطاعت کرتے ہیں، اور کبھی بھی اس کی معصیت نہیں کرتے ﴿لَا يَسْبِقُونَهُ بِالْقَوْلِ وَهُم بِأَمْرِهِ يَعْمَلُونَ﴾(۳) ''جو کسی بات پر اس پر سبقت نہیں کرتے ہیں اور اس کے احکام پر برابر عمل کرتے ہیں''۔

---

(۱) سورۂ بقرہ، آیت ۲۸۵ (۲) سورۂ انبیاء، آیت ۲۶

(۳) سورۂ انبیاء، آیت ۲۷

۳۔ملائکہ، خداوند عالم کی طرف سے مختلف قسم کی بہت سی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہیں

ایک گروہ، عرش کو اٹھائے ہوئے ہے۔(سورہ حاقہ، آیت ۱۷)

ایک گروہ، مدبرات امر ہے۔(سورہ نازعات، آیت ۵)

ایک گروہ، قبض روح کرتا ہے۔(سورہ اعراف، آیت ۳۷)

ایک گروہ، انسان کے اعمال کا نگراں ہے۔(سورہ انفطار، آیت ۱۰تا۱۳)

ایک گروہ، انسان کو خطرات اور حوادث سے محفوظ رکھتا ہے۔(سورہ انعام، آیت ۶۱)

ایک گروہ، سرکش اقوام پر عذاب نازل کرتا ہے۔(سورہ ہود، آیت ۷۷)

اور ایک گروہ، جنگوں میں مومنین کی امداد کرتا ہے۔(سورہ احزاب، آیت ۹)

اور بعض گروہ، انبیاء علیہم السلام پر وحی اور آسمانی کتابیں نازل کرنے والے ہیں۔(سورہ نحل، آیت۲)

اگر ہم ان کے ایک ایک کام اور ذمہ داری کو شمار کرنا چاہیں تو بحث طولانی ہوجائے گی۔

۴۔ملائکہ، ہمیشہ خداوند عالم کی تسبیح و تقدیس کرتے رہتے ہیں، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے

﴿وَالْمَلاَئِکَةُ یُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَیَسْتَغْفِرُونَ لِمَنْ فِی الْأَرْضِ﴾(۱)

"اور ملائکہ بھی اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کررہے ہیں اور زمین والوں کے حق میں استغفار کررہے ہیں"۔

۵۔ان تمام چیزوں کے باوجود انسان استعداد اور تکامل و ترقی کے لحاظ سے ان سے بلند و

(۱)سورہ شوریٰ، آیت ۵

برتر ہے یہاں تک کہ سب فرشتوں نے جناب آدم کو سجدہ کیا اور جناب آدم علیہ السلام ان کے معلم قرار پائے۔(سورہ بقرہ، آیت ۳۰ تا ۳۴)

۶۔ ملائکہ کبھی کبھی انسان کی صورت میں آجاتے ہیں اور انبیاء بلکہ غیر انبیاء کے سامنے ظاہر ہو جاتے ہیں، جیسا کہ سورہ مریم میں پڑھتے ہیں ﴿فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا﴾(۱) ”تو ہم نے اپنی روح [جبرائیل] کو بھیجا جو ان کے سامنے ایک اچھا خاصا آدمی بن کر پیش ہوا“۔

ایک دوسرے مقام پر جناب ابراہیم اور جناب لوط کے سامنے انسانی صورت میں آئے۔ (سورہ ہود، آیت ۶۹ و ۷۷)

یہاں تک کہ درج ذیل آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قوم لوط نے ان کو انسانی شکل و صورت میں دیکھا تھا۔(سورہ ہود، آیت ۷۸)

کیا انسانی شکل وصورت میں ظاہر ہونا ایک حقیقت ہے؟ یا صرف خیالی اور سمجھنے کی حد تک؟ قرآن مجید کی آیات سے پہلے معنی ظاہر ہوتے ہیں، اگرچہ بعض مفسرین نے دوسرے معنی مراد لیتے ہیں۔

۷۔ اسلامی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ کسی بھی انسان سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا، جیسا کہ حضرت امام صادق علیہ السلام سے منقول ایک روایت میں پڑھتے ہیں: جس وقت امام علیہ السلام سے سوال کیا گیا کہ فرشتوں کی تعداد زیادہ ہے یا انسانوں کی؟ تو امام علیہ السلام نے فرمایا: ”قسم اس خدا کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، زمین میں مٹی کے ذرات سے کہیں زیادہ آسمان میں فرشتوں کی تعداد ہے، آسمان میں کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں پر

(۱) سورہ مریم، آیت ۱۷۔

کسی فرشتہ نے خداوند عالم کی تسبیح و تقدیس نہ کی ہو"۔(۱)

۸۔ وہ نہ کھانا کھاتے ہیں اور نہ پانی پیتے ہیں، اور نہ ہی شادی کرتے ہیں، جیسا کہ امام صادق علیہ السلام سے منقول ایک حدیث میں بیان ہوا ہے "فرشتے نہ کھانا کھاتے ہیں اور نہ پانی پیتے ہیں اور نہ ہی شادی کرتے ہیں بلکہ نسیم عرش الٰہی کی وجہ سے زندہ ہیں"۔(۲)

۹۔ وہ نہ سوتے ہیں نہ سستی اور غفلت کا شکار ہوتے ہیں، جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام سے منقول ایک روایت میں بیان ہوا ہے "ان میں سستی ہے اور نہ غفلت، اور وہ خدا کی نافرمانی نہیں کرتے، ان کو نیند بھی نہیں آتی، ان کی عقل کبھی سہو و نسیان کا شکار نہیں ہوتی، ان کا بدن سست نہیں ہوتا، اور وہ صلب پدر اور رحم مادر میں قرار نہیں پاتے۔(۳)

۱۰۔ ان کے مختلف مقامات اور مختلف درجات ہوتے ہیں، ان میں بعض ہمیشہ رکوع میں رہتے ہیں اور بعض ہمیشہ سجدہ کی حالت میں:

﴿وَمَا مِنَّا إِلَّا لَهُ مَقَامٌ مَعْلُومٌ ☆ وَإِنَّا لَنَحْنُ الصَّافُّونَ ☆ وَإِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُونَ﴾(۴)

"اور ہم میں سے ہر ایک کے لئے ایک مقام معین ہے اور ہم اس کی بارگاہ میں صف بستہ کھڑے ہونے والے ہیں اور ہم اس کی تسبیح کرنے والے ہیں"۔

حضرت امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: خداوند عالم نے کچھ فرشتوں کو یوں خلق کیا ہے جو روز قیامت تک رکوع میں رہیں گے اور بعض فرشتے ایسے ہیں جو قیامت تک سجدہ کی حالت

---

(۱) بحار الانوار، جلد ۵۹، صفحہ ۱۷۶، (حدیث ۸) اس کے علاوہ اور بہت سی دوسری روایتیں اس بارے میں نقل ہوئی ہیں۔

(۲) بحار الانوار، جلد ۵۹، صفحہ ۱۷۴، (حدیث ۳)

(۳) بحار الانوار، جلد ۵۹، صفحہ ۱۷۵

(۴) سورۂ صافات، آیت ۱۶۴۔ ۱۶۶

میں رہیں گے۔(۱)(۲)

اب یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ یہ تمام فرشتے ان تمام اوصاف کے ساتھ مجرد موجود ہیں یا مادی؟! اس میں شک نہیں ہے کہ یہ تمام صفات کسی مادی عنصر کے نہیں ہو سکتے، لیکن ان کے "لطیف اجسام" سے پیدا ہونے میں کوئی مانع بھی نہیں ہے، جو اس معمولی مادہ سے مافوق ہو۔

فرشتوں کے لئے "مطلق طور پر مجرد" یہاں تک کہ زمان و مکان اور اجزا سے بھی مجرد ہونے کا اثبات کوئی آسان کام نہیں ہے اور اس مسئلہ میں تحقیق کرنے کا بھی کوئی خاص فائدہ نہیں ہے، اہم بات یہ ہے کہ ہم فرشتوں کو قرآن میں بیان ہوئے اوصاف کے ذریعہ پہچانیں، اور ان کو خداوند عالم کی بلند و بالا مخلوق مانیں، اور ان کے لئے صرف مقام بندگی و عبادت کے قائل ہوں، اور ان کو خداوند عالم کے ساتھ خلقت یا عبادت میں شریک نہ مانیں، اور اگر کوئی ان کو شریک مانے گا تو یہ شرک اور کفر ہوگا۔

فرشتوں کے سلسلہ میں ہم اتنی بحث و گفتگو کو کافی سمجھتے ہیں اور تفصیلی بحث کے لئے اس موضوع پر لکھی گئی کتابوں کا مطالعہ فرمائیں۔ توریت میں بہت سے مقامات پر فرشتوں کو "خدا" کہا گیا ہے جو نہ صرف یہ کہ شرک ہے بلکہ اس وقت کی توریت میں تحریف کی دلیل ہے، لیکن قرآن مجید اس طرح کے الفاظ سے پاک و منزہ ہے، کیونکہ قرآن میں صرف ان کے لئے مقام بندگی، عبادت اور حکم خدا کی تعمیل کے علاوہ کچھ نہیں ملتا، جیسا کہ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ قرآن مجید کی بہت سی آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کامل کا درجہ فرشتوں سے بلند و بالا ہے۔(۳)

---

(۱) بحارالانوار، جلد ۵۹، صفحہ ۱۷۴

(۲) ملائکہ کے اوصاف اور ان کی اقسام کے سلسلہ میں کتاب "السماء والعالم" بحارالانوار "ابواب الملائکہ" (جلد ۵۹، صفحہ ۱۴۴ تا ۳۲۶) پر رجوع فرمائیں، اسی طرح نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۱، ۹۱، ۱۰۹، ۱۷۱ پر بھی رجوع فرمائیں۔

(۳) تفسیر نمونہ، جلد ۱۸، صفحہ ۱۷۲

۹۲۔ رجعت کیا ہے اور کیا اس کا امکان پایا جاتا ہے؟

"رجعت" شیعوں کا معروف عقیدہ ہے اور ایک مختصر جملہ میں اس کے معنی یہ ہیں "امام زمانہ (ع) کے ظہور کے بعد اور روز قیامت سے پہلے "خالص مومنین" کا ایک گروہ اور "کفار اور بہت سرکش و شریر لوگوں کا ایک گروہ" اس دنیا میں لوٹایا جائے گا، پہلا گروہ [یعنی مومنین] کمال کی منزلوں کو طے کرے گا اور دوسرا گروہ بہت سخت سزا پائے گا"۔

جلیل القدر شیعہ عالم دین "سید مرتضیٰ" علیہ الرحمہ فرماتے ہیں "امام مہدی (ع) کے ظہور کے بعد خداوند عالم بہت سے لوگوں کو مرنے کے بعد پھر اس دنیا میں پلٹائے گا، تاکہ امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کی مدد کا فخر اور ثواب حاصل کریں، الٰہی حکومت حق [وعدالت] میں شریک ہوں، اور اسی طرح سخت ترین دشمنوں کو بھی اس دنیا میں لوٹائے گا تاکہ ان سے انتقام لیا جاسکے۔

اس کے بعد موصوف مزید بیان کرتے ہیں اس عقیدہ کے صحیح ہونے پر دلیل یہ ہے کہ کوئی بھی عاقل اس کام پر خدا کی قدرت سے انکار نہیں کرسکتا، کیونکہ یہ مسئلہ کوئی محال کام نہیں ہے، حالانکہ ہمارے بعض مخالفین اس موضوع کا اس طرح انکار کرتے ہیں کہ گویا یہ کام محال اور غیر ممکن ہے۔

اس کے بعد سید بزرگوار فرماتے ہیں، اس عقیدہ کی دلیل "فرقہ امامیہ کا اجماع" ہے، کیونکہ

اس عقیدہ میں کسی نے بھی مخالفت نہیں کی ہے۔(۱)

گرچہ بعض قدیم شیعہ علماء اور اسی طرح مرحوم طبری صاحب مجمع البیان کی گفتگو سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بہت ہی کم شیعہ علماء نے اس عقیدہ کی مخالفت کی ہے، وہ ''رجعت'' کے معنی ''حکومت اہل بیت علیہم السلام کی بازگشت'' کئے ہیں، نہ لوگوں کی بازگشت اور مردوں کا زندہ ہونا، لیکن ان افراد کی مخالفت کچھ اس طرح ہے جس سے اجماع پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

یہاں پر بہت سی بحثیں ہیں لیکن ہم ان کا خلاصہ پیش کرتے ہیں

۱۔ بے شک اس دنیا میں مردوں کا زندہ ہونا کوئی محال کام نہیں ہے، جیسا کہ قیامت میں تمام انسانوں کا زندہ ہونا مکمل طور پر ممکن ہے، اور اس [رجعت] پر تعجب کرنا گویا زمانہ جاہلیت میں قیامت کے مسئلہ پر تعجب کی طرح ہے، اس کا مذاق اڑانا مشرکین کا قیامت کے مذاق اڑانے کی طرح ہے، کیونکہ عقل اس طرح کے کام کو محال نہیں مانتی، اور خدا کی وسیع قدرت کے سامنے یہ کام بہت آسان ہے

۲۔ قرآن مجید میں اجمالی طور پر گزشتہ امتوں کے پانچ موقع پر ''رجعت'' کا واقعہ پیش آیا ہے۔

الف۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ایک نبی کے بارے میں ارشاد ہوا ہے یا اس بندہ [نبی] کی مثال جس کا گزر ایک قریہ سے ہوا جس کے سارے ستون اور چھتیں گر چکی تھیں تو اس بندہ نے کہا کہ خدا ان سب کو موت کے بعد کس طرح زندہ کرے گا؟ تو خدا نے اس بندہ کو سو سال کے لئے موت دیدی اور پھر زندہ کیا اور پوچھا کہ کتنی دیر پڑے رہے؟ تو اس نے کہا کہ ایک دن یا اس سے کچھ کم، فرمایا نہیں، سو سال، ذرا اپنے کھانے اور پینے کو تو دیکھو کہ خراب تک نہیں ہوا اور اپنے گدھے پر نگاہ

(۱) سفینۃ البحار، جلد اول، صفحہ ۵۱۱ (مادہ رجع)

کرو(کہ سڑ گل گیا ہے) ورہم اسی طرح تمھیں لوگوں کے لئے ایک نشانی بنانا چاہتے ہیں (سورہ بقرہ، آیت ۲۵۹)

اس نبی کا نام عزیر تھا یا کچھ اور، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اہم بات یہ ہے کہ قرآن مجید نے واضح لفاظ میں بیان کیا ہے کہ وہ موت کے بعد اسی دنیا میں دوبارہ زندہ ہوئے۔ ﴿فَأَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ ..﴾

ب۔ قرآن کریم کے سورہ بقرہ میں ان لوگوں کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے "جو ہزاروں کی تعداد میں موت کے خوف سے اپنے گھروں سے نکل پڑے(اور بعض مفسرین کے قول کے مطابق یہ لوگ طاعون کی بیماری کا بہانہ بنا کر میدان جہاد میں جانا نہیں چاہتے تھے)اور خدا نے انھیں موت کا حکم دیدیا اور پھر زندہ کردیا ﴿فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوتُوا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ﴾(۱)

اگرچہ اس غیر معمولی واقعہ کو ہضم نہ کرنے والے مفسرین نے اس کو صرف ایک مثال شمار کیا ہے، لیکن یہ بات واضح ہے کہ اس طرح کے الفاظ ظہور، بلکہ آیت کی صراحت کے مقابل، قابل قبول نہیں ہیں۔

ج۔ سورہ بقرہ کی آیت میں "بنی اسرئیل" کے بارے میں بیان ہوا ہے کہ دیدار خدا کے تقاضا کے بعد ان لوگوں پر ہلاک کرنے والی بجلی گری اور وہ لوگ مرگئے، اس کے بعد خدا نے ان کو زندہ کیا تاکہ اس کی نعمتوں کا شکر ادا کریں: ﴿ثُمَّ بَعَثْنَاكُمْ مِنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾(۲) **"پھر ہم نے تمھیں موت کے بعد زندہ کردیا کہ شاید اب شکر گزار بن جاؤ"۔**

د۔ سورہ مائدہ، آیت نمبر ۱۱۰ میں جناب عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کو شمار کیا گیا ہے کہ وہ خدا

---

(۱) سورہ بقرہ، آیت ۲۴۳

(۲) سورہ بقرہ، آیت ۵۶

کے حکم سے مردوں کو زندہ کرتے تھے ﴿وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰی بِاِذْنِیْ﴾ "تم مردوں کو میرے حکم سے زندہ کرتے تھے"۔

یہ الفاظ اس بات کی عکاسی کرتے ہیں کہ جناب عیسیٰ علیہ السلام اپنے اس معجزہ (یعنی مردوں کو زندہ کرنے) سے فائدہ اٹھاتے تھے، بلکہ آیت میں "تُخْرِجُ" کا لفظ استعمال ہوا ہے جو تکرار پر دلیل ہے اور یہ خود رجعت کی ایک قسم شمار ہوتی ہے۔

۵۔ اور آخری موقع سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۷۳ میں بنی اسرائیل کے مقتول کے بارے میں بیان ہوا کہ جب بنی اسرائیل میں اس کے قاتل کی پہچان کے سلسلہ میں اختلاف ہوا، چنانچہ اس سلسلہ میں قرآن کا ارشاد ہے: ﴿فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَيُرِيْكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾ "تو ہم نے کہا کہ مقتول کو گائے کے ٹکڑے سے مس کر دو، خدا اسی طرح مردوں کو زندہ کرتا ہے اور تمہیں اپنی نشانیاں دکھلاتا ہے کہ شاید تمہیں عقل آجائے"۔

ان پانچ موارد کے علاوہ قرآن مجید میں اور دیگر واقعات ملتے ہیں جیسے کہ اصحاب کہف کا واقعہ جو تقریباً "رجعت" سے مشابہ ہے، اسی طرح جناب ابراہیم علیہ السلام کا چار پرندوں کو ذبح کرنا اور ان کا دوبارہ زندہ ہونا، تاکہ انسانوں کے لئے قیامت میں دوبارہ زندہ ہونے کا تصور مجسم ہو جائے، یہ واقعہ بھی رجعت کے سلسلہ میں قابل توجہ ہے۔

اور یہ کس طرح ممکن ہے کہ کوئی قرآن مجید پر ایک آسمانی کتاب کے عنوان سے عقیدہ رکھتا ہو، لیکن ان تمام آیات کے پیش نظر رجعت کے امکان کا منکر ہو جائے؟ کیا رجعت کے معنی مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کے علاوہ کچھ اور ہیں؟

کیا اسی دنیا میں قیامت کا ایک نمونہ رجعت نہیں ہے؟

جو شخص قیامت کو اس کی تفصیل کے ساتھ مانتا ہے تو پھر ایسے شخص کے لئے رجعت کا انکار کرنا یا اس کا مذاق اڑانا یا احمد امین مصری کی طرح کتاب "فجر الاسلام" میں کہنا کہ "الیھودیۃ

ظَهَرَتْ بِالتَّشَيُّعْ بِالقَوْلِ بِالرَّجْعَةِ" (۱) "یہودیت کا ایک دوسرا رخ شیعوں کے پاس میں "رجعت" کے عقیدہ کے ساتھ ظاہر ہوا ہے" واقعاً جائے تعجب ہے۔

احمد امین کے اس قول اور دور جاہلیت کے مشرکین کے جسمانی معاد کے انکار میں کیا فرق ہے؟!

۳۔ یہاں تک جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اس سے "رجعت" کا ممکن ہونا ثابت ہو جاتا ہے، اور رجعت کے واقع ہونے کی تائید کرنے والی بہت سی روایت ہیں جن کو ائمہ معصومین علیہم السلام سے بہت سے موثق راویوں نے نقل کیا ہے، اور چونکہ ہم یہاں پر ان تمام کو نقل نہیں کر سکتے، لیکن صرف ان کے اعداد وشمار کو نقل کرتے ہیں جیسا کہ علامہ مجلسی علیہ الرحمہ رقمطراز ہیں

"کس طرح ممکن ہے کہ کوئی اہل بیت علیہم السلام کی صداقت پر ایمان رکھتا ہو لیکن رجعت کے بارے میں متواتر احادیث کو قبول نہ کرے؟ بہت ہی واضح احادیث جن کی تعداد تقریباً دو سو ہے اور تقریباً چالیس موثق راویوں اور علما نے نقل کی ہیں، اور پچاس سے زیادہ کتابوں میں وارد ہوئی ہیں... اگر یہ حدیث متواتر نہیں ہے تو پھر کون سی حدیث متواتر ہو سکتی ہے؟! (۲) (۳)

رجعت کا فلسفہ

اسلامی روایات کے پیش نظر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ رجعت سب لوگوں کے لئے نہیں ہے، بلکہ یہ اعمال صالح انجام دینے والے مومنین کے لئے ہے جو ایمان کے بلند درجہ پر فائز ہیں، اور اسی طرح ان ظالم وسرکش کفار کے لئے ہے جو کفر وظلم میں غرق ہیں۔

---

(۱) "عقائد الامامیہ" شیخ محمد رضا المظفر صفحہ ۱۸

(۲) بحار الانوار، جلد ۵۳ صفحہ ۱۲۲

(۳) تفسیر نمونہ، جلد ۱۵، صفحہ ۵۵۵

ان تمام روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا میں دوبارہ زندگی مومنین کے لئے کمال کے درجات حاصل کرنے کے لئے ہے اور دوسرے گروہ کو کیفر کردار تک پہنچنے کے لئے ہے۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ وہ مخلص مومنین جو معنوی کمال حاصل کرنے میں موانع اور مشکلات سے دوچار ہو گئے تھے اور ان کی معنوی ترقی نامکمل رہ گئی تھی تو حکمت الٰہی اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ایسے مومنین کو دوبارہ زندگی دی جائے اور وہ کمال کی منزلوں کو مکمل کریں، حق و عدالت کی عالمی حکومت کو دیکھیں، اور اس حکومت میں شریک ہوں کیونکہ ایسی حکومت میں شریک ہونا ہی بہت بڑا افتخار ہے۔

ان کے برخلاف کفار و منافقین اور بڑے بڑے ظالم و جابر روز قیامت عذاب کے علاوہ اس دنیا میں بھی سزا بھگتیں گے جیسا کہ گزشتہ سرکش اقوام جیسے قوم فرعون، قوم عاد، قوم ثمود اور قوم لوط اپنے کیفر کردار تک پہنچی ہیں، اور یہ صرف رجعت کی صورت میں ممکن ہے۔

حضرت امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا "إِنَّ الرَّجْعَةَ لَیْسَتْ بِعَامَّةٍ، وَهِیَ خَاصَّةٌ لَا یَرْجِعُ إِلَّا مَنْ مَحَضَ الإِیمَانَ مَحْضاً، أَوْ مَحَضَ الشِّرْکَ مَحْضاً" ( ) "رجعت عام نہیں ہوگی بلکہ خاص ہوگی، رجعت صرف انہیں افراد کے لئے ہے جو خالص مومن یا جو خالص مشرک ہیں"۔

ممکن ہے کہ سورہ انبیاء کی آیت نمبر ۹۵ میں اسی بات کی طرف اشارہ ہو جیسا کہ ارشاد ہوا ہے ﴿وَحَرَامٌ عَلَى قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا أَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُونَ﴾ "اور جس بستی کو ہم نے تباہ کر دیا ہے اس کے لئے بھی ناممکن ہے کہ قیامت کے دن ہمارے پاس پلٹ کر نہ آئے" کیونکہ نہ لوٹایا جانا انہیں لوگوں کے بارے میں ہے جو اسی دنیا میں اپنے کیفر کردار تک پہنچ چکے ہیں، اور اس سے یہ بھی

( ) بحار الانوار، جلد ۵۳، صفحہ ۳۹

روشن ہو جاتا ہے کہ جو لوگ اس طرح کے عذاب میں مبتلا نہیں ہوئے ہیں ان کو دوبارہ اس دنیا میں لوٹا کر ان کو سزا دی جائے گی۔ (غور کیجئے)

یہاں یہ بھی احتمال پیدا ہوتا ہے کہ ان دو جمعیتوں کی بازگشت تاریخ بشریت کے اس خاص زمانہ میں (قیامت کے لئے) دو عظیم درس اور عظمت خدا کی دو نشانیاں ہوں گی، تاکہ مومنین ان کو دیکھنے کے بعد معنوی کمال اور ایمان کے بلند درجات تک پہنچ جائیں اور کسی طرح کی کوئی کمی باقی نہ رہ جائے۔ (۱)

(۱) تفسیر نمونہ، جلد ۱۵، صفحہ ۵۵۹

۹۳۔ توکل کی حقیقت اور اس کا فلسفہ کیا ہے؟

"توکل" دراصل "وکالت" سے مشتق ہے، اور وکیل انتخاب کرنے کے معنی میں ہے اور ہم جانتے ہیں کہ ایک اچھا وکیل وہی ہے جو کم از کم چار صفت کا حامل ہو۔

۱۔ضروری معلومات۔

۲۔امانت داری۔

۳۔ طاقت وقدرت۔

۴۔ ہمدردی۔

شاید اس بات کو بیان کرنے کی ضرورت نہ ہو کہ مختلف کاموں کے لئے ایک مدافع وکیل کا انتخاب اس موقع پر ہوتا ہے جہاں انسان ذاتی طور پر دفاع کرنے پر قادر نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ وہ اس موقع پر دوسرے کی قوت سے فائدہ حاصل کرتا ہے اور اس کی طاقت وصلاحیت کے ذریعہ اپنی مشکل حل کرتا ہے۔

لہٰذا خدا پر توکل کرنے کا اس کے علاوہ کوئی اور مفہوم نہیں ہے کہ انسان زندگی کی مشکلات و حوادث، مخالفین کی دشمنیوں اور سختیوں، پیچیدگیوں اور کبھی اہداف کے راستے میں حائل رکاوٹوں کو خود دور کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اسے اپنا وکیل قرار دے اور اس پر بھروسہ کرے اور خود بھی ہمت اور کوشش کرتا رہے بلکہ جہاں کسی کام کو خود انجام دینے کی طاقت رکھتا ہو وہاں بھی موثر حقیقی اخدا ہی کو

مانے کیونکہ اگر ایک موحد کی چشم بصیرت سے دیکھا جائے تو تمام قدرتوں اور قوتوں کا سرچشمہ وہی ہے۔

"تَوَکُّل عَلَی الله" کا نقطۂ مقابل یہ ہے کہ اس کے غیر پر بھروسہ کیا جائے، یعنی کسی غیر کے سہارے پر جینا، دوسرے سے وابستہ ہونا اور اپنی ذات میں استقلال و اعتماد سے عاری ہونا۔

علمائے اخلاق کہتے ہیں کہ توکل، براہ راست خدا کی توحید افعالی کا نتیجہ ہے کیونکہ جیسے ہم نے کہا ہے کہ ایک موحد کی نظر میں ہر حرکت، ہر کوشش، ہر جنبش اور اس عالم میں ہر چیز آخر کار اس جہان کی پہلی علت یعنی ذات خدا سے ربط رکھتی ہے، لہٰذا ایک موحد کی نگاہ میں تمام طاقتیں اور کامیابیاں اسی کی طرف سے ہیں۔

توکل کا فلسفہ

[قارئین کرام!] ہماری مذکورہ گفتگو پر توجہ کرنے سے معلوم ہوجاتا ہے

اور "تَوَکُّل عَلَی الله" زندگی کے سخت وقت و مشکلات میں اس ناقابل فنا مرکز قدرت پر توکل انسان کی استقامت و مقاومت کا سبب بنتا ہے یہی وجہ ہے کہ جب مسلمانوں نے میدان احد میں سخت ضرب کھائی اور دشمن میدان چھوڑنے کے بعد دوبارہ پلٹ آئے تاکہ مسلمانوں پر آخری ضرب لگائیں اور یہ خبر مسلمانوں کو پہنچی تو اس موقع پر قرآن کہتا ہے کہ صاحب ایمان افراد اس خطرناک لحہ میں وحشت زدہ نہ ہوئے جب کہ وہ اپنی فوجی قوت کا ایک اہم حصہ کھو چکے تھے بلکہ "توکل" اور قوت ایمانی نے ان کی استقامت میں اضافہ کردیا اور فاتح دشمن اس آمادگی کی خبر سنتے ہی تیزی سے پیچھے ہٹ گیا (سورہ آل عمران، آیت ۱۷۳)

توکل کے سائے میں اس استقامت کے نمونے متعدد آیات میں نظر آتے ہیں، ان میں سے سورہ آل عمران کی، آیت ۲۲ میں قرآن مجید کہتا ہے توکل علی اللہ نے مجاہدین کے دوگروہوں کو

میدان جہاد میں سستی سے بچایا۔

سورۂ ابراہیم کی، آیت نمبر۱۲ میں دشمن کے حملوں اور نقصانات کے مقابل میں توکل اور صبر کا باہم ذکر ہوا ہے۔

آل عمران کی آیت ۱۵۹ میں اہم کاموں کی انجام دہی کے لئے پہلے مشورہ اس کے بعد پختہ ارادہ اور پھر "**توکل علی اللہ**" کا حکم دیا گیا ہے، یہاں تک کہ قرآن کہتا ہے

﴿إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ﴾(۱)

"**شیطان ہرگز لوگوں پر غلبہ نہیں پاسکتا جو صاحبان ایمان ہیں اور جن کا اللہ پر توکل اور اعتماد ہے**"۔

ان آیات سے مجموعی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شدید مشکلات میں انسان ضعف اور کمزوری محسوس نہ کرے بلکہ اللہ کی بے انتہا قدرت پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو کامیاب اور فاتح سمجھے، گویا توکل امید آفریں، قوت بخش، تقویت پہنچانے والا اور استقامت میں اضافہ کرنے کا باعث ہے، توکل کا مفہوم اگر گوشہ نشینی اختیار کرنا اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانا ہوتا تو مجاہدین اور اس قسم کے لوگوں میں تحریک پیدا کرنے کا باعث نہ بنتا۔

اگر کچھ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ عام اسباب اور طبیعی عوامل کی طرف توجہ روح توکل سے مناسبت نہیں رکھتی تو وہ انتہائی غلط فہمی میں مبتلا ہیں، کیونکہ طبیعی عوامل کے اثرات کو ارادۂ الٰہی سے جدا کرنا ایک طرح کا شرک ہے، کیا ایسا نہیں ہے، کہ عوامل طبیعی کے پاس جو کچھ ہے وہ اسی کا ہے اور سب کچھ اسی کے ارادہ اور فرمان کے تحت ہے، البتہ اگر عوامل کو ایک مستقل طاقت سمجھ جائے اور انھیں اس کے ارادہ کے مدمقابل قرار دیا جائے تو یہ چیز روح توکل سے مطابقت نہیں رکھتی۔

---

(۱) سورۂ نحل، آیت ۹۹

یہ توکل کی یسی تفسیر کرنا کیسے ممکن ہے جبکہ خود متوکلین کے سید و سردار پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اہداف کی ترقی کے لئے کسی موقع پر صحیح منصوبہ، مثبت ٹکنیک اور مختلف ظاہری وسائل سے غفلت نہیں برتتے تھے۔

یہ سب چیزیں ثابت کرتی ہیں کہ توکل کا منفی مفہوم نہیں ہے۔

ثانیاً "توکّل علی اللہ" انسان کو ان وابستگیوں سے نجات دلاتا ہے جو ذلت و غلامی کا سرچشمہ ہیں اور اسے آزادی اور خود اعتمادی عطا کرتا ہے۔

"توکل" اور "قناعت" ہم ریشہ ہیں اور فطرتاً ان دونوں کا فلسفہ بھی کئی پہلوؤں سے ایک دوسرے سے مشابہت رکھتا ہے، اس کے باوجود ان میں فرق بھی ہے یہاں ہم چند اسلامی روایت پیش کرتے ہیں جن سے توکل کا حقیقی مفہوم اور اصلی بنیاد واضح ہو سکے۔

حضرت امام صادق علیہ السلام کا فرمان ہے "اِنَّ الغِنا وَالعِزَّ یَجُولان فَاِذا ظَفَرا بِمَوضِعِ التَّوَکّل وَطَنا"(۱) "بے نیازی اور عزت جستجو میں رہتی ہیں جہاں توکل کو پاتی ہیں وہیں ڈیرے ڈال دیتی ہے اور اسی مقام کو اپنا وطن بنا لیتی ہیں"۔

اس حدیث میں بے نیازی اور عزت کا اصلی وطن "توکل" بیان کیا گیا ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا

"جب بندہ اس حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے کہ مخلوق اس کو نقصان پہنچا سکتی ہے اور نہ فائدہ، تو وہ مخلوق سے توقع اٹھا لیتا ہے تو پھر وہ خدا کے علاوہ کسی کے لئے کام نہیں کرتا، اور اس کے سوا کسی سے اُمید نہیں رکھتا ہے، اور یہی حقیقت توکل ہے"۔(۲)

---

(۱)اصول کافی، جلد دوم، باب التفویض الی اللہ والتوکل علیہ، حدیث ۳

(۲)بحار الانوار، جلد۱۵، اخلاق کی بحث میں صفحہ۱۴ طبع قدیم

کسی نے حضرت امام علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام سے سوال کیا "مَا حَدُّ التَّوَکُّل" (توکل کی حد کیا ہے؟) تو آپ نے فرمایا "اِنْ لَا تَخَافَ مَعَ اللّٰہِ اَحداً" (۱) "خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے کسی سے نہ ڈرو"۔ (۲)(۳)

( ) سفینۃ البحار، جلد دوم، صفحہ ۶۸۲

(۲) توکل کے بارے میں مزید وضاحت کے لئے "تفسیر پیدائش مذہب" کی طرف رجوع فرمائیں

(۳) تفسیر نمونہ، جلد ۱۰، صفحہ ۲۹۵

۹۴۔ دعا وزاری کا فلسفہ کیا ہے؟

دعا کی حقیقت، اس کی روح اور اس کے تربیتی اور نفسیاتی اثر سے بے خبر لوگ دعا پر طرح طرح کے اعتراضات کرتے ہیں۔

کبھی کہتے ہیں یہ اعصاب کو کمزور اور بے حس کردیتی ہے کیونکہ ان کی نظر میں دعا لوگوں کو فعالیت، کوشش، ترقی اور کامیابی کے وسائل کے بجائے کسی راستہ پر لگا دیتی ہے، اور انھیں سعی و کوشش کے بدلے اسی پر اکتفا کرنے کا سبق دیتی ہے۔

کبھی کہتے ہیں دعا اصولی طور پر خدا کے معاملات میں بے جا دخل اندازی کا نام ہے، خدا جیسی مصلحت دیکھے گا اسے انجام دے گا، وہ ہم سے محبت کرتا ہے اور ہمارے مصالح و منافع کو بہتر جانتا ہے، پھر کیوں ہر وقت ہم اپنی مرضی اور پسند کے مطابق اس سے سوال کرتے رہیں؟!

کبھی کہتے ہیں ان تمام چیزوں کے علاوہ دعا ”ارادۂ الٰہی پر راضی رہنے اور اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے منافی ہے!

[قارئین کرام!] جو لوگ اس طرح کے اعتراضات کرتے ہیں وہ دعا اور تضرع وزاری کے نفسیاتی، اجتماعی، تربیتی اور معنوی و روحانی آثار سے غافل ہیں، انسان ”ارادہ کی تقویت اور دکھ درد کے دور ہونے کے لئے کسی سہارے کا محتاج ہے، اور دعا انسان کے دل میں امید کی کرن چمکا دیتی

ہے، جو لوگ دعا کو فراموش کئے ہوئے ہیں وہ نفسیاتی اور اجتماعی طور پر ناپسندیدہ عکس العمل سے دوچار ہوتے ہیں۔

ایک مشہور ماہر نفسیات کا کہنا ہے "کسی قوم میں دعا وتضرع کا فقدان اس ملت کی تباہی کے برابر ہے، جس قوم نے دعا کی ضرورت کے احساس کا گلا گھونٹ دیا ہے وہ عموماً فساد اور زوال سے محفوظ نہیں رہ سکتی"۔

البتہ اس بات کو نہیں بھولنا چاہئے کہ صبح کے وقت دعا اور عبادت کرنا اور باقی تمام دن ایک وحشی جانور کی طرح گزارنا، بیہودہ اور فضول ہے، دعا کو مسلسل جاری رہنا چاہئے، کیونکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ انسان اس کے عمیق اثر سے ہاتھ دھو بیٹھے۔(1)

جو لوگ دعا کو کاہلی اور سستی کا سبب سمجھتے ہیں وہ دعا کے معنی ہی نہیں سمجھے، کیونکہ دعا کا یہ مطلب نہیں کہ مادی وسائل و اسباب سے ہاتھ روک لیا جائے اور صرف دست دعا بلند کیا جائے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ تمام موجودہ وسائل کے ذریعہ اپنی پوری کوشش بروئے کار لائی جائے اور جب معاملہ انسان کے بس میں نہ رہے اور وہ مقصد تک نہ پہنچ پائے تو دعا کا سہارا لے، توجہ کے ساتھ خدا پر بھروسہ کرے اپنے اندر امید کی کرن پیدا کرے اور اس مبدأ عظیم کی بے پناہ نصرتوں کے ذریعہ مدد حاصل کرے۔

لہٰذا دعا مقصد تک نہ پہونچنے کی صورت میں ہے نہ کہ یہ فطری اسباب کے مقابلہ میں کوئی سبب ہے۔

مذکورہ ماہر نفسیات لکھتا ہے

"دعا انسان میں اطمینان پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ انسان کی فکر میں ایک طرح کی شگفتگی

---

(1) "نیایش" تالیف، طبیب و روانشناس مشہور "الکسیس کارل"

پیدا کرتی ہے، باطنی انبساط کا باعث بنتی ہے اور بعض اوقات یہ انسان کے لئے بہادری اور دلیری کی روح کو ابھارتی ہے، دعا کے ذریعہ انسان پر بہت سی علامات ظاہر ہوتی ہیں، جن میں سے بعض تو صرف دعا سے مخصوص ہیں، جیسے نگاہ کی پاکیزگی، کردار میں سنجیدگی، باطنی انبساط و مسرت، مطمئن چہرہ، استعداد ہدایت اور حوادث کا استقبال کرنے کا حوصلہ، یہ سب دعا کے اثرات ہیں، دعا کی قدرت سے پسماندہ اور کم استعداد لوگ بھی اپنی عقلی اور اخلاقی قوت کو بہتر طریقہ سے کارآمد بنالیتے ہیں اور اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں، لیکن افسوس کی بات ہے کہ ہماری دنیا میں دعا کے حقیقی رخ کو پہچاننے والے لوگ بہت کم ہیں"۔(۱)

[قارئین کرام!] ہمارے مذکورہ بیان سے اس اعتراض کا جواب واضح ہوجاتا ہے کہ دعا تسلیم و رضا کے منافی ہے، کیونکہ جیسا کہ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں دعا، پروردگار کے بے انتہا فیض سے زیادہ سے زیادہ کسب کمال کا نام ہے۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ انسان دعا کے ذریعہ پروردگار کی زیادہ سے زیادہ توجہ اور فیض کے حصول کی اہلیت اور استعداد حاصل کرلیتا ہے، اور یہ بات واضح ہے کہ تکامل کی کوشش اور زیادہ سے زیادہ کسب کمال کی سعی قوانین آفرینش کے سامنے تسلیم و رضا ہے، اس کے منافی نہیں ہے۔

ان سب کے علاوہ دعا ایک طرح کی عبادت، خضوع اور بندگی کا نام ہے، انسان دعا کے ذریعہ ذات الٰہی کے ساتھ ایک نئی وابستگی پیدا کرتا ہے، اور جیسے تمام عبادات تربیتی تاثیر رکھتی ہیں اسی طرح دعا میں بھی یہی تاثیر پائی جاتی ہے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ دعا امور الٰہی میں مداخلت ہے اور جو کچھ مصلحت کے مطابق ہو خدا

(۱) نیایش الکسیس کارل

عطا کردیتا ہے، چنانچہ وہ لوگ اس طرف متوجہ نہیں ہیں کہ عطیات خداوندی استعداد اور لیاقت کے لحاظ سے تقسیم ہوتے ہیں، جتنی استعداد اور لیاقت زیادہ ہوگی انسان کو عطیات بھی اسی لحاظ سے نصیب ہوں گے۔

اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت امام صادق علیہ السلام نے فرمایا: ''إنَّ عِنْدَ اللهِ عَزَّ وَ جَلَّ مَنْزِلَةً لاٰتُنَالُ اِلاّٰ بِمَسْاَلَةٍ'' ( )''خداوند عالم کے یہاں ایسے مقامات و منازل ہیں جو بغیر مانگے نہیں ملتے''۔

ایک دانشور کا کہنا ہے جس وقت ہم دعا کرتے ہیں تو اپنے آپ کو ایک ایسی لا متناہی قوت سے متصل کردیتے ہیں جس نے ساری کائنات کی اشیا کو ایک دوسرے سے پیوستہ کر رکھا ہے''۔(۲)

نیز موصوف کا کہنا ہے: ''آج کا جدید ترین علم یعنی علم نفسیات بھی یہی تعلیم دیتا ہے جو انبیاء کی تعلیم تھی، کیونکہ نفسیاتی ڈاکٹر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ دعا، نماز اور دین پر مستحکم ایمان؛ اضطراب، تشویش، ہیجان اور خوف کو دور کردیتا ہے جو ہمارے دکھ درد کا آدھے سے زیادہ حصہ ہے''۔(۳)

(۴)

---

(۱)اصول کافی، جلد دوم، صفحہ۳۳۸، باب فضل الدعاء و الحث علیہ، حدیث۳

(۲)آئین زندگی، صفحہ۵۶

(۳)آئین زندگی صفحہ۵۲

(۴)تفسیر نمونہ جلد اول، صفحہ۶۳۹

۹۵۔ کبھی کبھی ہماری دعا کیوں قبول نہیں ہوتی؟

دعا کی قبولیت کے شرائط کی طرف توجہ کرنے سے بھی بظاہر دعا کے پیچیدہ مسائل میں سے حقائق آشکار ہوتے ہیں اور اس کے اصلی اسرار واضح ہوجاتے ہیں، اس ضمن میں ہم چند احادیث پیش کرتے ہیں

۱۔ دعا کی قبولیت کے لئے ہر چیز سے پہلے دل اور روح کی پاکیزگی کی کوشش کرنا، گناہ سے توبہ اور اصلاح نفس ضروری ہے، اس سلسلہ میں خدا کے بھیجے ہوئے رہنماؤں اور رہبروں کی زندگی سے الہام وہدایت حاصل کرنا چاہئے۔ حضرت امام صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے، "جب تم میں سے کوئی اپنے رب سے دنیا وآخرت کی کوئی حاجت طلب کرنا چاہے تو پہلے خدا کی حمد وثنا کرے، پیغمبرؐ اوران کی آل پر درود بھیجے، اپنے گناہوں کا اعتراف کرے اور پھر اپنی حاجت طلب کرے" ( )

۲۔ اپنی زندگی کی پاکیزگی کے لئے غصبی مال اور ظلم وستم سے بچنے کی کوشش کرے، اور حرام غذا نہ کھائے، جیسا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے: "مَنْ اَحَبَّ اَنْ یُسْتَجَابَ دُعَائُہُ فَلْیُطِبْ مطعمہُ وَ مکسبہ" (۲) "جو شخص چاہتا ہے کہ اس کی دعا قبول ہو تو اس کے لئے اس کی غذا اور کاروبار کا حلال اور پاکیزہ ہونا ضروری ہے"۔

( ) سفینۃ البحار، جلد اول، صفحہ ۴۴۸، ۴۴۹

(۲) سفینۃ البحار، جلد اول، صفحہ ۴۴۸، ۴۴۹

۳۔ فتنہ وفساد کا مقابلہ کرے اور حق کی دعوت دینے میں کوتاہی نہ کرے کیونکہ جو لوگ امر بامعروف اور نہی عن المنکر کو ترک کردیتے ہیں ان کی دعا قبول نہیں ہوتی، جیسا کہ پیغمبر اسلام سے منقول ہے "امر بامعروف اور نہی عن المنکر ضرور کرو، ورنہ خدا برے لوگوں کو تمہارے اچھے لوگوں پر مسلط کردے گا، پھر تمہارے اچھے لوگ دعا کریں گے تو ان کی دعا قبول نہیں ہوگی"۔ (۱)

حقیقت میں یہ عظیم ذمہ داری جو ملت کی نگہبان ہے اسے ترک کرنے سے معاشرہ کا نظام درہم وبرہم ہوجاتا ہے جس کے نتیجہ میں بدکاروں کے لئے میدان خالی ہوجاتا ہے، اس صورت میں دعا اس کے نتائج کو زائل نہیں کرسکتی کیونکہ یہ کیفیت ان کے اعمال کا قطعی اور حتمی نتیجہ ہے۔

۴۔ دعا قبول ہونے کی ایک شرط خدا کی عہد وپیمان کو پورا کرنا ہے، ایمان، عمل صالح، امانت اور صحیح کام اس عہد وپیمان کا ایک حصہ ہیں، جو شخص اپنے پروردگار سے کئے گئے عہد کی پاسداری نہیں کرتا اسے یہ توقع نہیں ہونا چاہئے کہ پروردگار کی طرف سے دعا قبول ہونے کا وعدہ اس کے شامل حال ہوگا۔

کسی شخص نے امیر المومنین علی علیہ السلام کے سامنے دعا قبول نہ ہونے کی شکایت کرتے ہوئے کہا: خدا کہتا ہے کہ دعا کرو، میں تمہاری دعاؤں کو قبول کرتا ہوں، لیکن اس کے باوجود کیا وجہ ہے کہ ہم دعا کرتے ہیں اور وہ قبول نہیں ہوتی!

اس کے جواب میں امام علیہ السلام نے فرمایا: "إنَّ قُلُوبَكُم خانَ بِثَمانِ خِصالٍ" تمہارے دل ودماغ نے آٹھ چیزوں میں خیانت کی ہے، (جس کی وجہ سے تمہاری دعا قبول نہیں ہوتی):

۱۔ تم نے خدا کو پہچان کر اس کا حق ادا نہیں کیا، اس لئے تمہاری معرفت نے تمہیں کوئی فائدہ

(۱) سفینۃ البحار، جلد اول، صفحہ ۴۴۸ و ۴۴۹

نہیں پہنچایا۔

۲۔تم اس کے بھیجے ہوئے پیغمبرؐ پر ایمان تو لے آئے ہو لیکن اس کی سنت کی مخالفت کرتے ہو، ایسے میں تمہارے ایمان کا کیا فائدہ ہے؟

۳۔تم اس کی کتاب کو تو پڑھتے ہو مگر اس پر عمل نہیں کرتے، زبانی طور پر تو کہتے ہو کہ ہم نے سنا اور طاعت کی، لیکن عملی میدان میں اس کی مخالفت کرتے رہتے ہو!

۴۔تم کہتے ہو کہ ہم خدا کے عذاب سے ڈرتے ہیں لیکن اس کے باوجود اس کی نافرمانی کی طرف قدم بڑھاتے ہو اور اس کے عذاب سے نزدیک ہوتے رہتے ہو۔

۵۔تم کہتے ہو کہ ہم جنت کے مشتاق ہیں حالانکہ تم ہمیشہ ایسے کام کرتے ہو جو تمہیں اس سے دور لے جاتے ہیں....

۶۔نعمت خدا سے فائدہ اٹھاتے ہو لیکن اس کے شکر کا حق ادا نہیں کرتے!

۷۔اس نے تمہیں حکم دیا ہے کہ شیطان سے دشمنی رکھو (اور تم اس سے دوستی کا نقشہ بناتے رہتے ہو) تم شیطان سے دشمنی کا دعوی تو کرتے ہو لیکن عملی طور پر اس کی مخالفت نہیں کرتے۔

۸۔تم نے لوگوں کے عیوب کو اپنا نصب العین بنا رکھا ہے اور اپنے عیوب کو مڑ کر بھی نہیں دیکھتے....

ان حالات میں تم کیسے امید رکھتے ہو کہ تمہاری دعا قبول ہو جب کہ تم نے خود اس کی قبولیت کے دروازے بند کر رکھے ہیں۔

تقوی و پرہیزگاری اختیار کرو، اپنے اعمال کی اصلاح کرو، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو تاکہ تمہاری دعا قبول ہو سکے۔(۱)

---

(۱)سفینۃ البحار، جلد اول، صفحہ ۴۴۸

یہ پُرمعنی حدیث صراحت کے ساتھ اعلان کر رہی ہے

خدا کی طرف سے دعا قبول ہونے کا وعدہ مشروط ہے مطلق نہیں، بشرطیکہ تم اپنے عہد و پیمان پورا کرو جبکہ تم آٹھ طرح سے پیمان شکنی کرتے ہو، تم عہد شکنی نہ کرو تو تمہاری دعا قبول ہو جائے گی۔

مذکورہ آٹھ احکام جو دعا کی قبولیت کے شرائط ہیں انسان کی تربیت، اس کی توانائیوں کو اصلاح کرنے اور اسے ثمر بخش بنانے کے لئے کافی ہیں۔

۵۔ دعا کی قبولیت کے لئے ایک شرط یہ ہے کہ دعا عمل اور کوشش کے ہمراہ ہو، حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کے کلمات قصار میں بیان ہوا ہے "الداعی بلا عمل کالرامی بلا وتر"(۱)(عمل کے بغیر دعا کرنے والا بغیر کمان کے تیر چلانے والے کے مانند ہے)۔

اس چیز کی طرف توجہ رکھنا چاہئے کہ چلہ کمان تیر کے لئے عامل حرکت اور ہدف کی طرف پھینکنے کا وسیلہ ہے اس سے تاثیر دعا کے لئے عمل کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔

مذکورہ پانچوں شرائط سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ دعا عمل و اسباب کے بجائے دعا قبول نہیں ہوتی بلکہ قبولیت دعا کے لئے دعا کرنے والے کی زندگی میں ایک مکمل تجدید بھی ضروری ہے، اسے اپنی فکر کو نئے سانچے میں ڈھلنا چاہئے اور اسے اپنے گزشتہ اعمال پر تجدید نظر کرنا چاہئے۔

ان تمام مطالب کے پیش نظر دعا کو اعصاب کمزور کرنے والی اور کاہلی کا سبب قرار دینا کیا بے خبری اور غفلت نہیں ہے؟! اور کیا یہ تہمت کسی غرض کے لئے نہیں ہے؟!(۲)

(۱) نہج البلاغہ حکمت نمبر ۳۳۷

(۲) تفسیر نمونہ، جلد اول، صفحہ ۶۳۳

۹۶۔ جبر اور اختیار کے سلسلہ میں اسلام کا نظریہ کیا ہے؟

علمائے اسلام کے درمیان یہ مسئلہ زمانہ قدیم سے مورد نزاع رہا ہے، ایک جماعت انسان کی آزادی اور اختیار کی قائل ہے جبکہ دوسرا گروہ جبر کے نظریہ کا طرفدار ہے، اور ہر جماعت اپنے مقصد کے اثبات کے لئے دلائل پیش کرتی ہے۔

لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ "جبر کے قائل" بھی اور "اختیار کے طرفدار" بھی مقام عمل میں اختیار اور آزادی کو ہی صحیح مانتے ہیں، یا دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ یہ تمام بحث و گفتگو صرف علمی میدان تک ہے مقام عمل میں نہیں، جس سے بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ تمام انسانوں میں آزادی اور اختیار اصل ہے، اور اگر اس سلسلہ میں مختلف وسوسے نہ پائے جائیں تو سبھی انسان آزادی اور اختیار کے طرفدار رہوں گے۔

عام فکر و خیال اور فطرت انسان "نظریہ اختیار" کی واضح دلیل ہے، جو انسانی زندگی کے مختلف مواقع پر جلوہ گر ہے، کیونکہ اگر انسان اپنے اعمال میں خود کو مجبور سمجھے اور اپنے لئے اختیار کا قائل نہ ہو، تو پھر کیوں

انسان اپنے کئے ہوئے بعض کاموں پر یا بعض کاموں کے نہ کرنے پر پشیمان اور شرمندہ ہوتا ہے، اور یہ طے کرلیتا ہے کہ اپنے گزشتہ تجربات سے فائدہ اٹھائے، "جبر کا عقیدہ رکھنے والوں" کو

[بھی] یہ شرمندگی بہت سے موارد میں پیش آتی ہے، گر نظریہ اختیار صحیح نہیں ہے تو پھر یہ شرمندگی کیسی؟!

۲۔ بُرے لوگوں کی سب مذمت کرتے ہیں، اگر جبر کا نظریہ صحیح ہے تو مذمت کیسی؟!

۳۔ نیک اور اچھے لوگوں کی سب تعریفیں کرتے ہیں، گر جبر کا نظریہ صحیح ہے تو تعریف کیوں؟!

۴۔ سبھی اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت میں کوشش کرتے ہیں تا کہ وہ خوش بخت ہو جائیں، گر سبھی مجبور ہیں تو پھر تعلیم و تربیت کیا معنی رکھتی ہے؟!

۵۔ معاشرہ میں اخلاق سطح کو بلند کرنے کے لئے سبھی علماء و دانشور کوشش کرتے ہیں۔

۶۔ انسان اپنی خطاؤں سے توبہ کرتا ہے، لیکن گر جبر کے نظریہ کو قبول کیا جائے تو پھر توبہ کی کیا حیثیت ہے؟!

۷۔ نسان اپنی کوتاہی اور خامیوں پر حسرت اور افسوس کرتا ہے، کیوں؟

۸۔ پوری دنیا میں مجرم اور بُرے لوگوں کو سزا ملتی ہے اور سختی کے ساتھ سوال و جواب ہوتے ہیں، لیکن جو کام ان کے اختیار میں نہیں ہے تو پھر یہ سزا اور بازپرس کیسی؟!

۹۔ پوری دنیا اور تمام مذہب و ملت میں چاہے وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم سبھی کے یہاں مجرموں کے لئے سزا معین ہے، لیکن انسان جس کام پر مجبور ہو تو پھر سزا کیسی؟!

۱۰۔ یہاں تک کہ جبری مکتب کے قائل لوگوں کا گر کوئی نقصان کر دیتا ہے یا کوئی ان پر ظلم و ستم کرتا ہے تو ان کی فریاد بلند ہو جاتی ہے، اس کو خطا کار شمار کرتے ہیں اور اس کو عدلیہ تک لے جاتے ہیں!

خلاصہ یہ کہ گر حقیقت میں انسان مختار نہیں ہے تو پشیمانی کیوں؟!

مذمت اور ملامت کس لئے؟ گر کسی کا ہاتھ بے اختیار لرزتا ہو تو کیا اس کو مذمت کی جائے

گی؟

کیوں نیک افراد کی مدح وثنا کی جاتی ہے، کیا انھوں نے اپنے اختیار سے کچھ کیا ہے جو نیک کام کی طرف ترغیب دلانے سے نیک کام کرتے رہتے ہیں؟!

اصولی طور پر تعلیم وتربیت کی تاثیر کو قبول کرتے ہوئے جبری نظریہ کا کوئی مفہوم ہی باقی نہیں رہتا۔

اس کے علاوہ آزادی وراختیار کو قبول کئے بغیر اخلاقی مسائل کا ہرگز کوئی مفہوم نہیں نکلتا۔

اگر ہم اپنے کاموں میں مجبور ہوں تو پھر توبہ کیوں؟ کیوں حسرت کی جائے؟اس لحاظ سے مجبور شخص کو سزا دینا سب سے بڑا ظلم ہے۔

یہ سب چیزیں واضح کرتی ہیں کہ تمام انسانوں میں آزادی اور اختیار اصل ہے، اور نوع بشر کا دل بھی اسی چیز کی گواہی دیتا ہے، نہ صرف عوام الناس بلکہ تمام علما اور فلاسفہ مقام عمل میں اسی طرح ہیں، یہاں تک کہ جبری نظریہ رکھنے والے بھی مقام عمل میں اختیار کے نظریہ کو مانتے ہیں

”اَلْجَبرِیُّوْنَ اِخْتِیَارِیُّوْنَ مِنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ!“

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن مجید نے اس مسئلہ پر بارہا تاکید کی ہے، ارشاد خداوندی ہے ﴿فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّهِ مَآبًا﴾(۱) ”[یہی برحق دن ہے] تو جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف ٹھکانا بنا لے“۔

قرآن مجید کی دیگر آیات میں انسان کے ارادہ واختیار پر بہت زیادہ اعتماد کیا گیا ہے، اس سب کو یہاں بیان کرنے کا موقع نہیں ہے صرف دو آیتوں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے:

---

(۱) سورۂ نبا، آیت ۳۹

﴿إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا﴾(۱) ”یقیناً ہم نے انسان کو راستہ کی ہدایت دے دی ہے چاہے وہ شکر گزار ہو جائے یا کفرانِ نعمت کرنے والا ہو جائے“۔

اسی طرح ایک دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے ﴿فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ﴾(۲) ”اب جس کا جی چاہے ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے کافر ہو جائے“۔ (لیکن معلوم ہونا چاہئے کہ ہم نے کافروں کے لئے دردناک عذاب مہیا کر رکھا ہے)

”جبر وتفویض“ کے سلسلہ میں گفتگو بہت طویل ہے، اس سلسلہ میں بہت سی کتابیں اور مقالات لکھے گئے ہیں، لیکن اس مسئلہ میں صرف قرآن ووجدان کی روشنی میں لکھا گیا ہے، ہم اس گفتگو کو ایک ”اہم نکتہ“ کی یاددہانی کے ساتھ آگے بڑھاتے ہیں۔

مسئلہ جبر سے ایک گروہ کی طرفداری فلسفی یا استدلالی مشکلات کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ اس عقیدہ کی پیدائش میں اجتماعی اور نفسیاتی عوامل کا دخل تھا۔

”جبر“ یا ”جبری زندگی“ اور جبر کے معنی میں ”قضا وقدر“ کا عقیدہ رکھنے والے متعدد افراد بعض ذمہ داریوں سے فرار کرنے کے لئے اس عقیدہ کا سہارا لیتے ہیں، جو اس عقیدہ کی آڑ میں ہر غلط کام اور شکست کی توجیہ کرنا چاہتے ہیں جو خود ان کی سستی اور کاہلی کی بنا پر ہوتا تھا۔

یا اپنی ہوس اور بے راہ روی پر اس عقیدہ کا پردہ ڈال کر ہر کام کو جائز کرنا چاہتے تھے۔

اور کبھی استعمار، عوام الناس کی تحریک کو کچلنے اور قوم وملت کے قہر وغضب کی آگ کو خاموش کرنے کے لئے اپنے عقیدہ کو لوگوں پر حمل کرتا ہے کہ شروع سے تمہاری قسمت میں یہی تھا لہٰذا اس پر راضی اور تسلیم ہونے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں!

---

(۱) سورۂ دہر، آیت ۳

(۲) سورۂ کہف، آیت ۲۹

اس [غلط] نظریہ کے تحت اپنے تمام ظلم وستم اور غلط اعمال کی توجیہ کر لیتے ہیں، اور سبھی گناہگاروں کے گناہوں کی منطقی اور عقلی توجیہ ہو جاتی ہے، اس صورت میں طاعت گزار اور مجرم کے درمیان کوئی فرق ہی نہیں رہ جاتا۔(۱)

انسان کی آزادی اور اختیار کے لئے سورہ فصلت کی یہ آیہ کریمہ واضح دلیل ہے: ﴿وَمَا رَبُّکَ بِظَلَّامٍ لِلْعَبِیدِ﴾ (۲) یہ آیہ شریفہ اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ خداوند عالم کسی کو بلاوجہ عذاب نہیں دیتا اور نہ ہی کسی کے عذاب میں دلیل کے بغیر اضافہ کرتا، اس کے کام صرف عدالت پر مبنی ہوتے ہیں، کیونکہ ظلم وستم کا سرچشمہ کمی اور خامی جہل و نادانی یا ہوائے نفس ہوتے ہیں، جبکہ خداوند عالم کی ذات قدس ان تمام چیزوں سے پاک ومنزہ ہے۔

قرآن مجید اپنی واضح آیات (بینات) میں ''جبری نظریہ'' (جس کے پیش نظر معاشرہ میں ظلم وفساد پھیلتا ہے، برائیوں کی تائید ہوتی ہے اور انسان ہر طرح کی ذمہ داری سے بچ جاتا ہے) کو باطل قرار دیتی ہیں، اور سبھی انسانوں کو اپنے اعمال کا ذمہ دار شمار کرتی ہیں اور ہر انسان کے اعمال کے نتائج [جزا یا سزا] اسی کی طرف پلٹتے ہیں۔

حضرت امام علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام سے منقول ایک حدیث میں بیان ہوا ہے، کہ آپ کے ایک صحابی نے سوال کیا ''هَلْ یجبرُ اللهُ عبادَه علی المعاصی؟ فقالَ لا، بل یُخیّرُهُم و یُمهِلُهُم حتی یَتُوبُوا''

''کیا خداوند عالم اپنے بندوں کو گناہوں پر مجبور کرتا ہے؟ تو امام علیہ السلام نے فرمایا نہیں، بلکہ ان کو آزاد چھوڑ دیتا ہے اور ان کو مہلت دیتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنے گناہوں سے توبہ کرلیں''

---

(۱) تفسیر نمونہ، جلد ۲۶، صفحہ ۹۶

(۲) سورۂ فصلت، آیت ۴۶۔ ''اور آپ کا پروردگار بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے''

اس صحابی نے دوبارہ سوال کیا "هل کلف عباده ما لا یطیقون؟" "کیا خداوند عالم اپنے بندوں کو "تکلیف ما لا یطاق" دیتا ہے؟ [یعنی ایک چیز کے انجام دینے کے لئے کہتا ہے جس کی انسان میں طاقت نہ ہو۔]

اس وقت امام علیہ السلام نے جواب میں فرمایا "کیف یفعل ذلک؟ و هو یقول ﴿وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِلْعَبِيدِ﴾(۱) "وہ کس طرح یہ کر سکتا ہے جبکہ خود اس نے فرمایا ہے: اور آپ کا پروردگار بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے"۔

اس کے بعد امام علیہ السلام نے مزید فرمایا ہمارے پدر بزرگوار موسیٰ بن جعفر علیہ السلام نے اپنے پدر بزرگوار جعفر بن محمد علیہ السلام سے اس طرح نقل فرمایا ہے: "جو شخص یہ گمان کرے کہ خداوند عالم اپنے بندوں کو گناہوں پر مجبور کرتا ہے یا تکلیف ما لا یطاق دیتا ہے، تو ایسے شخص کے ہاتھوں کا ذبیحہ نہ کھاؤ، اس کی گواہی قبول نہ کرو، اس کے پیچھے نماز نہ پڑھو، اور اس کو زکوٰۃ نہ دو، (خلاصہ یہ کہ اس پر اسلام کے احکام جاری نہ کرو)(۲)

[قارئین کرام!] مذکورہ حدیث سے ضمنی طور پر یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ ایک ظریف نکتہ ہے کہ "مکتب جبری" تکلیف ما لا یطاق کا دوسرا چہرہ ہے، کیونکہ اگر انسان ایک طرف گناہ کرنے پر مجبور ہو اور دوسری طرف اس کو نہی کی جائے تو یہ تکلیف ما لا یطاق کا واضح مصداق ہوگا۔(۳)

اسی طرح قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے ﴿إِنَّ هَٰذِهِ تَذْكِرَةٌ فَمَن شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا﴾(۴) "بے شک یہ ایک نصیحت کا سامان ہے اب جس کا جی چاہے اپنے پروردگار کے راستہ

---

(۱) سورۂ فصلت، آیت ۴۶

(۲) عیون اخبار الرضا، نور الثقلین، جلد ۲، صفحہ ۵۵ کے نقل کے مطابق

(۳) تفسیر نمونہ، جلد ۲۰، صفحہ ۳۰۸ (۴) سورۂ انسان [دہر]، آیت ۲۹

کو اختیار کرلے"، (یہ خود یک یاددہانی ہے جس کے ذریعہ انسان خداوندعالم کے بتائے ہوئے راستہ کا انتخاب کرسکتا ہے)

اور چونکہ ممکن تھا کہ کم ظرف لوگ اس مذکورہ تعبیر سے مطلق طور پر "تفویض" کا تصور کریں، اسی وجہ سے بعد والی آیت میں "تفویض" کی نفی کے لئے ارشاد ہوا ہے ﴿وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللّٰهُ﴾ "اور تم لوگ صرف وہی چاہتے ہو جو پروردگار چاہتا ہے"۔ "بے شک اللہ ہر چیز کا جاننے والا اور صاحب حکمت ہے"۔ ﴿إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا﴾ (۱)

دراصل یہ مشہور ومعروف قاعدہ "الامر بین الامرین" [۲] کا اثبات ہے، ایک طرف تو خداوندعالم فرماتا ہے "خدا نے راستہ دکھا دیا ہے، راستہ کا انتخاب تمہارا کام ہے"، دوسری طرف فرماتا ہے: "تمہارا انتخاب مشیت الٰہی پر موقوف ہے" یعنی تم مکمل طور پر استقلال نہیں رکھتے بلکہ تمہاری قدرت، آزادی اور ارادہ خدا کی مرضی اور اس کی طرف سے ہے، وہ جس وقت بھی ارادہ کرے تمہاری قدرت اور آزادی کو سلب کرسکتا ہے۔

اس لحاظ سے نہ مکمل "تفویض" ہے اور نہ "جبر" اور سلب اختیار، بلکہ ان دونوں کے درمیان ایک دقیق ولطیف حقیقت ہے، بالفاظ دیگر ایک قسم کی آزادی ہے لیکن مشیت الٰہی سے وابستہ، یعنی جب بھی خدا چاہے اس آزادی کو واپس لے سکتا ہے، تاکہ بندگان خدا تکالیف اور ذمہ داریوں کا احساس کریں دوسری طرف سے خدا سے بے نیازی کا تصور بھی پیدا نہ ہو۔

مختصر یہ تعبیرات اس وجہ سے ہیں کہ بندے ہدایت، حمایت، توفیق اور تائید ذات مقدس سے بے نیازی کا تصور نہ کریں، اپنے کاموں کے عزم وارادہ کو خداوندعالم کے سپرد کریں اور اس کی حمایت کے زیر سایہ قدم اٹھائیں۔

---

(۱) سورہ انسان [دہر] آیت ۳۰

[۲] یعنی نہ جبر ہے اور نہ تفویض، بلکہ ان دونوں کا درمیانی راستہ صحیح ہے

یہاں سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ بعض جبری مسلک رکھنے والے مفسرین اس آیت کا سہارا لیتے ہیں البتہ وہ اس مسئلہ میں پہلے سے فیصلہ کر چکے ہیں، (یعنی جبری نظریہ کو پہلے سے قبول کر چکے ہیں) جیسا کہ فخر رازی کا کہنا ہے "واعلم انّ ھذہ الآیۃ من جملۃ الآیات التی تلاطمت فیھا أمواج الجبر و القدر" (۱) "جاننا چاہیے کہ یہ آیت ان آیات میں سے ہے جن میں "جبر" کی موجیں متلاطم ہیں"، ہاں! اگر اس آیت کو پہلی آیت سے الگ کریں تو اس طرح کا وہم وگمان کیا جاسکتا ہے لیکن چونکہ ایک آیت میں "اختیار" کی تاثیر کو بیان کیا گیا ہے اور دوسری آیت میں "مشیت پروردگار" کی تاثیر کو بیان کیا گیا ہے، جس سے "امر بین الامرین" کا مسئلہ ثابت ہو جاتا ہے۔

عجیب بات تو یہ ہے کہ "تفویض" کے طرفدار افراد پہلی آیت کو دلیل قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ آیت "مطلق اختیار" کو بیان کرتی ہے، جبکہ "جبر" کے طرفدار بھی اس آیت، کہ جس سے صرف جبر کی بو آتی ہے، تمسک کرتے ہیں اور دونوں پہلے سے اپنے کئے ہوئے فیصلہ کی توجیہ کرتے ہیں، جبکہ کلام الٰہی (بلکہ کسی بھی کلام) کو صحیح سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اپنے نظریہ کو دور رکھیں اور تعصب سے کام نہ لیتے ہوئے فیصلہ کریں۔ آیت کے ذیل میں فرمایا گیا ہے **﴿ان اللہ کان علیماً حکیماً﴾** جو اسی بات کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے کیونکہ خداوند عالم کی حکمت اور اس کا علم اس بات کا موجب ہے کہ انسان کمال اور ترقی کی منزلوں کو طے کرنے میں آزاد ہے ورنہ اجباری تکامل وترقی کوئی کمال نہیں ہے۔

اس کے علاوہ خداوند عالم کا علم اور اس کی حکمت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ کچھ لوگوں کو نیک کام پر مجبور کرے اور کچھ لوگوں کو برے کاموں پر مجبور کرے، پہلے گروہ کو جزا یا انعام دے اور دوسرے گروہ کو سزا اور عذاب میں مبتلا کرے۔ (۲)

(۱) تفسیر فخر رازی، جلد ۳۰، صفحہ ۲۶۲

(۲) تفسیر نمونہ، جلد ۲۵، صفحہ ۳۸۵

۹۶۔ کیا نظر بد کی کوئی حقیقت ہے؟

جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَإِنْ يَكَادُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَيُزْلِقُونَكَ بِأَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ﴾(۱) ''اور یہ کفار قرآن کو سنتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ عنقریب آپ کو نظروں سے پھسلا دیں گے''۔

اس آیت کے پیش نظر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا نظر بد کی کوئی حقیقت ہے؟

بہت سے لوگوں کا ماننا ہے کہ بعض لوگوں کی آنکھوں میں ایک مخصوص اثر ہوتا ہے کہ جس وقت وہ کسی چیز کو تعجب کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو ممکن ہے وہ خراب ہو جائے یا نیست و نابود ہو جائے، یا اگر کسی انسان کو اس نگاہ سے دیکھے تو یہ وہ بیمار یا پاگل ہو جائے۔

عقلی لحاظ سے یہ مسئلہ محال نہیں ہے کیونکہ آج کل کے متعدد دانشوروں کا ماننا ہے کہ بعض لوگوں کی آنکھوں میں ایک مقناطیسی طاقت ہوتی ہے جس سے بہت کام لیا جا سکتا ہے، یہاں تک کہ اس کی تمرین اور ممارست سے اس میں اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے، ''مقناطیسی نیند'' [ہپناٹزم Hypnotism] بھی آنکھ کی اسی مقناطیسی طاقت کے ذریعہ ہوتی ہے۔

آج جبکہ ''لیزری شعاعیں'' دکھائی نہ دینے والی ہریں ہیں یہ کام کرتی ہیں جو کسی خطرناک

---

(۱) سورہ قلم آیت ۵

اور تباہ کن ہتھیار سے نہیں ہو سکتا، تو بعض لوگوں کی آنکھوں میں اس طاقت کا پایا جانا جو مخصوص لہروں کے ذریعہ مد مقابل پر اثر انداز ہوتی ہے، جائے تعجب نہیں رہ جاتا۔

متعدد لوگوں نے یہ بیان کیا ہے کہ ہم نے خود اپنی آنکھوں سے بعض لوگوں کی آنکھوں میں ایسی طاقت کا مشاہدہ کیا ہے جنھوں نے اپنی نظر سے انسان یا حیوان یا دوسری چیزوں کو نیست و نابود کر دیا ہے۔

لہٰذا نہ صرف اس چیز کے انکار پر اصرار کیا جائے بلکہ عقلی اور علمی لحاظ سے اس کو قبول کیا جانا چاہئے۔

بعض اسلامی روایات میں بھی ایسے الفاظ ملتے ہیں جن سے اجمالی طور پر اس چیز کی تائید ہوتی ہے۔

چنانچہ ایک حدیث میں بیان ہوا ہے کہ **"اسماء بنت عمیس"** نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کی جعفر کے بچوں کو نظر لگ جاتی ہے کیا میں ان کے لئے 'رقیہ' لے لوں ("رقیہ" اس دعا کو کہتے ہیں جو نظر لگنے سے روکنے کے لئے لکھی جاتی ہے، اور اس کا تعویذ بنایا جاتا ہے)

تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "نَعَمْ، فَلَوْ كَانَ شَيْءٌ يَسْبِقُ الْقَدَرَ لَسَبَقَهُ الْعَيْنُ" (۱) "ہاں، کوئی حرج نہیں ہے، اگر کوئی چیز قضا و قدر پر سبقت لینے والی ہوتی تو وہ نظر بد ہوتی ہے"۔

ایک دوسری حدیث میں بیان ہوا ہے کہ حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام نے فرمایا: پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امام حسن اور امام حسین علیہما السلام کے لئے تعویذ بنایا اور اس دعا کو پڑھا: "**أُعِيذُكُمَا بِكَلِمَاتِ التَّامَّةِ وَ أَسْمَاءِ اللّٰهِ الْحُسْنٰى كُلِّهَا عَامَّةً، مِنْ شَرِّ السَّامَّةِ وَ الْهَامَّةِ، وَ مِنْ**

(۱) مجمع البیان، جلد ۱۰، صفحہ ۳۴۱

شَرِّ كُلِّ عَيْنٍ لَامَّةٍ، وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ" (تمہیں تمام کلمات اور اللہ کے اسماء حسنیٰ کی پناہ میں دیتا ہوں، بری موت، موذی حیوانات، بری نظر اور حسد کرنے والے کے شر سے)، اور اس کے بعد ہماری طرف دیکھ کر فرمایا "جناب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے اسماعیل اور اسحاق کے لئے یہی تعویذ بنایا تھا۔(۱)

اسی طرح نہج البلاغہ میں بیان ہوا ہے "الْعَيْنُ حَقٌّ وَ الرُّقَى حَقٌّ" (۲) چشم بد اور دعا کے ذریعہ اس کو دفع کرنا حقیقت رکھتے ہیں" (۳)

---

(۱) نورالثقلین، جلد۵، صفحہ۴۰۰

(۲) نہج البلاغہ، کلمات قصار، نمبر ۴۰۰ (یہ حدیث صحیح بخاری جلد ۷، صفحہ ۱۷۱، باب "العین حق" میں بھی اسی صورت سے نقل ہوئی ہے "العین حق")، نیز "معجم الفاظ حدیث النبوی" میں بھی مختلف منابع سے اس حدیث کو نقل کیا گیا ہے، (جلد ۴، صفحہ ۴۲۵)

(۳) تفسیر نمونہ، جلد ۲۴، صفحہ ۴۶۶

۹۸۔ کیا فال نیک اور بدشگونی حقیقت رکھتے ہیں؟

شاید ہمیشہ سے مختلف قوم و ملت کے درمیان فال نیک اور بدشگونی کا رواج پایا جاتا ہے بعض چیزوں کو "فال نیک" قرار دیتے ہیں جس کو کامیابی کی نشانی اور بعض چیزوں کو "بدشگونی" ناکامی اور شکست کی نشانی سمجھتے تھے، جبکہ ان چیزوں کا کامیابی اور شکست سے کوئی منطقی تعلق نہیں پایا جاتا، خصوصاً بدشگونی کے سلسلہ میں بہت سی نامعقول اور خرافات قسم کی چیزیں رائج ہیں۔

اگرچہ ان دونوں کا طبیعی اثر نہیں ہے لیکن نفسیاتی اثر ہوسکتا ہے، فال نیک انسان کے لئے امید اور تحریک کا باعث ہے اور بدشگونی ناامیدی اور سستی کا سبب بن سکتی ہے۔

شاید اسی وجہ سے اسلامی روایات میں فال نیک سے ممانعت نہیں کی گئی ہے لیکن فال بد اور بدشگونی کے لئے شدت سے ممانعت کی گئی ہے، چنانچہ ایک مشہور و معروف حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے "تَفَأَلُوا بِالخَیرِ تَجِدُوهُ"، اپنے کاموں میں فال نیک کرو (اور امیدوار رہو) تاکہ اس کے انجام تک پہنچ جاؤ) اس حدیث میں اس موضوع کا مثبتی پہلو منعکس ہے، اور خود آنحضرت ﷺ، ائمہ دین علیہم السلام کے حالات میں بھی یہ چیز دیکھنے میں آئی ہے کہ یہ حضرات بعض مسائل کو فال نیک سمجھتے تھے، مثال کے طور پر جب سرزمین "حدیبیہ" میں مسلمان کفار کے مقابل قرار پائے اور "سہیل بن عمرو" کفار مکہ کا نمائندہ بن کر پیغمبر اکرم ﷺ کے پاس آیا، جب آنحضرت ﷺ اس کے نام سے باخبر ہوئے تو فرمایا "قَدْ سَهُلَ عَلَیکُم أَمْرُکُمْ" (یعنی میں

"تسہیل" کے نام سے تفأل کرتا ہوں کہ تمہارا کام سہل اور آسان ہوگا"۔(۱)

چھٹی صدی ہجری کے "دمیری" نامی مشہور ومعروف دانشور مؤلف نے اپنی ایک تحریر میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ اس وجہ سے فالِ نیک کیا کرتے تھے کیونکہ جب انسان فضل پروردگار کا امیدوار ہوتا ہے تو راہ خیر میں قدم بڑھاتا ہے لیکن جب رحمت پروردگار کی امید ٹوٹ جاتی ہے تو پھر برے راستہ پر لگ جاتا ہے، اور فال بد یا بدشگونی کرنے سے بدگمانی پیدا ہوتی ہے اور انسان بد اور بدبختی سے خوف زدہ رہتا ہے۔(۲)

فال بد یا بدشگونی کے بارے میں اسلامی روایات نے بہت شدت کے ساتھ مذمت کی ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کی مذمت کی ہے(۳)، نیز پیغمبر اکرم ﷺ کی ایک حدیث میں بیان ہوا ہے "الطِّیَرَةُ شِرْکٌ"(۴) (بدشگونی کرنا (اور انسان کی زندگی میں اس کو موثر ماننا) ایک طرح سے خدا کے ساتھ شرک ہے)

اسی طرح ایک دوسری جگہ بیان ہوا ہے کہ اگر بدشگونی کا کوئی اثر ہے تو وہ نفسیاتی اثر ہے، حضرت امام صادق علیہ السلام نے فرمایا "بدشگونی کا اثر اسی مقدار میں ہے جتنا تم اس کو قبول کرتے ہو، اگر اس کو کم اہمیت مانو گے تو اس کا اثر کم ہوگا اور اگر اس سلسلہ میں تم بہت معتقد ہوگے تو اس کا اثر بھی اتنا ہی ہوگا، اور اگر اس کی بالکل پروا نہ کرو تو اس کا بھی کوئی اثر نہیں ہوگا"۔(۵)

اسلامی روایات میں پیغمبر اکرم ﷺ سے نقل ہوا ہے کہ بدشگونی سے مقابلہ کرنے کے لئے بہترین راستہ یہ ہے کہ اس پر توجہ نہ کی جائے، چنانچہ پیغمبر اکرم ﷺ سے منقول ہے "تین

(۱) المیزان، جلد ۱۹، صفحہ ۸۶

(۲) سفینۃ البحار، جلد دوم، صفحہ ۱۰۲

(۳) مثلاً سورۂ یٰس، آیت ۱۹، سورۂ نمل آیت ۴۷، سورۂ اعراف آیت ۱۳۱۔

(۵،۴) المیزان، محل بحث آیت کے ذیل میں

چیزوں سے کوئی بھی نہیں بچ سکتا، (جنات کا وسوسہ، کثر لوگوں کے دلوں پر ثر کر جاتا ہے) فال بد یا بد شگونی، حسد اور سوءِ ظن، صحابہ نے سوال کیا کہ ان سے بچنے کے لئے ہم کیا کریں؟ تو آنحضرتؐ نے فرمایا جب کوئی تمہارے لئے بدشگونی کرے تو اس پر توجہ نہ کرو، جس وقت تمہارے دل میں حسد پیدا ہو تو اس کے مطابق عمل نہ کرو، ور جب تمہارے دل میں کسی کی طرف سے سوءِ ظن ور بدگمانی پیدا ہو تو اس کو نظر انداز کر دو۔"

عجیب بات تو یہ ہے کہ یہ فال نیک ور بدشگونی کا موضوع ترقی یافتہ ممالک ور روشن فکر یہاں تک کہ مشہور و معروف نابغہ فراد کے یہاں بھی پایا جاتا ہے، مثال کے طور پر مغربی ممالک میں زینے کے نیچے سے گزرنا، یا نمکدانی کا گرنا یا تحفہ میں چاقو دینا وغیرہ کو بدشگونی کی علامت سمجھا جاتا ہے!

البتہ فال نیک کا مسئلہ کوئی اہم نہیں بلکہ اکثر اوقات س کا اثر مثبت ہوتا ہے، لیکن بدشگونی سے مقابلہ کرنا چاہئے ور اپنے ذہن سے دور کرنا چاہئے، جس کا بہترین راستہ یہ ہے کہ انسان خداوند عالم پر توکل اور بھرپور بھروسہ رکھے، جیسا کہ اسلامی روایات میں س چیز کی طرف شارہ بھی کیا گیا ہے۔ (۱)

---

(۱) تفسیر نمونہ، جلد ۶، صفحہ ۳۷

۹۹۔ کیا تمام اصحاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نیک افراد تھے؟

"پہلے مہاجرین" کے لئے قرآن کی بیان کردہ عظمت کے پیش نظر بعض برادران اہل سنت یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ وہ لوگ آخری عمر تک کوئی خلاف [شرع] کام نہیں کر سکتے، لہٰذا کسی چون وچرا کے بغیر سب کو قابل احترام شمار کیا جائے، اس کے بعد اس موضوع کو تمام "اصحاب" کے لئے عام کر دیا چونکہ "بیعت رضوان" میں صحابہ کی مدح کی گئی ہے، لہٰذا ان کی نظر میں اصحاب کے متعلق کوئی تنقید قابل قبول نہیں ہے چاہے ان کے اعمال کیسے ہی ہوں!

جیسا کہ مشہور مفسر مؤلف المنار شیعوں پر شدید اعتراض کرتے ہیں کہ یہ لوگ مہاجرین پر کیوں انگلی اٹھاتے ہیں، اور ان پر کیوں تنقید کرتے ہیں" جبکہ وہ اس بات پر توجہ نہیں کرتے کہ صحابہ کرام کے بارے میں اس طرح کا عقیدہ اسلام اور تاریخ اسلام کے برخلاف ہے۔

قارئین کرام! بے شک "صحابہ" خصوصاً پہلے مہاجرین کا ایک خاص احترام ہے، لیکن یہ احترام اسی وقت تک ہے جب تک وہ صحیح راستہ پر قدم بڑھاتے رہیں، لیکن جب بعض صحابہ، اسلام کے حقیقی راستہ سے منحرف ہو جائیں تو پھر اصولی طور پر قرآن مجید کا کچھ اور ہی نظریہ ہوگا۔

مثال کے طور پر ہم کس طرح "طلحہ" اور "زبیر" سے یونہی گزر سکتے ہیں جبکہ انھوں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین اور خود اپنے انتخاب کردہ خلیفۂ رسول کی بیعت کو توڑ دیا، ہم کیسے ان کے دامن پر لگے جنگ جمل کے سترہ ہزار مسلمانوں کے خون کو نظر انداز کر سکتے ہیں؟! اگر کوئی شخص کسی

ایک بے گناہ کا خون بہائے تو وہ خدا کے سامنے کوئی جواب نہیں دے سکتا، اتنے لوگوں کا خون تو بہت دور کی بات ہے، کیا اصولی طور پر جنگ جمل میں "حضرت علی علیہ السلام اور آپ کے ساتھی" اور "طلحہ وزبیر اوران کے ساتھی دیگر صحابہ" دونوں کو حق پر مانا جاسکتا ہے؟

کیا کوئی بھی عقل اور منطق اس واضح تضاد اور ٹکراؤ کو قبول کرسکتی ہے؟! اور کیا ہم "صحابہ کی عظمت" کی خاطر اپنی آنکھوں کو بند کریں اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد پیش آنے والے تاریخی حقائق کو نظر انداز قرار دے دیں اور اسلامی وقرآنی قاعدہ "إِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ اَتْقَاكُمْ"(۱) کو پاؤں تلے روند ڈالیں؟! واقعا کیا یہ غیر منطقی فیصلہ ہے؟!

اصولی طور پر اس چیز میں کیا ممانعت ہے کہ کوئی شخص ایک روز بہشتیوں کی صف میں اور حق کا طرفدار ہو، لیکن اس کے بعد دشمنان حق اور دوزخیوں کی صف میں چلا جائے؟ کیا سب معصوم ہیں؟! اور کیا ہم نے اپنی آنکھوں سے بہت سے لوگوں کے حالات بدلتے نہیں دیکھے ہیں؟!

"اصحاب ردّہ" (یعنی رحلت پیغمبرؐ کے بعد کچھ اصحاب کے مرتد [وکافر] ہوجانے) کا واقعہ شیعہ اور سنی سب نے نقل کیا کہ خلیفۂ اول نے ان سے جنگ کی اوران پر غلبہ حاصل کرلیا، کیا "اصحاب ردّہ" کو کسی نے نہیں دیکھا کیا وہ صحابہ کی صف میں نہیں تھے؟!

اس سے کہیں زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ اس تضاد اور ٹکراؤ سے بچنے کے لئے بعض لوگوں نے "اجتہاد" کا سہارا لیا اور کہتے ہیں کہ "طلحہ، زبیر اور معاویہ" نیز ان کے ساتھی مجتہد تھے اور انھوں نے اپنے اجتہاد میں غلطی کی، لیکن وہ گناہگار نہیں ہیں بلکہ اپنے ان عمل پر خدا کی طرف سے اجر وثواب پائیں گے!!

واقعا کتنی رسوا کن دلیل ہے؟ جانشین رسولؐ کے مقابلہ میں آجانا، اپنی بیعت کو توڑ دینا،

---

(۱) سورۂ حجرات، آیت ۱۳، "بے شک تم میں سے خدا کے نزدیک زیادہ محترم وہی ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے"۔

ور ہزاروں بے گناہوں کا خون بہاتا ور وہ بھی جاہ طلبی اور مال و مقام کے رنج میں یہ سب کچھ کرتا کیا کوئی ایسا موضوع ہے جس کی برائی سے کوئی بے خبر ہو؟ کیا اتنے بے گناہوں کا خون بہانے پر خداوند عالم اجر و ثواب دے سکتا ہے؟! اگر کوئی شخص اس طرح بعض اصحاب کے ظلم و ستم سے ان کو بری کرنا چاہے تو پھر دنیا میں کوئی گناہگار باقی نہ بچے گا اور سبھی قاتل و ظالم و جابر اس منطق کے تحت بری ہو سکتے ہیں۔ صحابہ کا اس طرح سے غلط دفاع کرنا خود اسلام سے بدظن ہونے کا سبب بنتا ہے۔

اس بنا پر ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے کہ ہم سب کے لئے خصوصاً اصحاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احترام کے قائل ہوں، لیکن جب وہ حق و عدالت کی راہ اور اسلامی اصولوں سے منحرف ہو جائیں تو پھر ان کا کوئی احترام نہیں ہوگا۔(۱)

اہل سنت کے متعدد مفسرین نے یہ حدیث نقل کی ہے کہ "حمید بن زیاد" کا کہنا ہے "میں محمد بن کعب قرظی کے پاس گیا اور کہا: اصحاب پیغمبرؐ کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ تو اس نے کہا: "جمیعُ اَصحابِ رسولِ اللّٰہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فی الجنۃِ مُحسِنُھُم و مُسیئُھُم!" (یعنی تمام اصحاب پیغمبر جنتی ہیں چاہے وہ نیک ہوں یا گنہگار!) میں نے کہا: یہ بات تم کیسے کہہ رہے ہو؟ تو اس نے کہا: اس آیت کو پڑھو ﴿وَالسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُم بِإِحْسَانٍ ...﴾ یہاں تک کہ ارشاد ہوتا ہے ﴿رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ﴾(۲) اس کے بعد کہا: تابعین کے لئے صحابہ کی صرف نیک کاموں میں اتباع اور پیروی کرنے کی شرط کی گئی ہے، (صرف اسی صورت میں اہل نجات ہیں، لیکن صحابہ کے لئے اس طرح کی کوئی شرط نہیں ہے)(۳)

---

(۱) تفسیر نمونہ، جلد ۸، صفحہ ۲۷۲ (۲) سورۂ توبہ، آیت ۱۰۰، "اور مہاجرین و انصار میں سبقت کرنے والے اور جن لوگوں نے نیکی میں ان کا اتباع کیا ہے ان سب سے خدا راضی ہو گیا ہے اور یہ سب خدا سے راضی ہیں"۔

(۳) تفسیر المنار اور تفسیر فخر رازی مندرجہ بالا آیت کے ذیل میں رجوع فرمائیں۔

لیکن ان کا یہ دعویٰ متعدد دلائل کی وجہ سے باطل اور غیر قابل قبول ہے، کیونکہ

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ آیہ شریفہ میں مذکورہ حکم تابعین کے لئے بھی ہے، تابعین سے وہ مسلمان مراد ہیں جو پہلے مہاجرین اور انصار کی پیروی کریں، اس بنا پر بغیر کسی استثنا کے پوری امت کو اہل نجات اور جنتی ہونا چاہئے۔

اور جیسا کہ محمد بن کعب کی حدیث میں اس چیز کا جواب دیا گیا کہ خداوند عالم نے تابعین میں "نیکی کی شرط" لگائی ہے یعنی صحابہ کے نیک کاموں میں پیروی کریں، ان کے گناہوں کی پیروی نہیں، لیکن یہ گفتگو بہت ہی عجیب ہے۔

کیونکہ اس کا مفہوم اضافۂ "فرع" بر "اصل" کی طرح ہے یعنی جب تابعین اور صحابہ کے پیروکاروں کے لئے نجات کی شرط یہ ہے کہ اعمال صالحہ میں ان کی پیروی کی جائے تو پھر بطریق اولیٰ یہ شرط خود صحابہ میں بھی ہونی چاہئے۔

بالفاظ دیگر خداوند عالم مذکورہ آیت میں فرماتا ہے: میری رضایت اور خوشنودی پہلے مہاجرین وانصار اوران کی پیروی کرنے والوں کے شامل حال ہوگی جو ایمان اور عمل کے لحاظ سے صحیح تھے، نہ یہ کہ سب مہاجرین وانصار چاہے نیک ہوں یا گنہگار، سب کو رحمت الٰہی میں شامل سمجھیں، لیکن تابعین میں خاص شرط کے تحت قابل قبول ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ موضوع عقلی لحاظ سے بھی قابل قبول نہیں ہے کیونکہ عقلی لحاظ سے صحابہ اور غیر صحابہ میں کوئی فرق نہیں ہے، ابوجہل اور اسلام لا کر پھر جانے والے میں کیا فرق ہے؟!

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے برسوں اور صدیوں بعد اس دنیا میں جو افراد پیدا ہوئے اور انھوں نے اسلام کی راہ میں بڑی بڑی قربانیاں پیش کیں اور جن کی قربانی پہلے مہاجرین وانصار سے کم نہیں ہے، بلکہ ان کا یہ بھی امتیاز ہے کہ انھوں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھے بغیر پہچانا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائے تو کیا ایسے افراد رضایت وخوشنودی الٰہی کے حقدار نہیں ہیں؟!

جو قرآن کہتا ہو کہ تم میں سب سے زیادہ خدا کے نزدیک وہ شخص معزز و محترم ہے جو سب سے زیادہ متقی اور پرہیزگار ہو، تو پھر قرآن اس غیر منطقی امتیاز کو کیسے پسند کرسکتا ہے؟! جس قرآن کی مختلف آیات میں ظالمین اور فاسقین پر لعنت بھیجی گئی ہے اور ان کو عذاب ہی کا مستحق قرار دیا گیا ہو تو پھر صحابہ کے سلسلہ میں اس غیر منطقی معصومیت کو کیونکر قبول کرسکتا ہے؟ اور کیا اس لعنت، ورنچیلنج میں استثنا کی کوئی گنجائش ہے؟ تاکہ کچھ [صحابہ] اس سے الگ ہوجائیں؟ کیوں؟ اور کس لئے؟

ان سب کے علاوہ کیا اس طرح کا حکم کرنا صحابہ کو ہری جھنڈی دکھانا نہیں ہے جس سے ان کا کوئی بھی کام گناہ اور ظلم شمار نہ ہو؟

تیسری بات یہ ہے کہ یہ حکم کرنا، اسلامی تاریخ کے برخلاف ہے، کیونکہ بہت سے لوگ ایسے تھے جو پہلے مہاجرین و انصار میں تھے لیکن بعد میں راہ حق سے منحرف ہوگئے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان پر غضبناک ہوئے (جبکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا غضبناک ہونا خدا کے غضب اور عذاب کا موجب ہے) کیا ''ثعلبہ بن حاطب انصاری'' کا واقعہ نہیں پڑھا کہ وہ کس طرح دین سے منحرف ہوگیا اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس پر غضبناک ہوئے۔

واضح طور پر یوں کہا جائے کہ اگر ان کا مقصد یہ ہے کہ تمام اصحاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی بھی طرح کے گناہ کے مرتکب نہیں ہوئے، وہ معصوم تھے اور معصیت سے پاک تھے، تو یہ بالکل واضح چیزوں کے انکار کی طرح ہے۔

اور اگر ان کا مقصد یہ ہو کہ انھوں نے گناہ کئے ہیں اور خلاف [دین] کام انجام دئے ہیں لیکن پھر بھی خداوندعالم ان سے راضی ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ گنہگاروں سے بھی [نعوذ باللہ] خدا راضی ہوسکتا ہے!

''طلحہ و زبیر'' جن کا شمار پہلے اصحاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ہوتا تھا اسی طرح زوجہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جناب ''عائشہ'' کو جنگ جمل کے سترہ ہزار بے گناہ مسلمانوں کے خون سے کون بری کرسکتا ہے؟ کیا

خداوندعالم اس خون کے بہنے سے راضی تھا؟۔

کیا خلیفہ پیغمبر اکرمؐ حضرت علی علیہ السلام کی مخالفت، اگر بالفرض یہ بھی مان لیں کہ رسول خداؐ نے ان کو خلیفہ معین نہیں کیا تھا لیکن کم سے کم اس بات کو تو اہل سنت بھی قبول کرتے ہیں کہ آپ کی پوری امت کے اجماع کے ذریعہ خلیفہ بنایا گیا تھا، تو اگر جانشین رسول ﷺ اور ان کے وفادار ساتھیوں کے مقابلہ میں تلوار کھینچ لی جائے تو کیا اس کام سے خداوندعالم راضی اور خوشنود ہوگا؟۔ حقیقت یہ ہے کہ ''صحابہ کو بے گناہ'' ماننے والوں کے اصرار اور اس بات پر بضد ہونے کی وجہ سے پاک وپاکیزہ اسلام کو بدنام کردیا ہے، وہ اسلام جس کی نظر میں لوگوں کی عظمت، ایمان واعمال صالحہ ہے۔

اس سلسلہ میں آخری بات یہ ہے کہ مذکورہ آیت میں جس رضا اور خوشنودی الٰہی کی بات کی گئی ہے وہ ایک عام عنوان کے تحت ہے، اور وہ ''ہجرت''، ''نصرت''، ''ایمان''، اور ''عمل صالح'' ہے، لہٰذا تمام صحابہ اور تابعین اگران عناوین کے تحت قرار پائیں گے تو رضائے الٰہی ان کے شامل حال رہے گی، لیکن اگر وہ ان عناوین سے خارج ہوجائیں تو پھر رضایت اور خوشنودی الٰہی سے بھی خارج ہوجائیں گے۔

[قارئین کرام!] ہماری مذکورہ گفتگو سے بخوبی روشن ہوجاتا ہے کہ متعصب مفسر صاحب المنار کے قول کی کوئی اہمیت نہیں ہے، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے کہ موصوف تمام صحابہ کو گناہوں سے پاک نہ ماننے پر شیعوں پر حملہ آور ہوتے ہیں، لیکن ہم کہتے ہیں کہ شیعوں کی کیا خطا ہے؟ یہی کہ انھوں نے اس سلسلہ میں قرآن، تاریخ، اور عقل کی گواہی کو مانا ہے، اور بیہودہ اور غلط امتیازات کے آگے تسلیم نہیں ہوئے ہیں!!(۱)

(۱)تفسیر نمونہ، جلد ۸، صفحہ ۱۰۹۔

۱۰۰۔ ذوالقرنین کون تھے؟

جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿ وَيَسْأَلُونَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ قُلْ سَأَتْلُوا عَلَيْكُمْ مِنْهُ ذِكْرًا ... ﴾(۱)

''اور اے پیغمبر! یہ لوگ آپ سے ذوالقرنین کے بارے میں سوال کرتے ہیں تو آپ کہہ دیجئے کہ میں عنقریب تمہارے سامنے ان کا تذکرہ پڑھ کر سنادوں گا''۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ذوالقرنین کون تھے؟

جس ذوالقرنین کا قرآن مجید میں ذکر ہے، تاریخی طور پر وہ کون شخص ہے، تاریخ کی مشہور شخصیتوں میں سے یہ داستان کس پر منطبق ہوتی ہے، اس سلسلے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے اس سلسلے میں بہت سے نظریات پیش کئے گئے ہیں، ان میں سے یہ تین زیادہ اہم شمار ہوتے ہیں

پہلا نظریہ: بعض کا خیال ہے کہ ''اسکندر مقدونی'' ہی ذوالقرنین ہے۔

لہٰذا وہ اسے اسکندر ذوالقرنین کے نام سے پکارتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ اس نے اپنے باپ کی موت کے بعد روم، مغرب اور مصر پر تسلط حاصل کیا، اس نے اسکندریہ شہر بنایا، پھر شام اور

---

(۱) سورۂ کہف، آیت ۸۳

بیت المقدس پر اقتدار قائم کیا، وہاں سے رملستان گیا، عراق و ایران کو فتح کیا، پھر ہندوستان اور چین کا قصد کیا وہاں سے خراسان پلٹ آیا، اس نے بہت سے نئے شہروں کی بنیاد رکھی، پھر وہ عراق آ گیا، اس کے بعد وہ شہر "زور" میں بیمار پڑا اور مر گیا، بعض نے کہا ہے کہ اس کی عمر چھتیس سال سے زیادہ نہ تھی، اس کا جسد خاکی اسکندریہ لے جا کر دفن کر دیا گیا۔(۱)

دوسرا نظریہ: مورخین میں سے بعض کا نظریہ ہے کہ ذوالقرنین یمن کا ایک بادشاہ تھا۔

اصمعی نے اپنی تاریخ "عرب قبل از اسلام" میں، ابن ہشام نے اپنی مشہور تاریخ "سیرۃ" میں اور ابوریحان بیرونی نے "الآثار الباقیۃ" میں یہی نظریہ پیش کیا ہے۔

یہاں تک کہ یمن کی ایک قوم "حمیری" کے شعرا اور زمانۂ جاہلیت کے بعض شعرا کے کلام میں دیکھا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اس بات پر فخر کیا ہے کہ ذوالقرنین ہم میں سے ہیں۔

تیسرا نظریہ: جو جدید ترین نظریہ ہے جس کو ہندوستان کے مشہور عالم ابوالکلام آزاد نے پیش کیا ہے، ابوالکلام آزاد کسی دور میں ہندوستان کے وزیر تعلیم تھے، اس سلسلے میں انہوں نے ایک تحقیقی کتاب لکھی ہے۔(۲)

اس نظریہ کے مطابق ذوالقرنین "کورش کبیر" "بادشاہ ہخامنشی" ہے۔(۳)

لیکن چونکہ پہلے اور دوسرے نظریہ کے لئے کوئی خاص تاریخی منبع نہیں ہے، اس کے علاوہ قرآن کریم نے ذوالقرنین کے جو صفات بیان کئے ہیں ان کا حامل سکندر مقدونی ہے نہ کوئی بادشاہ یمن۔

---

(۱) تفسیر فخر رازی، ذیل بحث آیت میں اور کامل ابن اثیر، جلد اول صفحہ ۲۸۰ میں، اور بعض دوسرے مورخین اس بات کے قائل ہیں کہ سب سے پہلے اس نظریہ کو پیش کرنے والے شیخ ابو علی سینا ہیں جنہوں نے اپنی کتاب "الشفاء" میں اس کا ذکر کیا ہے

(۲) المیزان، جلد ۱۳، صفحہ ۴۱۴

(۳) فارسی میں اس کتاب کے ترجمہ کا نام "ذوالقرنین یا کورش کبیر" رکھا گیا ہے، اور متعدد معاصر مورخین نے اسی نظریہ کی تائید کرتے ہوئے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔

اس کے علاوہ اسکندر مقدونی نے کوئی معروف دیوار بھی نہیں بنائی ہے، لیکن رہی یمن کی "دیوار مأرب" تو اس میں ان صفت میں سے ایک بھی نہیں ہے جو قرآن کی ذکر کردہ دیوار میں ہیں، جبکہ "دیوار مأرب" عام مصالحہ سے بنائی گئی ہے اور اس کی تعمیر کا مقصد پانی کا ذخیرہ کرنا اور سیلاب سے بچنا تھا، اس کی وضاحت خود قرآن میں سورہ سبا میں بیان ہوئی ہے۔

لہٰذا ہم تیسرے نظریہ پر بحث کرتے ہیں یہاں ہم چند امور کی طرف مزید توجہ دینا ضروری سمجھتے ہیں

الف: سب سے پہلے یہ بات قابل توجہ ہے کہ ذوالقرنین کو یہ نام کیوں دیا گیا؟

پہلی بات تو یہ ہے کہ "ذوالقرنین" کے معنی ہیں "دوسینگوں والا"، لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انہیں اس نام سے کیوں موسوم کیا گیا؟ بعض کا نظریہ ہے کہ یہ نام اس لئے پڑا کہ وہ دنیا کے مشرق و مغرب تک پہنچے جسے عرب "قرنی الشمس" (سورج کے دوسینگ) سے تعبیر کرتے ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ یہ نام اس لئے پڑا کہ انہوں نے دو قرن زندگی گزاری یا حکومت کی، اور پھر یہ کہ قرن کی مقدار کتنی ہے، اس میں بھی مختلف نظریات ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ ان کے سر کے دونوں طرف ایک خاص قسم کا ابھار تھا اس وجہ سے ذوالقرنین مشہور ہوگئے۔

بعض کا یہ نظریہ ہے کہ ان کا خاص تاج دوشاخوں والا تھا۔

ب۔ قرآن مجید سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین ممتاز صفات کے حامل تھے خداوند عالم نے کامیابی کے اسباب ان کے اختیار میں دئے تھے، انہوں نے تین اہم لشکر کشی کی، پہلے مغرب کی طرف، پھر مشرق کی طرف اور آخر میں ایک ایسے علاقے کی طرف گئے جہاں ایک کوہستانی درہ موجود تھا، ان مسافرت میں وہ مختلف اقوام سے ملے۔

وہ ایک مرد مومن، موحد اور مہربان شخص تھے، وہ عدل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے تھے،

اسی بنا پر خداوند عالم کا خاص لطف ان کے شامل حال تھا۔

وہ نیک لوگوں کے دوست اور ظالموں کے دشمن تھے، انہیں دنیا کے مال ودولت سے کوئی لگاؤ نہ تھا، وہ اللہ پر بھی ایمان رکھتے تھے اور روز جزا پر بھی۔

انہوں نے ایک نہایت مضبوط دیوار بنائی ہے، یہ دیوار انہوں نے اینٹ اور پتھر کے بجائے لوہے اور تانبے سے بنائی (اور اگر دوسرے مصالحے بھی استعمال ہوئے ہوں تو ان کی بنیادی حیثیت نہ تھی)، اس دیوار کے بنانے سے ان کا مقصد مستضعف اور ستم دیدہ لوگوں کی یاجوج وماجوج کے ظلم و ستم کے مقابلے میں مدد کرنا تھا۔

وہ ایسے شخص تھے کہ نزول قرآن سے قبل ان کا نام لوگوں میں مشہور تھا، لہذا قریش اور یہودیوں نے ان کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا تھا، جیسا کہ قرآن کہتا ہے: ﴿وَيَسْأَلُونَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ﴾ "اور اے پیغمبر! یہ لوگ آپ سے ذوالقرنین کے بارے میں سوال کرتے ہیں، حضرت رسول اللہ ﷺ اور ائمہ اہل بیت علیہم السلام سے بہت سی ایسی روایات منقول ہیں جن میں بیان ہوا ہے کہ "وہ نبی نہیں تھے بلکہ اللہ کے نیک صالح بندے تھے"۔(۱)

ج۔ تیسرا نظریہ (ذوالقرنین کورش ہی کو کہتے ہیں) اس کی دو بنیادیں

۱۔ اس مطلب کے بارے میں سوال کرنے والے یہودی تھے، یہ یہودیوں کے کہنے پر قریش نے سوال کیا تھا، جیسا کہ آیت کی شان نزول کے بارے میں منقول روایات سے ظاہر ہوتا ہے، لہذا اس سلسلہ میں یہودی کتابوں کو دیکھنا چاہئے۔

یہودیوں کی مشہور کتابوں میں سے کتاب "دانیال" کی آٹھویں فصل میں تحریر ہے:

---

(۱) دیکھئے تفسیر نور الثقلین، جلد ۳، صفحہ ۲۹۳، اور ۲۹۵

"بل شعر" کی سلطنت کے سال مجھے دانیال کو خواب میں دکھایا گیا، جو خواب مجھے دکھایا گیا اس کے بعد اور خواب میں، میں نے دیکھا کہ میں ملک "عیلام" کے "قصر شوشان" میں ہوں، میں نے خواب میں دیکھا کہ میں "دریائے والای" کے پاس ہوں، میں نے آنکھیں اٹھا کر دیکھا کہ ایک مینڈھا دریا کے کنارے کھڑا ہے، اس کے دو لمبے سینگ تھے، اور اس مینڈھے کو میں نے مغرب، مشرق اور جنوب کی سمت سینگ مارتے ہوئے دیکھا، کوئی جانور اس کے مقابلہ میں ٹھہر نہیں سکتا تھا اور کوئی اس کے ہاتھ سے بچانے والا نہ تھا وہ اپنی مرضی پر عمل کرتا تھا اور وہ بڑا ہوتا جاتا تھا۔(۱)

اس کے بعد اسی کتاب میں دانیال کے بارے میں نقل ہوا ہے جبرئیل اس پر ظاہر ہوئے اور اس کے خواب کی تعبیر یوں بیان کی

"تم نے دو شاخوں والا جو مینڈھا دیکھا ہے وہ مدائن اور فارس (یا ماد اور فارس) کے بادشاہ ہیں۔

یہودیوں نے دانیال کے خواب کو بشارت قرار دیا وہ سمجھے کہ ماد و فارس کے کسی بادشاہ کے قیام اور بابل کے حکمرانوں میں ان کی کامیابی سے یہودیوں کی غلامی اور قید کا دور ختم ہو جائے گا، اور وہ اہل بابل کے چنگل سے آزاد ہو جائیں گے۔

زیادہ زمانہ نہ گزرا تھا کہ "کورش" نے ایران کی حکومت پر غلبہ حاصل کر لیا اس نے ماد اور فارس کو ایک ملک کر کے دونوں کو ایک عظیم سلطنت بنا دیا، جیسے دانیال کے خواب میں بتایا گیا تھا کہ وہ اپنے سینگ مغرب، مشرق اور جنوب کی طرف مارے گا، کورش نے تینوں سمتوں میں عظیم فتوحات حاصل کیں۔

---

(۱) کتاب دانیال، فصل ہشتم، جملہ نمبر ایک سے چار تک

اس نے یہودیوں کو آزاد کیا، اور فلسطین لوٹنے کی اجازت دی۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ توریت کی کتاب اشعیاء فصل ۴۴، نمبر ۲۸ میں یوں ہوا ہے "اس وقت خاص طور سے کورش کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ میرا چرواہا ہے اس نے میری مشیت کو پورا کیا ہے اور شلیم سے کہے گا تو تعمیر ہو جائے گا۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ توریت کے بعض الفاظ میں "کورش" کے بارے میں ہے کہ عقاب مشرق اور مرد تدبیر جو بڑی دور سے بلایا جائے گا۔ (کتاب شعیاء فصل ۴۶ نمبر ۱)

دوسری بنیاد یہ ہے کہ انیسویں عیسوی صدی میں دریائے "مرغاب" کے کنارے استخر کے قریب کورش کا مجسمہ دریافت ہوا، یہ ایک انسان کے قد و قامت کے برابر ہے۔ اس میں کورش کے عقاب کی طرح دو پر بنائے گئے ہیں اور اس کے سر پر ایک تاج ہے، اس میں مینڈھے کے سینگوں کی طرح دو سینگ نظر آتے ہیں۔

یہ مجسمہ بہت قیمتی اور قدیم فن سنگ تراشی کا نمونہ ہے، اس نے ماہرین کو اپنی طرف متوجہ کر رکھا ہے جرمنی ماہرین کی ایک جماعت نے صرف اسے دیکھنے کے لئے ایران کا سفر کیا۔

توریت کی تحریر کو جب اس مجسمہ کی تفصیلات کے ساتھ ملایا گیا تو ابو الکلام آزاد کو مزید یقین ہو گیا کہ کورش ذوالقرنین (دو سینگوں والا) کہنے کی وجہ یہ ہے، اس طرح یہ بھی واضح ہو گیا کہ کورش کے مجسمہ میں عقاب کے دو پر کیوں لگائے گئے ہیں، اس سے دانشوروں کے ایک گروہ کے لئے ذوالقرنین کی تاریخی شخصیت مکمل طور پر واضح ہو گئی۔

اس کے علاوہ اس نظریے کی تائید کے لئے کورش کے وہ اخلاقی صفات ہیں جو تاریخ میں لکھے ہوئے ہیں

یونانی مورخ ہیرودوٹ لکھتا ہے کورش نے حکم جاری کیا کہ اس کے سپاہی جنگ کرنے والوں کے علاوہ کسی کے سامنے تلوار نہ نکالیں اور اگر دشمن کا سپاہی اپنا نیزہ خم کر دے تو اسے قتل نہ

کریں. کورش کے لشکر نے اس کے حکم کی اطاعت کی، اس طرح سے ملت کے عام لوگوں کو مصائب جنگ کا احساس بھی نہ ہوا۔

ہرودوٹ کورش کے بارے میں لکھتا ہے کورش کریم، سخی، بہت نرم دل اور مہربان بادشاہ تھا، اسے دوسرے بادشاہوں کی طرح مال جمع کرنے کا لالچ نہ تھا، بلکہ سے زیادہ سے زیادہ کرم و بخشش کا شوق تھا، وہ ستم رسیدہ لوگوں کے ساتھ عدل و انصاف سے کام لیتا تھا اور جس چیز سے زیادہ خیر اور بھلائی ہوتی تھی اسے پسند کرتا تھا۔

اسی طرح یک دوسر مورخ ''ذی نوفن'' لکھتا ہے کورش عاقل اور مہربان بادشاہ تھا، اس میں بادشاہوں کی عظمت اور حکماء کے فضائل ایک ساتھ جمع تھے، وہ بلند ہمت تھا اس کا جود وکرم زیادہ تھا س کا شعار انسانیت کی خدمت تھا اور عدالت اس کی عادت تھی وہ تکبر کے بجائے انکساری سے کام لے لیتا تھا۔

مزے کی بات یہ ہے کہ کورش کی اس قدر تعریف وتوصیف کرنے والے مورخین غیر لوگ ہیں کورش کی قوم اور وطن سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے جو کہ اہل یونان ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ یونان کے لوگ کورش کی طرف دوستی ور محبت کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے کیونکہ کورش نے ''لیدیا'' کو فتح کر کے اہل یونان کو بہت بڑی شکست دی تھی۔

س نظریہ کے طرفدار کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں ذوالقرنین کے بیان ہونے والے اوصاف کورش کے وصاف سے مطابقت رکھتے ہیں۔

اس تمام باتوں کے علاوہ کورش نے مشرق، مغرب اور شمال کی طرف سفر بھی کئے ہیں اس کے تمام سفر کا حال [اور سفرنامہ] اس کی تاریخ میں تفصیلی طور پر ذکر ہوا ہے، یہ قرآن میں ذکر کئے گئے ذوالقرنین کے تینوں سفر سے مطابقت رکھتے ہیں۔

کورش نے پہلی لشکر کشی ''لیدیا'' پر کی، یہ ایشائے صغیر کا شمالی حصہ ہے یہ ملک کورش کے مرکز

حکومت سے مغرب کی سمت میں تھا۔

جس وقت آپ ایشائے صغیر کے مغربی ساحل کے نقشہ کو سامنے رکھیں گے تو دیکھیں گے کہ ساحل کے زیادہ تر حصے چھوٹی چھوٹی خلیجوں میں بٹے ہوتے ہیں، خصوصاً ''ازمیر'' کے قریب جہاں خلیج یک چشمہ کی صورت میں دکھائی دیتا ہے۔

قرآن کا بیان ہے کہ ذوالقرنین نے اپنے مغرب کے سفر میں محسوس کیا کہ جیسے سورج کیچڑ آلود چشمہ میں ڈوب رہا ہے، یہ وہی منظر ہے جو کورش نے غروب آفتاب کے وقت ساحلی خلیجوں میں دیکھا تھا۔

کورش کی دوسری لشکر کشی مشرق کی طرف تھی جیسا کہ ہرودوٹ نے کہا ہے کہ کورش کا یہ مشرقی حملہ ''لیدیا'' کی فتح کے بعد ہو خصوصاً بعض بیابانی وحشی قبائل کی سرکشی نے کورش کو اس حملہ پر مجبور کیا۔

چنانچہ قرآن میں بھی ارشاد ہے:

﴿حَتَّى إِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلَى قَوْمٍ لَمْ نَجْعَلْ لَهُمْ مِنْ دُونِهَا سِتْرًا﴾(۱)

''یہاں تک کہ جب طلوع آفتاب کی منزل تک پہنچا تو دیکھا کہ وہ ایک ایسی قوم پر طلوع کر رہا ہے جن کے پاس سورج کی کرنوں سے بچنے کے لئے کوئی سایہ نہ تھا''۔

یہ الفاظ کورش کے سفر مشرق کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جہاں اس نے دیکھا کہ سورج ایسی قوم پر طلوع کر رہا ہے جن کے پاس اس کی تپش سے بچنے کے لئے کوئی سایہ نہ تھا، یہ اس طرف اشارہ ہے کہ وہ قوم صحرا نورد تھی اور بیابانوں میں رہتی تھی۔

---

(۱) سورۂ کہف، آیت ۹۰

کورش نے تیسری لشکر کشی شمال کی طرف ''قفقاز'' کے پہاڑوں کی طرف کی یہاں تک کہ وہ دو پہاڑوں کے درمیان ایک درّے میں پہنچا، یہاں کے رہنے والوں نے وحشی اقوام کے حملوں اور غارت گری کو روکنے کی درخواست کی اس پر کورش نے اس تنگ درے میں ایک مضبوط دیوار تعمیر کردی۔

اس درّہ کو آج کل درّہ ''داریال'' کہتے ہیں، موجودہ نقشوں میں یہ ''ولادی کیوکز'' اور ''تفلیس'' کے درمیان دیکھا جاتا ہے وہاں اب تک ایک آہنی دیوار موجود ہے، یہ وہی دیوار ہے جو کورش نے تعمیر کی تھی، قرآن مجید نے ذوالقرنین کی دیوار کے جو اوصاف بتائے ہیں وہ پوری طرح اس دیوار پر منطبق ہوتے ہیں۔

اس تیسرے نظریہ کا خلاصہ یہ تھا جو ہماری نظر میں بہتر ہے۔( )

یہ صحیح ہے کہ اس نظریہ میں بھی کچھ مبہم چیزیں پائی جاتی ہیں، لیکن عملاً ذوالقرنین کی تاریخ کے بارے میں ابھی تک جتنے نظریات پیش کئے گئے ہیں اسے ان میں سے بہترین کہا جا سکتا ہے۔(۲)

( ) اس سلسلہ میں مزید وضاحت کے لئے کتاب ''ذوالقرنین یا کورش کبیر'' اور ''فرہنگ قصص قرآن'' کی طرف رجوع فرمائیں

(۲) تفسیر نمونہ، جلد ۱۲، صفحہ ۵۴۴

۱۰۱۔ کیوں بعض ظالم اور گنہگار لوگ نعمتوں سے مالا مال ہیں اور ان کو سزا نہیں ملتی؟

قرآن مجید کی آیات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خداوند عالم گناہوں میں زیادہ آلودہ نہ ہونے والے گنہگاروں کو خطرہ کی گھنٹی یا ان کے اعمال کے عکس العمل یا ان کے اعمال کی مناسب سزا کے ذریعہ جگا دیتا ہے، اور ان کو درست کی ہدایت فرما دیتا ہے، یہ وہ لوگ ہیں جن کے یہاں ہدایت کی صلاحیت پائی جاتی ہے، ان پر لطف خدا ہو سکتا ہے، در اصل ان کی سزا یا مشکلات ان کے لئے نعمت حساب ہوتی ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ﴾ (۱) "(لوگوں کے ہاتھوں کی کمائی کی بنا پر) فساد خشکی اور تری ہر جگہ غالب آگیا ہے تاکہ خدا ان کو ان کے کچھ اعمال کا مزا چکھا دے تو شاید یہ لوگ پلٹ کر راستہ پر آجائیں"۔

لیکن گناہ و معصیت میں غرق ہونے والے باغی اور نافرمانی کی انتہا کو پہنچنے والے لوگوں کو خداوند عالم ان کے حال پر چھوڑ دیتا ہے، ان کو مزید موقع دیتا ہے تاکہ وہ گناہوں میں مزید غرق

---

(۱) سورۂ روم، آیت ۴۱

ہو جائیں، اور بڑی سے بڑی سزا کے مستحق بن جائیں، یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے پیچھے کے تمام پلوں کو توڑ دیا ہے اور پیچھے پلٹنے کا کوئی راستہ باقی نہیں چھوڑا، انھوں نے حیا وشرم کے پردوں کو چاک کرڈالا اور ہدایت کی صلاحیت کو بالکل ختم کردیا ہے۔

قرآن مجید کی ایک دوسری آیت اسی معنی کی تائید کرتی ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے

﴿وَلاٰیَحْسَبَنَّ الَّذِینَ کَفَرُوا اَنَّمَا نُمْلِی لَهُمْ خَیْرٌ لِاَنْفُسِهِمْ اِنَّمَا نُمْلِی لَهُمْ لِیَزْدَادُوا اِثْمًا وَلَهُمْ عَذَابٌ مُهِینٌ﴾ (۱) ”اور خبردار یہ کفار نہ سمجھیں کہ ہم جس قدر راحت وآرام دے رہے رہیں وہ ان کے حق میں بھلائی ہے ہم تو صرف اس لئے دے رہے ہیں کہ جتنا گناہ کرسکیں کرلیں اور ان کے لئے رسوا کن عذاب ہے“۔

اسلام کی شجاع خاتون جناب زینب کبریٰ سلام اللہ علیہا نے شام کی ظالم وجابر حکومت کے سامنے ایک بہترین خطبہ دیا جس میں اسی آیۂ شریفہ سے ظالم وجابر یزید کے سامنے استدلال کیا اور یزید کو ناقابل بازگشت گنہگاروں کا واضح مصداق قرار دیا، آپ فرماتی ہیں

”تو آج خوش ہورہا ہے، اور سوچتا ہے کہ گویا دنیا کو ہمارے اوپر تنگ کردیا ہے اور آسمان کے دروازہ ہم پر بند ہوگئے ہیں، اور ہمیں اس دربار کے اسیر کے عنوان سے دربدر پھرایا جارہا ہے، تو سوچتا ہے کہ میرے پاس قدرت ہے، اور خدا کی نظر میں قدر ومنزلت ہے، اور خدا کی نظر میں ہماری کوئی اہمیت نہیں ہے؟! تو یہ تیرا خیال خام ہے، خدا نے یہ فرصت تجھے اس لئے دی ہے تاکہ تیری پیٹھ گناہوں کے وزن سے سنگین ہوجائے، اور خدا کی طرف سے دردناک عذاب تیرا منتظر ہے...“

(۱) سورہ آل عمران آیت ۱۷۸

ایک سوال کا جواب:

مذکورہ آیت بعض لوگوں کے ذہن میں موجود اس سوال کا جواب بھی دے دیتی ہے کہ کیوں بعض ظالم اور گناہگار لوگ نعمتوں سے مالا مال ہیں اور ان کو سزا نہیں ملتی؟

قرآن کا فرمان ہے: ان لوگوں کی اصلاح نہیں ہوسکتی، قانون آفرینش اور آزادی و اختیار کے مطابق ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا ہے، تاکہ تنزل کے آخری مرحلہ تک پہنچ جائیں اور سخت سے سخت سزاؤں کے مستحق ہوجائیں۔

اس کے علاوہ قرآن مجید کی بعض آیات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خداوند عالم اس طرح کے لوگوں کو بہت زیادہ نعمتیں عطا کرتا ہے اور جب وہ خوشی اور غرور کے نشہ میں مادی لذتوں میں غرق ہوجاتے ہیں تو اچانک سب چیزیں ان سے چھین لیتا ہے، تاکہ اس دنیا میں بھی سخت سے سخت سزا بھگت سکیں، چونکہ اس طرح کی زندگی کا چھن جانا ان لوگوں کے لئے بہت ہی ناگوار ہوتا ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتَّىٰ إِذَا فَرِحُوا بِمَا أُوتُوا أَخَذْنَاهُم بَغْتَةً فَإِذَا هُم مُّبْلِسُونَ﴾(۱) ”پھر جب ان نصیحتوں کو بھول گئے جو انھیں یاد دلائی گئی تھیں تو ہم نے امتحان کے طور پر ان کے لئے ہر چیز کے دروازے کھول دئے یہاں تک کہ جب وہ ان نعمتوں سے خوش حال ہوگئے تو ہم نے اچانک انھیں اپنی گرفت میں لے لیا اور وہ مایوس ہوکر رہ گئے“۔

دراصل ایسے لوگ اس درخت کی طرح ہیں جس پر نامعقول طریقہ سے انسان جتنا بھی اوپر جاتا ہے خوش ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس درخت کی چوٹی پر پہنچ جاتا ہے اچانک طوفان چلتا ہے اور وہ زمین پر گرجاتا ہے، اور اس کی تمام ہڈی پسلیاں چور چور ہوجاتی ہیں۔(۲)

---

(۱) سورۂ انعام، آیت ۴۴ (۲) تفسیر نمونہ، جلد ۳، صفحہ ۱۸۰

۱۰۲۔ ایمان نہ رکھنے والی اقوام کیوں عیش و عشرت میں ہیں؟

جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ﴾ (۱) ”اگر اہل قریہ ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرلیتے تو ہم ان کے لئے زمین و آسمان سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے“۔

اس آیت کے پیش نظر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایمان اور تقویٰ، رحمت الٰہی اور برکات کا موجب ہے تو پھر ان قوموں کے پاس بہت زیادہ نعمتیں کیوں پائی جاتی ہیں جن کے پاس ایمان نہیں ہے ان کی زندگی بہترین ہوتی ہے، اور ان کو پریشانی نہیں ہوتی، یہ کیوں ہے؟

اس سوال کا جواب درج ذیل دو نکات پر توجہ کرنے سے روشن ہو جائے گا

۱۔ یہ تصور کرنا کہ بے ایمان قوم وملت نعمتوں سے مالا مال ہے، ایک غلط فہمی ہے، جو ایک دوسری غلط فہمی کا نتیجہ ہے، اور وہ مال و دولت ہی کو خوش بختی سمجھ لینا ہے۔

عام طور پر عوام الناس میں یہی تصور پایا جاتا ہے کہ جس قوم وملت کے پاس ترقی یافتہ ٹیکنیک ہے یا بہت زیادہ مال و دولت ہے وہی خوش بخت ہے، حالانکہ اگر ان اقوام میں جا کر نزدیک سے دیکھیں تو ان کے یہاں نفسیاتی اور جسمانی بے پناہ درد اور مشکلات پائی جاتی ہیں اور اگر نزدیک

---

(۱) سورۂ اعراف، آیت ۹۶

سے دیکھیں تو ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ ان میں سے متعدد لوگ دنیا کے سب سے ناچار افراد ہیں، قطع نظر اس بات سے کہ یہی نسبی ترقی ان کی سعی وکوشش، نظم ونسق اور ذمہ داری کے احساس جیسے اصول پر عمل کا نتیجہ ہیں، جو انبیاء علیہم اسلام کی تعلیمات میں بیان ہوئے ہیں۔

ابھی چند دنوں کی بات ہے کہ اخباروں میں یہ بات شایع ہوئی کہ امریکہ کے شہر ''نیویورک'' میں (جو مادی لحاظ سے دنیا کا سب سے مالدار اور ترقی یافتہ شہر ہے) اچانک [طولانی مدت کے لئے] بجلی چلی گئی اور ایک عجیب وغریب واقعہ پیش آیا: ''بہت سے لوگوں نے دکانوں پر حملہ کردیا اور دکانوں کو لوٹ لیا، اس موقع پر پولیس نے تین ہزار لوگوں کو گرفتار کرلیا''۔

یہ بات طے ہے کہ لٹیروں کی تعداد ان گرفتار ہونے والوں سے کئی گنا زیادہ ہوگی جو موقع سے فرار نہ کرسکے اور پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہوگئے، اور یہ بھی مسلم ہے کہ یہ لٹیرے کوئی تجربہ کار نہیں تھے جس سے انھوں نے ایک پروگرام کے تحت یہ کیا ہو کیونکہ یہ واقعہ اچانک پیش آیا تھا۔

ہذا ہم اس واقعہ سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اس ترقی یافتہ اور مالدار شہر کے ہزاروں لوگ چند گھنٹوں کے لئے بجلی جانے پر ''لیٹرے'' بن سکتے ہیں، یہ صرف اخلاقی پستی کی دلیل نہیں ہے بلکہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس شہر میں اجتماعی نا امنی کس قدر پائی جاتی ہے۔

اس کے علاوہ اخباروں میں اس خبر کا بھی اضافہ کیا جو دراصل پہلی خبر کا ہی تتمہ تھا کہ انھیں دنوں ایک مشہور ومعروف شخصیت نیویورک کے بہت بڑے ہوٹل میں قیام پذیر تھی، چنانچہ وہ کہتا ہے بجلی جانے کے سبب ہوٹل کے ہال اور راستوں میں آمد ورفت خطرناک صورت اختیار کرچکی تھی کیونکہ ہوٹل کے ذمہ دار لوگوں نے آمد ورفت سے منع کردیا تھا کہ کوئی بھی اکیلا کمرے سے باہر نہ نکلے، کہیں لٹیروں کا اسیر نہ ہوجائے، لہٰذا مسافروں کی کم وبیش دس دس کے گروپ میں وہ بھی مسلح افراد کے ساتھ آمد ورفت ہوتی تھی اور مسافر اپنے اپنے کمروں میں پہنچائے جاتے تھے! اس کے بعد یہی شخص کہتا ہے کہ جب تک شدید بھوک نہیں لگتی تھی کوئی بھی باہر نکلنے کی جرأت نہیں کرتا تھا!!

لیکن پسماندہ مشرقی ممالک میں اس طرح بجلی جانے سے اس طرح کی مشکلات پیش نہیں آتیں، جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ ان ترقی یافتہ اور ،سد رممالک میں امنیت نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔

ن کے علاوہ چشم دید گواہوں کا کہنا ہے کہ وہاں قتل کرنا پانی پینے کی طرح آسان ہے، اور قتل بہت ہی آسانی سے ہوتے رہتے ہیں، اور ہم یہ جانتے ہیں کہ اگر کسی کو ساری دنیا بھی بخش دی جائے تاکہ ایسے ماحول میں زندگی کرے تو ایسا شخص دنیا کا سب سے پریشان حال ہوگا، ورامیت کی مشکل اس کی مشکلات میں سے ایک ہے۔

اس کے علاوہ اجتماعی طور پر بہت سی مشکلات پائی جاتی ہیں جو خود اپنی جگہ دردناک ہیں، لہٰذا ان تمام چیزوں کے پیش نظر مال ودولت کو باعث خوشبختی تصور نہیں کرنا چاہئے۔

۲۔لیکن یہ کہنا کہ جن معاشروں میں ایمان اور پرہیزگاری پائی جاتی ہے وہ پسماندہ ہیں، تو گر ایمان اور پرہیزگاری سے مراد صرف سلام اور تعلیمات انبیاء کے اصول کی پابندی کا دعوی ہو تو ہم بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ایسے فرد پسماندہ ہیں۔

لیکن ہم جانتے ہیں کہ ایمان اور پرہیزگاری کی حقیقت یہ ہے کہ ان کا اثر زندگی کے ہر پہلو پر دکھائی دے، صرف سلام کا دعوی کرنے سے مشکل حل نہیں ہوتی۔

نہایت ہی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آج اسلام اور انبیاالٰہی کی تعلیمات کو بہت سے اسلامی معاشروں میں یا بالکل ترک کردیا گیا ہے یا آدھا چھوڑ دیا گیا ہے، لہٰذا ان معاشروں کا حال حقیقی مسلمانوں جیسا نہیں ہے۔

اسلام، طہارت، صحیح عمل، امانت اور سعی وکوشش کی دعوت دیتا ہے، لیکن کہاں ہے امانت اور سعی وکوشش؟

اسلام، علم ودانش اور بیداری وہوشیاری کی دعوت دیتا ہے، لیکن کہاں ہے علم وآگاہی؟

اسلام، اتحاد اور فداکاری کی دعوت دیتا ہے، لیکن کیا اسلامی معاشروں میں ان اصولوں پر عمل کیا جا رہا ہے؟ جبکہ یہ مسلمان ہیں؟! اس بنا پر یہ اعتراف کرنا ہوگا کہ اسلام ایک الگ چیز ہے اور ہم مسلمان ایک الگ چیز، [ورنہ اگر اسلام کے اصول اور قواعد پر عمل کیا جائے تو اسلام اس نظام الٰہی کا نام ہے جس کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے مسلمان خوش حال نظر آئیں گے](۱)

(۱) تفسیر نمونہ، جلد ۶، صفحہ ۲۶۸

۱۰۳۔ مسلمانوں کی پسماندگی کے اسباب کیا ہیں؟

قرآن مجید کی آیات سے بخوبی یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہر طرح کی ناکامی و شکست جس سے ہم دوچار ہوتے ہیں، وہ چیزوں میں سے کسی ایک چیز کی وجہ سے ہے یا تو ہم نے جہاد [و کوشش] میں کوتاہی کی ہے یا ہمارے کاموں میں خلوص نہیں پایا جاتا، اور اگر یہ دونوں چیزیں باہم جمع ہو جائیں تو خداوند عالم کے وعدہ کی بنا پر کامیابی و رہدیت یقینی ہے۔

اگر صحیح طور پر غور و فکر کیا جائے تو اسلامی معاشرہ کی مشکلات اور پریشانیوں کا سبب معلوم ہو سکتا ہے۔

کیوں مسلمان آج تک پسماندہ ہیں؟

کیوں سب چیزوں میں غیروں کی طرف ہاتھ پھیلائے ہوئے ہیں یہاں تک کہ علم و ثقافت اور قوانین کے سلسلہ میں بھی دوسروں کی مدد کے محتاج ہیں؟

کیوں سیاسی بحران، فوجی حملوں کے طوفان میں دوسرے پر بھروسہ کیا جائے؟

کیوں اسلام کے علمی اور ثقافتی دسترخوان پر بیٹھنے والے آج مسلمانوں سے آگے نکل گئے ہیں؟

کیوں غیروں کے ہاتھوں اسیر ہو چکے ہیں اور ان کی زمینوں پر اغیار کا قبضہ ہے؟!

ان تمام سوالوں کا ایک ہی جواب ہے کہ یا تو وہ جہاد کو بھول گئے ہیں یا ان کی نیتوں میں خلوص نہیں رہا اور ان کی نیتوں میں فتور آ گیا ہے؟

جی ہاں! علمی، ثقافتی، سیاسی، اقتصادی اور نظامی میدان میں جہاد [اور کوشش] کو بھلا دیا گیا ہے، حب نفس، عشق دنیا، راحت طلبی، تنگ نظری اور ذاتی اغراض کا سبب ہو گیا ہے یہاں تک کہ مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کے قتل ہونے والی تعداد غیروں کے ہاتھوں قتل ہونے والوں کی تعداد سے کہیں زیادہ ہے!

بعض مغرب اور مشرق پرست افراد کا ہمت ہار جانا، بعض ذمہ دار لوگوں کا سیم و زر کے بدلے بک جانا اور دانشوروں و مفکرین قوم کا گوشہ نشین ہو جانا، یہ سب ایسی وجوہات ہیں جس کی بنا پر جہاد و کوشش ہمارے یہاں سے جاتی رہی اور اخلاص بھی رخصت ہو گیا۔

اگر ہمارے درمیان تھوڑا بھی اخلاص پیدا ہو جائے اور ہمارے مجاہدین میں جوش و جذبہ پیدا ہو جائے تو پھر یکے بعد دیگرے کامیابی ہی کامیابی ہوگی۔

اسیری کی زنجیریں ٹوٹ جائیں گی، مایوسی امید میں، شکست کامیابی میں، ذلت عزت و سربلندی میں، اختلاف و نفاق وحدت و یکدلی میں تبدیل ہو جائیں گے، اور واقعاً قرآن مجید کس قدر الہام بخش ہے جس نے ایک چھوٹے سے جملہ [۱] میں تمام مشکلات اور پریشانیوں کا راہ حل بیان کر دیا!

جی ہاں جو لوگ راہ خدا میں جہاد کرتے ہیں، ہدایت الٰہی ان کے شامل حال ہوتی ہے، اور

---

[۱] سورہ عنکبوت، آیت نمبر ۶۹ کی طرف اشارہ ہے، جہاں ارشاد ہوتا ہے

﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ﴾ (اور جن لوگوں نے ہماری راہ میں جہاد کیا ہے ہم انھیں اپنے راستوں کی ہدایت کریں گے اور یقیناً اللہ حسن عمل والوں کے ساتھ ہے) (مترجم)

یہ بات واضح ہے کہ جس کو خدا کی طرف گمراہی سے ہدایت مل جائے تو اس کے یہاں شکست کا تصور ہی نہیں پایا جاتا۔

بہر حال جو شخص اس قرآنی حقیقت کو اپنی کوششوں ورکاوشوں کی روشنی کو اس وقت محسوس کرتا ہے، جب وہ خدا کے لئے وراس کی راہ میں جہاد اور کوشش کرتا ہے تو رحمت خدا کے دروازے اس کے لئے کھل جاتے ہیں وراس کے لئے مشکلات آساں اور سختیاں قابل تحمل ہو جاتی ہیں۔ ( )

(تفسیر نمونہ، جلد ۲، صفحہ ۳۵۰.

۱۰۴۔ واقعہ فدک کیا ہے؟

"فدک" طراف مدینہ میں تقریبا یک سو چالیس کلومیٹر کے فاصلہ پر خیبر کے نزدیک یک آباد قصبہ تھا۔

جب سات ہجری میں خیبر کے قلعے یکے بعد دیگرے سلامی فوجوں نے فتح کر لیے ور یہودیوں کی مرکزی قوت ٹوٹ گئی تو فدک کے رہنے والے یہودی صلح کے خیال سے خدمت پیغمبرؐ میں سر تسلیم خم کرتے ہوئے آئے اور انہوں نے اپنی نصف زمینیں اور باغات آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سپرد کر دیئے اور نصف اپنے پاس رکھے رہے۔

اس کے علاوہ نہوں نے پیغمبر سلامؐ کے حصے کی زمینوں کی کاشتکاری بھی پنے ذمہ لی، پنی کاشتکاری کی زحمت کی اجرت وہ پیغمبر سلامؐ سے وصول کرتے تھے۔ (سورہ حشر، آیت ۷) کے پیش نظر یہ زمینیں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ملکیت تھیں، ان کی آمدنی کو آپؐ پنے مصرف میں لاتے تھے یا ان مقامات میں خرچ کرتے تھے جن کی طرف سورہ حشر، آیت نمبر ۷ میں شارہ ہوا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ ساری زمینیں پنی بیٹی حضرت فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا کو عنایت فرمادیں، یہ ایسی حقیقت ہے جسے بہت سے شیعہ ور اہل سنت مفسرین نے صراحت کے ساتھ تحریر کیا ہے، منجملہ دیگر مفسرین کے تفسیر در منثور میں ابن عباسؓ سے مروی ہے

جس وقت آیت (فَاٰتِ ذَا الْقُرْبیٰ حَقَّهٗ)(۱) نازل ہوئی تو پیغمبرؐ نے جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا کو فدک عنایت فرمایا (اقطَعَ رَسُولُ اللّٰہ فاطمۃَ فَدَکًا)(۲)

کتاب کنز العمال، جو مسند احمد کے حاشیہ پر لکھی گئی ہے، میں صلہ رحم کے عنوان کے تحت ابوسعید خدری سے منقول ہے کہ جس وقت مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی تو پیغمبر ﷺ نے فاطمہ سلام اللہ علیہا کو طلب کیا اور فرمایا:

"یا فاطمۃ لکِ فدک" "اے فاطمہ فدک تمہاری ملکیت ہے"۔(۳)

حاکم نیشاپوری نے بھی اپنی تاریخ میں اس حقیقت کو تحریر کیا ہے۔(۴)

ابن ابی الحدید معتزلی نے بھی نہج البلاغہ کی شرح میں داستان فدک تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے اور اسی طرح بہت سے دیگر مورخین نے بھی۔(۵)

لیکن وہ افراد جو اس اقتصادی قوت کو حضرت علی علیہ السلام کی زوجہ محترمہ کے قبضہ میں رہنے دینا اپنی سیاسی قوت کے لئے مضر سمجھتے تھے، انہوں نے مصمم ارادہ کیا کہ حضرت علی علیہ السلام کے یار و انصار کو ہر لحاظ سے کمزور اور گوشہ نشین کردیں، جعلی حدیث (نَحْنُ مُعَاشِرَ الْأَنْبِیَاءِ لاَ نُوَرِّثُ) (ہم گروہ انبیاء میراث نہیں چھوڑتے) کے بہانے انہوں نے اسے اپنے قبضہ میں لے لیا اور باوجود یکہ حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا قانونی طور پر اس پر متصرف تھیں اور کوئی شخص "ذو ید" (جس کے قبضہ میں مال ہو) سے گواہ کا مطالبہ نہیں کرتا، جناب سیدہ سلام اللہ علیہا سے گواہ طلب کئے گئے، بی بی نے گواہ پیش کئے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے خود انہیں فدک عطا فرمایا ہے لیکن انہوں نے ان تمام

(۱)سورۂ روم، آیت ۳۸
(۲)در منثور، جلد ۴ صفحہ ۱۷۷
(۳) کنز العمال، جلد ۲ صفحہ ۱۵۸
(۴) دیکھئے کتاب فدک صفحہ ۴۹ کی طرف
(۵) شرح ابن ابی الحدید، جلد ۱۶، صفحہ ۲۰۹ اور اس کے بعد

چیزوں کی کوئی پرواہ نہیں کی، بعد میں آنے والے خلفاء میں سے جو کوئی اہل بیت علیہم السلام سے محبت کا اظہار کرتا تو وہ فدک انہیں لوٹا دیتا تھا لیکن زیادہ دیر نہیں گزرتی تھی کہ دوسرے خلیفہ اسے چھین لیتا تھا اور دوبارہ اس پر قبضہ کرلیتا تھا، خلفائے بنی امیہ اور خلفائے بنی عباس نے بارہا ایسا ہی کیا۔

واقعہ فدک اور اس سے متعلق مختلف واقعات جو صدر اسلام میں اور بعد میں پیش آئے، زیادہ دردناک اور غم انگیز ہیں اور وہ تاریخ اسلام کا ایک عبرت انگیز حصہ بھی ہیں جو محققانہ طور پر مستقل مطالعہ کا متقاضی ہے تاکہ تاریخ اسلام کے مختلف واقعات نگاہوں کے سامنے آسکیں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اہل سنت کے نامور محدث مسلم بن حجاج نیشاپوری نے اپنی مشہور و معروف کتاب "صحیح مسلم" میں جناب فاطمہ (سلام اللہ علیہا) کا خلیفہ اول سے فدک کے مطالبہ کا واقعہ تفصیل سے بیان کیا ہے، اور جناب عائشہ کی زبانی نقل کیا ہے کہ جب خلیفۂ اول نے جناب فاطمہؑ کو فدک نہیں دیا تو بی بی ان سے ناراض ہوگئیں اور آخر عمر تک ان سے کوئی گفتگو نہیں کی۔ (صحیح مسلم، کتاب جہاد، جلد ۳ ص ۱۳۸۰ حدیث ۵۲)(۱)

---

(۱) تفسیر نمونہ، جلد ۲۳، صفحہ ۵۱

۱۰۵۔ کیا جناب ابوطالبؑ مومن تھے؟

تمام علمائے شیعہ اور اہل سنت کے بعض بزرگ علماء مثلاً "ابن ابی الحدید" شارح نہج البلاغہ اور "قسطلانی" نے ارشاد الساری اور "زینی دحلان" نے سیرۂ حلبی کے حاشیہ میں حضرت ابوطالبؑ کو مومنین اور اہل اسلام میں سے بیان کیا ہے، اسلام کی بنیادی کتابوں کے منابع میں بھی ہمیں اس موضوع کے بہت سے شواہد ملتے ہیں جن کے مطالعہ کے بعد ہم گہرے تعجب اور حیرت میں پڑ جاتے ہیں کہ حضرت ابوطالب پر ایک گروہ کی طرف سے اس قسم کی بے جا تہمتیں کیوں لگائی گئیں؟!

جس نے اپنے تمام وجود کے ساتھ پیغمبر اسلام کا دفاع کیا اور بارہا خود اپنے فرزند کو پیغمبر اسلام کے مقدس وجود کو بچانے کے لئے خطرات کے مواقع پر ڈھال بنادیا! یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اس پر ایسی تہمت لگائی جائے؟!۔

یہی سبب ہے کہ تحقیق کرنے والوں نے دقت نظر کے ساتھ یہ سمجھا ہے کہ حضرت ابوطالبؑ کے خلاف مخالفت کی لہر ایک سیاسی ضرورت کی وجہ سے ہے جو "شَجَرۂ خَبِیثَۃ بَنِي اُمَیّہ" کی حضرت علی علیہ السلام کے مقام ومرتبہ کی مخالفت سے پیدا ہوئی ہے۔

کیونکہ یہ صرف حضرت ابوطالب کی ذات ہی نہیں تھی جو حضرت علی علیہ السلام کے قرب کی وجہ سے ایسے حملے کی زد میں آئی ہو، بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر وہ شخص جو تاریخ اسلام میں کسی طرح سے

بھی امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے قربت رکھتا ہے ایسے ناجوانمردانہ حملوں سے نہیں بچ سکا، حقیقت میں حضرت علی علیہ السلام جیسے عظیم پیشوائے اسلام کے باپ ہونے کے علاوہ حضرت ابوطالب کا کوئی گناہ نہیں تھا ہم یہاں پر ان بہت سے دلائل میں سے جو واضح طور پر ایمان ابوطالب کی گواہی دیتے ہیں کچھ دلائل مختصر طور پر فہرست وار بیان کرتے ہیں تفصیلات کے لئے اس موضوع پر لکھی گئی کتابوں کا مطالعہ کریں۔

۔حضرت ابوطالب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے پہلے اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کا بھتیجا مقام نبوت تک پہنچے گا، مورخین نے لکھا ہے کہ حضرت ابوطالب قریش کے قافلے کے ساتھ شام گئے تھے تو اپنے بارہ سالہ بھتیجے محمد کو بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے، اس سفر میں انہوں نے آپ کی بہت سی کرامات کا مشاہدہ کیا۔

ان میں ایک واقعہ یہ ہے کہ جونہی قافلہ "بحیرا" نامی راہب کے قریب سے گزرا جو قدیم زمانہ سے ایک گرجا گھر میں مشغول عبادت تھا اور کتب عہدین [توریت وانجیل] کا عالم تھا اور تجارتی قافلے اپنے سفر کے دوران اس کی زیارت کے لئے جاتے تھے، تو راہب کی نظریں قافلہ والوں میں سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جم کر رہ گئیں، اس وقت آپ کی عمر بارہ سال سے زیادہ نہ تھی

بحیرا نے تھوڑی دیر کے لئے حیران و ششدر رہ کر گہری اور پرمعنی نظروں سے دیکھنے کے بعد کہا یہ بچہ تم میں سے کس سے تعلق رکھتا ہے؟ لوگوں نے ابوطالب کی طرف اشارہ کیا، انہوں نے بتایا کہ یہ میرا بھتیجا ہے۔ "بحیرا" نے کہا اس بچہ کا مستقبل بہت درخشاں ہے، یہ وہی پیغمبر ہے جس کی نبوت ورسالت کی آسمانی کتابوں نے خبر دی ہے اور میں نے اس کی تمام خصوصیات کتابوں میں پڑھی ہیں۔(۱)

---

(۱) تلخیص از سیرہ ابن ہشام جلد ۱ صفحہ ۱۹۱، سیرہ حلبی جلد ۱ صفحہ ۱۲۰ وغیرہ

ابوطالب اس واقعہ اور اس جیسے دوسرے واقعات سے پہلے دوسرے قرائن سے بھی پیغمبر اکرم کی نبوت اور معنویت کو سمجھ چکے تھے۔

اہل سنت کے عالم شہرستانی (صاحب ملل ونحل) اور دوسرے علما کی نقل کے مطابق "ایک سال آسمان مکہ نے اہل مکہ سے اپنی برکت روک لی اور سخت قسم کی قحط سالی نے لوگوں کو گھیر لیا تو ابوطالب نے حکم دیا کہ ان کے بھتیجے محمدؐ کو جو ابھی شیر خوار ہی تھے، لایا جائے، جب بچے کو اس حال میں کہ وہ ابھی کپڑے میں لپیٹا ہوا تھا انہیں دیا گیا تو وہ اسے لینے کے بعد خانہ کعبہ کے سامنے کھڑے ہو گئے اور تضرع وزاری کے ساتھ اس طفل شیر خوار کو تین مرتبہ اوپر کی طرف بلند کیا اور ہر مرتبہ کہتے تھے پروردگارا اس بچہ کے حق کا واسطہ ہم پر بابرکت بارش نازل فرما۔

زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ افق سے بادل کا ایک ٹکڑا نمودار ہوا اور مکہ کے آسمان پر چھا گیا اور بارش سے ایسا سیلاب آیا جس سے خوف پیدا ہونے لگا کہ کہیں مسجد الحرام ہی ویران نہ ہو جائے"

اس کے بعد شہرستانی کا کہنا ہے کہ یہی واقعہ جو ابوطالب کی اپنے بھتیجے کے بچپن سے اس کی نبوت ورسالت سے آگاہ ہونے پر درست کرتا ہے ان کے پیغمبرؐ پر ایمان رکھنے کا ثبوت بھی ہے اور ابوطالب نے بعد میں درج ذیل اشعار اسی واقعہ کی مناسبت سے کہے تھے

وَ ابیض یستسقي الغَمَامُ بوجهه

ثَمالُ الیتامٰی عُصمۃ للأرامل

"وہ ایسا روشن چہرے والا ہے کہ بادل اس کی خاطر سے بارش برساتے ہیں وہ یتیموں کی پناہ گاہ اور بیواؤں کے محافظ ہیں"

یلُوذُ به الهُلاک مِن آلِ هَاشِم

فَهُمْ عِنْدَہ فِي نِعمَةٍ وَ فَوَاضِلِ

"بنی ہاشم میں سے جو ہلاک ہونے لگے ہیں وہ اسی سے پناہ لیتے ہیں اور اسی کے صدقے میں نعمتوں

اور احسانات سے بہرہ مند ہوتے ہیں"۔

ومیزانُ عدلِہ یحیس شعیرۃ

ووزانُ صدقٍ وزنہ غیرُ ھائلِ

"وہ یک ایسی میزان عدالت ہے جو ایک جو برابر بھی ادھر ادھر نہیں کرتا اور درست کاموں کا ایسا وزن کرنے والا ہے جس کے وزن کرنے میں کسی شک وشبہ کا خوف نہیں ہے"۔

قحط سالی کے وقت قریش کا ابوطالب کی طرف متوجہ ہونا اور ابوطالب کا خدا کو آنحضرت کے حق کا واسطہ دینا شہرستانی کے علاوہ اور دوسرے بہت سے عظیم مورخین نے بھی نقل کیا ہے، مرحوم علامہ امینی نے اسے اپنی کتاب **"الغدیر" میں "شرح بخاری"، "المواہب اللدنیہ"، "الخصائص الکبریٰ"، "شرح بہجۃ المحافل"، "سیرہ حلبی"، "سیرہ نبوی"** اور **"طلبۃ الطالب"** سے نقل کیا ہے (۱)

۲۔ اس کے علاوہ مشہور اسلامی کتابوں میں ابوطالب کے بہت سے اشعار ایسے ہیں جو ہماری دسترس میں ہیں جس کے مجموعہ کا نام "دیوان ابوطالب" رکھا گیا ہے، ہم ان میں سے کچھ اشعار ذیل میں نقل کررہے ہیں:

واللہ لن یصلوا الیک بجمعھم

حتّی اُوسد فی التُّراب دفینًا

"اے میرے بھتیجے! خدا کی قسم جب تک ابوطالب مٹی میں نہ سوجائے اور لحد کو اپنا بستر نہ بنالے دشمن ہرگز ہرگز تجھ تک نہیں پہنچ سکیں گے"۔

فاصدع بأمرکَ ماعلیکَ غضاضۃ

وَابشر بِذاکَ وَ قرمنک عیونًا

"لہذا کسی چیز سے نہ ڈر اور اپنی ذمہ داری اور ماموریت کا ابلاغ کردو، بشارت دو اور

آنکھوں کو ٹھنڈا کرو"۔

وَدَعَوتَنِي وَعَلِمتُ أَنَّكَ نَاصِحِي
وَلَقَد دَعَوتَ وَكُنتَ ثَمَّ أَمِيناً

"تو نے مجھے اپنے مکتب کی دعوت دی اور مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تیرا ہدف و مقصد صرف پند و نصیحت کرنا اور بیدار کرنا ہے، تو اپنی دعوت میں امین ہے"۔

وَلَقَد عَلِمتُ أَنَّ دِينَ مُحَمَّدٍ (ص)
مِن خَيرِ أَديَانِ البَرِيَّةِ دِيناً (۱)

"میں یہ بھی جانتا ہوں کہ محمدؐ کا دین تمام ادیان میں سب سے بہتر دین ہے"۔

اور یہ اشعار بھی انھوں نے ہی ارشاد فرمائے ہیں:

أَلَم تَعلَمُوا أَنَّا وَجَدنَا مُحَمَّداً
رَسُولاً كَمُوسَى خُطَّ فِي أَوَّلِ الكُتُبِ

"اے قریش! کیا تمھیں معلوم نہیں ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) موسیٰ (علیہ السلام) کی مثل ہیں اور موسیٰ علیہ السلام کے مانند خدا کے پیغمبر اور رسول ہیں جن کے آنے کی پیشین گوئی گزشتہ آسمانی کتابوں میں لکھی ہوئی ہے اور ہم نے اسے پالیا ہے"۔

---

(۱) خزانۃ الادب، تاریخ ابن کثیر، شرح ابن ابی الحدید، فتح الباری، بلوغ الارب، تاریخ ابو الفداء، سیرۂ نبوی وغیرہ، الغدیر، جلد ۸ کی نقل کے مطابق

وَ إنَّ علَيه في العِبَادِ محبة

ولاحيفَ في من خصّهُ اللہ في الحبّ (۱)

"خدا کے بندے اس سے خاص لگاؤ رکھتے ہیں اور جسے خداوند متعال نے اپنی محبت کے لئے مخصوص کر لیا ہو اس شخص سے یہ لگاؤ بے جا نہیں ہے۔"

ابن ابی الحدید، جناب ابوطالب کے کافی اشعار نقل کرنے کے بعد (جن کے مجموعہ کو ابن شہر آشوب نے "متشابہات القرآن" میں تین ہزار اشعار کہا ہے) کہتا ہے "ان تمام اشعار کے مطالعہ سے ہمارے لئے کسی قسم کے شک وشبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ ابوطالب اپنے بھتیجے کے دین پر ایمان رکھتے تھے"۔

۳۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بہت سی ایسی احادیث بھی نقل ہوئی ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ان کے فداکار چچا ابوطالب کے ایمان پر گواہی دیتی ہیں منجملہ "ابوطالب مومن قریش" کے مولف کی نقل کے مطابق ایک یہ ہے کہ جب ابوطالب کی وفات ہوگئی تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی تشییع جنازہ کے بعد اس سوگواری کے ضمن میں جو اپنے چچا کی وفات کی مصیبت میں آپ کر رہے تھے آپ یہ بھی کہتے تھے "ہائے میرے بابا! ہائے ابوطالب! میں آپ کی وفات سے کس قدر غمگین ہوں میں کس طرح آپ کی مصیبت کو بھول جاؤں، اے وہ شخص جس نے بچپن میں میری پرورش و تربیت کی اور بڑے ہونے پر میری دعوت پر لبیک کہی، میں آپ کے نزدیک اس طرح تھا جیسے آنکھ خانۂ چشم میں اور روح بدن میں"۔ (۲)

---

(۱) خزانۃ الادب، تاریخ ابن کثیر، شرح ابن ابی الحدید، فتح الباری، بلوغ الارب، تاریخ ابی الفداء، سیرۃ نبوی وغیرہ، الغدیر، جلد ۸ کی نقل کے مطابق

(۲) شیخ الابطح، ابوطالب مومن قریش سے نقل کے مطابق۔

نیز آپ ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے "ما نالت منّي قُريش شيئاً اكرهُه حتّى ماتَ ابو طَالب "(۱)

"اہل قریش اس وقت تک میرے خلاف کوئی ناپسندیدہ اقدام نہ کرسکے جب تک ابوطالب کی وفات نہ ہوگئی"۔

۴۔ ایک طرف سے یہ بات مسلم ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ کو ابوطالب کی وفات سے کئی سال پہلے یہ حکم مل چکا تھا کہ وہ مشرکین کے ساتھ کسی قسم کا دوستانہ رابطہ نہ رکھیں، اس کے باوجود ابوطالب کے ساتھ اس قسم کے تعلق اور مہر و محبت کا اظہار اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ انھیں مکتب توحید کا معتقد جانتے تھے، ورنہ یہ بات کس طرح ممکن ہوسکتی تھی کہ دوسروں کو تو مشرکین کی دوستی سے منع کریں اور خود ابوطالب سے عشق کی حد تک محبت رکھیں۔

۵۔ اہل بیت پیغمبر علیہم السلام کے ذریعہ سے ہم تک پہنچنے والی احادیث میں حضرت ابوطالب کے ایمان و اخلاص کے بڑی کثرت سے مدارک نظر آتے ہیں، جن کو یہاں نقل کرنے سے بحث طولانی ہو جائے گی، یہ احادیث منطقی استدلال کی حامل ہیں ان میں سے ایک حدیث چوتھے امام علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے اس میں امام علیہ السلام نے اس سوال کے جواب میں کہ کیا ابوطالب مومن تھے؟ جواب دینے کے بعد ارشاد فرمایا

"إنّ هُنا قوماً يزعمون أنّه كافرٌ" اس کے بعد فرمایا "تعجب کی بات ہے کہ بعض لوگ یہ کیوں خیال کرتے ہیں کہ ابوطالب کافر تھے، کیا وہ نہیں جانتے کہ وہ اس عقیدہ کے ساتھ پیغمبرؐ اور ابوطالب پر طعن کرتے ہیں کیا ایسا نہیں ہے کہ قرآن کی کئی آیات میں اس بات سے منع کیا گیا ہے (اور یہ حکم دیا گیا ہے کہ) مومن عورت ایمان لانے کے بعد کافر کے ساتھ نہیں رہ سکتی اور یہ بات مسلم

(۱) طبری، ابوطالب مومن قریش کی نقل کے مطابق

ہے کہ فاطمہ بنت اسد سلام اللہ علیہا سابق ایمان لانے والوں میں سے ہیں، اور وہ ابو طالب کی زوجیت میں ابو طالب کی وفات تک رہیں۔" (۱)

۲۔ ان تمام باتوں کے علاوہ، اگر انسان ہر چیز میں شک کرے تو کم از کم اس حقیقت میں تو شک نہیں کر سکتا کہ ابو طالب، اسلام اور پیغمبر اکرم ﷺ کے صف اول کے حامی و مددگار تھے، انھوں نے اسلام اور رسولؐ کی جو حمایت کی ہے اسے کسی طرح بھی رشتہ داری اور قبائلی تعصبات سے منسلک نہیں کیا جا سکتا۔

اس کا زندہ نمونہ شعب ابو طالب کی داستان ہے، تمام مورخین نے لکھا ہے کہ جب قریش نے پیغمبر اکرم ﷺ اور مسلمانوں کا ایک شدید اقتصادی، سماجی اور سیاسی بائیکاٹ کیا اور ان سے ہر قسم کے روابط ان سے منقطع کر لئے تو آنحضرت ﷺ کے واحد حامی اور مدافع، ابو طالب نے اپنے تمام کاموں سے ہاتھ کھینچ لیا، اور برابر تین سال تک ہاتھ کھینچے رکھا اور بنی ہاشم کو ایک درہ میں لے گئے جو مکہ کے پہاڑوں کے درمیان اور "شعب ابو طالب" کے نام سے مشہور تھا وہاں پر سکونت اختیار کر لی۔

ان کی فداکاری اس مقام تک جا پہنچی کہ قریش کے حملوں سے بچانے کیلئے کئی ایک مخصوص قسم کے برج تعمیر کرنے کے علاوہ ہر رات پیغمبر اکرم ﷺ کو ان کے بستر سے اٹھاتے، اور ان کے آرام کے لئے دوسری جگہ مہیا کرتے اور اپنے فرزند دلبند علیؑ کو ان کی جگہ پر سلا دیتے اور جب حضرت علیؑ کہتے "بابا جان! میں تو اسی حالت میں قتل ہو جاؤں گا" تو ابو طالب جواب میں کہتے میرے پیارے بچے! بردباری اور صبر ہاتھ سے نہ چھوڑو، ہر زندہ شخص موت کی طرف رواں دواں ہے، میں نے تجھے فرزند عبداللہ کا فدیہ قرار دیا ہے۔

(۱) کتاب الحجہ، درجات الرفیعہ، الغدیر، جلد ۸ کی نقل کے مطابق

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ جو حضرت علی علیہ السلام باپ کے جواب میں کہتے ہیں کہ بابا جان میرا یہ کلام اس بنا پر نہیں تھا کہ میں محمد کے لئے قتل ہونے سے ڈرتا ہوں، بلکہ میرا یہ کلام اس بنا پر تھا کہ میں یہ چاہتا تھا کہ آپ کو یہ معلوم ہو جائے کہ میں کس طرح سے آپ کی اطاعت اور احمد مجتبیٰ کی نصرت و مدد کے لئے آمادہ ہوں۔(۱)

قارئین کرام! ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص بھی تعصب کو ایک طرف رکھ کر غیر جانبداری کے ساتھ ابوطالب کے بارے میں تاریخ کی سنہری سطروں کو پڑھے گا تو وہ ابن ابی الحدید شارح نہج البلاغہ کا ہم آواز ہو کر کہے گا:

وَلَوْلَا أَبُوطَالِب وَ اِبنُهُ لَمَا مَثُلَ الدِّينُ شَخْصاً وَقَامَا

فَذَاكَ بِمَكَّةَ آوَى وَحَامَى وَهَذَا بِيَثْرِبَ جَسَّ الحِمَامَا(۲)

"اگر ابوطالب اور ان کے فرزند نہ ہوتے تو ہرگز مکتب اسلام باقی نہ رہتا اور اپنا قدموں پر کھڑا نہ ہوتا، ابوطالب تو مکہ میں پیغمبر کی مدد کیلئے آگے بڑھے اور علی یثرب (مدینہ) میں حمایت اسلام کی راہ میں گرداب موت میں ڈوب گئے"۔

اگر جناب ابوطالب اور ان کے فرزند ارجمند نہ ہوتے تو دین اسلام بھی نہ ہوتا، اگر یہ نہ ہوتے تو اسلام کے لئے کوئی سہارا نہ تھا، جناب ابوطالب نے مکہ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی مدد کی اور حضرت علی علیہ السلام نے مدینہ میں، اور اسلام کی حمایت میں عظیم قربانیاں پیش کیں۔(۳)

---

(۱) الغدیر، جلد ۸

(۲) الغدیر، جلد ۸

(۳) تفسیر نمونہ، جلد ۵ صفحہ ۹۲

۱۰۶۔ گناہان کبیرہ کا معیار کیا ہے؟

گناہان کبیرہ کی طرف قرآن مجید میں چند آیات میں اشارہ ہوا ہے( ) جن کے بارے میں مفسرین، فقہا اور محدثین نے طولانی گفتگو کی ہے۔

بعض مفسرین تمام گناہوں کو "گناہان کبیرہ" مانتے ہیں، کیونکہ صاحب عظمت خدا ہر گناہ بڑا، ہے۔

جبکہ بعض علما نے "کبیرہ" اور "صغیرہ" کو نسبی امر بتایا ہے، اور ہر گناہ کو دوسرے، اہم گناہ کے مقابل صغیرہ قرار دیا ہے اور اس سے چھوٹے گناہ کی نسبت کبیرہ قرار دیا ہے۔

بعض مفسرین نے ان گناہوں کو کبیرہ قرار دیا ہے جن پر قرآن مجید میں عذاب الٰہی کا وعدہ کیا گیا ہے۔

نیز بعض حضرات کا یہ کہنا ہے کہ گناہ کبیرہ وہ گناہ ہے جس کے ارتکاب کرنے والے پر "حدّ شرعی" جاری ہوتی ہے۔ لیکن سب سے بہتر یہ ہے کہ ہم یوں کہیں کہ بعض گناہوں کو "کبیرہ" کہنا خود اس کے عظیم ہونے پر دلالت کرتا ہے لہٰذا جس گناہ میں درج ذیل شرائط میں سے کوئی ایک شرط پائی جائے تو وہ گناہ کبیرہ ہے۔

( ) سورۂ نساء، آیت ۳۱ سورۂ شوریٰ، آیت ۳۷، اور آیات محل بحث [سورہ نجم آیت ۳۱،۳۲]

الف۔ جن گناہوں پر عذاب الٰہی کا وعدہ کیا گیا ہے۔

ب۔ جن گناہوں کو قرآن وسنت میں اہم قرار دیا گیا ہے۔

ج۔ جن گناہوں کو شرعی منابع میں گناہ کبیرہ سے بھی عظیم قرار دیا گیا ہے۔

د۔ جن گناہوں کے بارے میں معتبر روایات میں کبیرہ ہونے کی وضاحت کی گئی ہے۔

اسلامی روایات میں ”گناہان کبیرہ“ کی تعداد مختلف بیان ہوئی ہے، بعض روایت میں سات گناہوں کو کبیرہ قرار دیا گیا ہے (قتل نفس، عقوق والدین، سود خوری، ہجرت کے بعد دار الکفر کی طرف پلٹ جانا، پاکدامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگانا، یتیموں کا مال کھانا اور جہاد سے فرار کرنا)(۱)

بعض دیگر روایات میں [بھی] ”گناہان کبیرہ“ کی تعداد سات ہی بیان کی گئی ہے صرف اس فرق کے ساتھ کہ اس میں عقوق والدین کی جگہ یہ جملہ بیان ہوا ہے کہ ”کُلُّما اَوْجَبَ اللهُ عَلَیه النّار“ (جن چیزوں پر خدا نے جہنم کو واجب قرار دیا ہے)

جبکہ بعض دوسری روایات میں ”گناہان کبیرہ“ کی تعداد ۱۰، بعض میں ۱۹، اور بعض میں اس کی تعداد اس سے کہیں زیادہ بتائی گئی ہے۔(۲)

گناہان کبیرہ کی تعداد کے سلسلہ میں اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ تمام گناہان کبیرہ برابر نہیں ہیں، بلکہ ان میں سے بعض کی بہت زیادہ اہمیت ہے، یا باالفاظ دیگر ”اکبر الکبائر“ [کبیرہ سے زیادہ بڑا] ہے، لہٰذا ان کے درمیان کوئی تضاد اور ٹکراؤ نہیں ہے۔ (۳)

---

(۱) وسائل الشیعہ، جلد ۱۱ (ابواب جہاد بالنفس باب ۴۶ حدیث ۱)

(۲) اس سلسلہ میں مزید آگاہی کے لئے وسائل الشیعہ (باب ۴۶ از ابواب جہاد بالنفس) پر رجوع فرمائیں، اس باب میں گناہان کبیرہ کی تعداد کے سلسلہ سے ۳۷ حدیث نقل ہوئی ہیں

(۳) تفسیر نمونہ، جلد ۲۲، صفحہ ۵۰۱

۱۰۷۔ کیا دنوں کو سعد و نحس ماننا صحیح ہے؟

عوام الناس کے درمیان یہ بات مشہور ہے کہ کچھ دن سعد اور نیک ہوتے ہیں اور کچھ نحس ہوتے ہیں، اگرچہ اس میں شدید اختلاف ہے کہ کون کون سے دن سعد یا نحس ہیں؟ یہاں بحث یہ ہے کہ عوام الناس کا یہ عقیدہ اسلام کی نظر میں کہاں تک قابل قبول ہے؟ یا یہ نظریہ اسلام ہی سے لیا گیا ہے؟ اگرچہ عقلی لحاظ سے زمان اور ایام میں فرق کا پیدا جانا محال نہیں ہے، کہ بعض ایام نحوست کی علامت رکھتے ہوں اور بعض دن سعد اور نیک ہوں، اگرچہ ہمارے پاس ایسی کوئی عقلی دلیل نہیں ہے جس کے ذریعہ ان کو ثابت کیا جائے یا اس کی نفی کی جائے، ہم تو صرف اتنا کہتے ہیں کہ ایسا ہونا ممکن ہے لیکن عقلی لحاظ سے ثابت نہیں ہے۔

لہٰذا اگر اس سلسلہ میں شرعی دلائل موجود ہوں تو اس کو قبول کیا جا سکتا ہے بلکہ ان کو ماننا ضروری ہے۔ قرآن مجید میں صرف دو مقامات پر ''نحوست ایام'' کی طرف اشارہ ہوا ہے، ایک سورہ قمر، آیت نمبر ۱۹ میں اور دوسرے سورہ فصلت، آیت نمبر ۱۶ میں جہاں قوم عاد کے واقعہ کی طرف اشارہ ہوا ہے، چنانچہ ارشاد خداوندی ہے: ﴿فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا فِي أَيَّامٍ نَحِسَاتٍ﴾ ( )

( ) سورۂ فصلت، آیت ۱۶

”تو ہم نے بھی ان کے اوپر تیز اور تند آندھی کو ان کی نحوست کے دنوں میں بھیج دیا“۔( )

اس کے مدمقابل بعض آیت میں دنوں کے لئے لفظ ”مبارک“ آیا ہے، جیسا کہ شب قدر کے بارے میں ارشاد ہے ﴿اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةٍ مُبَارَكَةٍ﴾ (۲) ”ہم نے اس قرآن کو ایک مبارک رات میں نازل کیا ہے“۔

”نحس“ اصل میں فق کی بہت زیادہ سرخی کو کہتے ہیں جس کو ”نحاس“ (یعنی ایسا شعلہ جس میں دھواں نہ ہو) کی شکل میں دیتے ہیں، لیکن بعد میں اس کو ”شوم“ (یعنی بُرے) کے معنی میں استعمال کیا جانے لگا۔

اس لحاظ سے قرآن مجید میں صرف اس مسئلہ کی طرف مجمل اشارہ ہے، لیکن دنوں کے ”سعد ونحس“ کے سلسلہ میں اسلامی منابع میں بہت سی روایات موجود ہیں، اگرچہ ان میں سے متعدد روایت ضعیف ہیں، یا بعض روایات خرافات سے ملی جلی ہیں، لیکن سب ایسی نہیں ہیں، بلکہ ان کے درمیان متعدد روایت معتبر اور قابل قبول ہیں، جیسا کہ مذکورہ آیات کی تفسیر میں بہت سے مفسرین نے ان روایات کو صحیح قرار دیا ہے۔

محدث بزرگوار مرحوم علامہ مجلسی علیہ الرحمہ نے بھی اس سلسلہ میں بہت سی حدیث ”بحار الانوار“ میں بیان کی ہیں۔(۳)

ہم یہاں چند مطالب مختصر طور پر بیان کرتے ہیں:

(۱) توجہ رہے کہ مذکورہ آیت میں ”نحسات“ کا لفظ آیا ہے جو ایام کی صفت ہے، یعنی وہ دن نحس تھے، جبکہ آیات محل بحث ﴿في يوم نحس مستمر﴾ میں یوم ”نحس“ کی طرف مضاف ہوا ہے اور صفت کے معنی میں نہیں ہے لیکن مذکورہ آیت کے پیش نظر ہم کہتے ہیں کہ یہاں پر موصوف، صفت کی طرف اضافہ ہوا ہے۔

(۲) سورہ دخان، آیت ۳

(۳) بحار الانوار، جلد ۵۹ کتاب ”السماء والعالم“ صفحہ ۱ تا ۹۱، اور کچھ روایات اس کے بعد بیان کی ہیں۔

الف۔ متعدد روایات میں تاریخوں کو سعد ونحس ان تاریخوں میں واقع ہونے والے واقعات کی بنا پر سعد ونحس کہا گیا ہے، مثال کے طور پر حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام سے منقول ایک روایت میں بیان ہوا ہے کہ ایک شخص نے امام علیہ السلام سے درخواست کی کہ جس میں "چہار شنبہ" کے بارے میں سوال کیا جس کو عوام الناس کے درمیان اچھا نہیں سمجھا جاتا اور اس کو برا سمجھا جاتا ہے، امام سے سوال کیا کہ وہ کونسا چہار شنبہ ہے؟ امام علیہ السلام نے فرمایا "اس سے مراد مہینہ کا آخری چہار شنبہ ہے، جس میں بہت سے واقعات رونما ہوئے ہیں، اسی روز قابیل نے اپنے بھائی "ہابیل" کو قتل کیا... اور اسی روز چہار شنبہ میں خداوند عالم نے قوم عاد پر تیز آندھی کے ذریعہ عذاب نازل کیا"۔(۱)

لہٰذا متعدد مفسرین نے اس طرح کی بہت سی روایات کی پیروی کرتے ہوئے ہر مہینہ کے آخری چہار شنبہ کو روز "نحس" قرار دیا، اور اس کو "اربعاء لا تدور" قرار دیا، (یعنی ایسا چہار شنبہ جس کی تکرار نہیں ہوتی)

اسی طرح بعض دوسری روایات میں بیان ہوا ہے کہ ہر ماہ کی پہلی تاریخ نیک اور مبارک ہے، کیونکہ اس میں جناب آدم علیہ السلام پیدا ہوئے، اسی طرح ہر ماہ کی ۲۶ تاریخ کو نیک شمار کیا ہے کیونکہ خداوند عالم نے اس تاریخ میں جناب موسیٰ علیہ السلام کے لئے دریا میں راستہ بنایا۔(۲)

اسی طرح ہر ماہ کی ۳ تاریخ کو نحس قرار دیا کیونکہ اس تاریخ میں جناب آدم وحوا علیہما السلام کو جنت سے نکالا گیا اور ان کے بدن سے جنتی لباس جدا ہوگیا۔(۳)

یا ہر مہینہ کی سات تاریخ کو نیک مانتے ہیں کیونکہ اس تاریخ میں جناب نوح علیہ السلام کشتی

---

(۱) تفسیر نور الثقلین، جلد ۵، صفحہ ۱۸۳، (حدیث ۲۵)
(۲) تفسیر نور الثقلین، جلد ۵، صفحہ ۵۰
(۳) تفسیر نور الثقلین، جلد ۵، صفحہ ۵۸

پر سوار ہوئے (اور غرق ہونے سے نجات پاگئے)(۱)

یا جیسا کہ نوروز کے سلسلہ میں حضرت امام صادق علیہ السلام سے منقول حدیث میں بیان ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا یہ ایک مبارک روز ہے جس میں جناب نوح علیہ السلام کی کشتی جودی نامی پہاڑی پر رکی، جناب جبرئیل پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئے، اسی روز حضرت علی علیہ السلام نے دوش پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سوار ہوکر خانہ کعبہ سے بتوں کو توڑا، اور واقعہ غدیر خم بھی اسی نوروز میں واقع ہوا ہے...(۲)

المختصر اس طرح کے الفاظ بہت سی روایات میں بیان ہوئے ہیں جن میں بعض اچھے وقت اور بعض ناگوار واقعات کی بنا پر تاریخوں کو سعد یا نحس قرار دیا ہے، خصوصاً روز عاشورہ کے سلسلہ میں جس کو بنی امیہ اہل بیت علیہم السلام پر کامیابی کے گمان سے اس دن کو ایک مبارک روز شمار کرتے تھے، لہٰذا روایات میں اس دن کو مبارک ماننے سے نہی کی گئی ہے بلکہ اس روز کاروبار اور تحصیل رزق کی تعطیل کے لئے کہا گیا ہے، تاکہ عملی طور پر بنی امیہ کے اس کام سے دوری اختیار کریں، لہٰذا اس طرح کی روایات کے پیش نظر بعض علما نے سعد ونحس کی اس طرح تفسیر کی ہے کہ اسلام نے ان واقعات کی طرف توجہ دی ہے تاکہ انسان خود کو عملی طور پر تاریخی مثبت واقعات کے مطابق قرار دے، اور برے اور غلط واقعات، نیز اس طرح کے واقعات کو رونما کرنے والوں سے دوری اختیار کریں۔

ممکن ہے کہ یہ تفسیر بعض روایات کے سلسلہ میں صادق اور صحیح ہو لیکن تمام روایات کے سلسلہ میں مسلم طور پر صادق نہیں ہے کیونکہ انھیں بعض روایات سے نتیجہ نکلتا ہے کہ بعض دنوں میں مخفی تاثیر پائی جاتی ہے جس سے ہم آگاہ نہیں ہیں۔

---

(۱) تفسیر نور الثقلین، جلد۵، صفحہ۶ (۲) بحار الانوار، جلد۵۹، صفحہ۹۲

ب۔ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ بعض لوگ سعد و نحس کے سلسلہ میں اس قدر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ کوئی کام کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے تاریخ کے سعد و نحس ہونے کی جستجو کرتے ہیں، جس کی وجہ سے بعض کاموں کو چھوڑ دیتے ہیں اور اس سنہری موقع کو گنوا بیٹھتے ہیں۔

یا یہ کہ اپنی یا دوسروں کی کامیابی یا ناکامی کے اسباب و علل کی جستجو کرنے اور اپنی زندگی کے تجربات سے فائدہ اٹھانے کے بجائے ہر طرح کی ناکامی کو تاریخ اور دنوں کی گردن پر یہ کہہ کر ڈال دیتے ہیں کہ ہم کیا کریں تاریخ ہی نحس تھی، دوسری طرح کامیاب ہونے پر نیک اور مبارک تاریخ ہونے کی علت سمجھتے ہیں!

لیکن یہ ایک طرح حقیقت سے فرار اور اس مسئلہ میں زیادہ روی سے کام لینا اور حوادث زندگی کی فضول توضیح و تفسیر ہے جس سے ہمیں پرہیز کرنا چاہئے، ان مسائل میں عوام الناس میں شائع شدہ مسائل پر دھیان نہیں دینا چاہئے اور نہ ہی منجمین کی باتوں پر عمل کرنا چاہئے اور نہ ہی فال نکالنے والوں کی باتوں پر عمل کیا جائے، اگر اس سلسلہ میں کوئی چیز معتبر حدیث کے ذریعہ ثابت ہو جائے تو اس کو قبول کیا جائے، اگر ثابت نہ ہو تو ہر کس و ناکس کی بات پر توجہ نہ کرتے ہوئے اپنی زندگی کو آگے بڑھایا جائے، سعی و کوشش کرتے ہوئے اپنے قدم بڑھائے، انسان خدا پر بھروسہ کرے اور اسی کی نصرت و مدد طلب کرے۔

ج۔ تاریخوں کے سعد و نحس کے مسئلہ پر توجہ، غالباً انسان کو تاریخی ثبت و قوت کی طرف رہنمائی کے علاوہ سبب ہوتی ہے کہ انسان خداوند عالم کی ذات مقدس کی طرف متوجہ ہو اور اس کی ذات پاک سے نصرت و مدد طلب کرے، لہٰذا ہم متعدد روایات میں پڑھتے ہیں: جن تاریخوں کو نحس قرار دیا گیا ہے اس میں صدقہ دے کر، یا دعا پڑھ کر، خداوند عالم کے لطف و کرم سے نصرت و مدد طلب کرے، قرآن کی بعض آیات کی تلاوت کرکے اور خداوند منان کی ذات پر توکل اور بھروسہ کرتے ہوئے اپنے کاموں کو انجام دے تاکہ اپنے کاموں میں کامیاب ہو جاؤ۔

جیسا کہ ایک حدیث میں بیان ہوا ہے کہ حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کے دوستوں میں سے ایک شخص منگل کے روز امام کی خدمت میں حاضر ہوا، امام علیہ السلام نے فرمایا کہ تم کل نہیں آئے؟ اس نے عرض کیا کل پیر کا دن تھا، میں پیر کے دن گھر سے باہر نکلنے کو اچھا نہیں مانتا" اس وقت امام حسن عسکری علیہ السلام نے فرمایا "جو شخص پیر کے دن کے شر سے محفوظ رہنا چاہتا ہے اسے نماز صبح کی پہلی رکعت میں سورہ "ہل اتی" پڑھنی چاہئے۔ اس کے بعد امام علیہ السلام نے سورہ ہل اتی کی اس آیت کی تلاوت فرمائی (جو شر اور بلا کے دور ہونے کے لئے مناسب ہے) ﴿فَوَقَاهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقّٰاهُمْ نَضْرَةً وَسُرُورًا﴾ (۱) "تو خدا نے انھیں اس دن کی سختی سے بچالیا اور تازگی و سرور عطا کردیا"۔(۲)

اسی طرح ایک دوسری حدیث میں بیان ہوا ہے کہ حضرت امام صادق علیہ السلام کے اصحاب میں سے ایک شخص نے امام علیہ السلام سے سوال کیا کیا روز چہار شنبہ جس کو نحس قرار دیا گیا یا اس کے علاوہ دوسرے نحس دنوں میں سفر کرنا مناسب ہے؟ امام علیہ السلام نے اس کے جواب میں فرمایا: صدقہ دے کر سفر کا آغاز کرو، اور نکلتے وقت آیۃ الکرسی کی تلاوت کرو (اور جہاں چاہو سفر کرو)(۳)

نیز ایک دوسری حدیث میں بیان ہوا ہے کہ امام علی نقی علیہ السلام کے دوستوں میں سے ایک شخص کہتا ہے: میں امام علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا، حالانکہ راستہ میں میری انگلی زخمی ہوگئی تھی چونکہ ایک سواری میرے پاس سے گزری جس کی وجہ سے میرا شانہ زخمی ہوگیا، جس کی بنا پر کچھ لوگوں سے نزاع ہوگئی اور انھوں نے میرے کپڑے تک پھاڑ ڈالے، میں نے کہا: اے دن! خدا

(۱) سورہ دہر، آیت ۱۱ (۲) بحار الانوار، جلد ۵۹، صفحہ ۳۹، حدیث ۷

(۳) بحار الانوار، جلد ۵۹، صفحہ ۲۸

تیرے شر سے محفوظ رکھے، کتنا برا دن ہے! اس وقت امام علیہ السلام نے فرمایا تو ہماری محبت کا دعویٰ کرتا ہے اور اس طرح کہتا ہے؟! اس دن کی کیا خطا ہے جو تو اس دن کو گناہگار قرار دیتا ہے؟ چنانچہ وہ شخص کہتا ہے کہ میں امام علیہ السلام سے یہ گفتگو سن کر ہوش میں آیا اور میں نے اپنی غلطی کا احساس کرتے ہوئے عرض کی اے میرے مولا و آقا! میں توبہ و استغفار کرتا ہوں، اور خدا سے بخشش طلب کرتا ہوں۔ اس موقع پر امام علیہ السلام نے فرمایا "دنوں کا کیا گناہ ہے؟ کہ تم ان کو برا اور نحس مانتے ہو جب کہ تمہارے عمل ان دنوں میں تمہارے دامن گیر ہوتے ہیں"؟!

راوی کہتا ہے "میں نے عرض کی میں خدا سے ہمیشہ کے لئے استغفار کرتا ہوں، اے فرزند رسول! میں توبہ کرتا ہوں"۔

اس وقت امام علیہ السلام نے فرمایا "اس سے کوئی فائدہ نہیں، جس چیز میں مذمت نہیں ہے اس کی مذمت کرنے پر خدا تمہیں سزا دے گا، کیا تمہیں نہیں معلوم کہ خدا وند عالم ثواب و عذاب دیتا ہے، اور اعمال کی جزا اس دنیا اور آخرت میں دیتا ہے، اس کے بعد مزید فرمایا اس کے بعد اس عمل کی تکرار نہ کرنا، اور حکم خدا کے مقابل دنوں کی تاثیر پر عقیدہ نہ رکھنا"۔ (۱)

[قارئین کرام! یہ مذکورہ حدیث اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اگر دنوں کا کوئی اثر ہے بھی تو وہ حکم خدا سے ہے، لہٰذا ان کے لئے مستقل طور پر تاثیر کا قائل نہ ہونا چاہئے، اپنے کو خدا کے لطف و کرم سے بے نیاز نہیں جاننا چاہئے، اس واقعات کو جو اکثر اوقات انسان کے برے اعمال کا کفارہ ہوتے ہیں، دنوں کی تاثیر نہیں جاننا چاہئے اور اپنے کو بری الذمہ نہیں قرار دینا چاہئے، اس سلسلہ میں ان مختلف روایات کو جمع کرنے کے لئے شاید یہ بہترین راستہ ہو۔ (غور کیجئے) (۲)

---

(۱) تحف العقول، بحار الانوار، جلد ۵۹، صفحہ ۲، ح ۱ کے مطابق (مختصر فرق کے ساتھ)

(۲) تفسیر نمونہ، جلد ۲۳، صفحہ ۳۱

۱۰۸۔ کیا اصحاب کہف کا واقعہ سائنس سے مطابقت رکھتا ہے؟

شہر "افسوس" کے طولانی مدت تک سونے والوں (یعنی اصحاب کہف) کی نیند کے بارے میں بعض لوگ شک و تردید کرسکتے ہیں، ہوسکتا ہے کہ اس کو سائنس کے علمی اصول سے موافق نہ سمجھیں اور اس کو "قصہ و کہانیوں" کی صف میں قرار دے دیں، کیونکہ

۱۔ بیدار رہنے والوں کے لئے سیکڑوں سال تک زندہ رہنا مشکل ہے، سوتے ہوئے لوگوں کے لئے تو بہت دور کی بات ہے!

۲۔ بیداری کے عالم میں تو بافرض محال یہ مانا بھی جاسکتا ہے کہ اتنی طویل عمر ہوسکتی ہے، لیکن جو شخص سویا ہو ہو اس کے لئے ناممکن ہے، کیونکہ کھانے پینے کی مشکل پیش آئے گی، انسان اتنی مدت تک بغیر کھائے پئے کیسے زندہ رہ سکتا ہے، اور اگر فرض کریں کہ انسان کے لئے ہر روز ایک کلو کھانا اور ایک لیٹر پانی کی ضرورت ہوتی ہے تو اصحاب کہف کی عمر کے لئے دس کوئنٹل کھانا اور ایک ہزار لیٹر پانی ضروری ہے جس کو بدن میں ذخیرہ کرنا معنی نہیں رکھتا۔

۳۔ اگر ان سب سے چشم پوشی کریں تو یہ اعتراض پیش آتا ہے کہ بدن کے ایک حالت میں اتنی طولانی مدت تک باقی رہنے سے انسانی جسم کے مختلف اعضا خراب ہوجاتے ہیں۔

اس طرح کے اعتراضات کے پیش نظر ظاہری طور پر کوئی راہ حل دکھائی نہ دیتی، جبکہ یہ

نہیں ہے کیونکہ:

الف طولانی عمر کا مسئلہ کوئی غیر علمی مسئلہ نہیں ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ (سائنس کے لحاظ سے) ہر زندہ موجود کے لئے کوئی معین معیار نہیں کہ اس وقت اس کی موت یقینی ہو۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہیں کہ یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ انسان کی طاقت تھکی ہوئی اور آخر کار محدود اور ختم ہونے والی ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان کا بدن یا کوئی دوسرا جاندار اس معمولی مقدار سے زیادہ زندگی کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا مثال کے طور پر درجہ حرارت سو تک پہنچنے پر پانی کھول جاتا ہے اور درجہ حرارت صفر ہونے پر پانی برف بن جاتا ہے، لہٰذا انسان کے سلسلہ میں ایسا کوئی قانون نہیں ہے کہ جب انسان سو سال یا ڈیڑھ سو سال کا ہو جائے تو انسان کی حرکت قلب بند ہو جائے اور وہ مر جائے۔

بلکہ انسان کی عمر کا معیار زیادہ تر اس کی زندگی کے حالات پر موقوف ہے اور حالات کو بدلنے سے اس کی عمر میں تبدیلی آسکتی ہے، اس کا زندہ ثبوت یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا بھر کے دانشوروں نے انسان کے لئے کوئی خاص عمر معین نہیں کی ہے، اس کے علاوہ متعدد دانشوروں نے بعض جانداروں کی عمر کو بعض مخصوص لیبریٹری میں رکھ کر دو برابر، چند برابر اور بعض اوقات ۱۲ برابر تک پہنچا دیا ہے، یہاں تک کہ محققین اور دانشوروں نے ہمیں امید دلائی ہے کہ مستقبل میں سائنس کے جدید طریقوں کے ذریعہ انسان کی عمر اس وقت کی عمر سے چند برابر بڑھ جائے گی، یہ خود طولانی عمر کے سلسلہ میں ہے۔

ب: اس طولانی نیند کے بارے میں کھانے پینے کا مسئلہ اگر معمولی نیند ہو تو اعتراض وارد ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ سائنس سے ہم آہنگ نہیں ہے، اگرچہ سوتے وقت کھانے پینے کی ضرورت کم ہوتی ہے لیکن چند سالوں کے لئے یہ مقدار بہت زیادہ ہونی چاہئے، لیکن اس بات پر توجہ رکھنا چاہئے کہ جہان طبیعت میں ایسی بھی نیند پائی جاتی ہیں جن میں کھانے پینے کی ضرورت بہت ہی کم ہوتی ہے،

اس کے لئے جانوروں کی مثال دی جاتی ہے جو موسم سرما میں سو جاتے ہیں۔

سردیوں کی نیند

بہت سے جانور ایسے ہیں جو پوری سردیوں کے موسم میں سوتے رہتے ہیں اسے سائنس کی اصطلاح میں "سردیوں کی نیند" کہا جاتا ہے۔

ایسی نیند میں زندگی کے آثار تقریباً ختم ہو جاتے ہیں، زندگی کا معمولی سا شعلہ روشن رہتا ہے، دل کی دھڑکن تقریباً رک جاتی ہے، اور اتنی خفیف ہو جاتی ہے کہ بالکل محسوس نہیں ہوتی۔

ایسے مواقع پر بدن کو ایسے بڑے بھٹے سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جو بجھ جاتا ہے اور چھوٹا سا شعلہ بھڑکتا رہتا ہے، واضح ہے کہ آسمان سے باتیں کرتے ہوئے شعلوں کے لئے بھٹے کو یک دن کے لئے جلتے تیل یا گیس کی ضرورت ہوتی ہے ایک خفیف سے شعلہ کے لئے اتنی خوراک برسوں یا صدیوں کے لئے کافی ہے، البتہ اس میں جلتے ہوئے بھٹے کی مقدار اور خفیف سے شعلہ کی مقدار کے لحاظ سے فرق ہو سکتا ہے۔

جانوروں کی سردیوں کی نیند کے بارے میں دنستورس کا کہنا ہے "اگر کسی مینڈک کو سردیوں کی نیند سے اس کی جگہ سے باہر نکالیں تو وہ مردہ معلوم ہوگا، اس کے پھیپھڑوں میں ہوا نہیں ہوتی، اس کے دل کی حرکت اتنی کمزور ہوتی ہے کہ پتہ نہیں چلایا جا سکتا، سرد خون جانوروں (Cool Blooded) میں بہت سے جانور سردیوں کی نیند سوتے ہیں، اس سلسلہ میں کئی طرح کے کیڑے مکوڑے، حشرات الارض، زمینی سیپ [صدف] اور رینگنے والے جانوروں کے نام لئے جا سکتے ہیں، بعض خون گرم جانور (Warm Blooded) بھی سردیوں کی نیند سوتے ہیں اس نیند کے عالم میں حیاتی فعالیتیں بہت سست پڑ جاتی ہیں اور بدن میں ذخیرہ شدہ چربی آہستہ آہستہ صرف ہوتی رہتی ہے۔ (۱)

---

(۱) اقتباس از کتاب فرہنگ معارف (دائرۃ المعارف جدید فارسی) مادہ مستاخوابی

مقصد یہ ہے کہ ایک ایسی بھی نیند ہے جس میں کھانے پینے کی بہت کم ضرورت ہوتی ہے اور حیاتی حرکتیں تقریباً صفر تک پہنچ جاتی ہیں، اتفاق کی بات یہ ہے کہ یہی صورت حال عضو کو فرسودگی سے بچانے اور جانوروں کو ایک طولانی مدت تک جینے میں مدد دیتی ہے، اصولی طور پر جو جاندار احتماً سردیوں میں اپنی غذا حاصل کرنے کی طاقت نہیں رکھتے ان کے لئے سردیوں کی نیند بہت غنیمت شے ہے۔

یوگا کے ماہرین؛ ایک اور نمونہ

یوگا کے ماہرین کے بارے میں دیکھا گیا ہے کہ ان میں سے بعض کو یقین نہ کرنے والے حیرت زدہ افراد کی آنکھوں کے سامنے بعض اوقات تابوت میں رکھ کر ہفتہ بھر کے لئے مٹی کے نیچے دفن کر دیتے ہیں اور ایک ہفتہ کے بعد انہیں باہر نکالتے ہیں ان کی مالش کی جاتی ہے اور مصنوعی سانس دی جاتی ہے اور وہ رفتہ رفتہ اصلی حالت پر پلٹ آتے ہیں

اتنی مدت کے لئے اگر کھانے پینے کا مسئلہ کوئی اہم نہ ہو تو بھی آکسیجن کا مسئلہ بہت اہم ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں دماغ کے خلیے آکسیجن کے معاملہ میں اتنے حساس اور ضرورت مند ہوتے ہیں کہ اگر چند سیکنڈ بھی اس سے محروم رہیں تو تباہ ہو جائیں، لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک یوگا کرنے والا پورا ہفتہ کس طرح آکسیجن کی اس کمی کو برداشت کر لیتا ہے۔

ہماری مذکورہ گفتگو کے پیش نظر اس سوال کا جواب کوئی زیادہ مشکل نہیں ہے، بات یہ ہے کہ یوگا کرنے والے کے بدن کی حیاتی حرکت اس عرصہ میں تقریباً رک جاتی ہے اس دوران خلیے کو آکسیجن کی ضرورت اور اس کا مصرف بہت کم ہو جاتا ہے یہاں تک کہ وہی ہوا جو تابوت کے اندرونی حصہ میں ہوتی ہے بدن کے خلیوں کی ہفتہ بھر کی غذا کے لئے کافی ہو جاتی ہے!۔

زندہ انسان کے بدن کو منجمد کرنا

جانوروں بلکہ انسانی بدن کو منجمد کر کے ان کی عمر بڑھانے کے بارے میں آج کل بہت سے نظریات پیش کیے گئے ہیں جن پر بحثیں ہو رہی ہیں ان میں سے بعض تو عملی جامہ پہن چکے ہیں۔

ان تھیوریوں کے مطابق یہ ممکن ہے کہ ایک انسان یا حیوان کے بدن کو ایک خاص طریقے سے تحت صفر سے کم درجہ حرارت پر رکھ کر اس کی زندگی کو ٹھہرا دیا جائے جس سے اس کی موت واقع نہ ہو پھر ایک ضروری مدت کے بعد اسے مناسب حرارت دی جائے اور وہ عام صحت پر لوٹ آئے"

بہت دور دراز کے فضائی سفر جن کے لئے کئی سو سال یا کئی ہزار سال کی مدت درکار ہے، ان کے لئے کئی منصوبے پیش کیے جا چکے ہیں ان میں سے ایک یہی ہے کہ خلا نورد کے بدن کو ایک خاص تابوت میں رکھ کر اسے منجمد کر دیا جائے اور جب سالہا سال کی مسافت کے بعد وہ مقررہ کرات کے قریب پہنچ جائے تو ایک آٹومیٹک نظام کے تحت اس تابوت میں حرارت پیدا ہو جائے اور خلا نورد اپنی حیات کو ضائع کیے بغیر حالت معمول پر لوٹ آئے۔

ایک سائنسی جریدہ میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ حال ہی میں انسانی بدن کو لمبی عمر کے لئے منجمد کرنے کے بارے میں رابرٹ تیسن نے کتاب لکھی ہے، سائنس کی دنیا میں یہ کتاب بہت مقبول ہوئی ہے اور اس کے مندرجات کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔

جریدہ کے اس مقالہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ حال ہی میں اس عنوان کے تحت ایک خاص سائنسی شعبہ قائم ہو گیا ہے، چنانچہ مذکورہ مقالہ میں لکھا ہے

ہمیشہ سے انسانی تاریخ میں "حیات جاودانی" انسان کا سہرا خواب رہی ہے، لیکن اب یہ خواب حقیقت میں بدل گیا ہے، یہ ہر ایک نئے علم کی خوشگوار اور حیرت انگیز ترقی کا مرہون منت ہے اس علم کا نام "کریانک" ہے، (یہ علم انسانی بدن کو منجمد کر کے زندہ رکھنے کے بارے میں ہے)، اس کے

مطابق انسان کے بدن کو منجمد کر کے اسے بچایا جا سکتا ہے یہاں تک کہ سائنسدان اسے پھر سے زندہ کردیں)

کیا یہ بات قابل یقین ہے؟ بہت سے ممتاز دانشور اس مسئلہ پر غور وفکر کر رہے ہیں، اس کے بارے میں متعدد کتابیں چھپ چکی ہیں مثلاً "الف" اور "اسکوبز"، پوری دنیا کے اخبارات پورے زور وشور سے اس مسئلہ پر بحث کر رہے ہیں، اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس سلسلہ میں اب تجربات شروع ہو چکے ہیں۔(۱)

کچھ عرصہ ہوا کہ اخبار میں یہ خبر چھپی تھی کہ برفانی قطبی علاقے سے چند ہزار سال پہلے کی ایک منجمد مچھلی ملی ہے جسے خود وہاں کے لوگوں نے دیکھا ہے اس مچھلی کو جب مناسب پانی میں رکھا گیا تو سب لوگ حیرت زدہ رہ گئے کہ وہ مچھلی پھر سے جی اٹھی اور چلنے لگی۔

واضح رہے کہ حالت انجماد میں علامات حیات، موت کی طرح بالکل ختم نہیں ہوتی کیونکہ اس صورت میں تو زندہ ہونا ممکن نہیں ہے بلکہ اس عالم میں حیات کی فعالیتیں اور حرکتیں بہت سست رفتار ہو جاتی ہیں۔

ان تمام باتوں سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ انسانی زندگی کو ٹھہرا دینا یا بہت ہی سست کیا جا سکتا ہے، اور سائنس کی مختلف تحقیقات اس امکان کی متعدد حوالوں سے تائید کرتی ہیں، اس حالت میں غذا کا مصرف بدن میں تقریباً صفر تک پہنچ جاتا ہے، اور انسان کے بدن میں موجود غذا کا تھوڑا سا ذخیرہ اس کی سست زندگی کے لئے طولانی برسوں تک کافی ہو سکتا ہے۔

اس چیز میں غلط فہمی نہ ہو کہ ہم ان باتوں کے ذریعہ اصحاب کہف کی نیند کے اعجازی پہلو کا

(۱) مجلہ دانشمند سال ۵۰ نمبر ۳۲۴ شمارہ صفحہ ۳

انکار نہیں کرنا چاہئے بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ سائنس کے اعتبار سے اس واقعہ کو ذہنوں کے قریب کردیں کیونکہ یہ بات مسلم ہے کہ اصحاب کہف ہماری طرح نہیں سوئے، جیسے کہ ہم معمول کے مطابق رات کو سوتے ہیں ان کی نیند ایسی نہیں تھی بلکہ وہ ستثنائی پہلو رکھتی تھی، لہٰذا اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے کہ وہ ارادۂ الٰہی کے تحت ایک طولانی مدت تک سوتے رہے، اس دوران نہ انھیں غذا کی کمی لاحق ہوئی اور نہ ان کے بدن کے ارگانیزم (اجزا) کو کوئی نقصان پہنچا۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ سورہ کہف کی آیات سے ن کی سرگزشت کے بارے میں یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ن کی نیند عام طریقہ کی نیند اور معمول کی نیند سے بہت مختلف تھی، چنانچہ ارشاد خدوندی ہے

﴿وَتَحْسَبُهُمْ أَيْقَاظًا وَهُمْ رُقُودٌ وَنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَذَاتَ الشِّمَالِ وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيدِ لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا﴾(۱)

''اور تمہارا خیال ہے کہ وہ جاگ رہے ہیں حالانکہ وہ عالم خواب میں ہیں اور ہم انھیں داہنے بائیں کروٹ بھی بدلوا رہے ہیں اور ان کا کتا ڈیوڑھی پر دونوں ہاتھ پھیلائے ڈٹا ہوا ہے اگر تم ان کی کیفیت پر مطلع ہوجاتے تو الٹے پاؤں بھاگ نکلتے اور تمہارے دل میں وحشت سما جاتی''۔

یہ آیت اس بات کی گواہ ہے کہ ن کی نیند عام نیند نہ تھی بلکہ یسی نیند تھی جو حالت موت کے مشابہ تھی اور ان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔

س کے علاوہ قرآن مجید میں بیان ہوا ہے ''سورج کی روشنی ن کے غار کے اندر نہیں پڑتی تھی'' نیز اس مر کی طرف توجہ کی جائے کہ ان کی غار احتمالاً یشائے صغیر کے کسی بلند اور سرد مقام پر واقع

---

(۱) سورۂ کہف، آیت ۱۸

تھا تو ان کی نیند کے استثنائی حالات مزید واضح ہو جاتے ہیں۔

دوسری طرف قرآن کہتا ہے: ﴿وَنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَذَاتَ الشِّمَالِ﴾ (١) ''اور ہم انھیں دائیں بائیں کروٹ بھی بدلوا رہے ہیں'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بالکل ایک ہی حالت میں نہیں رہتے تھے ایسے عوامل جو ابھی تک ہمارے لئے معمہ ہیں ان کے تحت شاید سال میں ایک مرتبہ انھیں دائیں بائیں پلٹا جاتا تھا تا کہ ان کے بدن کے ارگانیزم (Organism) میں کوئی نقص نہ آنے پائے۔

اب جبکہ اس سلسلہ میں کافی واضح عملی بحث ہو چکی ہے اس سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے معاد اور قیامت کے بارے میں زیادہ گفتگو کی ضرورت نہیں رہتی، کیونکہ ایک طویل نیند کے بعد بیداری، موت کے بعد کی زندگی کے غیر مشابہ نہیں ہے، اس سے ذہن معاد اور قیامت کے امکان سے قریب ہو جاتا ہے۔ (٢)(٣)

---

(١) سورۂ کہف، آیت ١٨

(٢) اس مسئلہ میں مزید وضاحت کے لئے کتاب 'معاد وجہان پس از مرگ' کی طرف رجوع فرمائیں۔

(٣) تفسیر نمونہ، جلد ١٢، صفحہ ٤٠٦

۱۰۹۔ تقیہ کا مقصد کیا ہے؟

تقیہ ایک دفاعی ڈھال

یہ صحیح ہے کہ انسان کبھی بلند مقاصد، شرافت کے تحفظ اور حق کی تقویت اور باطل کے تزلزل کے لئے اپنی عزیز جان قربان کر سکتا ہے، لیکن کیا کوئی عاقل یہ کہہ سکتا ہے کہ انسان کے لئے بغیر کسی خاص مقصد کے اپنی جان کو خطرہ میں ڈالنا جائز ہے؟

اسلام نے واضح طور پر اس بات کی اجازت دی ہے کہ اگر انسان کی جان، مال اور عزت خطرہ میں ہو اور حق کے اظہار سے کوئی خاص فائدہ نہ ہو تو وقتی طور پر اظہار حق نہ کرے بلکہ مخفی طریقہ سے اپنی ذمہ داری کو پورا کرتا رہے، جیسا کہ قرآن مجید کے سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۲۸ اس چیز کی نشاندہی کرتی ہے[۱] یا دوسرے الفاظ میں سورہ نحل میں ارشاد ہوتا ہے ﴿مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِهِ إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ﴾ (۲) "جو شخص بھی اللہ پر ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کرلے علاوہ اس کے کہ جو کفر پر مجبور کردیا جائے اور اس کا دل ایمان کی طرف سے مطمئن ہو"۔

---

(۱) ﴿لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِي شَيْءٍ إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً﴾ (سورہ آل عمران، آیت ۲۸) "خبردار صاحبان ایمان، مومنین کو چھوڑ کر کفار کو اپنا ولی اور سرپرست نہ بنائیں کہ جو بھی ایسا کرے گا اس کا خدا سے کوئی تعلق نہ ہوگا مگر یہ کہ تمہیں کفار سے خوف ہو تو کوئی حرج بھی نہیں ہے"

(۲) سورہ نحل، آیت ۱۰۶

کتب احادیث اور تواریخ میں جناب ''عمار یاسر'' اور ان کے والدین کا واقعہ سب کے سامنے ہے، جو مشرکین اور بت پرستوں کے ہاتھوں اسیر ہوگئے تھے، ان کو سخت تکلیفیں پہنچائی گئیں تھیں تاکہ اسلام سے بیزاری کریں، اسلام کو چھوڑ دیں، لیکن جناب عمار کے ماں باپ نے ایسا نہیں کیا جس کی بنا پر مشرکین نے ان کو قتل کردیا، لیکن جناب عمارؓ نے ان کی مرضی کے مطابق اپنی زبان سے سب کچھ کہہ دیا، اور خوف خدا کی وجہ سے روتے ہوئے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، [واقعہ بیان کیا] تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ نے ان سے فرمایا ''اِنْ عادُوا لَکَ فَعُدْ لَهُمْ'' اگر پھر کبھی یہ واقعہ پیش آئے تو جو تم سے کہیں کہہ دینا، اور اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ نے ان کے خوف و پریشانی کو دور کردیا۔

مزید توجہ کا حامل ایک دوسرا نکتہ یہ ہے کہ تقیہ کا حکم سب جگہ ایک نہیں ہے بلکہ کبھی واجب، کبھی حرام اور کبھی مباح ہوتا ہے۔

تقیہ کرنا اس وقت واجب ہے جب بغیر کسی اہم فائدہ کے انسان کی جان خطرہ میں ہو، لیکن اگر تقیہ باطل کی ترویج، لوگوں کی گمراہی اور ظلم و ستم کی تقویت کا سبب بن رہا ہو تو اس صورت میں حرام اور ممنوع ہے۔

اس لحاظ سے تقیہ پر ہونے والے اعتراضات کا جواب واضح ہوجاتا ہے، دراصل اگر تقیہ پر اعتراض کرنے والے تحقیق و جستجو کرتے تو ان کو معلوم ہوجاتا کہ یہ عقیدہ صرف شیعوں کا نہیں ہے بلکہ تقیہ کا مسئلہ اپنی جگہ پر عقل کے قطعی حکم اور انسانی فطرت کے موافق ہے۔(١)

کیونکہ دنیا بھر کے تمام صاحبان عقل وخرد جس وقت ایک ایسی جگہ پہنچتے ہیں جہاں سے دو راستے ہوں یا تو اپنے اندرونی عقیدہ کے اظہار سے چشم پوشی کریں یا اپنے عقیدہ کا اظہار کرکے اپنی

(١)اقتباس، کتاب آئین، صفحہ ٣٦٣

جان و مال اور عزت کو خطرہ میں ڈال دیں، تو ایسے موقع پر انسان تحقیق کرتا ہے کہ اگر اس عقیدہ کے اظہار سے اس کی جان و مال اور عزت کی قربانی کی کوئی اہمیت اور فائدہ ہے تو ایسے موقع پر اس فدا کاری اور قربانی کو صحیح مانتے ہیں اور اگر دیکھتے ہیں کہ اس کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہے تو اپنے عقیدہ کے اظہار سے چشم پوشی کرتے ہیں۔

تقیہ یا مقابلہ کی دوسری صورت

مذہبی، اجتماعی اور سیاسی مبارزات اور تحریک کی تاریخ میں یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ جب ایک مقصد کا دفاع کرنے والے اگر علی الاعلان جنگ یا مقابلہ کریں تو وہ خود بھی نیست و نابود ہو جائیں گے اور ان کے مقاصد بھی خاک میں مل جائیں گے یا کم سے کم ان کے سامنے بہت بڑا خطرہ ہوگا جیسا کہ غاصب حکومت بنی امیہ کے زمانہ میں حضرت علی علیہ السلام کے شیعوں نے ایسا ہی کردار ادا کیا تھا، ایسے موقع پر صحیح اور عاقلانہ کام یہ ہے کہ اپنی طاقت کو یونہی ضائع نہ کریں اور اپنے اغراض و مقاصد کو آگے بڑھانے کے لئے غیر مستقیم اور مخفی طریقہ سے اپنی فعالیت و تحریک جاری رکھیں، دراصل تقیہ اس طرح کے مکاتب اور ان کے پیروؤں کے لئے ایسے موقع پر جنگ و مبارزہ کی ایک دوسری شکل شمار ہوتا ہے جو ان کو نابودی سے نجات دیتا ہے اور وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جاتے ہیں، تقیہ کو نہ ماننے والے افراد نا معلوم اس طرح کے موقع پر کیا نظریہ رکھتے ہیں؟ کیا ان کا نابود ہونا صحیح ہے یا صحیح اور منطقی طریقہ پر اس مبارزہ کو جاری رکھنا؟ اسی دوسرے راستہ کو تقیہ کہتے ہیں جبکہ کوئی بھی صاحب عقل اپنے لئے پہلے راستہ کو پسند نہیں کرتا۔(۱)

حقیقی مسلمان، اور پیغمبر اسلام کا تربیت یافتہ انسان دشمن سے مقابلہ کا عجیب حوصلہ رکھتا ہے، اور ان میں سے بعض "علی ابن مہزیار کے والد" کی طرح دشمن کے دباؤ پر بھی اپنی زبان سے کچھ کہنے

---

(۱) تفسیر نمونہ، جلد دوم، صفحہ ۴۲۳

کے لئے تیار نہیں ہوتے، اگرچہ ان کا دل عشق خدا و رسولؐ سے لبریز ہوتا ہے، یہاں تک کہ وہ اس راستہ میں اپنی جان بھی قربان کردیتے ہیں۔

ان میں سے بعض خود "عمار یاسر" کی طرح اپنی زبان سے دشمن کی بات کہنے کے لئے تیار ہوجاتے ہیں لیکن پھر بھی ان پر خوف خدا طاری ہوتا ہے، اور خود کو خطا کار اور گنہگار تصور کرتے ہیں، جب تک خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اطمینان نہیں دلا دیتے کہ ان کا یہ کام اپنی جان بچانے کے لئے شرعی طور پر جائز ہے، اس وقت تک ان کو سکون نہیں ملتا۔

جناب "بلالؓ" کے حالات میں ہم پڑھتے ہیں کہ جس وقت وہ اسلام لائے اور جب اسلام اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی حمایت میں دفاع کے لئے اٹھے تو مشرکین نے بہت زیادہ دباؤ ڈالا، یہاں تک کہ ان کو تیز دھوپ میں گھسیٹتے ہوئے لے جاتے تھے اور ان کے سینہ پر ایک بڑا پتھر رکھ دیتے تھے اور ان سے کہتے تھے تمہیں ہماری طرح مشرک رہنا ہوگا۔

لیکن جناب بلالؓ اس بات پر آمادہ نہیں ہوتے تھے حالانکہ ان کی سانس لبوں پر آچکی تھی لیکن ان کی زبان پر یہی کلمہ تھا "احد، احد" (یعنی خدا ایک ہے، خدا ایک ہے) اس کے بعد کہتے تھے خدا کی قسم اگر مجھے معلوم ہوتا کہ اس کلام سے ناگوار تر تمہارے لئے کوئی دوسرا لفظ ہے تو میں وہی کہتا! ( )

اسی طرح "حبیب بن زید" کے حالات میں ملتا ہے کہ جس وقت "مسیلمہ کذاب" نے ان کو گرفتار کرلیا اور ان سے پوچھا کہ کیا تو گواہی دیتا ہے کہ محمدؐ رسول خدا ہیں؟ تو اس نے کہا: جی ہاں!

پھر سوال کیا کہ کیا تو گواہی دیتا ہے کہ میں خدا کا رسول ہوں؟ تو حبیب نے اس کی بات کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا کہ میں نے تیری بات کو نہیں سنا! یہ سن کر مسیلمہ اور اس کے پیروکاروں

( ) تفسیر فی ظلال، جلد ۵، صفحہ ۲۸۴

نے ان کے بدن کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، لیکن وہ پہاڑ کی طرح ثابت قدم رہے۔(۱)

اس طرح کے دل ہلا دینے والے واقعات تاریخ اسلام میں بہت ملتے ہیں خصوصاً صدر اسلام کے مسلمانوں اور ائمہ علیہم السلام کے پیروؤں میں بہت سے ایسے واقعات موجود ہیں۔

اسی بنا پر محققین کا کہنا ہے کہ ایسے موقع پر تقیہ نہ کرنا اور دشمن کے مقابل تسلیم نہ ہونا جائز ہے اگرچہ ان کی جان ہی چلی جائے کیونکہ ایسے مواقع پر پرچم اسلام اور کلمہ اسلام کی سرفرازی مقصود ہے، خصوصاً پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے آغاز میں اس مسئلہ کی خاص اہمیت تھی۔

لہٰذا اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس طرح کے موقع پر تقیہ بھی جائز ہے اور اس سے زیادہ خطرناک مواقع پر واجب ہے، اور کچھ جاہل اور نادان لوگوں کے برخلاف تقیہ (البتہ خاص مواقع پر نہ سب جگہ) نہ تو ایمان کی کمزوری کا نام ہے اور نہ دشمن کی کثرت سے گھبرانے کا نام ہے اور نہ ہی دشمن کے دباؤ میں تسلیم ہونا ہے بلکہ تقیہ انسان کی حفاظت کرتا ہے اور مومنین کی زندگی کو چھوٹے اور کم اہمیت موضوع کے لئے برباد ہونے نہیں دیتا۔

یہ بات پوری دنیا میں رائج ہے کہ مجاہدین اور جنگجو لوگوں کی اقلیت، ظالم و جابر اکثریت کا تختہ پلٹنے کے لئے عام طور پر خفیہ طریقہ پر عمل کرتی ہے، اور زیر گراؤنڈ کچھ لوگوں کو تیار کیا جاتا ہے اور مخفی طور پر منصوبہ بندی ہوتی ہے، بعض وقت کسی دوسرے لباس میں ظاہر ہوتے ہیں، اور اگر کسی موقع پر گرفتار بھی ہو جاتے ہیں تو ان کی اپنی گروہ کے اسرار کو فاش نہ کرنے کی پوری کوشش ہوتی ہے، تاکہ اس کی طاقت فضول نیست و نابود نہ ہونے پائے، اور آئندہ کے لئے اس کو ذخیرہ کیا جاسکے۔

عقل اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ مجاہدین کی ایک اقلیت اپنے کو ظاہری اور علی

---

(۱) تفسیر فی ظلال، جلد ۵، صفحہ ۲۸۲

ار عدن مخفی رکھے جائے، اور اگر ایسا نہ کیا تو دشمن پہچان لے گا اور بہت ہی آسانی سے ان کو نیست و نابود کردیا جائے گا۔

اسی دلیل کی بنا پر "تقیہ" اسلامی قانون سے پہلے تمام انسانوں کے لئے ایک عقلی اور منطقی طریقہ ہے جس پر حق تو دشمن کے مقابلہ کے زمانہ میں عمل ہوتا چلا آیا ہے اور آج بھی اس پر عمل ہوتا ہے۔

اسلامی روایات میں تقیہ کو ایک دفاعی ڈھال سے تشبیہ دی گئی ہے۔

حضرت امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: "التقیة ترس المؤمن والتقیة حرز المؤمن"(۱) "تقیہ مومن کے لئے ڈھال ہے، اور تقیہ مومن کی حفاظت کا سبب ہے"۔

(محترم قارئین! اس بات پر توجہ رہے کہ یہاں تقیہ کو ڈھال سے تشبیہ دی گئی ہے اور یہ معلوم ہے کہ ڈھال کو صرف دشمن کے مقابلہ اور میدان جنگ میں استعمال کیا جاتا ہے)

اور اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ احادیث اسلامی میں تقیہ کو دین کی نشانی اور ایمان کی علامت قرار دیا گیا ہے اور دین کے دس حصوں میں سے نو حصہ شمار کیا گیا ہے، تو اس کی وجہ یہی ہے۔

البتہ تقیہ کے سلسلہ میں بہت زیادہ تفصیلی بحث ہے جس کا یہ موقع نہیں ہے، ہمارا مقصد یہ تھا کہ تقیہ کے سلسلہ میں اعتراض کرنے والوں کی جہالت اور ناآگاہی معلوم ہوجائے کہ وہ تقیہ کے شرائط اور فلسفہ سے جاہل ہیں، بے شک بہت سے ایسے مواقع ہیں جہاں تقیہ کرنا حرام ہے، اور وہ اس موقع پر جہاں انسان کی جان کی حفاظت کے بجائے مذہب کے لئے خطرہ ہو یا کسی عظیم فساد کا خطرہ ہو، لہٰذا ایسے موقع پر تقیہ نہیں کرنا چاہئے اس کا نتیجہ جو بھی ہو قبول کرنا چاہئے۔(۲)

---

(۱) وسائل الشیعہ، جلد ۱۱ حدیث ۶، باب ۲۴، از ابواب امر بمعروف۔

(۲) تفسیر نمونہ، جلد ۲، صفحہ ۳۲۳

۱۱۰۔ افسانہ آیات شیطانی یا افسانہ "غرانیق" کیا ہے؟

اس سلسلہ میں ایک واقعہ نقل ہوا ہے جو افسانہ "غرانیق" کے نام سے مشہور ہے، افسانہ یہ [گڑھا گیا] ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مشرکین کے سامنے سورہ "نجم" کی تلاوت فرما رہے تھے، اور جس وقت اس آیت پر پہنچے ﴿أَفَرَأَيْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزَّى وَمَنَاةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَى﴾(۱) اس موقع پر شیطان نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان پر یہ دو جملہ جاری کردئے "تلک الغرانیق العلی وانّ شفاعتهنّ لترتجی" "وہ بلند مقام پرندے ہیں اور ان کی شفاعت کی امید کی جاتی ہے"۔ (۳) جیسے ہی مشرکین نے یہ دو جملے سنے تو خوشی میں پھولے نہ سمائے، اور ان لوگوں نے کہا "محمد" نے اب تک ہمارے خداؤں کا نام خیر و نیکی سے نہیں لیا، اسی موقع پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سجدہ کیا تو ان لوگوں نے بھی سجدہ کیا، سب مشرکین قریش بہت خوش ہوگئے، اور وہاں سے متفرق ہوگئے، لیکن کچھ دیر نہ گزری تھی کہ جناب جبرئیل امین نازل ہوئے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خبر دی کہ یہ دو جملہ میں آپ کے لئے سے کر نازل نہیں ہوا تھا! بلکہ یہ شیطان کی طرف سے القا کئے گئے تھے! اور اس

---

(۱) سورہ نجم، آیت ۱۹، ۲۰، "کیا تم لوگوں نے لات و عزیٰ کو دیکھا ہے اور منات جو ان کا تیسرا ہے اسے بھی دیکھا ہے"۔ (کیا وہ خدا کی بیٹیاں ہیں؟)

(۲) "غرانیق"، (جو وزن کے وزن پر) "غرنوق" کی جمع ہے، ایک سیاہ اور سفید رنگ کا پرندہ ہے، لیکن اس کے علاوہ دوسرے معنی میں بھی آیا ہے۔ (اقتباس از قاموس المحیط)

وقت یہ آیت نازل ہوئی ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّىٰ أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ فَيَنسَخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللَّهُ آيَاتِهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ﴾(۱) ''اور ہم نے آپ سے پہلے کوئی ایسا رسول یا نبی نہیں بھیجا ہے کہ جب بھی اس نے کوئی نیک آرزو کی تو شیطان نے اس کی آرزو کی راہ میں رکاوٹ ڈال دی تو پھر خدا نے شیطان کی ڈالی ہوئی رکاوٹ کو مٹا دیا اور پھر اپنی آیت کو مستحکم بنا دیا کہ وہ بہت زیادہ جاننے والا اور صاحب حکمت ہے''، اور پیغمبرؐ اور دوسرے مومنین کو تاکید کی گئی ہے۔ (۲)

اگر اس حدیث کو قبول کر لیا جائے تو انبیاء علیہم السلام کی عصمت یہاں تک کہ وحی دریافت کرنے کے سلسلہ میں بھی مخدوش ہو جاتی ہے، اور انبیاء علیہم السلام کا اعتماد ختم ہو جاتا ہے۔

ہم یہاں پر پہلے سورہ حج کی آیت نمبر ۵۲ کو ان جعلی روایت سے جدا کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ آیت کیا کہتی ہے، اور پھر اس طرح کی روایت کی تنقید اور تردید کریں گے روایت کے جعلی اور جھوٹی ہونے سے قطع نظر اس آیت کے الفاظ اور مفہوم انبیاء علیہم السلام کی عصمت پر کوئی خدشہ وارد نہیں کرتے، بلکہ انبیاء علیہم السلام کی عصمت کی دلیل ہیں، کیونکہ آیت کہتی ہے کہ جس وقت انبیاء کوئی مثبت آرزو کرتے ہیں (قرآن مجید میں ''اُمنیہ'' کا لفظ آیا ہے جو ہر طرح کی آرزو کے لئے بولا جاتا ہے، لیکن یہاں انبیاء علیہم السلام کے مقصد کو آگے بڑھانے کے لئے یک مثبت آرزو کے معنی ہیں، کیونکہ اگر مثبت آرزو نہیں تھی تو پھر شیطان ایسے جملے کیوں القا کرتا)، لہذا جب وہ کوئی مثبت آرزو کرتے ہیں تو شیطان ان پر حملہ آور ہوتا ہے، لیکن ارادہ و عمل میں تاثیر سے پہلے خداوند عالم شیطانی الہامات کو نابود کر دیتا ہے، اور اپنی آیت کو استحکام بخشتا ہے۔

(توجہ رہے کہ ''فَيَنسَخُ اللَّهُ'' میں لفظ ''فا'' بدون فاصلہ ترتیب کے لئے ہے یعنی خداوند عالم

---

(۱) سورہ حج، آیت ۵۲ (۲) اس حدیث کو اکثر مفسرین نے مختصر تبدیلی کے ساتھ بیان کیا ہے اور پھر اس پر تنقید و تردید کی ہے

بلا فاصلہ فوری طور پر شیطانی الہامات کو ختم کر دیتا ہے)، اس بات پر گواہ قرآن مجید کی دیگر آیات ہیں جو صراحت کے ساتھ کہتی ہیں ﴿وَلَوْلاَ أَنْ ثَبَّتْنَاكَ لَقَدْ كِدْتَ تَرْكَنُ إِلَيْهِمْ شَيْئاً قَلِيلاً﴾(۱) ''اور اگر ہماری توفیق خاص نے آپ کو ثابت قدم نہ رکھا ہوتا تو آپ (بشری طور پر) کچھ نہ کچھ ان کی طرف مائل ضرور ہو جاتے''۔

سورہ اسراء کی بہترویں آیت اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ کفار و مشرکین یہ کوشش کرتے تھے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آسمانی وحی سے منحرف کر دیں، لیکن خداوند عالم کبھی بھی اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ یہ لوگ اپنے وسوسوں میں کامیاب ہو جائیں۔ (غور کیجئے)

اسی طرح سورہ نساء میں بیان ہوتا ہے: ﴿وَلَوْلاَ فَضْلُ اللهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهُ لَهَمَّتْ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ أَنْ يُضِلُّوكَ وَمَا يُضِلُّونَ إِلاَّ أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّونَكَ مِنْ شَيْءٍ﴾(۲) ''اور اگر آپ پر فضل خدا اور رحمت پروردگار کا سایہ نہ ہوتا تو ان کی ایک جماعت نے آپ کو بہکانے کا ارادہ کر لیا تھا اور یہ اپنے علاوہ کسی کو گمراہ نہیں کر سکتے اور آپ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچا سکتے''۔

یہ باتیں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ خداوند عالم اپنی تائیدات اور امداد کے ذریعہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جن و انس کے شیطانوں کے وسوسوں کا اثر نہیں ہونے دیتا، اور ان کو ہر طرح کے انحراف سے محفوظ رکھتا ہے۔

یہ بات اس صورت میں ہے کہ جب ''اُمنیہ'' کے معنی ''آرزو''، ''منصوبہ'' اور ''نقشہ'' مراد ہیں (کیونکہ اس لفظ کی بازگشت تقدیر، تصویر اور فرض کی طرف ہے) لیکن اگر ''اُمنیہ'' کے تلاوت کے معنی مراد ہوں جیسا کہ بہت سے مفسرین نے احتمال دیا ہے، یہاں تک کہ بعض افراد نے ''حسان

---

(۱) سورۂ اسراء، آیت ۷۴۔

(۲) سورۂ نساء، آیت ۱۱۳

بن ثابت" کے اشعار کو اسی مدعا کے ثبات کے لئے شاہد قرار دیا ہے (۱) اسی طرح فخر رازی نے اپنی تفسیر میں بھی کہا ہے لغوی اعتبار سے "تمنی" دو معنی کے لئے آیا ہے، ایک "تمنی" قلبی آرزو کے معنی میں اور دوسرے "تمنی" تلاوت و قرائت کے معنی میں ہے۔(۲)

اس صورت میں آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ جس وقت خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے انبیاء کفار و مشرکین کے سامنے آیات کی تلاوت کرتے ہیں اور ان کو وعظ و نصیحت کرتے ہیں تو شیطان (اور شیطان صفت لوگ) ان کی باتوں کے ساتھ میں اپنی باتوں کو بھی القاء کرتے ہیں، جیسے کہ خود رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ بھی یہ ہوا ہے، سورہ فصلت کی آیت نمبر ۲۶ میں ارشاد ہے ﴿وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهَٰذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُونَ﴾ (۳) "اور کفار آپس میں کہتے ہیں کہ اس قرآن کو ہرگز مت سنو اور اس کی تلاوت کے وقت ہنگامہ کرو شاید اسی طرح ان پر غالب آجاؤ"۔

اس معنی کے علاوہ سورہ حج آیت نمبر ۵۳ کا مفہوم بھی واضح و روشن ہو جاتا ہے جیسا کہ ارشاد ہے ﴿لِيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ فِتْنَةً لِلَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ وَالْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُمْ﴾

"تا کہ وہ شیطانی القا کو ان لوگوں کے لئے آزمائش بنا دے جن کے قلوب میں مرض ہے

(۱) شعر یہ ہے تمنی کتاب اللہ أوّل لیلة وآخرها لاقی حمام المقادر

"تاج العروس شرح قاموس، اور اسی طرح خود قاموس" میں "تمنی کتاب" کے معنی تلاوت کتاب کے لئے ہیں اس کے بعد "زہری" سے نقل کیا ہے کہ تلاوت کو اس وجہ سے "تمنی" کہا جاتا ہے کیونکہ تلاوت کرنے والا جب "آیۂ رحمت" پر پہنچتا ہے تو رحمت کی آرزو کرتا ہے، اور جب عذاب کی آیت پر پہنچتا ہے تو عذاب سے نجات کی امید کرتا ہے لیکن صاحب "مقاییس اللغہ" کا اس بات پر عقیدہ ہے کہ اس لفظ کا تلاوت پر اطلاق کرنا اس وجہ سے ہے کہ اس میں ایک طرح کی اندازہ گیری اور اس آیت سے گزرنا ہوتا ہے

(۲) تفسیر فخر رازی، جلد ۲۳، صفحہ ۵۱۔ (۳) سورۂ فصلت، آیت ۲۶

اور جن کے دل سخت ہو گئے ہیں"۔(۱)

ایسا تو آج کل بھی ہوتا ہے کہ جب قوم وملت کی اصلاح کرنے والے علما اور واعظین معاشرہ کے لئے مفید باتیں پیش کرتے ہیں تو کج فکر اور منحرف افراد اپنی شیطانی حرکتوں، غلط پروپیگنڈوں اور بیہودہ نعروں کے ذریعہ ان مفید باتوں کے اثر کو ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ یہ در اصل معاشرہ کے تمام لوگوں کے لئے امتحان ہے، اور اسی موقع پر سنگدل اور بیمار دل لوگ جادۂ حق سے منحرف ہو جاتے ہیں، جبکہ مومنین انبیاء علیہم السلام کی حقانیت کو بہتر طریقہ سے پہچان لیتے ہیں اور انبیاء علیہم السلام کی دعوت کے سامنے تسلیم ہو جاتے ہیں ﴿وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَيُؤْمِنُوا بِهِ فَتُخْبِتَ لَهُ قُلُوبُهُمْ ...﴾(۲) "اور اس لئے بھی کہ صاحبان علم کو معلوم ہو جائے کہ یہ وحی پروردگار کی طرف سے برحق ہے اور اس طرح وہ ایمان لے آئیں، اور پھر ان کے دل اس کی بارگاہ میں عاجزی کا اظہار کریں"۔

ہماری مذکورہ گفتگو سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ محل بحث آیت میں انبیاء علیہم السلام کی عصمت کے برخلاف کوئی چیز نہیں پائی جاتی، بلکہ جیسا کہ ہم نے اس بات کی طرف اشارہ بھی کیا ہے کہ یہ آیت عصمت پر مزید تاکید کرتی ہے، کیونکہ خداوند عالم اس آیت میں فرماتا ہے کہ جب انبیاء

---

(۱) اگرچہ آخری آیت کی تفسیر اس معنی کے لحاظ سے اعتراض سے خالی نہیں ہے، کیونکہ جب یہ شیطانی وسوسہ اگرچہ بعد میں مدد کے ذریعہ فوراً نیست و نابود ہو جاتا ہے، لیکن اس کے ذریعہ منافقین اور بیمار دل لوگوں کے لئے باعث امتحان نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہ وسوسے ظاہر نہیں ہوتے بلکہ انبیاء علیہم السلام پر ان وسوسوں کا اثر نہیں ہوتا کیونکہ فوراً ہی خداوند عالم اس کو ختم کر دیتا ہے۔
مگر یہ کہا جائے کہ مراد یہ ہے کہ جب انبیاء نے الٰہی پیغام دیا اور ہدایت کو عملی بنانا چاہتے ہیں تو اس موقع پر شیاطین تخریب اور وسوسوں کے ذریعہ حملہ آور ہوتے ہیں اور اس موقع پر امتحان کی بھٹی گرم ہو جاتی ہے، البتہ ان تینوں آیات (سورہ حج آیات نمبر ۵۲، ۵۳ اور ۵۴) میں ہم آہنگی اور انسجام برقرار رہو جاتا ہے۔
عجیب بات تو یہ ہے کہ بعض مفسرین نے پہلی آیت میں مختلف تفاسیر کر کے ہیں، جبکہ بعد والی آیات کی ہم آہنگی اور انسجام کو باقی نہیں رکھ پائے ہیں۔ (غور کیجئے)
(۲) سورہ حج آیت ۵۴

وحی کو حاصل کرتے ہیں یا اپنے مقاصد کے لئے دوسرا قدم اٹھاتے ہیں تو ان کی شیطانی وسوسوں سے محافظت فرماتا ہے۔ [قارئین کرام!] اب ہم اس سلسلہ میں گڑھے گئے افسانہ کی طرف پلٹتے ہیں آخر کار نوبت یہ پہنچ گئی کہ بعض شیطان صفت افراد نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی عظمت کو گھٹانے کے لئے کتاب ''شیطانی آیات'' لکھ ڈالی اور اس طرح کے جعلی افسانوں کا سہارا لیا۔

افسانہ غرانیق کی روایتوں پر تنقید اور تردید

جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ گزشتہ آیات میں نہ صرف یہ کہ عصمت انبیاء کے برخلاف کوئی چیز نہیں پائی جاتی بلکہ یہ آیات خود عصمت انبیاء پر دلیل ہیں، لیکن اہل سنت کی دوسرے درجہ کی کتابوں میں کچھ ایسی روایت ہیں جو بظاہر عجیب ہیں، لہٰذا ان کی الگ سے بحث ہونا چاہئے، جن روایات کی طرف ہم نے آغاز کلام میں اشارہ کیا ہے یہ کبھی ابن عباس سے، اور کبھی سعید بن جبیر اور کبھی بعض دیگر صحابہ و تابعین سے نقل کی جاتی ہیں۔(۱)

جبکہ اس طرح کی روایات مکتب اہل بیت علیہم السلام میں موجود نہیں ہے، اور بعض اہل سنت کے علما کے بقول صحاح ستہ میں بھی اس طرح کی روایت نہیں ہیں لیکن ''تفسیر مراغی'' میں بیان ہوا ہے ''بے شک یہ احادیث ملحدین اور اسلامی دشمنوں کی طرف سے گڑھی گئی ہیں، کیونکہ یہ کسی روایات کسی بھی معتبر کتاب میں نہیں ملتیں، اور دین اسلام کے اصول اور تعلیمات اسلام ان کی تکذیب اور تردید کرتی ہیں، عقل سلیم بھی ان کے باطل ہونے پر گواہی دیتی ہے، لہٰذا تمام علمائے اسلام پر ان کی تردید کرنا واجب ہے، اور اپنے [قیمتی] وقت کو ان کی تفسیر و تاویل میں صرف نہ کریں، خصوصاً جبکہ موثق راویوں نے ان کے جعلی اور جھوٹے ہونے پر صریح الفاظ میں بیان کیا ہے۔(۲)

---

(۱) اس سلسلہ میں اہل سنت کی روایات سے مزید آگاہی کے لئے کتاب الدر المنثور، جلد چہارم صفحہ ۳۶۶ تا ۳۶۸ پر سورہ حج آیت ۵۲ کے ذیل میں رجوع کریں

(۲) تفسیر مراغی، جلد ۱۷، صفحہ ۳۰، مذکورہ آیت کے ذیل میں

یہی معنی ایک دوسری طرح تفسیر ''جواہر'' (موسفہ طنطاوی) میں بیان ہوئے ہیں ''اس طرح کی حادیث صحاح ستہ'' صحیح بخاری، صحیح مسلم، موطا بن مالک، جامع ترمذی، سنن نسائی اور سنن بن داود'' میں نہیں آئی ہیں، (۱) ہذا کتاب ''تیسیر الوصول لج مع ا صول'' جس میں صحاح ستہ کی تفسیری روایات کو جمع کیا گیا ہے، اس روایت کو سورہ نجم کی آیات میں بیان نہیں کیا ہے، لہٰذا اس طرح کی احادیث کے لئے اہمیت کا قائل ہونا مناسب نہیں ہے، اور نہ ہی ان کا ذکر کرنا مناسب ہے، ان پر اعتراض کرنا ور جواب دینا تو دور کی بات ہے، یہ احادیث جھوٹی اور جعلی ہیں''! (۲)

علامہ فخر الدین رازی ن روایت کے جعلی ہونے کے سلسلہ میں اس طرح کہتے ہیں صحیح بخاری میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوا کہ جس وقت سورہ نجم کی تلاوت فرمائی تو جن وانس، مسلمان اور مشرکین نے سجدہ کیا، لیکن اس حدیث میں ''غرنیق'' کی کوئی بات نہیں ہے، اسی طرح یہ حدیث (جو صحیح بخاری سے نقل ہوئی ہے) دوسرے متعدد طریقوں سے نقل ہوئی ہے لیکن ن میں سے کسی میں بھی ''غرانیق'' کا لفظ نہیں آیا ہے۔ (۳)

نہ صرف مذکورہ مفسرین بلکہ دیگر عمدہ مفسرین جیسے ''قرطبی'' نے اپنی تفسیر ''الجامع'' میں ور سید قطب نے ''فی ظلال'' وغیرہ میں اسی طرح تمام شیعہ بزرگ علما نے بھی اس طرح کی روایت کو خرافات قرار دیتے ہوئے جعلی مانا ہے اور ن کی نسبت دشمنان اسلام کی طرف دی ہے۔

س کے باوجود عجیب نہیں ہے کہ اسلام دشمن خصوصاً معاند مستشرقین نے اس طرح کی روایات کا بہت زیادہ پروپیگنڈا کیا ہے، اور اس کو بہت ہی آب وتاب کے ساتھ نقل کیا ہے، ور ہم دیکھتے ہیں کہ آج کے دور میں شیطان رشدی نے ''آیات شیطانی'' نامی کتاب لکھ ڈالی، خیال

(۱) توجہ رہے کہ موطا بن مالک کا شمار صحاح ستہ میں نہیں ہے بلکہ اس کی جگہ پر سنن ابن ماجہ ہے

(۲) تفسیر جواہر، جلد ۶، صفحہ ۳۶ (۳) تفسیر فخر رازی، جلد ۲۳، صفحہ ۵۰

داستان میں بہت ہی نازیبا الفاظ کے ساتھ اسلامی مقدسات کی توہین کی ہے، بلکہ یہاں تک کہ بڑے بڑے انبیاء جن کو بھی آسمانی ادیان احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، (جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام) کی شان میں بھی گستاخی، جسارت اور توہین کی ہے۔

یہ بھی عجیب بات ہے کہ اس کتاب کا مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوا اور دنیا بھر میں نشر کیا گیا، اور جس وقت امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ نے سلمان رشدی کے مرتد ہونے اور اس کے قتل کا تاریخ ساز فتویٰ صادر کیا، تو استعماری حکومتوں اور اسلام دشمن طاقتوں کی طرف سے ایسی حمایت ہوئی کہ آج تک دیکھنے میں نہیں آئی! چنانچہ اس رویہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس کام میں صرف سلمان رشدی ہی نہیں تھا اور نہ ہی اسلام کی مخالفت میں لکھی جانے والی کتاب کا مسئلہ تھا، دراصل مغربی ممالک اور صہیونیزم کی طرف سے اسلام کے خلاف ایک بہت بڑی سازش تھی، اگرچہ ظاہر میں سلمان رشدی نے کتاب لکھی ہے لیکن اس کے پس پردہ اسلام دشمن طاقتیں تھیں۔

لیکن حضرت امام خمینی (علیہ الرحمہ) نے اپنے فتویٰ میں استقامت کی اور پھر ان کے جانشین [حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای مدظلہ العالی] نے اسی فتویٰ کو برقرار رکھا، نیز اس تاریخی فتویٰ کو دنیا بھر کے مسلمانوں نے قبول کیا، جس سے دشمن کی سازش ناکام ہوگئی، اور سلمان رشدی آج تک (کتاب کی اس حصہ کی تالیف تک) روپوش ہے، اور اسلام دشمن طاقتیں اس کی مکمل طور پر حفاظت کر رہی ہیں، اور یہ لگتا ہے کہ آخری عمر تک اسی طرح چھپ کر زندگی بسر کرے گا، اور شاید خود انھیں لوگوں کے ہاتھوں قتل ہوگا تاکہ اس رسوائی سے نجات پاسکے۔

اس بنا پر جو چیز بھی اس طرح کی روایات کی علت "محدثہ" یعنی وجود میں لانے والی علت ہے وہی چیز علت "مبقیہ" یعنی باقی رکھنے والی علت بھی ہے، یعنی جو سازش اسلام دشمنوں کی طرف سے شروع ہوئی ہزاروں سال بعد بھی انھیں اسلام دشمن طاقتوں کی طرف سے ایک وسیع پیمانہ پر وہی سازش آج بھی ہو رہی ہے۔

لہذا اس چیز کی ضرورت نہیں محسوس کی جاتی کہ تفسیر "روح المعانی" یا دوسری تفاسیر کی طرح ان روایات کے بارے میں تفصیلی گفتگو کی جائے، کیونکہ ان روایات کی بنیاد ہی خراب ہے، اور بڑے بڑے علماء کرام نے ان کے جعلی ہونے کی تاکید کی ہے، لہٰذا ہم ان روایات کی توجیہ کرنے سے صرف نظر کرتے ہیں، صرف یہاں مزید وضاحت کے لئے چند درج ذیل نکات بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں

۱۔ یہ بات کسی دوست و دشمن پر مخفی نہیں ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آغاز دعوت سے آخر عمر تک بت اور بت پرستی کا شدت کے ساتھ مقابلہ کیا، اور یہی وہ مسئلہ ہے کہ جس میں کسی طرح کی مصلحت، سازش اور نرمی نہیں کی گئی، لہٰذا ان تمام چیزوں کے پیش نظر بتوں کی شان میں اس طرح کے الفاظ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان پر کس طرح آسکتے ہیں؟

اسلامی تعلیمات کہتی ہیں کہ صرف شرک اور بت پرستی ہی ایک ایسا گناہ ہے جو قابل بخشش نہیں ہے، لہٰذا بت پرستی کے مرکز کو ہر قیمت پر نابود کرنا واجب قرار دیا ہے، اور پورا قرآن اس بات پر گواہ ہے، یہ خود حدیث "غرانیق" کے جعلی ہونے پر دلیل ہے جن میں بتوں کی مدح و ثنا کی گئی ہے۔

۲۔ اس کے علاوہ "غرانیق" افسانہ لکھنے والوں نے اس بات پر توجہ نہیں دی ہے کہ خود سورہ نجم کی آیات پر ایک نظر ڈالنے سے ان خرافی حدیث کی دھجیاں اڑ جاتی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ بتوں کی مدح و ثنا والے جملے: "تلک الغرانیق العلی وانّ شفاعتھنّ لترتجی" اور آیات ماقبل و مابعد میں کوئی ہم آہنگی نہیں ہے، کیونکہ اسی سورہ کے شروع میں بیان ہوا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہرگز اپنی خواہش کے مطابق کلام ہی نہیں کرتے، اور جو کچھ عقائد اور اسلامی قوانین کے بارے میں کہتے ہیں وہ وحی الٰہی ہوتی ہے۔ ﴿وَمَا یَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ☆ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ﴾(۱) "اور وہ اپنی خواہش سے کلام نہیں کرتا ہے اس کا کلام وحی ہے جو مسلسل نازل ہوتی رہتی ہے"۔

اور اس بات کا صاف طور پر اعلان ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہرگز راہ حق سے منحرف نہیں

(۱) سورۂ نجم، آیت ۳، ۴

ہوتا، اور اپنے مقصد کو گم نہیں کرتا ﴿مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ﴾ (۱) ''تمہارا ساتھی نہ گمراہ ہوا ہے اور نہ بہکا''۔

اس سے زیادہ گمراہی اور انحراف اور کیا ہوگا کہ پیغمبر آیات الٰہی کے درمیان شرک کی باتیں اور بتوں کی تعریفیں کریں؟ اور اپنی خواہش کے مطابق گفتگو اس سے بدتر اور کیا ہو سکتی ہے کہ کلام خدا میں شیطانی القاء کا اضافہ کرے اور آیت کے درمیان کہے ''تلک الغرانیق العلی''؟

مزے کی بات یہ ہے کہ محل بحث آیات کے بعد صاف طور پر بت اور بت پرستوں کی مذمت کی گئی ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے ﴿إِنْ هِيَ إِلَّا أَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْأَنْفُسُ﴾ (۲) ''یہ سب وہ نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے طے کر لئے ہیں خدا نے ان کے بارے میں کوئی دلیل نازل نہیں کی ہے درحقیقت یہ لوگ صرف اپنے گمانوں کا اتباع کر رہے ہیں اور جو کچھ ان کا دل چاہتا ہے''۔

کون عقلمند اس بات کا یقین کر سکتا ہے کہ ایک صاحب حکمت اور باہوش نبی مقام نبوت میں پہلے جملوں میں بتوں کی مدح و ثنا کرے اور بعد والے دو جملوں میں بتوں کی مذمت اور ملامت کرے؟ لہٰذا ان دو جملوں کے تناقض اور تضاد کی کس طرح توجیہ اور تاویل کی جا سکتی ہے؟

پس ان تمام باتوں کے پیش نظر اعتراف کرنا پڑے گا کہ قرآن مجید کی آیات میں کس قدر ہم آہنگی پائی جاتی ہے کہ دشمنوں اور بدخواہ غرض رکھنے والوں کی طرف سے کی گئی ملاوٹ کو بالکل باہر نکال دیتی ہے، اور اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ یہ ایک غیر مربوط اور جدا جملہ ہے، یہ ہے سورہ نجم کی آیات کے درمیان حدیث ''غرانیق'' قرار دینے کی سرگزشت۔

قارئین کرام! یہاں پر ایک یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ تو پھر اتنی بے بنیاد اور بے سر و پیر

(۱) سورہ نجم آیت ۲ (۲) سورہ نجم آیت ۲۳

چیزیں کیسے اتنی مشہور ہوگئیں ؟ اس سوال کا جواب بھی کوئی پیچیدہ نہیں ہے کیونکہ اس حدیث کی شہرت زیادہ تر دشمنان اسلام اور بیمار دل لوگوں کی طرف سے ہے جو یہ سوچ رہے تھے کہ یہ حدیث خود پیغمبرؐ اسلام کی عصمت اور قرآن کی حقانیت کو مخدوش کرنے کے لئے بہترین مدرک ہے، لہٰذا دشمنان اسلام کے درمیان اس حدیث کی شہرت کی دلیل معلوم ہے، لیکن اسلامی مورخین کے درمیان شہرت کی وجہ بعض علما کے قول کے مطابق یہ ہے کہ بعض مورخین ہمیشہ سے نئے حادثات اور نئے مطالب کی طرف دوڑتے ہیں نیز کوشش کرتے ہیں کہ اپنی کتابوں میں ہیجان آور اور استثنائی وقعات بیان کریں چاہے وہ تاریخی حقیقت رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں، کیونکہ ان کا مقصد اپنی کتاب کو مقبول بنانا اور ہنگامہ برپا کردینا ہوتا ہے، اور چونکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں غرانیق جیسا افسانہ بہت زیادہ بیان ہوا ہے لہٰذا اس کے منبع اور اس کے مفہوم کے بے بنیاد ہونے پر توجہ کئے بغیر بعض تاریخی کتابوں اور بعض حدیث کی کتابوں میں نقل کردیا گیا ہے، جبکہ بعض علما نے اس پر تنقید اور تردید کے لئے بیان کیا ہے۔

نتیجہ

[قارئین کرام!] ہماری مذکورہ بحث سے یہ مسئلہ واضح اور روشن ہوجاتا ہے کہ قرآن مجید میں نہ صرف کوئی ایسی چیز موجود نہیں ہے کہ جو ان کے مقام عصمت کے منافی ہو، بلکہ یہی آیت جن کو عصمت کے منافی سمجھ لیا گیا ہے، عصمت انبیاء علیہم السلام پر واضح اور بہترین دلیل ہیں۔(۱)

تَمَّتْ بِالْخَيْرِ ، وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَ لَهُ الشُّكْرُ عَلىٰ هٰذَا التَّوْفِيقِ، رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ.

مترجم اقبال حیدر حیدری

---

(۱) تفسیر پیام قرآن ، جلد ۷، صفحہ ۱۹۴

فہرست کتاب

حرف اوّل ۔۔۔۔۔۔ ۷

عرض مترجم ۔۔۔۔۔۔ ۹

تقریظ حضرت آیت اللہ العظمیٰ مکارم شیرازی دام ظلہ ۔۔۔۔۔۔ ۱۱

پیش گفتار ۔۔۔۔۔۔ ۲۳

معرفت خدا

۱۔خدا کی معرفت کیوں ضروری ہے؟ ۔۔۔۔۔۔ ۲۷

۲۔خداوند عالم کو درک کیوں نہیں کیا جا سکتا؟ ۔۔۔۔۔۔ ۲۹

۳۔کس طرح بغیر دیکھے خدا پر ایمان رکھیں؟ ۔۔۔۔۔۔ ۳۰

۴۔توحید ذات، توحید صفات، توحید افعال اور توحید عبادت کے کیا معنی ہیں؟ ۔۔۔۔۔۔ ۳۹

۵۔دین کس طرح فطری ہے؟ ۔۔۔۔۔۔ ۴۴

۶۔خدا کے "سمیع" اور "بصیر" ہونے کا کیا مطلب ہے؟ ۔۔۔۔۔۔ ۵۱

۷۔صفات جمال وجلال سے کیا مراد ہے؟ ۔۔۔۔۔۔ ۵۳

۸۔خداوند عالم کے ارادہ کی حقیقت کیا ہے؟ ۔۔۔۔۔۔ ۵۵

۹۔اسم اعظم کیا ہے؟ ۔۔۔۔۔۔ ۵۷

۱۰۔کیا خداوند عالم کو دیکھا جا سکتا ہے؟ ۔۔۔۔۔۔ ۵۹

۔عرش خدا کیا ہے؟ ۔۔۔۔۔۔ ۶۵

۱۲۔عالم ذرّ کا عہد و پیمان کیا ہے؟ ۔۔۔۔۔۔ ۷۰

۱۳۔خداوند عالم کی طرف سے ہدایت و گمراہی کے کیا معنی ہیں؟ ۔۔۔۔۔۔ ۷۴

۱۴۔کس طرح کائنات کی ہر شئی خدا کی تسبیح کرتی ہے؟ ۔۔۔۔۔۔ ۸۱

۱۵۔کیا خداوند عالم کسی چیز میں حلول کر سکتا ہے؟ ۔۔۔۔۔۔ ۸۷

۱۶۔بدا کیا ہے؟ ۔۔۔۔۔۔ ۹۰

۱۷۔ کیا اولیاء خدا کو وسیلہ قرار دینا توحید خدا کے مخالف ہے؟ ۹۷

۱۸۔ دعا کرتے وقت آسمان کی طرف ہاتھ کیوں کرتے ہیں؟ ۱۰۳

عدل الٰہی

۱۹۔ کیا انسانوں میں پیدائشی فرق، خداوند عالم کی عدالت سے ہم آہنگ ہے؟ ۱۰۹

۲۰۔ کیا روزی کے لحاظ سے لوگوں میں پایا جانے والا فرق، عدالت الٰہی سے ہم آہنگ ہے؟ ۱۱۲

۲۱۔ انسان کو پیش آنے والی پریشانیوں اور مصیبتوں کا فلسفہ کیا ہے؟ ۱۱۶

۲۲۔ خداوند عالم نے شیطان کو کیوں پیدا کیا؟ ۱۲۳

انبیاء علیہم السلام

۲۳۔ خاتمیت انسانی ترقی کے ساتھ کس طرح ہم آہنگ ہے؟ ۱۲۹

۲۴۔ ثابت قوانین، آج کل کی مختلف ضرورتوں سے کس طرح ہم آہنگ ہے؟ ۱۳۱

۲۵۔ کیا توریت اور انجیل میں پیغمبر اکرم ﷺ کی بشارت دی گئی ہے؟ ۱۳۳

۲۶۔ اولو العزم پیغمبر کون ہیں؟ ۱۳۸

۲۷۔ بچپن میں نبوت یا امامت کس طرح ممکن ہے؟ ۱۴۲

۲۸۔ وحی کی اسرار آمیز حقیقت کیا ہے؟ ۱۴۵

۲۹۔ کیا پیغمبر اکرم ﷺ امی تھے؟ ۱۵۰

۳۰۔ معراج، جسمانی تھی یا روحانی اور معراج کا مقصد کیا تھا؟ ۱۵۳

۳۱۔ کیا معراج، آج کے علوم و سائنس سے ہم آہنگ ہے؟ ۱۵۶

۳۲۔ کیا عصمت انبیاء جبری طور پر ہے؟ ۱۶۰

۳۳۔ جادوگروں اور ریاضت گروں کے عجیب و غریب کاموں اور معجزہ میں کیا فرق ہے؟ ۱۶۵

۳۴۔ جناب آدم کا ترک اولیٰ کیا تھا؟ ۱۷۱

۳۵۔ کیا معجزہ "شق القمر" سائنس کے لحاظ سے ممکن ہے؟ ۱۷۵

۳۶۔ بعض آیات و احادیث میں غیر خدا سے علم غیب کی نفی اور بعض میں ثابت ہے،
اس اختلاف کا حل کیا ہے؟ ۱۸۰

۳۷۔کیا انبیاءؑ میں بھول چوک کا امکان ان کی عصمت سے ہم آہنگ ہے؟ ۔۔۔ ۱۸۹
۳۸۔پیغمبر اکرم ﷺ کی متعدد بیویوں کا فلسفہ کیا ہے؟ ۔۔۔ ۱۹۳

قرآن

۳۹۔کیا قرآن مجید میں تحریف ہوئی ہے؟ ۔۔۔ ۱۹۹
۴۰۔قرآن کریم کس طرح معجزہ ہے؟ ۔۔۔ ۲۰۳
۴۱۔کیا قرآن کا اعجاز صرف فصاحت وبلاغت میں منحصر ہے؟ ۔۔۔ ۲۱۰
۴۲۔قرآن کے مثل کیسے نہ لا سکے؟ ۔۔۔ ۲۱۳
۴۳۔قرآن کے حروف مقطعہ سے کیا مراد ہے؟ ۔۔۔ ۲۱۹
۴۴۔قرآن مجید پیغمبر اکرمؐ کے زمانہ میں مرتب ہو چکا تھا یا بعد میں ترتیب دیا گیا؟ ۔۔۔ ۲۲۲
۴۵۔قرآن مجید کی آیات میں محکم اور متشابہ سے کیا مراد ہے؟ ۔۔۔ ۲۲۶
۴۶۔کیوں بعض قرآنی آیات متشابہ ہیں؟ ۔۔۔ ۲۲۹
۴۷۔کیا بسم اللہ تمام سوروں کا جزء ہے؟ ۔۔۔ ۲۳۲

امامت

۴۸۔امامت سے مراد کیا ہے؟ اور امامت اصول دین میں ہے یا فروع دین میں؟ ۔۔۔ ۲۳۹
۴۹۔امامت کی بحث کب سے شروع ہوئی؟ ۔۔۔ ۲۴۳
۵۰۔اولوا الامر سے مراد کون ہیں؟ ۔۔۔ ۲۴۶
۵۱۔اہل بیتؑ سے مراد کون حضرات ہیں؟ ۔۔۔ ۲۵۵
۵۲۔واقعۂ غدیر کیا ہے؟ ۔۔۔ ۲۶۵
۵۳۔ولایت تکوینی اور تشریعی میں کیا فرق ہے؟ ۔۔۔ ۲۸۲
۵۴۔بیعت کی حقیقت کیا ہے؟ نیز انتخاب اور بیعت میں کیا فرق ہے؟ ۔۔۔ ۲۸۵
۵۵۔کیا دس سالہ بچہ کا اسلام قابل قبول ہے؟ ۔۔۔ ۲۹۰
۵۶۔امام حسنؑ نے زہر آلود کوزہ سے پانی کیوں پی لیا اور امام رضاؑ نے زہر آلود انگور کیوں تناول فرمایا؟ ۔۔۔ ۲۹۴

۵۷۔ فلسفۂ انتظار کیا ہے؟ ۲۹۶

قیامت

۵۸۔ قیامت کے عقلی دلائل کیا ہیں؟ ۳۱۰

۵۹۔ معاد جسمانی ہے یا روحانی؟ ۳۱۶

۶۰۔ شبہ آکل و ماکول کیا ہے؟ ۳۱۹

۶۱۔۶۱۔ روح کیا ہے؟ اور یہ کیسے ثابت کیا جا سکتا ہے کہ روح ہی اصل ہے؟ ۳۲۵

۶۲۔ اجل مسمّی (حتمی) اور اجل معلق (غیر حتمی) سے مراد کیا ہے؟ ۳۴۷

۶۳۔ کیا سائنس تجسم اعمال کی تائید کرتا ہے؟ ۳۵۱

۶۴۔ عالم برزخ کیا ہے اور وہاں کی زندگی کیسی ہے؟ ۳۵۶

۶۵۔ کیا دنیا اور آخرت میں تضاد پایا جاتا ہے؟ ۳۶۰

۶۶۔ نامۂ اعمال کیا ہے اور اس کا فلسفہ کیا ہے؟ ۳۶۶

۶۷۔ روز قیامت اعمال کو کس قسم کی ترازو میں تولے جائیں گے؟ ۳۷۰

۶۸۔ پل صراط کی حقیقت کیا ہے؟ ۳۷۲

۶۹۔ فلسفۂ شفاعت کیا ہے؟ اور کیا شفاعت کی امید، گناہ کی ترغیب نہیں دلاتی؟ ۳۷۶

۷۰۔ کیا شفاعت توحید کے منافی ہے؟ ۳۸۱

فروع دین

نماز

۷۱۔ وضو، غسل اور تیمم کا فلسفہ کیا ہے؟ ۳۹۳

۷۲۔ فلسفۂ نماز کیا ہے؟ ۴۰۱

روزہ

۷۳۔ روزہ کا فلسفہ کیا ہے؟ ۴۱۱

خمس

۷۴۔ خمس کا نصف حصہ سادات سے مخصوص ہونا کیا طبقاتی نظام نہیں ہے؟ ۴۱۷

زکوٰۃ

۷۵۔ فلسفۂ زکوٰۃ کیا ہے؟.. ۴۲۰

حج

۷۶۔ فلسفہ اور اسرار حج کیا ہیں؟.. ۴۲۳

جہاد

۷۷۔ جہاد کا مقصد کیا ہے؟ اور ابتدائی جہاد کس لئے ہے؟.................... ۴۳۳

اسلام میں خواتین کے حقوق

۷۸۔ اسلام؛ خواتین کے لئے کن حقوق کا قائل ہے؟.................................. ۴۳۷
۷۹۔ پردہ کا فلسفہ کیا ہے؟.. ۴۴۳
۸۰۔ میراث میں مرد کا حصہ عورت کے دو برابر کیوں ہے؟.................... ۴۵۱
۸۱۔ فلسفۂ متعہ کیا ہے؟.. ۴۵۴
۸۲۔ عدّہ کا فلسفہ کیا ہے؟.. ۴۶۳

اسلام کے بعض محرمات کا فلسفہ

۸۳۔ غنا؛ کیا ہے اور اس کی حرمت کا فلسفہ کیا ہے؟.................................. ۴۶۷
۸۴۔ زنا کی حرمت کا فلسفہ کیا ہے؟.. ۴۷۳
۸۵۔ ہم جنس بازی کی حرمت کا فلسفہ کیا ہے؟.................................. ۴۷۶
۸۶۔ شراب کی حرمت کا فلسفہ کیا ہے؟.. ۴۷۹
۸۷۔ محارم سے شادی کی حرمت کا فلسفہ کیا ہے؟.................................. ۴۸۴

مختلف موضوعات

۸۸۔ خلقتِ انسان کا مقصد کیا ہے؟.. ۴۹۴
۸۹۔ کیا انسان کی سعادت اور شقاوت ذاتی ہے؟.................................. ۴۹۷
۹۰۔ اسلام اور ایمان میں کیا فرق ہے؟.. ۵۰۱
۹۱۔ جن اور فرشتہ کی حقیقت کیا ہے؟.. ۵۰۴

۹۲۔رجعت کیا ہے اور کیا اس کا امکان پایا جاتا ہے؟..................۵۱۴
۹۳۔توکل کی حقیقت اور اس کا فلسفہ کیا ہے؟..................۵۲۱
۹۴۔دعا وزاری کا فلسفہ کیا ہے؟..................۵۲۶
۹۵۔ کبھی کبھی ہماری دعا کیوں قبول نہیں ہوتی؟..................۵۳۰
۹۶۔جبر اور اختیار کے سلسلہ میں اسلام کا نظریہ کیا ہے؟..................۵۳۳
۹۷۔کیا نظر بد کی کوئی حقیقت ہے؟..................۵۴۲
۹۸۔کیا فال نیک اور بدشگونی حقیقت رکھتے ہیں؟..................۵۴۵
۹۹۔کیا تمام اصحاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نیک افراد تھے؟..................۵۴۸
۱۰۰۔ذوالقرنین کون تھے؟..................۵۵۴
۱۰۱۔کیوں بعض ظالم اور گناہگار لوگ نعمتوں سے مالامال ہیں اور ان کو سزا نہیں ملتی؟.....۵۶۴
۱۰۲۔ایمان نہ رکھنے والی اقوام کیوں عیش وعشرت میں ہیں؟..................۵۶۶
۱۰۳۔مسلمانوں کی پسماندگی کے اسباب کیا ہیں؟..................۵۷۰
۱۰۴۔واقعہ فدک کیا ہے؟..................۵۷۳
۱۰۵۔کیا جناب ابوطالبؑ مومن تھے؟..................۵۷۶
۱۰۶۔گناہان کبیرہ کا معیار کیا ہے؟..................۵۸۵
۱۰۷۔کیا دنوں کو سعد ونحس ماننا صحیح ہے؟..................۵۸۷
۱۰۸۔کیا اصحاب کہف کا واقعہ سائنس سے مطابقت رکھتا ہے؟..................۵۹۴
۱۰۹۔تقیہ کا مقصد کیا ہے؟..................۶۰۳
۱۱۰۔افسانہ آیات شیطانی یا افسانہ ''غرانیق'' کیا ہے؟..................۶۰۸

☆☆☆☆☆

مجمع جهانی اهل بیت علیهم‌السلام
www.ahl-ul-bayt.org
ISBN 964-529-130-5
9789645291301